

دشتِ سُورِ ناول

حسین دین منصور حیات — ایک ڈھانچہ

<http://www.pakistanconnections.com/ebooks>

جمیلہ ہاشمی

دشت سوں

(ناول)

جمیلہ ہاشمی

صدائے ساز

مسجد کا صحن نمازیوں سے پر تھا اور میناروں پر ڈوبتے سورج کی آخری کرنیں گلرنگ روشنی سے دھندلے سفید اجالے میں اور پھر دھواں دھواں نیلے اندھیرے میں بدل رہی تھیں۔ موزن نے اپنی جگہ سنبھالنے کے لئے پہلی سیڑھی پر قدم دھرا، صو خانوں میں پانی رواں ہونے کی صدائیں آئیں۔ کاروانوں کے سالار اونٹوں کو روکے رکھنے کا حکم دے کر ساربانوں کی معیت میں دالان در دالان اونچی چھتوں سے مزین صحنوں میں داخل ہوئے۔ لوگ درو درو سلام میں منہمک اور پھر خاموش ہو گئے۔ اذان کا جلال آسمانوں اور زمینوں پر منکشف ہوا۔ اونچے ایوان سبزہ زار اور باغوں سے گھری بستی میں یہ مشک بوگوںج ہوا کے ساتھ ساری پستیوں اور بلندیوں پر جاری و ساری بلند ہوئی۔

درویشوں کی ایک ٹکڑی اپنے فرغوں کو سنبھالتی ہاتھوں سے کلاہ تھا، ایک انداز مستانہ سے چلتی اپنے نعروں کے خروش کو اپنے سینوں میں دبائے ملحقہ خانقاہ سے آکر نمازیوں کی صفوں میں شامل ہو گئی۔ یہ غیاب حضور کی کیفیت سے سرشار عجیب لوگ تھے کہ جب سجدے کے لئے جھکتے تو انہیں اٹھنے کا ہوش نہ رہتا۔ جب اٹھتے تو امام کی آواز سنائی دینے کے باوجود کھڑے رہتی۔ یہ کیسی نماز میں سرشار تھے؟

نمازی اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہے تھے جب انہیں نماز کا ہوش نہیں تھا تو یہ جماعت میں کیوں شامل ہوئے تھے؟ آج سے پہلے ایسی کسی جماعت نے نماز میں شرکت نہ کی تھی جو امام کے پیچھے اپنی الگ نماز میں مشغول ہو۔ خانقاہ میں یہ کہاں سے وارد ہوئے تھے؟

نماز ختم ہوئی تو بعض لوگ ان درویشوں سے بچ کر باہر نکلے اور کچھ ان کے گرد حلقہ باندھ کر بیٹھ گئے کہ جب وہ فارغ ہوں تو ان سے استفسار کیا جاسکے۔ خضوع و خشوع کی کون سی کیفیت تھی جو ان کے سجدوں کو طویل اور ان کے قیام کو طویل کر رہی تھی؟ دعا میں ان کے ہاتھ سینوں پر بندھے تھے۔ وہ سر جھکائے تھے اور کم پڑتی روشنی میں ان کے چہرے آنسوؤں سے تر تھے۔ زاری و الحاح سے ان کی جانیں کیوں اتنی بے تاب تھیں۔ ان کا مسلک کیا تھا؟ مناجات کا طریقہ انہوں نے کہاں سے سیکھا تھا؟

نہایت عاجزی دے ان میں سے ایک نے جس کے شانے بیٹھے ہوئے باقی لوگوں سے ذرا بلند اور گردن لمبی تھی ہاتھ سے آسمان

کی طرف اشارہ کیا۔

عشق ایک مزرعِ گلاب ہے

اس کی پگڈنڈیاں ان کے لئے ہیں

جو عاشقوں کے قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں

عشق کی نشانیاں توفیق اور مہربانیاں

ان کی منزل ہیں

اور مجھوریاں غم خاموش اور برداشت

کبھی نہ ختم ہونے والا سوزِ ہیجلی اور اذیت ناک

اس کی شان ہے

اس کے سوا باقی سب گم کردہ منزل

جہالت اور وحشت تنہائی

اور بے جا دہ گردش ہے

عشق مزرعِ زندگی ہے

کاروانِ سالار آقائے رازی نے اپنے قریب بیٹھے کلاہ پوش کا کندھا ہلا کر کہا۔ ”یہ دل دوز لے اس سے پہلے میں نے کبھی نہیں

سنی۔ کیا کلام ہے اور کیا ادائیگی، کیا نغمہ ہے، کیا جان کو پگھلانے والے بول۔“ اس نے بیٹھے بیٹھے اپنے زانو پر زور سے ہاتھ مارا۔

اس کے سوا باقی سب گم کردہ منزل

دریش نے اس کی طرف نہ کر کے نہایت آہستگی سے کہا۔ ”ہاں، اس کے سوا باقی سب گم کردہ منزل۔“ یہ اوائل شعبان کی راتیں

تھیں، نیم گرم ہوا ستاروں کے ساتھ باغوں کی خوشبوؤں پر اتر آئی تھی اور آسمان درویشوں کی صداؤں پر نفسِ گم کردہ مراقبے میں کھویا

ہوا صوفی تھا۔

کاروانوں کے گزرنے کی شاہرہ جو فتن سے دمق کو جاتی تھی اس بستی کو چھو کر گزرتی تھی اور یہ مسجد جو اس کے انتہائی سرے پر تھی

نارنگی کے پھولوں سے بھری تھی اور مسافروں سے آباد رہتی تھی یونکہ وہ یہاں جاری پانی تھا اور ذکر کی محفلیں رات کے ہر حصے میں ہوا

رہتیں اور اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں حدی خوانوں کی نواؤں کے ساتھ برابر سنائی دیتیں۔ کبھی تیز جب منزل دور ہوتی چلنے والوں کے قدموں کو تیزی کی ضرورت ہوتی کبھی نہایت آہستہ جیسے منزل کے قرب کا احساس بے خودی میں بدل جائے۔

آقائے رازی دمشق سے نقتن جا رہا تھا اور سامان تجارت سے لدے اس کے اونٹ مسجد کے باہر بس ذرا کی ذرا کے تھے۔ اس کے قافلے کو صبح تک چلتے رہنا تھا اور کہیں اگلی بستی میں ان کا قیام ہوتا۔ جب سورج ان کھنڈروں پر سے طلوع ہوتا جو کتنی تہذیبوں کے آغاز اور انجام پر گواہوں کی طرح انسانیت کی عدالت میں حاضر تھے۔ عبرت پر صاد کرنے کے لئے بہت بہتر اور بہت عمدہ لوگوں کے مدفن رواجوں، مذہبوں، سلطنتوں کے نشان اور سورج پوگواہی دینے کے لئے کہ سفر جاری رہتا ہے، بنا اس خیال لے کہ دنیا میں کون ہے!

مگر کاروان سالار نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ باہر نکل کر اس نے ساتھیوں سے کہا کہ وہ قریب لگی پہلی سرائے میں ٹھہر جائیں، اونٹوں کو چارہ اور پانی دیں، سامان اتار لیں اور سستانے کے لئے کمریں کھول لیں۔ مسافر حیران ہوئے مگر وہ ایک اچھا ساتھی اور مہربان سالار تھا۔ دانشمند اور دکھ درد میں شریک ہونے والا بلا وجہ راہ میں توقف کرنے والا بھی نہیں تھا۔ منزلوں کو بے جا طول دینے والا اور راہ میں ٹھہرنے والا بھی نہیں۔ لوگوں نے بنا سوال کئے سرائے کا رخ کیا اور آقائے رازی نے اس حلقہ ذکر میں جس کو پرسوز لے میں ایک درویش تھا، پھر شراکت کی۔ ہوئے ہوئے نوا بلند اور لے تیز ہونے لگی۔ صحن مسجد میں ادھر ادھر بکھرے مسافر اور نمازی گویا ایک نادیدہ رشتہ سے بندھے حلقے میں بیٹھتے گئے۔

اس کے سوا باقی سب گم کردہ منزل

جب ایک درویش چپ ہوتا تو دوسرا ”جہالت اور وحشت تنہائی اور بے جا گردش“ کا ذکر کرنا شروع کرتا۔ باری باری وہ سب اپنے گرد ہونے والے مجمع سے بے پروا سر جھکائے اپنے آپ میں مشغول تھے۔ یہاں تک کہ عشاء کی نماز کا وقت ہو گیا۔ نمازی پر جلال بلاتی ہوئی، ہوش دلاتی ہوئی رب جلیل کی طرف سے ہوش دلاتی صدا سن کر وضو خانوں کی طرف بھاگے۔ درویش پھر امام کے پیچھے اپنی نماز قائم کرنے کے لئے خاموشی سے کھڑے ہو گئے۔

رات کا آسمان ستاروں سے مزین گھرا چاندنی میں دھلا دھلا اور زردی مائل تھا اور کہکشاں کروڑوں زمین سے بھی بے سیاروں سے سبکی اپنی خاکساری میں سب سے زیادہ روشن ایک بڑے دھارے کی طرف افق سے تابا افق اپنے غبار میں ڈھکی بہہ رہی تھی اور بستی سے پرے کھلا صحرا ریت کے ٹولید لہریوں میں الجھا ہوا تھا اور قافلے رواں دواں شاہراہ پر سے گزر رہے تھے اور شعبان کی آباد

راتوں کی رونق میں اضافہ کر رہے تھے۔

جب درویشوں کی نماز طویل ہو گئی تو آقائے رازی چغہ اپنے گرد لپیٹ کر اٹھا اور سرائے کی طرف روانہ ہوا۔ اس سے پہلے بھی وہ اس سرائے میں قیام کر چکا تھا۔ ایک آتش پرست محی اس کا مالک تھا۔ محی لین دین میں ایماندار اور نیاز مند تھا۔ اسے مسافروں کے آرام کا بطور خاص خیال رہتا تھا۔ جب دشت سوس کی کھلی ہوا یخ کرنے والی سردی سے پریشان کرتی تو وہ سرائے میں اقامت گزیر لوگوں کے لئے آگ تاپنے اور کوھڑیوں کو گرم رکھنے کا بندوبست کرتا اور اس کے لئے وہ زیادہ دام بھی وصول نہیں کرتا تھا۔ لوگ کہتے تھے وہ آتش پرست ہے اس لئے اپنی عاقبت سنوارنے کی خاطر ایسا کرتا ہے مگر وہ ان سب باتوں سے بے پروا تھا۔ گرمی کی شدت میں جب سورج ہی سے بے پناہ تیزی سے چمکتا تو ٹھنڈے پانی کا بندوبست بھی وہ اسی التزام سے کرتا۔ ڈھلے ہوئے حوض لباب ہوتے اور نہانے کے لئے علیحدہ جاری پانی ہوتا۔ اس کی طبیعت میں انکساری اور خوف خدا تھا جس کا اعلان وہ کبھی نہیں کرتا تھا، مگر جانوروں تک کی نگہداشت کرنے میں اسے کوئی امر مانع نہ ہوتا۔ اس لئے سرائے میں ایک الگ احاطے میں سایہ دار سرختوں تلے ان کے لئے باندھنے کی جتہ تھی اور چارہ بھی مہیا کیا جاتا تھا۔ وہ اونٹوں اور خچروں کی چھوٹی موٹی بیماریوں کا علاج بھی کر سکتا تھا اور قافلے والوں میں سے جب کسی کی طبیعت خراب ہوتی تو پریشان ہو جاتا۔ بستی میں ایک دانا حکیم تھا جو اکثر سفر پر رہتا مگر محی نے کچھ دواؤں کے نام اور بیماریوں کے علاج اس سے دریافت کر لئے تھے اور ذرا سی ناسازی طبع میں وہ اپنی یادداشت کام میں لاتا۔ آقائے رازی سے اور اس سے گہری دوستی کا تو نہیں مگر ایک خاموش معاہدے کا سارشتہ تھا۔ جب بھی قافلہ یہاں سے گزرتا تو سرائے میں ضرور قیام ہوتا۔ اب کے بھی ایسا ہو ہی گیا تھا اگرچہ یہ رواں رہنے کا وقت تھا اور قاعدے کی رو سے انہیں سفر جاری رکھنا چاہئے تھا۔

جب لوگ داستان گو کے پاس بیٹھ چکے اور قصہ گو پرانے بادشاہوں کے نام سے اپنے قصے کا آغاز کیا تو آقائے رازی محی کے پاس ہو بیٹھا۔ وہ اندر سے بہت مضطرب تھا۔ اس نے آج تک بہ سفر کئے تھے۔ اصل میں وہ ہمیشہ قافلوں کے ساتھ کوہ و صحرا میں سرگرداں رہا تھا۔ تیز بہتے دریاں کے ساتھ ساتھ پہاڑوں میں نہایت بلندی سے جا کر وادیوں میں اترتے راہوں پر اس نے چابک دستی سے اپنے سارے سفر کئے تھے۔ آنکھیں کھلی رکھی تھیں اور کانوں کو ہر آواز پر لگائے رکھا تھا۔ ہمت اور دانائی سے اس نے بہت کچھ دیکھا، بہت ان کہی باتیں سنیں اور بہت کچھ برداشت کیا تھا۔ بچپن سے اب تک اس نے زمانہ دیکھا تھا۔ ہاں! زمانہ دیکھا تھا اور اس کے الٹ پھیر دیکھے تھے۔ اس نے نئے فرقوں اور نئے مذہبوں کو طلوع ہوتے اور غروب ہوتے دیکھا تھا۔ نئے مہدی جو دنیا سے ختم کی گواہی دینے کے لئے اپنی امامت کا اعلان کرتے تھے اور پھر مارے جاتے تھے۔ نئے نبی جو عجیب و غریب شریعتوں کو لاتے

اور پھر جھٹلائے جاتے اور دار پر کھینچے جاتے تھے۔ دنیا نئی دریافتوں سے کبھی خالی نہیں ہوئی۔ شوریدہ سراوردیوانوں کے ذہنوں میں خیالوں کی یورشیں انہیں بے تاب کرتی اور موت کی طرف بلاتی ہیں۔ اور پھر وقت جو بے پایاں مسلسل اور شکست دینے والا ہے کبھی نہیں رکتا اور ان بستیوں اور ان کے مکینوں پر سے گزرتا ہے تاکہ وہ جو پہلے گزرا ہے بھلایا جاسکے اور زمین نئے فتنوں کی آماجگاہ بنتی رہے، نئی رحمتوں کے لئے آپنے آپ کو تیار کرتی رہے۔

”آقائے رازی! بہت اچانک آپ نے اپنا سفر ملتوی کیا ہے۔ گو میرے لئے یہ خوشی کی بات ہے مگر میں جانتا چاہوں گا کہ کیا واقعہ تاخیر کا سبب ہوا ہے؟ اگر کوئی امر مانع نہ ہو تو؟“ محی نے قالین کے حاشیے پر دو زانوں بیٹھتے ہوئے ادب سے سر جھکا کر پوچھا۔ آقائے رازی نے کھلے درتپے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”برادر محی جو چیز میرے لئے حیرت اور دلچسپی کا باعث ہے وہ آپ نے شاید دیکھی بھی نہ ہو۔ شام مسجد میں چند ایسے درویشوں کو دیکھا ہے جو اپنی نمازوں میں غلو کرتے اور اپنی جان پر سوز سے دلوں کی مضطرب کرتے ہیں۔ ان کی آوازوں میں بے پناہ سوز ہے مگر وہ کون ہیں؟ یہ جانتا بھی از حد ضروری ہے۔ کہیں وہ کسی نئے فتنے کو ہوانہ دے رہے ہوں۔“

محی ہنسنا دبی دبی سی خوشگوار ہنسی۔

”آقائے رازی بس اتنی سی بات؟ آخر آپ کس شے سے خوفزدہ ہیں؟ کیا یہ ضروری ہے کہ ہر شخص جس کا مسلک الگ اور جس کا طریقہ مختلف ہو کسی تازہ فتنے کا پیش خیمہ ہو اور پھر جان بے تاب کے لئے کوئی نام بھی ہو سکتا ہے مگر جہاں تک میری معلومات ہیں یہ لوگ سارے زمستان اسی خانقاہ میں مقیم رہے ہیں۔“

”کیا ہر نماز کے وقت ان کے وجد و کیف کا یہ حال ہوتا ہے؟“

”نہیں، مگر کبھی کبھار جب یہ زیادہ جوش میں ہوتے ہیں تو مسجد میں آتے ہیں ورنہ اکثر خانقاہ میں مراقبہ میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی جماعت کو کبھی خانقاہ سے باہر آتے نہیں دیکھا گیا۔“ آقائے رازی بہت دیر خاموش رہا۔ کچھ سوچتا ہوا، بہت کچھ یاد کرتا ہوا۔

”کیا آپ پسند فرمائیں گے اگر میں مقدس آگ سے مدد چاہوں کہ یہ گروہ ملک کے لئے سعید ہو گیا یا منحوس۔“ محی نے بہت انکساری سے کہا۔ ”ہمارے ہاں آتش سے سکون لینے کا رواج بہت پرانا ہے۔ ہماری برزسواہ جو کبھی بجھ نہیں سکتی جسے سورج کی کرن چھو نہیں سکتی۔“

”کیا مطلب سورج کے چھونہ سکنے کا؟“ آقائے رازی نے پوچھا۔

”یہ آگ اندھیروں میں تابناک ہوتی ہے۔ زندگی کے رہنے کا نشان۔ شعلہ مستعجل بے قرار اور بیٹھکی سے ہمکنار۔ دنیا کی رست خیز میں ایک جائے پناہ۔ دنیا کی تطہیر کرتی ہوئی اور جاودانی آسمانی طرف اشارہ کرتی ہوئی انگلی کی طرح اٹھتی ہوئی سعود کی طرف مائل سعود کا حصہ جو زائد اور بے جا ہے اس سے نجات دلانے والی پاک کرنے والی۔“

آقائے رازی نے سر ہلایا۔

پھر دونوں خاموشی سے اندرونی کمرے کی طرف بڑھے جو تہہ خانہ تھا اور آتش کدے کا کام دیتا تھا۔ سلگتے ہوئے کندے پر خوشبو دار لکڑی رکھ کر محمی نے اسے ہوا دی تو شعلہ بلند ہوا۔ پھر اس نے سپند کے چند دانے اس آگ پر ڈالے جو شاید تعداد میں سات یا پانچ تھے انہوں نے ایک دم آگ پکڑی چٹختے اور ننھے شعلوں کی طرح بڑے شعلے میں مٹ گئے۔ صرف ایک دانہ الگ رہا اور اس پر دور ہونے کی وجہ سے آگ کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ محمی آنکھیں بند کر کے دعائیں پڑھ رہا تھا۔

برکت دے اور ہم کو اٹھا سورج کی پتش اور برف کی ٹھنڈک میں

ہمیں ہمیشہ اپنے سیدھے راہ پر لگا

تمہاری جلائی ہوئی آگ اور تمہارا دین

ہمارا ہم نما ہو

سپند کے دانے کو ایک طرف پڑے دیکھ کر محمی نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ دل ہی دل میں جانے کیا کہہ رہا تھا۔ آقائے رازی دلچسپی سے آگ کی روشنی میں یہ سب دیکھ رہا تھا۔ یہ عبادت جس کو آج تک اپنی انتہائی فطرت میں اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

”آقائے رازی!“ محمی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ آگ جس کو میں نے آپ کے لئے فروزاں کیا تھا میرے لئے فتنے اور مصیبتیں لائے گی۔ آہور امزد امیری مدد کرے اور مجھے اپنی پناہ میں رکھے۔“

”کیا خاص بات ہے برادر!“ اس نے بہت فکر مند ہوتے ہوئے کہا۔

”نہیں فکر کی کوئی بات نہیں۔ جو ہونا ہے ہو کر رہے گا۔ آگ نے جس دانے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے وہ میرے گھرانے کا ہی فرد ہوگا۔ میرے خون کی امانت کو لئے ہوئے مجھ سے باغی میرا حصہ اور مجھ سے روگردانی کرے گا! جانے ابھی اندھیرے میں کیا کچھ ہے۔“ پھر اپنے پیچھے تہہ خانے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ”مگر آقائے رازی آپ کے لئے فکر کی کوئی بات نہیں۔ نہ ملک کے لئے اور نہ حکومت کے لئے۔ میری آتش کبھی غلط نہیں کہتی اور میرا شگون کبھی غلط نہیں ہوا۔“

دونوں پھر قالین پر آن بیٹھے۔ باہر گرد باد کی وجہ سے رات دھندلا گئی تھی اور دشت سوس پر مٹی اور ریت ملی ہوئی خوشبو کی طرح برس رہی تھی۔

”مگر اس سے پہلے میں ان درویشوں سے کبھی کیوں نہیں ملا؟“ آقائے رازی نے کہا۔ ”کیا تمہارے ہاں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ نئے مسلک عبادت کے نئے طریقے رائج ہوئے ہوں؟ کسی آدمی نے دعویٰ کیا ہو کہ وہ دوسروں سے زیادہ جانتا ہے؟“

”ہمارے ہاں معینہ وقت پر ایک سوشیات آئے گا جو رستخیز میں دنیا کو بچائے گا، وہ کسی کسی کے خیال کے مطابق بہرام وژ ہوگا، دنیا کو بچانے والا۔ جب بدی کی طاقتیں زور آور ہو جائیں گی اور اندھیرا ہر طرف سے چھا جائے گا، تب آہورا مزدا اور اہرمن میں جنگ ہوگی اور یزدان جیت جائے گا۔ بدی رخصت ہو جائے گی، شکست کھا جائے گی اور امن و امان کا دور دورہ ہوگا۔ ایک طرح سے تو وہ امام مہدی ہوگا۔ تمہارے مذہب کا امام مہدی یا سوشیات یا بہرام وژ جو تم اسے کہو۔“ آقا رازی نے بہت پر امید ہو کر کہا۔

حمی نے قالین پر بیٹھے بیٹھے جھک کر اپنے گھٹنوں کو چھوا

”ہاں آقا سوشیات جہاں کہیں بھی ہوگا پیدا ہو چکا ہوگا۔ اب دنیا فسق و فجور سے بھر گئی ہے۔“

وہ چپ ہو گیا تو آقائے رازی نے کہا۔ ”میں ذرا خانقاہ کی طرف جا رہا ہوں تاکہ ممکن ہو تو ان درویشوں سے پھر ملاقات کروں۔ ہو سکتا ہے مجھے ان کے متعلق مزید کچھ معلوم ہو سکے۔ کل پچھلے پہر ہمارا کوچ ہوگا۔ تب تک کے لئے سارے انتظام امید ہے حسب دلخواہ ہو سکیں گے۔“

حمی نے سر جھکا کر صا د کیا۔

آقائے رازی نے عمامہ اپنے سر پر رکھا اور بڑے رومال سے منہ چھپا کر کہ صرف آنکھیں کھلیں رہیں، سرائے سے باہر نکل گیا۔ کاروان سرائے میں عجیب گہما گہمی تھی، لوگ ٹولیوں میں بٹے یہاں وہاں باتیں کر رہے تھے۔ داستان سنانے والا ایک راوی تو نہیں تھا مختلف گروہ تھے اور الگ الگ تذکرے تھے۔ صحن میں درختوں کی سائیں سائیں آندھی کے شور برستی ریت اور بکھری ہوئی داغ داغ چاندنی کی وجہ سے عجیب طلسم کا سماں تھا۔ پھر گھوڑوں پر ہنہانا، اونٹوں کا جگالی کرتے میں سر ہونے سہ گھنٹیوں کی آوازیں، گدھوں کا پچھلے پہر ریگنا اور شاہراہ پر جاتے ہوئے قافلوں کی مسلسل حرکت اور آگے بڑھنے کا احساس۔

”تم نے سنا ہے۔“ عثمان بن عمر نے لیٹے لیٹے کہا ”کہ مشرقی صورت گر گئی ہے۔“

”موت کا کیا ذکر ہے؟“ اس کے ساتھی نے یونہی پوچھا۔

”ہمارے بعد جو کارواں سرائے میں آ کر ٹھہرا ہے وہ مغرب سے آیا ہے اور ان لوگوں کے قیاس کے مطابق قاہرہ میں ابن سعد کی مسجد اور شہر کے درمیان ایک مینار ہے جس پر دو مورتیں بنی تھیں ایک کا رخ سمت مشرق اور ایک کا رخ مغرب کی طرف تھا۔ مغربی مورت پہلے گر چکی ہے اور اس لئے مشرق نے مغرب پر تسلط جما لیا تھا۔ اب مشرقی مورت گر گئی ہے اور مغرب کے لوگ اس علاقے میں قابض ہو جائیں گے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ قرب قیامت کے آثار ہیں۔“

”کب کب قیامت کے آثار ہو یاد نہیں رہے۔“ ساتھی نے پھر کہا ”اور پھر قیامت اس وقت تک نہیں آ سکتی جب تک امام مہدی آسمان سے چالیس ہزار فرشتوں کے ہمراہ تشریف نہ لائیں دنیا کو برائی سے پاک نہ کریں اور حکومت نہ کریں۔ تم آرام سے باقی رات گزارا اور غمگین مت ہو یا رجائی کہ قیامت میں ابھی بہت دیر ہے اور پھر جب تک ہم اپنے اپنی وطنوں تک پہنچیں امام مہدی کا ظہور نہیں ہو سکتا۔“ اس نے ہنس کر بات ختم کی۔

”کیا تم زندگی اور موت پر قادر ہو؟“ عثمان نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ایک طرح سے تو ہیں کہ امید پر چلتے رہتے ہیں اس امید پر کہ لوٹ کر وطنوں میں آئیں گے اور جن کو پیچھے چھوڑا ہے ان سے پھر ملیں گے۔ خدا اتنا مہربان تو ہے ہی کہ ہمیں مسافت میں بے آسرا موت نہیں دے گا۔ ہمیں اس کی مہربانی سے ناامید ہونا نہیں چاہئے۔“

”تمہارا فلسفہ امید اور زندگی کا ہے، مگر اتنی خوش کن باتیں ہمیشہ واقع نہیں ہو سکتیں۔ تمہیں معلوم ہے موت اپنا کوڑا لئے تلاش میں رہتی ہے اور چونکہ اندھی ہے بے سوچے سمجھے اس کو لہراتی ہے۔ کون اس کی زد میں آ جائے اسے کیا۔“ اس نے ٹھنڈا سانس بھر کر کہا۔

”تم اتنے ادا اس ہو آج کی گھڑی یا حزن پسند ہو؟“ ساتھی نے کہا۔

رقصاں درویشوں کا نیم دائرہ خانقاہ کے صحن میں ہولے ہولے گردش میں تھا۔ نقارہ بجانے والا تقریباً خوابیدہ ہوا کبھی کبھار نقارے کو ایک پتلی لکڑی سے بس ذرا چھیڑ دیتا اور پھر اس ارتعاش سے خود بھی مست ہو جاتا جو قدموں کی مسلسل مگر سنائی نہ دینے والی تھا پ سے اس کے خیال میں پیدا ہو رہا تھا۔ لمبی قباؤں میں ہوا بھرنے سے کبھی وہ دائرہ پھیل جاتا اور کبھی سکڑ جاتا۔ نم شب کا چاند تابناک اور ماند ستاروں کے گھیروں میں کبھی زیادہ روشن ہو جاتا اور کبھی بجھا بجھاسا۔ ہوا کبھی چلنے لگتی اور کبھی تھم جاتی۔ دراز قد اور سفید ریش اپنی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتا تو سب حرکتیں ساکن ہو جاتیں جیسے موت کا سانس قریب ہو۔ حلقہ تنگ ہو جاتا اور سر ایک ساتھ جھک جاتے۔ پھر نقارے پر ہلکے سے چوٹ پڑتی جیسے برفانی سرد ہواؤں میں کوئی پیچھے رہ جانے والا پرندہ یکنخت چیخنے لگے۔ قدم آہستگی

سے اٹھتے اور ان پر آہوں کا گمان ہوتا۔ ہر درویش اپنے گرد دائرے میں الگ گھومتا اپنی نماز عشق اپنے طور پر قائم کرتا۔

آقائے رازی خوض کے کنارے بیٹھ گیا اور اس کے تھمنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر شاید یہ رقص نامختم تھا کہ جاری تھا اور کسی طور کوئی آثار اس کے انجام تک پہنچنے کے نہیں تھے۔ نقارہ بجانے والا شاید محو خواب تھا اور رقص کرنے والے محو خروش تھے کہ ان کا خروش ان کے سینوں کے اندر ان کی جان کو نہایت مضطرب کئے ہوئے تھا اور ان کے قدم اور ان کے خاکی جسم ان کی آرزوؤں کے دائرے میں محو خرام تھے۔ پھر جب ستاروں کا قافلہ جانب مشرق جھکنے لگا اور ناہید آسمان تھک کر تھمنے لگی اور بد صبحی گاہی نے چلنا شروع کیا، پرندے ایک ایک دو دو درختوں میں روشنی اور خوابوں کی وجہ سے چوکنے لگے تو آقائے رازی جو شب بیداری سے نہیں گھبراتا تھا، کیونکہ اس کا عادی تھا، نقارہ بجانے والے کی طرف گیا۔

”تم بھی اس تلاش میں آئے ہو کہ ان کا راز معلوم کرو۔“ اس نے نقارہ ایک طرف رکھ کر کہا۔

رازی نے سر کے اشارے سے جواب دیا۔

”تو پھر سوچ لو۔“ اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”یہ راز ایسے ہی رہے گا، وہ صرف نماز پڑھنے کے لئے تھمتے ہیں اور وضو کرنے کے لئے رکتے ہیں، رقص کناں سوتے ہیں، ان کی جسمانی حاجتیں تقریباً نہ ہونے کے برابر ہیں اور سوائے اپنی مناجات کے وہ آپس میں بھی بات نہیں کرتے۔ وہ صرف الحاح و زاری کرتے ہیں تو ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔“

”وہ کب سے اس خانقاہ میں ہیں اور تم کب سے ان کے نقیب بنے؟“ رازی نے ویسے ہی سرگوشی میں کہا۔

”میں ان کا ساتھی نہیں ہوں، میرا تعلق اس خانقاہ سے ہے۔ میں یہاں نقارہ بجانے پر ملازم ہوں۔ میرا مطلب ہے زمانوں سے میں یہاں پر ہوں۔“

”مگر تم ان کے لئے نقارہ بجانے پر کیسے لگ گئے؟“ رازی نے اس سے ذرا وضاحت سے پوچھا۔

”یہ بھی بس ایک الگ کہانی ہے۔ ایک دن جب تہجد کے وقت پانی بھرنے کے لئے میں اندر آیا تو ان کو میں نے یہاں رقص کوٹے پایا۔ نقارہ لے کر یونہی میں نے چوٹ کی تو ان کے رقص میں یوں طوفان سا آگیا جیسے پہاڑی خشک دریاں میں اچانک پانی کا ریلہ آجائے۔ تب سے میں بھی یہاں ہوں اور عجیب رشتے میں پرودیا گیا ہوں کہ میں نقارہ چھوڑنا چاہنے پر بھی اسے نہیں چھوڑ سکتا۔“

”لوگوں کو تعجب نہیں ہوتا، وہ پوچھتے تو ہوں گے؟“ رازی نے کہا۔

”مگر وہ جواب کس سے چاہیں گے، جو ان کو ن دے گا۔ مجھے تو اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں جو میں نے بتا دیا ہے۔“

”یہ شاید ہماری زبان بھی نہیں سمجھتے۔“ اس نے ہولے ہولے کہا اور نقارے پر چوٹ کی۔

پھر صبح کی اذان کے لئے موذن سیرھی چڑھا، مینار کی انتہائی بلند یوں تک پہنچا اور اس نے لوگوں کی نیند سے بیدار کرنے کے لئے انہیں جنت کی بشارت دی۔ انہیں بتایا کہ نماز نیند سے افضل ہے، خدا کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے گواہی دی کہ وہی آقا ہے اور اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہی ہر طرف شش جہات سے آمینہ اور آئینوں کے مقابل پر تو بھی خود اور پر تو میں منعکس بھی خود اپنی عظمت پر آپ گواہی دینے والا، کیونکہ اس کی گواہی دینے والا بھلا کون ہو سکتا ہے؟ اسے جاننے والا کون ہو سکتا ہے؟ وہ تخلیق کرنے والا خالق بھی خود مخلوق کی جانوں کا امین بھی خود۔ روحوں کو پیدا کرنے والا بھی اور روحوں کے جواب ”الست برکلم“ سننے والا بھی۔ جب اس نے چاہا کہ اپنے آپ کو دیکھے تو اس نے دنیا بنائی۔ ہر شے سے ماوراء بھی اور ہر ایک میں جلوہ فگن بھی۔ پتہ نہیں جب ہر طرف وہ خود ہے تو وہ پوشیدہ کس سے ہے؟ اس کی زیبائی، اس کی رعنائی اس کے سوا کون جان سکتا ہے۔ آدمی کو پیدا کر کے اس کی نارسائی پر بھی وہ خود ہی خد نہ زن ہے۔ انسانی کی کوششوں کو کبھی وہ شرف قبولیت بخشا ہے اور کبھی رقص میں محو رکھتا ہے۔ بس رقص میں لگے رہنے کی طاقت دیتا ہے اور اس سے آگے؟ جب تک وہ توفیق نہ دے، بھلا کون ہے جو کچھ بخشنے کے قابل ہو؟

اذان کی صدا سن کر درویشوں کے قدم تھم گئے۔ ایک مخلوق وضو خانوں کی طرف بڑھی، چشمے کا پانی رواں ہوا، شفاف میٹھا پانی نور کے دھارے کی طرح تھا اور فرحت بخش تھا۔ امام کے پیچھے کھڑے ہو کر آقائے رازی نے نماز پڑھی اور سجدے میں نہایت خضوع و خشوع کے ساتھ دنیا کے لئے، کائنات کے لئے، اپنے لئے، اپنے پیاروں کے لئے اس نے وہ سب دعائیں پڑھیں جو اسے یاد تھیں۔ جانے کتنی دیر وہ خالق کائنات کے سامنے ہاتھ پھیلائے، نظر جھکائے دل اور جان کی ساری حضوری کے ساتھ دعا مانگتا رہا۔ آنسو اس کی انگلیوں، تھیلیوں اور چہرے پر بارش کے پانی کی طرح تھے۔ اس کے دل کی کدورتوں کو، اس کے نفس کی کٹافتوں کو دھویا جارہا تھا۔ جیسے بارش ہوا کو دھو کر سبق، نرم اور شفاف بنا دیتی ہے۔

جب غبار دھل چکا اور سکون قلب ہوا تو اس نے دیکھا، درویشوں کے گروہ کا پتہ نہیں تھا۔ نقارہ بجانے والا وہیں حوض کی منڈیر پر سویا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں چوب خشک، جس سے وہ نقارے پر چوٹ لگاتا تھا، ٹوٹی پڑی تھی۔ دیر تک آقائے رازی حیران اور کھویا ہوا سا وہیں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سوچا خدا کو شاید ابھی اس راز سے پردہ اٹھانا مقصود نہیں ہوگا۔ جانے کیا راز ہے، میں اس کی ٹوہ میں بھلا کیسے لگ سکتا ہوں۔ میں جو مسافر ہوں اور محض تجسس کی وجہ سے میں نے ایک رات گنوائی ہے، میں جس پر قافلے کی ذمہ داری

عائد کی گئی ہے اور جس نے اپنے دل کی تسکین کے لئے اس پر دے کے پیچھے جھانکنا چاہا جس پر میرا کوئی اختیار نہیں تھا، میرے لئے تو صرف سفر کی شرط ہے، سفر کی۔ اور ذکر و حضوری کی یہ رات میں نے گنوا دی! اس پر مایوسی اور ندامت کا ایک حملہ سا ہوا۔ شعبان کی یہ مبارک ساعتیں جو بھر لوٹ کر نہیں، میں گی، وقت جو لمحہ لمحہ گریزاں تھا، گھٹ رہا تھا اور جو پل پل ہیٹگی کا ماضی کا حصہ بنتا جاتا تھا۔ وقت جواز سے ہے اور جاری رہے گا، وقت جو آ دی کو شکست اور اس کی کہنگی ہے، بے پایاں، مسلسل جس کو کوئی سمجھ نہیں سکا مگر جو ان بستیوں اور زمینوں اور ان مکینوں پر سے گزر جاتا ہے۔

دنیا شور و شوش سے پر ہو گئی تھی۔ ہمیشہ سے تھی، نئے فتنے پرانے رنگوں کے لہا دے اوڑھ کر سر اٹھاتے تھے۔ قرامطہ اور معتزلہ اور صاحب الزنج وہ اسلام میں مو شگافیاں کرتے تھے اور دنیا کی محبت میں دیوانے تھے۔ انہوں نے نئی شریعتیں رواج دی تھیں اور نئے فلسفے تعمیر کئے تھے۔ وہ عقل و دانش کی رو بانی سے دنیا پر مسلط ہو جانے کے خواب دیکھتے تھے اور مال و دولت پر جان دیئے دیتے تھے۔ انہوں نے نئے مذاہب کی بنیاد رکھی تھیں اور نئے کلمے ایجاد کئے تھے۔ وہ قرآن کا جواب لکھتے تھے اور خدا کو اس کے کلام میں (نعوذ باللہ) شکست دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے سحر کے زور سے اپنی لافیتوں کو صیقل کیا تھا اور اس کے بل بوتے پر وہ دلیر ہو گئے تھے۔ ایسے گیدڑوں کی طرح جو شیر کی کھال پہن کر جنگل کے قانون کو ہاتھ میں لے لیں۔ انہوں نے خلقت میں فتنے پیدا کئے تھے اور ہزاروں سادہ لوح لوگوں کی گمراہی اور موت کا سبب ہوئے تھے۔ انہوں نے علماء کی جانوں کو فتنے میں مبتلا کیا تھا اور بے وقوفوں کے لئے سستی، آسان اور قابل حصول جنت کا وعدہ کیا تھا جس کو بنا اس راہ میں کوئی مصیبت اٹھائے اور جان کو ہلکان کئے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ ہاروت ماروت کی طرح جو سحر سیکھنے کے چکر میں چاہ باہل میں قید کر دیئے گئے تھے۔

آقائے رازی نے نفاہ بجانے والے کو جگانا مناسب نہ سمجھا اور سرائے میں جا کر اس نے محمی کو سب واقعہ سنایا اور خود سونے کے لئے لیٹا کہ شاید نیند اس اضطراب کو کچھ کم کرے دے جو اس کے قلب میں بپا تھا۔ لگتا تھا اس نے خواب دیکھا ہے۔

اس کے سوا سب گم کردہ منزل

عشق مزرع گلاب ہے

عشق مزرع زندگی ہے

رقص کرتے ہوئے درویش ان کے سر پر اونچے کلاہ اور بہت ڈھیلی قبائل تمام رات وہ تقریباً ان کے قریب ہی کہیں موجود رہا تھا، مگر ان کے چہرے اس کی نظر سے پوشیدہ رہے تھے۔ کیا وہ ان کے دل کا راز جان گئے تھے یا پھر اس کی نظر کا دھوکا تھا۔ نماز کی

جماعت میں وہ رکوع و سجود کی قید سے آزاد تھے اور پھر وہ اپنی کوشش کے باوجود انہیں دیکھ نہ سکا تھا۔ کیاس نے انہیں دیکھنا نہیں چاہا؟ تیز روشنیوں والا دن ڈھل چکا تھا۔ سائے لمبے ہو کر ذرا ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ جب محمی نے اسے بیدار کیا۔ وہ خواب دیکھتا رہا تھا جس کا بے کنار بحر کی طرح کوئی کنارہ نہ تھا۔ جس میں نہ کوئی شے واضح تھی اور نہ ہی پوشیدہ۔ پھینکی بے کیف بے آرام نیند سے جاگ کر اس نے کوچ کا حکم دیا کیونکہ اب انہیں تمام رات سفر کرنا تھا اور اگلی صبح کے قریب کہیں ان کا قیام ہوگا۔ وہ راستے میں صرف نمازوں کے لئے رکیں گے اور پھر سفر پر رواں ہی رہیں گے۔

ہوا میں مگس کی بھنبھناہٹ اور پھولوں کی خوشبو تھی۔ کھیاں آنے والے موسموں کے لئے شہد تیار کرنے لگی تھیں اور تندہی سے مسافروں کا چچھانہیں کرتی تھیں۔ باغوں کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ گھنٹیوں کے شور کو بھی نظر انداز کر دیتیں۔ اور خوب مصروفیت سے وہ رس جمع کرنے میں لگی تھیں۔ اونٹ موسم کے کیف و مستی کو محسوس کرتے اور اپنے بار سے بے نیاز لمبی قطار میں سے باہر نکلنے کے لئے ضد کرتے اور بے فائدہ چکر لگاتے، بلبلاتے جیسے ناچنا اور بولنا چاہتے ہوں۔ گدھے اور خچر شرارت پر اتر آتے جیسے پیٹھ پر بندھے بوجھ سے نجات حاصل کرنا ہو اور پھر بے چین ہوتے۔ پانی کے مشکیزوں میں حوضوں سے پانی بھر لیا گیا تھا اور بستی کے لوگ ضرورت کی چیزیں فروخت کرنے کے لئے قافلے والوں کے گرد اڑوہام کئے ہوئے تھے۔ شور و غوغا، رخت سفر باندھنے اور مسافروں کو بار بار بلانے کی ضرورت۔ ہولے ہولے سائے لمبے ہوتے گئے۔ مسجدوں میں اذان کی آوازیں بلند ہوئیں۔ اونٹوں پر بیٹھے ایک دو لوگوں نے بربط اپنے سامنے رکھ لئے، شاید وہ رات کی خاموشی میں، تاروں کی روشنی میں، بہار کی سحر طراز ہوا میں موسیقی کی دلنواز تانوں سے اپنا جی خوش کرنا چاہیں۔

باغوں میں بلبلیں گارہی تھیں جب قافلہ دشت سوس کی زرد اور سرخی مائل سیاہ ریت کے قریب سے نکلا ہے۔ محمی نے الوداع کہتے ہوئے کہا ”ہو سکتا ہے اگلے پڑاؤ پر آپ کی ان درویشوں سے ملاقت ہو کیونکہ نقارہ بجانے والے کی روح تو ان کے پیچھے سرگرداں ہونے کے لئے پہلے ہی روانہ ہو چکی ہے۔“

آقائے رازی نے تاسف سے اس کی موت پر انا اللہ وہ انا اللہ راجعون پڑھا۔ پتہ نہیں اس کو سفر میں کیا پیش آنے والا تھا کیونکہ یہ دو بڑی ناکامیاں تھیں جو اس کی جان کا عذاب بن گئی تھیں اور باوصف نہ چاہنے کے وہ دونوں میں اپنے آپ کو قصور وار سمجھتا تھا۔ درویشوں کا یوں نگاہوں سے پھل کر گم ہو جانا اور نقارہ بجانے والے کی موت!

شعبان میں قافلے ختن سے دمشق کی طرف تو جاتے تھے مگر شاذ ہی کبھی کوئی قافلہ ختن کی طرف جاتا ہوا یہاں سے گزرتا۔ لوگ

اس مہینے کے احترام کی خاطر وطنوں کو جلد لوٹتے تاکہ رمضان کے دنوں میں با آسانی گھروں میں آرام سے رہیں۔ اس لئے محمدی کو اس ایک قافلے کے بعد کام کا زیادہ بوجھ نہیں تھا۔ وہ ایک آزاد خیال آتش پرست تھا اور چند یسا بور کے مدرسے میں فلسفہ لاوت کی درس و تدریس کا جو کام ہو رہا تھا اس میں خاصی دلچسپی رکھتا تھا۔ اسے معتزلہ کے عقائد سے ہمدردی تھی۔ انہوں نے دلائل عقلی اور براہین غیر منقول سے جس طرح اپنے مخالفوں کو ہرانے میں فوقیت حاصل کی تھی اس پر اسے تعجب ہوتا تھا۔ وہ علم الکلام کا طالب تھا۔ اور جس طرح ایک ہوشیار وکیل اپنے دلائل سے حاضر کو غائب اور غائب کا حاضر ثابت کرنے پر قدرت کاملہ رکھتا ہے اسی طرح معتزلہ بھی نہایت ہوشیاری سے اپنے عقائد کو صحیح ثابت کر سکتے تھے۔ پھر ہر مکتبہ خیال کے استاد و سطوری عیسائیوں کے اس مدرسے میں آن شامل ہوتے تھے۔ یونان کا فلسفہ خلیفہ منصور کے وقت سے ہی یہاں پڑھایا جاتا تھا اور ذہنوں کو جلا بخشتا تھا۔ اگرچہ معتزلہ مجوسیوں کے سخت ترین مخالف تھے مگر یہ بات محمدی کو حیران کرتی تھی کہ وہ کس خوش اسلوبی سے ہر مخالف کو منہ توڑ جواب دینے پر قادر تھے۔ اس کا اپنا بیٹا منصور اسی مدرسے میں طالب علم رہا تھا اور مجوسیت کے خلاف اسے اتنا قائل کر لیتا کہ وہ آتش پرستی کو کفر سمجھنے لگتا، حالانکہ وہ شنیویت اور مانویت سے در رہا تھا۔ وہ صرف زرتشتی تھا۔ بحث کی محفلوں میں منصور کو شکست دینا ناممکن تھا اور سرشاری کی کیفیت جو زیادہ آگاہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس نے اپنا مذہب تبدیل نہیں کیا تھا اور اسے اپنے مجوسی ہونے پر فخر تھا، مگر ایک دیوانگی کی حد تک محبت جو عقائد کو غیر متزلزل بنا دیتی ہے آدمی نامعلوم سے لڑ جاتا ہے، جان کی پروا نہیں کرتا۔ اس کا بہر حال دور دور پتہ نہ تھا کیونکہ یہ علم الکلام کے عام ہونے کا زمانہ تھا اور فتنے بیدار ہو رہے تھے۔ ان فتنوں سے دور رہنے کی خاطر منصور اپنے آپ کو محمدی کے ساتھ سرائے میں نہیں لگایا تھا اور یہ کاروبار اس کے مزاج کے مطابق بھی نہیں تھا۔ وہ دشت سوس کے کنارے کنارے ذرا اوپر کی طرف ایک ایسے قصبے میں سکونت پذیر تھا جہاں شہوت کے درختوں کے جنگل کے جنگل تھے اور ریشم کے کیڑے پالنے اور پھر ریشمی کپڑا بننے کا کام ہوتا تھا۔ یہ ہنر زمانہ قدیم میں وہاں کے لوگوں نے چینوں سے سیکھا تھا اور اس صدی کے شروع میں اسے وہاں رواج دیا تھا۔ آب و ہوا شہوت کے لئے سازگار تھی اور اس سارے عرصے میں باقی باریکیاں سیکھ کر اب جو کپڑا وہ بناتے تھے وہ کسی طور بھی چینی ریشم سے کمتر نہیں ہوتا تھا۔ زمانے کے ساتھ ساتھ اس میں جو نفاستیں ہونی چاہیں ایرانی مزاج کی جدت اور حدت وہ سب اس میں سرایت کرتی جاتی تھی۔

سلطنت اسلامیہ یوں بھی بڑھ اور پھیل رہی تھی۔ خود مختار ریاستوں کا ایک نیم دائرہ تھا جو بغداد کے نقطے کے گرد وجود میں آیا تھا۔ یہ وہ حکمران تھے جنہوں نے اپنے اپنے صوبوں میں اپنے خاندانوں کی حکومتوں کی بنا ڈالی تھی۔ وہ عظیم الشان سلطنتوں کے بانی مہانی تھے اور دربار خلافت کی طرف ایسے دیکھتے تھے جیسے اپنے گھر میں مطمئن اولاد اپنے والدین کے گھر کی طرف دیکھے۔ اطاعت گزار

احسان مند اور خود مختار۔ بغداد کے گرد اور دربار بڑھتے جا رہے تھے جو شان و شوکت میں کسی طور اس سے کم نہ تھے مگر جو سعادت مندی کی وجہ سے اپنا سر جھکائے رکھتے تھے۔

ہنرمند لوگ جو اقصائے عالم سے کھنچ کر دربار خلافت میں باریابی کے لئے برسوں منتظر رہتے تھے اب اور ٹھکانوں کی طرف بھی دیکھ سکتے تھے اور اس لئے ان علاقوں میں چینی حریر و دیا کی مانگ بھی بڑھ گئی تھی۔ منصور نے اپنا کاروبار بہت پھیلا یا نہیں تھا، مگر وہ جو کچھ بھی بناتا تھا اس میں اس کی ندرت طبع اور جدت خیال نے عجیب موشگافیاں کی تھیں۔ لوگ منصور کے نام کو ایک سند سمجھتے تھے۔ آقائے رازی کے رخصت ہو جانے کے بہت دنوں بعد تک بھی جب محمی اس راز کو حل نہ کر سکا اور ان رقصاں و رویشوں کا حال کسی طور نہیں کھلاتو اس نے منصور کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ اسے اپنے پوتے حسین سے بہت محبت تھی اور اب جب اس نے منصور کے پاس جانے کا ارادہ کر لیا تھا وہ اسے اور بھی شدت سے یاد آ رہا تھا۔ اس کی باتیں اور حرکتیں اور وہ بے پناہ آنکھیں عجیب سحر کرتی ہوئیں۔ اس کی نگاہ سے اکثر گھبرا جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا وہ تمہارے سینے کے اندر تک دیکھ رہا ہے۔ وہ ذرا سا معصوم بچہ خاموش بس دیکھتا چلا جاتا۔ ایسے میں اسے ہنسانے کی جتنی بھی کوشش کروہ ذرا سا بھی نہیں ہنسے گا۔ جیسے وہ دلوں کے بھید جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ ایسا بس کبھی کبھار ہی ہوتا تھا ورنہ صحن میں لڑھکنیاں کھاتا وہ کبھی رک جاتا اور آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ پھر زمین کے کسی نقطے پر نگاہ مرکوز کر لیتا۔ پھر بھاگتا اور گر جاتا اور ماں کی طرف ہاتھ پھیلاتا اور ضد کرتا اور چلا کر روتا اور کسی طور ہاتھ نہ آتا، بہلائے نہ بھلتا۔ منصور کہتا: ”سمجھ میں نہیں آتا یہ چاہتا کیا ہے۔“ اور محمی سے کہتا: ”کیا ہی اچھا ہو! آپ اسے لے جائیں اور سختی سے اس کی تربیت کریں۔“ محمی ہنسا۔ ”تم اس ذرا سے بچے سے عاجز آ جاتے ہو۔ ہم نے بھی تمہیں یونہی پالا تھا۔ سب بچے ایک سے ہوتے ہیں، وہ والدین کو اپنی انگلی کے گرد گھمانا جانتے ہیں۔“ وہ حسین کو گود میں بٹھالیت۔

”نہیں پدر محترم! آپ اسے نہیں سمجھ سکتے۔ آپ اسے اپنے ساتھ لے جائیں تو آپ کو پتہ چل جائے گا۔ اسے پالنا اور اس کی تربیت کرنا روز بروز مشکل ہوتا جاتا ہے۔“ منصور کہتا۔

محمی کو یہ سب باتیں یاد آ رہی تھیں اور اس کا جی بے چین ہو رہا تھا۔ اب حسین کی شرائطوں میں اضافہ ہو گیا ہوگا۔ اب منصور پھر اس سے کہے گا کہ ”آپ اس کو اپنے ساتھ لے جائیں۔“ چھ ماہ میں اس نے اور قد نکالا ہوگا، ذرا سا بڑا ہو گیا ہوگا۔ سمجھدار اور اپنی بے پناہ آنکھوں سے اسی طرح پھر مجھے گھبرائے گا، دیکھتا چلا جائے گا۔ سینے کے اندر ٹٹولتے ہوئے وہ ہنسے گا بھی نہیں۔ محمی بے چین سا ہو گیا۔ جیسے اتنی دوری سے بھی پوتے کی نگاہوں کو محسوس کر رہا ہو۔ پھر اس نے اپنے ملازم سے (جسٹی نژاد مگر تھوڑا سا ایرانی کہ ایران

میں پیدا ہوتا تھا) خچر لانے کو کہا اور خود لکڑی کی گھوڑا گاڑی جس میں بیل جتے تھے اور جس کے اندر سرخ رنگ سے روشنی سی لگتی تھی اور بیٹھے ہوئے لوگوں کے چہرے اتنے مکمل تھے گویا وہ بس ذرا سی دیر میں باتیں کرنے اور اپنے اپنے حال ایک دوسرے سے کہنے لگیں گے۔ وہ سوچتا رہا، یہ لکڑی جس درخت سے کاٹی گئی ہوگی وہ جانے کہاں اگا ہوگا۔ سیاہ جنگلوں کے گہرے اندھیروں میں مسلسل بارشوں کے جادوئی خوشبو پھیلاتے ریلے اور آوازت نے اگنے، بڑھنے، پھیلنے کے سارے مراحل میں نگہداشت کی ہوگی۔ یہ آتش جوتج کے اندر پوشیدہ ہوتی ہے اور گرمی حیات میں ہر شیخ کے اندر سرایت کرتی ہے اور اس کی نمو کا سبب بنتی ہے۔ اہرمن ویزداں کے اس کھیل میں جسے دنیا کہتے ہیں ایک مسلسل دوڑ جاری تھی۔ زرتشت کا قول تھا کہ ”دنیا میں رہے اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مل کر کر زندگی گزارے اور اولاد پیدا کرے اور آبادی میں اضافہ کرے، حیوانات کی پرورش کرے اور بے آباد زمینوں کو آباد کرے۔“ زرتشت کا قول ہے کہ ”جو شخص زمین میں بیج بوتا اور کھیتی اگاتا ہے وہ اس شخص سے ہزار درجہ بہتر ہے جو صرف مناجاتیں پڑھتا ہے۔“ اسے اور اقوال بھی یاد آ رہے تھے۔ ”وہ گھر جس میں بال بچے ہوں، کھیتی باڑی کرنے والے مرد ہوں اور حفاظت کرنے والا کتا ہو۔“ اس نے اور اس کے بیٹے منصور نے کھیتی باڑی نہیں کی تھی۔ زمین کے ساتھ ان کا رشتہ بس واجبی تھا مگر زرتشت کے وقتوں سے اب تک زندگی نے کتنے رنگ بدلے تھے۔ مذاہب، سلطنتیں، امتیں، لوگ، عبادتیں اور بادشاہتیں سبھی بدل گیا تھا۔ دنیا ایک حالت پر کب رہتی ہے۔

آقائے رازی کا قافلہ کسی اور منزل پر پہنچ رہا ہوگا۔ یہ شاہراہ جو ختن تک جاتی تھی بے کھٹکے سفر کے قابل سمجھی جاتی تھی۔ ایشیا کے طول و عرض میں اسلام کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کو مذہبی آزادی بھی تھی اور خطر اب بھی ٹل ہی گئے تھے۔ امن و آشتی کا دور دورہ تھا۔ جنگیں سرحدوں کی طرف مرکز سے دور ہو رہی تھیں۔ جنگ کرنا بھی بہت ضروری تھا۔ یہ ہوس ملک گیری نہیں ایک پرامن سلطنت کی حفاظت کے انتظامات تھے۔

چین سے لے کر ساحل نیل تک قافلے آتے جاتے تھے اور یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں سے کوئی تعرض نہیں کرتا تھا۔ کیا رقصاں درویش محض خیال تو نہیں تھے؟ محمی نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ پھر یکا یک اس نے سوچا، کیوں نہ منصور سے پوچھا جائے؟ ہو سکتا ہے اسے کسی ایسے فرقے کی خبر ہو، کیونکہ چند بیابانوں کے اس مدرسے سے میں ہندوستان کے لوگ درس میں شامل ہوتے تھے۔ وہ دوسرے فلسفوں اور مذہبوں کا مطالعہ کرنے آتے تھے۔ بدھ کے پیروکار جو کاشان کی پہاڑیوں سے لے کر شمال اور مشرق میں منگولیاں تک پھیلے ہوئے تھے۔ خود جھیل بیکال کے گرد رہنے والے دور دراز قبیلوں کا الگ مذہب تھا جو آسمانی دیوتا کی

پرستش کرتے تھے اور جن کا اپنا فلسفہ حیات اور نقطہ نظر تھا۔

آل علی کے لئے ان کی بے بسی کو محسوس کر کے دلوں نے خون کے آنسو بہائے تھے اور ان کے لئے نہایت عجیب و غریب عقائد اور مذاہب معرض وجود میں آئے تھے۔

حسین ابن علی کو بچا یا نہ جاسکا تھا۔ رسول خدا کے عاشقوں نے ان کے نواسے کو بے آب و گیاہ صحرا میں بیچارگی کی حالت میں گھیر لیا اور قتل کر دیا۔

زرتشت کے کسی مقلد کو بھی نقصان پہنچانے کا خیال دل میں نہیں لایا جاسکتا۔ وہ کیسی قوم تھی جنہوں نے اپنے پیاروں کے خون سے ہاتھ رنگے۔ کیا اس خون کا رنگ چھٹ سکے گا؟ مگر یہ درویشوں کا سلسلہ کن واسطوں سے آل علی تک پہنچتا ہوگا؟ اور منصور نے جانے کیوں اپنے بیٹے کا نام حسین رکھا تھا؟ کیا اسے خوف نہیں آتا تھا؟ وہ بھی نہ ہونے کے باوجود سوچتا ضرور تھا جہاں تک اس کی رسائی تھی۔

محمی چونکہ شخصی آزادی کا قائل تھا اور اپنے اکلوتے بیٹے کے معاملات میں کم ہی دخل دیتا تھا۔ اس لئے اس نے منصور سے کبھی پوچھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی کہ اس نے اپنے بیٹے کا نام حسین کیوں رکھا تھا۔ حکمرانوں کی نقل میں یوں بھی لوگ ایسا کرتے تھے۔ بادشاہ کا مزاج ملک کا مزاج بن جاتا ہے۔ عباسی خلفاء کے عہد میں اس کے باوجود کہ اہل بیت سے وہ سلوک نہیں کیا جاتا تھا جس کے وہ حقدار تھے۔ منصور کے بیٹے کا نام حسین تھا۔ خود وہ کہتا تھا: ”پدر محترم مجھے اس نام کا اختصار اس کی عظمت اور اس کا مکمل ہونا پسند ہے۔ آپ دیکھئے نالکھنے میں یہ کتنا مختصر اور جہان معانی رکھنے میں لا جواب ہے اور پھر اس کی نسبتیں کتنی عظیم ہیں۔ کوئی زرتشتی نام اس کو نہیں پہنچتا۔“

”آپ میری بات کو جی سے ٹھیک نہیں سمجھتے پدر محترم، مگر دیکھئے تو سہی۔“ منصور اسے وضاحت سے کہتا۔ محمی ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ کراتا۔ ”عزیز جو بات تمہیں پسند ہے مجھے بھی پسند ہے اور پھر ناموں میں کیا رکھا ہے۔“

”یہی بات تو میں کہنا چاہتا ہوں کہ نام بہت بڑی شے ہے نام ہی سب کچھ ہے۔“ منصور کہتا۔

محمی جب کوئی جواب نہ دیتا تو لگتا منصور شرمندہ ہے اور اپنی توجیہات کرنے پر نادم۔ پھر وہ اور باتیں کرنے لگتا۔ ریشم کی نفاست اور اس کی ملائیت اور آب و ہوا کے اختلاف کی جو چینی دنیا میں ایرانی ریشم میں مختلف نتائج کی وجہ ہے۔ اعلیٰ قسم کا کپڑا بننے والے ان کاریگروں کا ذکر جن کے اجداد چین سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ ہندوستانی ریشم کا ذکر جو آب و ہوا کی شدت کی وجہ سے چینی اور

ایرانی ریشم سے کمتر تھا، مگر ایک اور کپڑے کی بہت تعریف کی جاتی جو نفاست اور نرمی میں چینی اور ایرانی ریشم سے بڑھ کر تھا۔ یہ مرطوب آب و ہوا اور بارشوں کے شدید علاقے میں بنی جانے والی ململ تھی۔ جو سوداگر صرف خلفاء کے لئے یا امرا کے لئے تحفہ لاتے تھے اور جس کی قیمت کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ پھر ہندوستانی مزاج کی نفاستوں اور نزاکتوں کا ذکر ہوتا اور محی چپ چاپ مگر دلچسپی سے یہ سب باتیں سنتا۔ اسے حیرت تھی کہ اس کا بیٹا جو علمی محفلوں میں اٹھتا بیٹھتا، علماء کی صحبتوں میں شریک رہتا اور طبعاً درویش تھا، اپنے پیشے میں بھی کس قدر وسیع معلومات رکھتا تھا، مگر اسے تجارت کو بڑھانے اور دوسرے ملکوں میں قافلے لے جانے کا شوق نہیں تھا۔

”کیا ہی اچھا ہو، تم کبھی کسی قافلے کے ساتھ جاؤ۔ دنیا کی سیر کرو اور امکانات کا جائزہ لو۔“ محی نے ایک بار اس سے کہا۔ ”میں سفر کی صعوبتوں کو بیاں اٹھانے کا قائل نہیں ہوں۔ قناعت آدمی کے لئے سب سے بڑی دولت ہے اور پھر میری مختصر زندگی کی ضروریات بھی کیا ہیں؟“ منصور نہایت ادب سے کہتا۔

آدمی صرف ضروریات کے لئے ہی زندہ نہیں رہتا۔ اگریوں سوچا جائے تو کوئی بھی بڑھنے اور ترقی کرنے کا نہ سوچے۔ جان پدر تم دوسروں سے مختلف کیوں ہو؟ آقائے رازی، وہ سلاکار کا رواں بہت جوان آدمی ہے۔ تقریباً ہی ہم عمر، مگر سال کے اکثر مہینوں میں وہ سفر میں رہتا ہے۔ پھر اور بہت سے لوگ ہیں جو مشرق سے مغرب تک اور دیار شام سے ملک چین تک ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔

”ہر انسان ایک طرح کا نہیں ہے پدر بزرگوار۔ میری آرزو تو بس یہی ہے کہ علمی مجلسوں میں شریک رہوں اور اس لئے میں حسین کو بھی چند یسا پور کے مدرسے میں بھیجنا چاہتا ہوں۔“

”مگر تم خود اس سے مطمئن نہیں رہے۔ نسطوری عیسائیوں کے شدید مخالف ہو، ان کے بڑے نکتہ چیں، تم تو سرے سے ابن مریم کی اس مختصر اور شعلے کی سی زندگی اور صلیب اور حواریوں پر بحث کرتے ہو۔ ان استادوں کو تم نے کئی بار معتزلہ کے دلائل و براہین سے مباحث کی مجلسوں میں شکست دی ہے۔ پھر چند یسا پور پر تمہیں اتنا یقین کیسے ہو گیا؟ میرا خیال ہے نصیبین میں جو مدرسہ ہے وہ بہتر ہے گا۔“

”تو میں سرے سے اے عیسائی مدرسے میں بھیجوں گا ہی نہیں۔“ منصور نے قطعیت سے کہا۔

محی نے نرمی سے کہا ”میرا ہرگز یہ مطلب نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں جو چیز تمہیں اندر سے بے چین کرتی ہے اور جس کے تم قائل نہیں ہو، جس مذہب اور اس کی تعلیمات کو تم اپنی روحانی تربیت کے راستے میں جانتے ہو، اسے کیوں اختیار کرتے ہو۔ اپنے لئے تو تم نے اس کو ناپسند کیا تھا۔“

”جی پدر محترم! اور یہی بات میں چاہتا ہوں حسین میں پیدا ہو۔ اس کو وہ تعلیمات اندر سے مضطرب رکھیں گی تو وہ سچ کی تلاش میں سرگرداں رہے گا۔ وہ غلط سے صحیح کی طرف اپنے طور پر اپنا سفر جاری رکھ سکے گا۔ اسے اقصائے عالم میں تجارتی قافلوں کی اور دولت کی نہیں اصل حقیقت کو پانے کی خاطر گھومتے رہنا ہوگا۔“

”کیسی عجیب باتیں کرتے ہو منصور؟“ محی نے تعجب سے کہا۔

”آپ کو بظاہر یہ باتیں ایسی ہی لگیں گی۔ مگر مجھے سمجھائیے اگر آقائے رازی تجارت کا سامان لے کر چین تک کا سر کر سکتا ہے کوئی تلاش اور مفلس اور بظاہر دنیاوی طور پر تہی دست آدمی محض طلب صادق کے لئے کیوں دنیا میں نکل نہیں سکتا؟“

”عزیزم! دولت میرا بھی مطمع نظر نہیں زندگی کی حقیقت چاندی اور سونے سے بہت زیادہ ہے مگر حسین کے لئے میں بھی سوچ سکتا ہوں۔ وہ میرا خون ہے اس کی رگوں میں وہی کچھ ہے جو میرے جسم میں گردش کرتا ہے۔ میا خیال ہے نعمتیں میں کچھ دنوں اسے ابتدائی تعلیم دلوا کر اپنے ساتھ اپنے کام میں لگاؤ۔ ریشم بننا اور اس میں انتہائی کامیابی حاصل کرنا کوئی ایسا برا خیال نہیں۔ اگر آدمی جوانی میں کسی دربار سے منسلک ہو جائے تو بے شمار منافع اور دنیاوی کامیابیاں حاصل ہو سکتی ہیں۔“

”کیا دربار کا حال آپ سے پوشیدہ ہے؟ کیا زندگی اتنی کم مایہ شے ہے کہ اسے مالی منفعت کے لئے قربان کر دیا جائے؟“ منصور نے بڑے دکھ سے پوچھا۔

”تم مالی منفعت کے اتنے خلاف ہو یہ مجھے اس سے پہلے کبھی معلوم نہ تھا۔“ محی نے کہا۔ ”مگر حسین کے لئے تم ایسا کیوں سوچتے ہو؟ عام آدمی کی طرح اسے زندگی گزارنے کے لئے تیار کرو۔ یہ تمہارا فرض ہے۔ ہر شخص کو اپنے راستے چننے کا حق ہے۔ تم نے سرائے میں میری ساتھ کام کرنا نہیں چاہا، ٹھیک ہے اور میں نے بھی تمہیں مجبور نہیں کیا۔ پھر تم نے اپنے بچے کے لئے جود سے بربادی کی راہیں کیوں متعین کرو گے؟“

محی کو اب غصہ آ رہا تھا۔

پھر تقریباً چھ ماہ تک باپ بیٹے میں کوئی سلام و پیام نہ ہوا اب وہ مجبور ہو کر دل کے ہاتھوں اور جدائی سے تاب ہو کر جا رہا تھا۔ وہ دل میں سوچتا تھا کہ وہ اپنے پوتے کے لئے جا رہا ہے مگر اصل میں اس کا جی منصور کے لئے بے چین تھا۔ وہ اپنی رخصت کی گھڑیوں کو طویل کر رہا تھا۔ اپنے آپ کو روکنا چاہتا تھا کیونکہ ان مہینوں میں جب تک اس نے سلسلہ جنبائی نہیں کی، منصور نے اس کی خیریت کی خبر بھی نہیں منگائی، اروی بہشت سے شعبان تک ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ آدمی اپنی ساری آزاد پسندی کے ساتھ اولاد سے توقعات رکھتا

ہے وہ چاہتا ہے کہ چاہا جائے۔ اپنے آخری دنوں میں وہ احسان کا بدلہ چاہتا ہے جو اس نے اولاد کی نگہداشت اور اچھی تربیت اور کامیاب دنیا دار بنا کر کیا تھا۔ دل ہی دل میں وہ اپنے فرض کو پورا کرنے کی حقیقت کو تسلیم کرنا نہیں چاہتا۔ ناشکر گزار بچوں کے لئے اس کے جی سے دعا نہیں نکلتی اور اس لئے آخری گھڑی میں جب اس کے حبشی ملازم نے فخر کو تیار کر دیا اور وہ سوار ہونے والا تھا اس کا خیال تھا وہ نہ جائے۔ صبح دھندلی اور ماحقہ مسجد میں مجلس ذکر کی وجہ سے بہت آباد تھی۔ یہ ایک نہایت عمدہ تعبیر کا نادر نمونہ عبادت گاہ تھی جس کو زکثیر کے صرف سے ایک رئیس نے بنوایا تھا اور داخلی دروازے کی دہلیز کے عین اندر جہاں جوتے اتارے جاتے تھے اس نے اپنا نام سرفرش کھدوایا تھا۔ عاقبت کو سنوارنے کا یہ اچھا ذریعہ تھا ورنہ باقی دنوں میں وہ نہایت متکبر اور بہت ہی غصہ ور شخص تھا۔ وہ نہایت اکڑ کر چلتا تھا اور مسجد میں شاذ ہی نماز پڑھنے کے لئے آتا تھا۔ خدا کو خوش کرنے اور خریدنے کے لوگوں نے کیسے کیسے طریقے ایجاد کئے تھے۔ محی کی اور اس کی ملاقات تقریباً کبھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ عیدین کے موقع پر مسجد میں آتا تو اس کے ساتھ ایک بھیڑ ہوتی جو اس کے لئے راستہ بھی بناتی اور عام لوگوں کو اس سے دور رکھتی۔ خوشامدیوں کے اس گروہ کی وجہ سے نماز کی پہلی صفوں میں کھڑے ہوئے اس رئیس کو ملنا تقریباً ناممکن ہو جاتا اور پھر محی میں بھی ایک بے نیازی تھی اور وہ کسی کوشکایت کا موقع بھی نہیں دیتا تھا۔ ایک دو بار اس رئیس کے درباریوں نے کہا بھی کہ آقائے محمد آپ کو یاد کرتے ہیں مگر وہ مصروفیت کی وجہ سے جانہ سکا۔ وہ یوں بھی سلامتی چاہتا تھا اور اپنے کنارے پر ہی رہنا چاہتا تھا۔ اسے زیادہ نفع کی حاجت نہ تھی۔

دشت سوس کے کھنڈرات آب دز کے ساتھ ساتھ دور تک پھیلے ہوئے تھے اور مشرق کی طرف ذرا فاصلے پر وہ پل تھا جس کو پار کر کے ان کے شہوت کے جنگلوں میں داخل ہوتے تھے جس کے سرے پر منصور کی بستی تھی۔ شاہراہ کبھی بالکل ہی کنار آب جھک جاتی کہ اگر کسی موسم میں پانی زیادہ ہوا اور لہریں ساحل دریا کو چھوئیں تو وہ راستے کو بھی میراب اور لہریز کر دیں گی۔ جھاڑیوں کے اندر سے جھانکتا نیلا پانی سکون سے بہتا ہوا درخت، مینہ آب پر جھکے ہوئے اپنے آپ پر شار ہونے کو تیار اور کبھی پگڈنڈی ان مٹے ہوئے نشانوں اور بارگاہوں پر سے گھوم کر نکلتی ہوئی جن ایوانوں میں بار کے لئے جان کون منتظر رہا ہوگا۔ ساسانی بادشاہوں کے محلات اور ان کی بادشاہتیں، کچھ بھی تو نہیں رہتا، صرف فنا کو بقاء ہے اور یہ دریا ان زمانوں میں بھی اسی طرح رواں ہوگا۔ یہ ہوائیں جو کھنڈروں میں گھومتی ہیں، عالیشان بارگاہوں کے نشان اونچی چھتوں والے اطاقوں میں بھی اپنے لہریاں من لہراتی یونہی گھوما کرتی ہوں گی۔

انسان کیا ہے کہ ہر گھڑی ہر لمحہ گزرتا ہے اور پھر بھی لمحہ گزراں کو پکڑنا چاہتا ہے۔ نسلیں، قومیں، سلطنتیں سب اس گرد میں چھپ جاتا ہے اور پھر بھی دنیا کے محبت اور شدید چاہت آدمی کے جی کو بے چین رکھتی ہے۔ وہ ساری فانی چیزیں سے تعلق خاطر کی وجہ سے حیران

اور سرگرداں بھی ہوتا ہے۔ محی نے خچر کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ سورج آغا صبح سے ہی گرم تھا اور دھوپ کی تمازت دن کے پہلے جسے میں ہی تندی و تیز دکھانے لگی تھی۔ پانی سیال چاندی کی متحرک چادر کی طرح تھا اور اس میں سے مک ٹکلتی تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی تودہ تیز رو کی لپیٹ میں آ جاتا اور آواز سے پانی میں گر جاتا۔ چھوٹے چھوٹے بھنور سطح آب پر پڑ رہے تھے۔ آبادیاں شاید آب دز کی اسی خصوصیت کی وجہ سے اس سے دور ہٹ گئی تھیں۔ پہلے زمانوں میں کشتیوں کے ذریعے سے جو سامان تجارت ادھر سے ادھر آتا جاتا تھا، اب اس کا بھی کوئی چرچا نہیں تھا اور پورے طول میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کشتی کے ذریعے تجارت ہوتی ہو۔ ساسانی جو آتش پرست تھے اور جن کے عہد میں رب النوع کے معبد میں آتش ہمیشہ فروزاں رہتی تھی اور ان کھنڈرات میں بھی وہ آتش رہی ہوگی۔ یہ قانون قدرت تھا کہ ہر شے زوال کی زد میں فنا کی زد میں رہے اور آنے والی نسلیں اس سے عبرت حاصل کریں، مگر دنیا تو خوش ہونے، زندہ رہنے، بہار کی ہوا میں سانس لینے اور رقصاں رہنے کا نام ہے۔

رقصاں درویشوں کا کیا مذہب تھا؟ وہ کونسا فرقہ تھا؟ منصور شاید جانتا ہو؟ دھوپ ذرا سا گہنا گئی تو محی نے دیکھا بادل کا ایک ٹکڑا سورج کے سامنے ایک گستاخ طفل کتب کی طرح کھڑا تھا۔ پھر اس نے اپنا دامن لہرایا تو ہوائیں پرے باندھے اس کی مدد کو آئیں۔ کھنڈروں کی سرخ مٹی جو اینٹوں کی مسلسل کنگی سے ہوا کی رگڑ سے اس میں شامل رہتی ہے۔ آندھی نے تندی اختیار کر لی، وہ نہایت غصہ ور ملکہ کی طرح کرخت آواز میں احکام صادر کرتی اپنے دامن جھٹکتی ہوئی آب دز کے پانیوں کے مقابلے میں جم کر کھڑی ہو گئی۔ ساسانی عہد کا یہ کافی عریض پل تھا جس کی اونچی محرابوں تلے سے طغیانی کے موسموں کا پانی بھی آسانی سے گزر جاتا تھا۔ محی جب اس پر سے گزر رہا تھا تو ایک آدمی نے جس کی قبا تار تار اور جس کا کلاہ تقریباً ٹکڑے ٹکڑے تھا اس کے خچر کو روک لیا۔

”برادر کیا تم مجھے بستی تک لے جاؤ گے؟“

”کون سی بستی؟“ محی کا خچر زور زور سے سر ہلاتا اور کانوں کو جھٹکتا تھا جیسے انکار کر رہا ہو۔

”وہ جہاں ریشم کا کپڑا بننے والے رہتے ہیں۔ میں دور سے آیا ہوں اور میرے پاؤں زخمی ہیں۔“

”مگر یہاں ک اس پل تک کیسے پہنچے ہو؟“ محی عجیب شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گیا۔

”ہوانے مجھے یہاں لا پٹھا ہے۔“ اس نے لگام چھوڑ دی۔

”ہوش میں تو ہو برادر۔“ محی نے خچر کو آگے بڑھایا۔

”تمہیں کیوں یقین نہیں کہ ہوا جو زندہ اور متحرک اور دنیاؤں کے کناروں تک آمد و رفت رکھتی ہے ایسا کرتی ہے اکثر۔“

”میں نے یہ تو کبھی نہیں سنا کہ کسی آدمی ہو ہوانے اٹھایا اور پنچا ہو اور ٹھکانے سے دور لاپھیکا ہو۔“ محمی نے پھر باگ کو ذرا ڈھیل دی تاکہ اپنی منزل کی طرف بڑھے۔

”تو سنو وقت اور حرکتیں اور طاقتیں سب اسی کے تابع ہیں۔“ اس نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی، پھر رقص کرنے لگا اور پھر یکا یک ایک گولے کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

محمی حیران اور خوفزدہ سا تقریباً خچر کو بھگاتا ہوا پل کے دوسری طرف اتر گیا۔ گھنے درختوں کے اندر بنی پگڈنڈیاں بھاگتے خچر کی ٹاپوں سے گونجنے لگیں۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور اسے یقین نہیں تھا کہ جو اس نے دیکھا، وہ حقیقت تھی۔ شاید اس نے جاگتے میں خواب دیکھا تھا۔

منصور نے باپ کو دیکھا تو شدت انبساط سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے محمی کے سامنے جھک کر اس کے پاؤں چھوئے۔ اپنے لبادے سے ان کی گرد جھاڑی اور زور زور سے حسین کو پکارنے لگا۔

محمی ابھی تک پل پر اپنے عجیب اتفاق کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس لئے ہاتھ کے اشارے سے اس نے اسے روکا اور چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

محمی ابھی تک پل پر اپنے عجیب اتفاق کی وجہ سے پریشان تھا۔ اس لئے ہاتھ کے اشارے سے اس نے اسے روکا اور چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

دونوں باپ بیٹا نشست کے اس چھوٹے سے کمرے میں خاموش بیٹھے تھے۔ منصور نے دوزانو بیٹھتے ہوئے ادب سے کہا۔

”کیا بات ہے پدر محترم؟ کوئی حادثہ پیش آیا ہے کیا؟“

”میں اسے حادثہ نہیں، خواب کہوں گا۔“ اس نے منصور کو واقعہ سنا کر کہا۔

منصور تھوڑی دیر چپ رہا پھر اس نے کہا: ”رقصاں درویشوں کا تو میں نے سنا ہے، مگر کسی آدمی کا ہوا کے ساتھ اڑ کر اور ہوا میں تحلیل ہو جانا سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا راز تھا!“

محمی نے کہا: ”اور خچر اس قدر بے چین تھا حالانکہ طبیعت کا بہت غریب جانور ہے یہ۔“

”ہوا میں مافوق العقل ہستیاں اور روحوں جو قرار نہ پاسکیں اور جنات ہوتے ہیں۔“ منصور نے جواب دیا۔

حسین نے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا۔ ”دادا آپ حیران نہ ہوں، عرش سے لے کر فرش تک سمجھ میں نہ آنے والی طاقتیں

ہیں۔“

محی اور منصور نے بیک وقت مڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ گونے بازی کی گیند ہاتھ میں لئے کھڑ تھا جو پچھلی ملاقات میں اس کو دادا نے لا کر دی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں جیسے سورج کی روشنی کسی پراسرار طریقے سے ان میں سما گئی ہو آ ب دز کی سیال چاندی کا چمکتا ہوا دھارا وہاں فروزاں تھا۔ پھر اندر آیا اور محی سے لپٹ گیا اور اس کی رخساروں، چہرے اور آنکھوں پر بوسوں کی بارش کر دی۔

”آپ ہمیں بھول گئے ہیں۔“ اس نے محی سے لپٹتے ہوئے کہا۔

عجیب دیوانگی سے دادا اور پوتا ایک دوسرے کو لپٹا رہے تھے۔ منصور نے سوچا، باپ نے کبھی اس طرح سے نہیں لپٹایا، کبھی وافرنگی سے پیار نہیں کیا۔ ہمیشہ ایک دیوار اس کے اور میرے درمیان رہی۔ کچھ نہ کچھ تھا، ایک حجاب ایک جھجک جس نے دونوں کو ہمیشہ الگ رکھا جیسے دریا کے دو کنارے ہوں ایک ساتھ بھی اور جدا بھی۔ فاصلوں کی وجہ سے دھند سی ہمارے مابین رہی۔ شاید اولاد کے ساتھ سب باپ ایسے ہی کرتے ہیں۔ پھر اولاد کی اولاد میں وہ سارے ان کہے جذبے پہاڑی چشمے کی طرح کمزور سطح پا کر پورے زور سے اگلے ہیں اور سیرابی کی وہ کیفیت سرشاری کی سی ہوتی ہے۔ حسین اور اس کا دادا دونوں سیراب تھے جیسے بچپن اور بڑھاپا ایک ہی تصور کے دوزخ ہوں۔

”تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ راہ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے؟“ محی نے پیار سے اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

ان چھ ماہ میں اس نے خوب قد نکالا تھا۔ سنجیدہ اور پراسرار اور بڑھتا ہوا اور بے نیازی اور پروقار سا۔ سیاہ بالوں سے ڈھکا سر اور سرخ و سفید رنگ

حسین ہنسنا بہت کچھ جانتی ہوئی پراسراری مسکراہٹ اور اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کر کے اس نے کہا۔ ”مجھے دکھائی دیا تھا جب اس نے آپ کے خچر کی لگام تھامی تھی آپ کا راستہ روکا تھا اور پھر رقص کنناں گم ہو گیا تھا۔“

منصور نے اپنا سر جھکا لیا جیسے وہ اپنے بچے کی اس عادت سے سخت بیزار ہو۔

”پدر محترم! یہ خوابوں کے تانے بانے میں گم رہتا ہے اور میں پریشان رہتا ہوں۔ کوئی اس کے خوابوں کو سچ تو نہیں سمجھے گا مگر لوگ اسے دیوانہ پکاریں گے۔“

حسین اپنی گیند سے کھیلتا رہا۔ پھر اس نے دادا کے دامن کو مضبوط پکڑا ”میرے لئے آپ کیا لائے ہیں۔“

”منصور میں تو تقریباً بیٹھا تھا، خورچین میں اس کے لئے ایک گاڑی ہے۔“

گاڑی کہہ کر حسین بھی منصور کے ساتھ ہی باہر کی طرف بھاگا۔ محی نے ان کی غیر موجودگی میں دیکھا کہ نشست کے اس کمرے میں ایک آفتابہ رکھا ہوتا اور جائے نماز تہہ کر کے ایک طرف اونچے طاق میں پڑی تھی اور کلام پاک بھی عمدہ ریشمی کپڑے میں لپیٹ ہوا پاس ہی تھا۔ محی کو لگا کمرہ گھوم گیا ہے۔ اس کے باہر کی طرف کھلنے والے ذرا ذرا سے در پیچے بند ہو گئے ہیں اور چھت اس کے سر پر گرنے والی ہے۔ جندیا پور کے نسطوری عیسائیوں کے مدد سے میں پڑھنے کا یہ انجام ہوا تھا۔

زرتشتی محی کو خون اپنی رگوں میں کذب و افترا کی طرح خاموش ہوتا محسوس ہوا۔ اس کے سارے رشتے ماضی اور مقدس آتش اور معبد کے ساتھ ایک دم شکست ہو گئے۔ شہنارہ جانے اور گرم ہونے کا احساس اس پر چھا گیا۔ جیسے اور صاعقہ بلا کوئی لمحہ اس پر اپنا تسلط جمارہا ہو۔ اس کے حلقوم میں کچھ بگڑنے لگا، رکنے اور سکڑنے لگا۔ سینے پر کسی نادیدہ بلا نے پنجہ مارا۔ سر ایک دم گھوما اور وہ اپنا آپ بچانے کی خاطر اپنے آپ کو بکھرنے سے بچانے کی خاطر جھک گیا۔ ایک ہی جست میں اس کی روح اپنے قید خانے کے شکستہ دروازوں کو توڑ کر نفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔

خرداد کی پہلی تاریخیں تھیں۔ کوہ الوند پر برف پگھلنا شروع ہو گئی تھی اور بہار کا سانس ابھی شجر سایہ دار کے زیر سایہ محسوس ہوتا تھا جب حسین کو لے کر منصور تستر پہنچا۔ اس نے اپنے بیٹے کو بہت سے مدرسوں میں اس امید پر بھیجا تھا شاید وہ اپنی رگوں میں بستے آتشیں خون کی امانتوں کو ایمان افروز بنا سکے۔ آگ گلزار ہو جائے اور براہی امانتوں کی سعادت نصیب ہو۔

حسین کی روح بے چین تھی کیونکہ زاہد و پارسا سے پسند نہ تھے۔ ہم سبقوں سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تھا۔ استادوں کی غلطیاں وہ پکڑنے لگتا تھا اور درس کے لئے جو فضا ضروری ہے اسے درہم برہم کر دیتا تھا۔ منصور محی کے بعد خاندان سمیت سرائے میں اٹھ آیا تھا۔ اس نے کاروانوں کے لئے اسے بند کر دیا تھا گرا کا دکا مسافر بے منت دام و درہم وہاں ٹھہر سکتے تھے۔ وہ ان کے آرام کا خیال بھی اسی طرح کرتا تھا جیسے باپ کی زندگی میں ٹھہرنے والوں کی خدمت کی جاتی تھی۔ اس نے آتش کدے کو ایک حجرے میں تبدیل کر دیا تھا جہاں بچ راتوں میں جب باہر طوفان اٹھتے اور برف گرتی اور صحرا کی طرف سے ہوا چلتی اور درختوں کو جھکاتی سائیں سائیں کرتی وہی بے چین ہوتی تو وہاں بیٹھ کر کلام پاک پڑھا جاتا۔ اس کے معانی پر غور کیا جاتا اور ہر لحظہ حیرت بڑھتی تہہ در تہہ جہان معانی اور آہنگ نو اور معجزہ ناممکن البیان ہوتا ج سے اس کی روح سیراب ہوتی۔ اس اول نئے ذوق و شوق سے مشغول ہوتا۔

حسین ان دنوں اسی آبادی کی خانقاہ میں پڑھتا تھا۔ ایسی راتوں میں جب ہوا تھم تھم کر چل رہی ہوتی، استاد سخن میں الاؤ جلو کر اس کے گرد بیٹھ کر درس دیتے اور حسین سر جھکا کر سننے کی بجائے آگ کے دائرے سے پرے اندھیرے کی طرف دیکھتا اور دیکھتا چلا

جاتا۔ پھر اپنے چہرے پر خوف کی کئی کیفیتیں پیدا کرتا اور دوسرے طالب علموں کی توجہ میں نکل جاتا۔ وہ عمر میں ان سب سے کم تھا اور اس لئے استاد بے توجہی پر انہی کی سرزنش کرتے۔ منصور کو یاد آیا کہ جب بارہا ایسا ہو چکا تو استاد نے الاؤ میں سے جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر اس کی پیشانی کو داغ دیا۔ زخم گہرا تھا اور مندمل ہونے میں کئی ماہ صرف ہو گئے۔

حسین کہتا تھا میری پیشانی یہ پر یہ داغ دلربائی ہے۔

ہاں یہ داغ دلربائی تھا جسے اپنی پیشانی پر سجائے منصور اور وہ تستر میں وارد ہوئے تھے۔

سہل بن عبد اللہ تستری کا یہ مکتب تستر کی باغ و بہار سرزمین پر ایک خاموش اور کم آباد گوشے میں تھا۔ پہاڑ کے دامن میں وادی کے سرے پر جہاں آوازیں کم سنائی دیتی تھیں، جب شام ہوتی تو نیلے دھوئیں کی لکیریں نیچے سے اوپر اٹھتیں اور طویل سائے مسجد اور اقامت گاہ کی طرف بڑھتے اور چاروں اطراف سے رات ایک دم یورش کر کے در آتی۔ چراغوں کی لمبائی لوئیں دور پرے فاصلے پر دکھائی دیتیں اور ان پر ستاروں کا گمان ہوتا۔ کبھی فرحت اور انبساط کا محفل میخں جب نقارہ بجایا جاتا اور رقص کنناں مرد و زن زور زور سے ہاؤ ہو کرتے تو وہ صدائیں گونج پیدا کرتی ہوئی اپنے ساتھ نغموں اور لہروں کے سے ارتعاش کی بازگشت کو لاتیں دیر تک سنائی دیا کرتیں جیسے خالی کمروں میں کوئی اپنی ہی صدا کو سنتا ہوا اپنے گرد گردش کرے۔ مکتب سے مشرق کی طرف ایک کم بلند پہاڑی کے سرے پر جہاں جگہ کھلی تھی اور چشمہ تھا، ایک خانقاہ تھی۔ مراقبے میں گم اور مشغول عبادت گوشہ نشینوں کے ذکر سے فضا معمور رہتی۔ لوگ دور دراز سے زیارت کرنے آتے۔ قبولیت دعا کی طمانیت کے ساتھ۔ کیونکہ یہاں کا حلقہ درویشاں سے شب زندہ دار تھا۔ شوق ان کی جانوں کو بے قرار رکھتا تھا۔ ان کے دل گرم، ان کی نگاہ پاک اور جان بے تاب تھی اور مشک نافے کی بو کی طرح سارے عجم میں ان کی بو پھیلی ہوئی تھی، مشام جان کو معطر کرتی ہوئی۔

دروس میں شریک طالب علموں کو کڑی ریاضت، فاقہ کشی اور شب بیداری کے مراحل سے گزرنا پڑتا تھا۔ جان کو تحلیل کرنا پہلی منزل تھی۔ یہ سختیاں عام آدمی برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ یہاں پہنچ کر حسین کی خوشی دیدنی تھی۔

منصور نے حسین کو سل بن عبد اللہ تستری کے سامنے پیش کیا۔ ”کلام پاک سے محبت اس کی واحد سند ہے جو جرات اور عاجزی سے آپ کے سامن حاضر کر سکتا ہوں۔“

سہل سر ہلا کر چپ ہو گئے۔ اور حسین ان کے دروس میں شریک ہو گیا۔

رخصت ہوتے وقت منصور نے بیٹے سے کہا: ”جان پدراپنے آپ کو اس درس کا اہل ثابت کرنا اب تمہارا کام ہے۔“

”پدر محترم! میرا خدا جب مجھے یہاں تک لایا ہے تو رہنمائی بھی وہی کرے گا۔“ منصور نے کہا: ”جان پدر میں کپڑا بننے والا ایک کم علم آدمی ہوں۔ خدا اور آدمی کے درمیان رشتے کا شناسا بھی نہیں۔ زہد و ریاضت سے بھی مجھے کچھ حصہ نہیں ملا مگر میرے اشواق جلیل ہیں، میرا جی چاہتا ہے تم ان کی تکمیل کرو۔ میرے خوابوں کی تعبیر بنو۔ خواب جن کی آہٹ بھی والد بزرگوار کی حیات میں نے کس کو نہیں سنائی۔ میں نماز پڑھتا ہوں تو اپنی طبیعت کے ناقہ کو بس چار میں رکھنے کے لئے، ورنہ بے حضوری کے سجدوں میں کوئی لذت نہیں ہے۔ حضوری کی سعادت میرے نصیب میں کہاں؟ مگر خدا تمہیں کسی طوفان سے آشنا کر دے۔“

حسین نے بازو اپنے باپ کے گرس ڈالے اور اس تنگ حلقے میں ایک لچلے کے لئے منصور نے اپنی نگاہوں سے بہت کچھ دیکھا، بہت محسوس کیا، جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ بیٹے کی پیشانی پر وہ بوسہ شہد آ گئیں تھا جس کی شیرینی کو حسین نے اس کے بعد ہمیشہ اپنی جان میں محسوس کیا۔ وہ ایک گنج گراما یہ تھا۔ وہ ساری محبتیں اپنے دامن میں پوشیدہ جو منصور کو اب تک نصیب ہوئی تھیں، چشمے کی نغمگی کی طرح انہوں نے حسین کو گوش و ہوش کی آبیاری کی۔

پھر منصور ان چوڑی سبزھیوں پر سے اتر اور پہاڑی کے نیچے کھڑے ہو کر اس نے مڑ کر اوپر دیکھا۔ حسمن کا ہاتھ اٹھا ہوا تھا جیسے بحرنا پید میں ڈوبنے والا مدد کے لئے پکارنا چاہے۔ اس کا دل عجیب طرح سے بے چین ہوا، اس نے چاہا کہ واپس جائے اور بیٹے کو پھر اپنے سینے سے لگائے مگر اس نے بھی ہاتھ ہلایا، پھر موڑ کی وجہ سے سب کچھ اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

سرائے میں واپس پہنچ کر منصور بہت مطمئن تھا جیسے کسی بارگراں سے سبکدوش ہو گیا ہو۔ اسے یاد آیا کہ جب آخری بار حسین نے اس سے معاف کیا تھا تو ایک رد و نور اسے اپنے وجود میں سراپت کرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ عرش کے ساتوں در ایک دم وا ہوئے تھے جیسے آسمانی بجلی کا لہریا اس کی آنکھوں کے سامنے کو گیا ہو۔ یہ سب اسے اپنا وہم لگا تھا۔ اس کے اشواق جلیل اور اس کی ہمت قلیل تھی۔ وہ تو ایک نہایت عام آدمی تھا۔ بے بضاعت! جس کو حضور حق سے جان بے تاب عطا ہوئی تھی، مگر اس کی رسائی کہیں تک نہ تھی۔ وہ عبادت گزار نہ تھا، صرف نماز پڑھتا تھا۔ کلام پاک سے اس کی بے تابی اور بھی بڑھ جاتی، اس سکون سے بھی افزوں تر جو اسے حاصل ہوتا تھا۔ اسے ایک گونہ حیرت بھی ہوتی کہ وہ خدا سے ہم کلام ہے۔ وہ ذرہ نا چیز براہ راست اس خالق کائنات سے روبرو ہے۔ حاضر ہے۔ اس ناہ سے کہیں چھو جاتا ہے ”جو کن“ ہے۔ سارا دن وہ عجیب بے خودی کے عالم میں اپنے کاموں میں لگا رہتا۔ ایک چکا چوند سے سرشار اس لہریے کو بے پائی میں غلطاں۔

”تیر“ شروع ہو چکا تھا۔ جب سرائے میں ایک گروہ آن کر رکا۔ وہ بڑی پر اسراریت کے حامل تھے اور بے چین تھے۔ انہوں

نے آرام کرنے کے لئے کمریں نہیں کھولیں۔ ان کے خچروں کی خورچینیں ان پر اسی طرح بندھی رہیں۔

”کھانے کو کچھ مل سکے گا کیا؟“ انہوں نے منصور سے پوچھا۔

”سرائے بند ہو چکی ہے۔“ منصور نے اپنی کتاب سے نگاہ اٹھا کر بہت بے نیازی سے کہا۔

”وہ آتش پرست جو اس کا مالک تھا کہاں ہے؟“ ان میں سے ایک نے تیزی سے استفسار کیا۔

”آپ کو کیا چاہئے میں آپ کی خدمت کرنے کو تیار ہوں برادرانہ۔“ منصور نے کہا۔

”ہمارے پاس وقت کم ہے بلکہ بالکل نہیں ہے۔ کچھ بھی جو مل سکے ہم اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔“

”برادرم گرمی اس قدر شدید ہے اور دوپہر سر پر ہے۔ کی آپ آرام فرمانا پسند نہ کریں گے؟ اندر بروقت بھی ہے اور سائے میں

جانور بھی ذرا کی ذرا دم لے لیں گے۔“

نہایت بے حوصلگی سے ایک نے اپنے لبادے کو گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے پاس تو ڈھنگ سے موت کو خوش آمدید کہنے کا

وقت نہیں ہے، ٹھہرنے اور دعوت قبول کرنے کے لئے کہاں سے لائیں گے؟“

منصور نے بولنے والے کی طرف گہری نظر سے دیکھا، ان سب کی داڑھیاں بڑھی ہوئی اور لباس میلے تھے۔ بال الجھے ہوئے

اور پرانگندہ تھے۔ ناخنوں میں نیلے رنگ کا مین تھا۔ آنکھیں بے خوابی کی وجہ سے بند ہوتی ہوئی اور گدلی سرخ تھیں۔ تلواریں ان کے

پہلوؤں سے بے ترتیبی سے بندھی تھیں اور وہ مڑمڑ کر باہرے داخلے کے دروازے کی طرف دیکھتے تھے۔ پتہ نہیں یہ کون تھے؟ کہاں

سے آئے تھے؟“

منصور نے ابلا ہوا گوشت اور خشک روٹی حاضر کر دی۔ مشکیزہ پانی سے بھر دیا اور بے مبری سے انتظار کرنے والے لشکر یہ کا ایک

لفظ کہے بنا اپنے خچروں کو و تقریباً سر پٹ دوڑاتے گرد کے بادلوں میں غائب ہو گئے۔ وہ آب دز کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف سفر

کرنے والے تھے۔ آثار یہی کہتے تھے۔

منصور نے کتاب کھولی اور گرم ہوا کے تیز جھونکوں سے بچنے کے لئے درتے بچے کو بند کیا۔ یہ کونسا فتنہ تھا؟ اسلامی سلطنت کی پھیلی ہوئی

حدیں کتنی قیامتوں کو ہوا دے رہی تھیں۔ عجیب ادیان، عجیب و غریب فرقے اور عقائد پیدا ہو رہے تھے۔ پھر اس نے کتاب اٹھالی۔

گھوڑوں کی ٹاپوں کے شور سے صحن گونج اٹھا۔ جانے یہ اسی کے ساتھی تھے یا کون لوگ تھے جو پانی اور کھانے کی تلاش میں آئے

تھے مگر اب تو کسی کی خدمت کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ گوشت اور روٹی وہ پہلے ہی پیش کر چکا تھا اور اب دینے کے لئے کچھ باقی نہ تھا۔ پھر

تلوار کی نوس کے سینے میں چھو کر ایک فوجی نے اس سے پوچھا۔

”کیا تم نے کچھ زندہ یقوں کو دیکھا ہے؟ ہم ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔“

منصور حیران و پریشان ان کی شکلوں اور وضع قطع سے شک میں مبتلا ہو گیا۔ وہ انکار اور اقرار کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا تھا۔

”زندہ یق؟“ اس نے پوچھا اور نہایت آہستگی سے تلوار کو اپنے سینے سے پرے ہٹایا۔ وہ ان سے ترساں لرزاں نہیں تھا، صرف دلچسپی سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ یہ لوگ کم گرد آلود اور تھوڑے غلیظ تھے۔ ان کی آنکھیں سرخ تھیں جیسے شراب پئے ہوئے ہوں مگر وہ سخت غصے میں تھے جھلائے ہوئے جیسے شکار کے نکل جانے کے بعد شکاری۔

”ان کے درمیان ایک شخص ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔“ انہوں نے وضاحت کی ”اور اگر ابھی اسے سردار نہ کھنچا گیا تو مزید فتنے کا سبب ہوگا۔“

منصور ہنسا۔ ”نبی کو بھاگنے کی ضرورت؟“

”ہاں وہ اور اس کے ساتھی کاذب ہیں اور کہتے ہیں خدا نے انہیں اپنا جلوہ دکھایا ہے اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔“

”وہ اپنے آپ کو اہل بیت سے کہتا ہے، نبوت کا مدعی ہے۔“ دوسرے نے مزید تفصیل سے بتایا۔

”آپ لوگوں نے سورج کی نموکے ساتھ شبنم کو فنا ہوتے دیکھا ہوگا۔“ منصور نے کہا۔

پاس کے درختوں میں ایک لمبی تان گونجی جیسے راگ شروع کرنے سے پہلے ساز کو درست کیا جا رہا ہو۔ پھر سرائے پر لی طرف بستی کے باغوں میں ایک کے بعد ایک جیسے گواہی دینے والاے ہوں۔ طوفان گرد بار آس پاس منڈلایا۔ دشت سوس کی زرد اور سیاہ ریت لہروں میں اوپر اٹھی اور ہر شے پر مسلط ہو گئی۔ اس میں دور کھنڈروں اور ویرانوں میں آگے سخت جان پودوں اور پتوں کی خوشبو تھی۔ زمانوں سے شکست و ریخت میں گرفتار عمارتوں کی پرانی خاک تھی۔ آب دژ کے اوپر کی نمی اور ہوا تھی، مگر سارے راستے مسدود ہو چکے تھے۔

یہ ہلاکت آفریں ہوا تھی جس کی زہرناکی سے بچنے کے لئے درپچوں کو بند کرنا ضروری تھا ورنہ اس کی خشمکی جلد کو اپنی سمیت سے متاثر کرتی ہے اور اوپر کی کھال ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے جا کا علاج دنوں میں نہیں ہو پایا تھا۔ پیاس بجھائے نہ بجھتی تھی اور زبان سوکھ کر لٹک جاتی۔ البتہ جانوروں پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔

قالین پر بیٹھ کر اس نے اس سے کہا۔ ”آپ لوگ میرے مہمان ہیں، تشریف رکھئے۔ میں آپ کے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں وہ گو

آپ کے شایان شان نہیں ہوگا اس سے میری تسلی ضرور ہوگی۔“

”مگر ہم جس کی تلاش میں آئے ہیں اس کا کیا ہوگا؟“ ان میں سے اکثر قالین پر بیٹھ گئے۔ ”یہ ہوا جو دشت سوس سے چلتی ہے مٹی نہیں۔ اگر کوئی ایسے میں ان اطراف میں ہوتا تو اس کی بربادی پر صا د کر لیجئے۔“ منصور نے اندر کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”آخر لوگ کمتر اعلانات کیوں نہیں کرتے۔ نبی ہونے کا دعویٰ خدا ہونے کا، مافوق الفطرت ہونے کا ہی کیوں؟“ مہمانوں میں سے جو سب سے سنجیدہ تھا اس نے باقیوں سے پوچھا۔

”لوگوں کو چونکا نا نہیں حیران کرنا مقصود ہوتا ہوگا۔“ کسی نے کہا۔

”صرف یہی کافی نہیں باقی لوازمات کا بندوبست۔ کچھ کرامات، کچھ غیب دانی، اپنے گرد بے وقوفوں کو جمع کرنا۔“

”لوگوں کی تسلی کے لئے کوئی شعبہ تو لازم ہے۔“

”یہ نبی جس کے عقب میں ہم حیران و پریشان ہیں کیا تجلی رکھتا ہے؟“

”کہتا ہے مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے۔ یں ذوالقرنین ہوں اور میں نبی ہوں۔ عجیب تاویلات سے انے مطلب کی وضاحت کرتا ہے۔“

”کیا اس کے ساتھ ایک بڑھا آدی نہیں؟ سفید ریش! جو کہتا ہے کہ اس نے اپنے عالم ہوش میں اپنی ان فانی آنکھوں سے وحی نازل ہوتے دیکھی ہے۔“

”وہ کیا پڑھتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی کتاب، کوئی شریعت؟“ منصور نے پوچھا۔

”یہ شوریدہ اور دیوانے ہوتے ہیں۔ خیالوں کا دباؤ اور کچھ کر گزرنے دوسروں سے اپنے آپ کو ممتاز کرنے کی تمنا انہیں اس نازک مقام پر لے آتی ہے جہاں انہیں خواب دکھائی ہیں اور سارے اور صورتیں اور وہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان کو عام لوگوں سے زیادہ طاقت عطا کی گئی ہے۔ ان پر وحی اترتی ہے۔“

”کیا محمود بن فرج کا بھی یہی دعویٰ ہے؟“ منصور نے پوچھا۔

ملازم نے آ کر دسترخوان بچھایا اور سلطی لے کر سب کے ہاتھ دھلائے۔ پھر کبابوں کی مہک پھولوں کی خوشبو کی طرح اڑی اور مشام جان کو سیراب کر گئی۔ سیٹے سے مگر تیزی سے سینکے ہوئے سیخ کے کبابوں میں عمدہ مصالحے اور روغن کی ہلکی سی چکناہٹ تھی۔ ہندی

پکوانوں کی سی گھلاوٹ ان ایرانی کھانوں میں بھی محسوس ہوئی، کیونکہ ہندوستان دور نہیں تھا اور سودا گروں سے اکثر ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ سرائے میں محمی کے وقتوں میں زرتشتی دستور زیارتوں کے لئے اکثر دور دراز کا سفر طے کر کے معبودوں میں آتے اور اس سر زمین کی محبت میں اکثر یہیں رہ جاتے۔ تاہید کے بڑے معبد کے غلاموں میں تقریباً ہندی لوگ تھے جو عالم اور بہت خواندہ تھے اور کہانیاں کہنے میں کوئی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کہانیوں کی سر زمین جس پر زمانوں کے بعد اکثر اوتار آتے رہتے تھے۔

”میں آپ کی تواضع حسب دل خواہ نہیں کر سکا۔ منصور نے کہا۔ دسترخوان اٹھایا جا چکا تھا اور گرد باد کا شور ہر لحظہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ آسمان خاک سے پوشیدہ اور سورج اس سے بھی دور۔

”ایران ایک دنیا ہے۔ سب کی طرح کی آب و ہوا اس میں ملتی ہے اور ہر مذہب و ملت کے لوگ اور بھی اس سے پرے کچھ نا معلوم قبائل اور صحراؤں کی دوسری طرف شدید موسموں کا دباؤ۔ بلند پہاڑوں کی اوٹ میں بسنے والے خانہ بدوش جو خدا کی ذات پر یقین نہیں رکھتے اور یہاں اپنے آپ پر بے طرح نازاں غیر معمولی سمجھ کر دعویٰ نبوت کرنے والے آدمی اور ان کے تعاقب میں سر گرداں اپنے پر نیند اور آرام حرام کئے ہوئے آدمی۔“

”نہیں برادر! آپ نے جس محبت سے ہمیں اپنے ذاتی مہمان خانے میں جگہ دی ہے، ہم اس کا شکریہ ادا نہیں کر سکتے۔“ نیند کے غلبے سے بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولتے ہوئے سالار قافلہ نے کہا۔

”برادر کیا آپ محمود بن فرج کو جانتے ہیں؟“ ان میں سے ایک نے منصور سے پوچھا۔

”ان اطراف میں یہ روایت دشت کبیر کی طرف سے آئی ہے۔ وہاں محمود بن فرج اپنے اپنے نبی ہونے کا اعلان کیا ہے۔ کچھ لوگ اس کے ساتھ ہیں اور ہوا اپنے دین کی تبلیغ کے لئے کوہ و صحرا میں سرگرم عمل ہیں۔“ منصور نے جواب دیا۔

”آپ نے اسے دیکھا ہے؟“ پوچھا گیا۔

”نہیں، صرف حکایت سنی ہے۔ داستان جس کو رنگ آمیزی سے پر اسرار بنایا گیا ہے۔“

”جس نبی کا ہم تعاقب کر رہے ہیں، وہ فاسق اور دیوانہ ہے مگر اپنا مصحف رکھتا ہے۔“

”یعنی اپنا کلام جو اس نے حواشی اور زوائد کے ساتھ تاویلات اور تفسیر کے ساتھ اپنے اقوال و اعتقادات میں جمع کیا ہے۔“ منصور نے پوچھا۔

”وہ شاعر ہے، لفظوں کی جوڑ کر ترتیب سے بات کہنے والا۔ کہتا ہے یہ اس کی شاعری ہے اور شاعری پیغمبری ہوتی ہے۔“

”ایران کی نصف آبادی پیغمبری کا دعویٰ کر سکتی ہے۔“ منصور کو یہ باتیں دلچسپ معلوم ہوئی۔ شاید پیغمبر بننا عام آدمی بنے رہنے سے زیادہ آسان ہو۔ اس نے سوچا۔

بیٹھے ہوئے لوگوں نے زور زور سے قہقہے لگائے اور ہنسی کا ایک دورہ سالن پر پڑا۔

”کنارُب‘ شب ماہتاب“ میرے اس مصرع کو کوئی پورا کر دے۔ اب وہ یونہی ترنگ میں آ گئے تھے۔

”کیا باقی دن یہاں گنوا دینے کا ارادہ ہے؟“ ایک بڑی عمر کے آدمی نے پوچھا

”ہماری زندگی تنگ و تاڑ تو ہے، مگر زہریلی ہوا میں اپنا وجود پارہ پارہ کرنے کی کیا ضرورت؟ طوفان تھم لے۔“

یہ سرزمین کب سے فتنوں کی آماجگاہ تھی۔ عباسیوں کی کمال آزادی اظہار نے خیالات کی گستاخی و بے باکی نے فلسفے کی موشگافیوں نے ان فتنوں کو ہوا دی تھی۔ انہیں پنپنے کے لئے فضا کو سازگار بنایا تھا۔ یونان کے علمی خزانے تراجم کے ذریعے جیسے جیسے عرب و عجم میں داخل ہوئے، ان کو سمجھنے اور روزمرہ زندگی پر انہیں آزمانے کے لئے اپنے مذہب سے روگردانی نہیں، مگر کچھ جساریں بھی عام ہو گئیں۔ خلیفہ علم دوست تھے، نئے نئے فنون کی سرپرستی کرتے تھے اور اقصائے عالم سے لوگ اس بے پناہ دربار کی طرف کھینچتے تھے۔

جب خلق قرآن اور صفات باری تعالیٰ کا غلطہ اٹھا ہے تو معتزلہ جہاں اور فرقوں کے اور اسلام کے درمیان ایک فسیل آہن ثابت ہوئے وہاں انہوں نے ایک بھاری پتھر کی طرح عقائد کی تہ میں بیٹھنا شروع کیا۔ اپنے کلام کے زور سے وہ ایک خلقت کی بربادی کا سبب بن گئے۔ شخصی آزادی نے خیالات میں انقلاب پیدا کیا اور یہ معتزلہ کے اثر و نفوذ کا نتیجہ تھا کہ معمولی آدمیوں نے نبی ہونے کا دعویٰ کرنا شروع کیا۔ محمود بن فرج کا بوڑھا ساتھ چالیس درے کھا کرتا تب ہو گیا اور محمود کا انجام بھی کچھ کم نہیں ہوا۔ اس نے سو درے کھائے اور جان گنوا دی مگر آزادی فکر کی بنا اور تاویلات کا جو ایک سلسلہ چلا تھا، وہ گے چل کر مزید فتنوں کی پیدائش کی وجہ بنا۔

عیسائی اور یہودی اپنے بنیادی عقائد کے ہمراج جوان رگوں میں خون کے ساتھ تھے، اسلام میں داخل ہوئے تو ان کا خدا اسی طرح صلیب کے واسطے سے آسمانوں اور زمین کے درمیان اٹھا لئے جانے اور دفنادیئے جان کے درمیان ابن مریم ہونے اور روح پھونکے جانے کے مسائل کی وجہ سے انہیں پریشان کرتا رہا۔ وہ اسلام پر اپنی ساری روح سے فدا ہونے اور اسے قبول کر لینے کے اوصاف سوال کرنے والے دماغ اور جواب ڈھونڈنے کے لئے سرگرداں رہنے والے ذہن سے جو انہیں اندھیرے غاروں میں لے جاتا تھا، اپنا دامن نہ چھڑا سکے۔ اسلام کی رواداری نے انہیں جرات سوال عطا کی تھی، مگر ماضی کی بھول بھلیوں اور عود کرنے والی کے باوجود بھلائے نہ جانے والی جسارتوں نے ایسی الجھنیں پیدا کیں جو بظاہر چمکدار اور دور رس نکتہ آفریں کیفیات تھیں، مگر اصل میں

گمراہ کن اور بے جا تھیں اور تفریق کا باعث ہوئیں۔

جب طوفان گرد باد تم گیا اور وہ سب جا چکے تو منصور نے شام کے لے چراغوں میں تیل ڈالا اور غلام کے ساتھ مل کر درختوں کی خشک پتوں کو ایک جگہ جمع کر کے اس ڈھیر کو آگ لگائی۔ بڑی بڑی شاخوں کو جو ٹوٹ کر گی تھیں، علیحدہ رکھا اور صحن میں بکھرے جانوروں کے چارے کو پھر ان ناندوں میں بھرا۔ دشت سوس کی سرخ اور سیاہ اور زرد ریت کے انبار درپچوں کے آگے جمع ہو گئے جیسے دستک دیتے دیتے تھک کر بیٹھ گئے ہوں۔ انہیں ہٹانے میں اس کے غلام نے بہت مستعدی دکھائی۔ حوض جو تنکوں اور گھاس سے بھر گیا تھا، خالی کر کے پھر سے لبریز کیا گیا۔ اور وہ تقریباً فارغ ہو چکے تھے۔ جب مغرب کی اذان زندگی اور دنیا کو بلانے کے لئے رب قدیر کے جاہ و جلال، اس کی عظمت و حرمت پر گواہی دیتی ہوئی ہر سو ہر شے پر اندرون اور بیرون نہاں خانوں میں کھلی فضا میں گونجی۔

”جو جھوٹ ہے وہ خود مٹ جائے گا

اے شام صبح کے دشت میں پرواز کرتے سفیر و

جو جھوٹ ہے وہ خود مٹ جائے گا

اور سچ کیا ہے یہ بھی کسی کو کیا معلوم

کیا سچ وہ ہے جو تمہیں دکھائی دیتا ہے

اور جھوٹ وہ ہے جو دکھائی نہیں دیتا

یہ مسائل نہ تم حل کر سکو گے اور نہ میں

کیونکہ جو جھوٹ ہے وہ خود مٹ جائے گا“

جب وہ نماز پڑھ کر سرائے میں دوبارہ داخل ہوئے تو بڑے دروازے کے باہر کوئی کھر دردی، کرخت تقریباً تلخ آواز عود کے تاروں کے ساتھ سنائی دیتی تھی۔ پچھلی صدی میں ان گیتوں کو نستوری پادریوں نے لکھا تھا اور اپنے مذہب کی تبلیغ کے لئے اچھی سراور لے میں بہترین سازوں کے ساتھ انہیں گایا جاتا تھا۔ گرجاؤں میں باجوں کے ساتھ یہ پڑھا جاتے تھے۔ بہت سی آوازیں مل کر جب انہیں دہراتیں تو گونج پیدا ہوتی تھی۔ سچ اور جھوٹ اور لاہوت کے کتنے مسائل تھے جو روزمرہ کے کاموں میں ہر ہر گھڑی پیدا ہوتے تھے مگر اس کے لئے مننے کا انتظار! منصور ہنسا۔ اس نے گانے والے کو ٹھوڑی دیر دیکھا، پھر جیب سے ایک دینار نکالا اور اس کے پاؤں کے قریب رکھ کر اندر آ گیا۔

تستر سے آنے والے مسافر نے جب آدھی رات کے قریب سرائے کا دروازہ کھٹکھٹایا تو منصور ابھی نیم خوابیدہ گی کی حالت میں تھا۔ کتاب اس کے سامنے تھی اور ورق اسی جگہ کھلا تھا جہاں اس نے پڑھتے ہوئے اسے کھولا تھا اس بیان میں کہ ”ولایت کیا ہے؟“

”حسین نے یہ خط مجھے دیا ہے اور میں چونکہ اگلی منزل پر دن کے لئے ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ یہ خط آپ کو پہنچا دوں۔ وہ خیریت سے ہے۔“

منصور نے کہا۔ ”آدھی رات کے ستارے دب اکبر سے پرے جھک گئے ہیں اور زیادہ روشن ہیں۔ صبح اب ہوا ہی چاہتی ہے۔ میری خوشی تو یہی ہے کہ آپ میرے پاٹھریں۔ اگلی منزل زیادہ دور بھی نہیں۔ صبح کافی خوشگوار ہوتی ہے اور آپ دن گزارنے کے لئے وہاں تک آسانی سے پہنچ سکیں گے۔ پھر اس نے مسافر کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور اسے آہستہ چلاتا وہاں تک لایا جہاں اونٹ اور دوسرے جانور بندھتے تھے۔

قبوے کا فغان لے کر اور قالین پر بیٹھتے ہوئے مسافر نے جس کا نام صادق بن صدیق تھا کہا ”حسین آپ کا بیٹا، غیر معمولی طالب علم ہے۔ مکتب میں میرا بیٹا اس کام سبق ہے مگر سارے دروس میں اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ حسین کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔ میں اس کے لئے آپ کو مبارکباد دیتا ہوں۔“

منصور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

صادق بن صدیق نے پھر کہا۔ ”سہل بہت اچھے استاد ہیں۔ اگر وہ بغداد میں تو مدرسہ نظامیہ کی خوش قسمتی ہو مگر تستر بھی انہی کی وجہ سے آباد ہے اور بچوں کی سعادت ہے۔ اگر ایسے برگزیدہ بزرگ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کریں۔“ جب منصور نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا تو اس نے کہا ”کیا آپ خوش نہیں ہوئے؟“ وہ حیران تھا۔

”میں اب بات کو تو اپنی اور حسین ک خوش بختی گردانتا ہوں کہ وہ سہل جیسے کامل استاد کے زیر سایہ تربیت پا رہا ہے مگر اس کے غیر معمولی ہونے سے میں خوش نہیں ہوں۔ زمانہ ایسی کسی بات کو برداشت نہیں کر سکتا جو غیر معمولی ہو۔ ذہانت یا ریاضت فصاحت بد عام ہونے میں ہی انسان کی فلاح ہے۔“

”آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں ابو حسین!“ اس نے فغان کو ایک سے دوسرے ہاتھ میں تھام لیا۔

”مجھے یہ دعویٰ تو نہیں کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، مگر برادر ام آپ نے تجربہ کیا ہوگا کہ دنیا ہر اس شے کو جو اس کے پیمانے اندازے اور عقل سے بلند ہو پسند نہیں کرتی!“ منصور نے افسوس سے کہا۔

”میری خیال میں دنیا عبارت ہی سب غیر معمولی لوگوں سے ہے ورنہ روئیدگی اور خس و خاشاک کیا شے ہے؟“ اس نے ذرا تیزی سے کہا۔

”زمانہ اور دنیا دو بہت مختلف النوع خیال ہیں۔ گزرتا ہوا وقت اور اس کے ساتھ جو ہے وہ تو دنیا ہے اور لوگ زمانہ ہیں اور زمانہ خدا ہے۔“ منصر نے بہت نرمی سے کہا۔

”میں آپ کی ذومعنی باتیں سمجھ نہیں سکتا۔“ صادق نے خالی فہجان قالین کے چاشیے پر رکھ دیا۔

”شادی میں ذرا ادق زبان استعمال کر رہا ہوں اشارات طرز گفتگو۔“ منصور نے پاس ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ باہر درخت کی شاخوں میں رات کا پرندہ زور سے چلایا۔ تیزی سے پر پھڑا پھڑا کر اڑا۔ عین اس کمرے کی چھت پر بیٹھا درتچے میں اس کی آواز بہت قریب سے آئی جیسے ویرانوں میں کوئی بھنگی ہوئی روح چیخ اٹھے۔ صادق اور منصور دھیان سے دوسری چیخ کے منتظر رہے۔ پھر دوبارہ اڑنے اور پر پھڑ پھڑانے سے معلوم ہوا کہ وہ چھت سے پھر کسی اور درخت کی شاخوں میں الجھا ہے۔ ایک لمحے کے توقف اور معنی خیز خاموشی کے بعد کہیں دور کے درختوں سے بلبل ک صدا سنائی دی۔ صبح کی خوشخبریاں گاتی ہوئی پھر چڑیا بولنے لگیں۔ سورج کے لئے منتظر اور پرواز کے لئے اپنے اپنے آشیانوں میں بے تاب نیند سے تھک چھپوں کی نغمگی سے سرشار باد صبا ہولے سے گنگنائی ہوئی لچی۔ دشت سوس سے پرلی طرف صبح صادق کے آسمان پر سیاہ دھندلے میں ایک موہوم سی سفی لکیر مل گئی اور ریت کے لہریوں پر محبت کا تنفس تازہ پھیلتا چلا گیا۔

صادق نے سوار ہوتے ہوئے اپنے گوڑے کی لگام پکڑ کر کہا۔ ”ابو حسین آپ کی باتوں سے نئے درتچے کھلے مگر شک و شبہ کی ہوا جو اس سے آئی ہے میں بھی سوچنے لگا ہوں کہ کہیں وہ ہی سب کچھ نہ ہو۔“

”نہیں شک و شبہ سے ماورا ہونا زندگی کے لئے بہت ضروری ہے ورنہ جینا تلخ ہو جائے۔ میں نے کوئی غیر معمولی بات نہیں کی صرف یہی کہ زمانہ ان لوگوں کو معاف نہیں کرتا جو اس سے ایک آدم آگے سوچتے ہوں۔“

”شاید!“ صادق نے دل گرفتگی سے کہا۔ پھر وہ سوار ہو گیا اور شاہراہ پر صبح کے ستارے کی روشنی میں اس کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز گونجتی رہی۔

حسین نے لکھا تھا:

”پدر محترم۔“

استاد محترم شب بیداری، فاقی کشی کے عالم میں کرتے ہیں۔ ہمیشہ جو کی روٹی سے روزہ افطار کرتے ہیں اور تین یا پانچ شبانہ روز کا روزہ رکھتے ہیں۔ نفس کو سخت سزائیں دیتے ہیں اور کڑی ریاضتیں کرتے ہیں۔ نہ دیار سے ٹیک لگاتے ہیں نہ پاؤں پھیلاتے ہیں اور نہ کبھی کسی غیر کے سوال کا جواب دیتے ہیں۔ میں ان کے رسائل کا مطالعہ اکثر کرتا ہوں، کیونکہ ان کی عدم موجودگی میں جب مجھے اپنا درد خوب یاد ہو جاتا ہے تو میں کچھ کام کرنے کی جگہ انہیں دیکھتا ہوں۔ عجیب باتیں ان میں لکھی ہیں جو ابھی تو میرے فہم و ادراک سے بالا ہیں مگر شاید سمجھ آنے لگیں۔ دعا کیجئے میں استاد محترم کی خدمت کر سکوں اور مدرسے کے لئے باعث فخر بنوں۔

استاد کبھی کبھار مجھے اتنی گہری نظر سے دیکھتے ہیں کہ میں گھبرا جاتا ہوں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں ان کا مطلب کیا ہوگا۔ ان کی گہری سوچتی ہوئی میرے اندر تک دیکھتی ہوئی لگا ہیں؟“

منصور حسین کا خط لئے بیٹھا رہا، تتر میں کم عمر اور سیمابی طبیعت رکھنے والا اس کا بیٹا کچھ خوش نہیں تھا۔ کیا مجوسی خون بغاوت پر آمادہ تھا؟ کیا تطہیر کا عمل ابھی مکمل نہیں ہوا تھا؟ خود اس نے محمی کی زندگی میں ہی اسلام قبول کر لیا تھا۔ سیدھا اور سادہ اور مجاہد کا مذہب جس میں کبھی کسی آسے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اس نے حسین کے پیدا ہونے سے بہت پہلے کلمہ حق پڑھ لیا تھا۔ پھر وہ سوچا کرتا کہ اس کا بیٹا بڑا ہو کر دین محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کرے۔ وہ خود اس محبت سے سرشار و سیراب تھا۔ اسے کتنی تمنا تھی کہ روضہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے لئے جائے اور پھر وہیں رہ جائے۔ اس در کے گداؤں میں ہوا اس شہر خوبی کی گلیوں میں ناصیہ فرسائی کرے ان فضاؤں میں سانس لئے ان ہواؤں کو اپنے جسم سے مس ہوتا محسوس کرے جنہوں نے کبھی اس مولائے کل کے قدموں کو چھوا تھا۔ اس خاک کو آنکھوں میں لگائے۔ اس آسمان کو دیکھے جس کی طرف کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا نے دیکھا ہوگا۔ وہ مہک سے بھری گلیاں، وہ مکان، وہ مکن، کاش وہ جاسکتا، مگر سب کچھ اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے۔ آدمی کے اپنے اختیار میں کچھ بھی نہیں، مگر جسے خدا چاہتا ہے دیتا ہے۔

دعا سے کوئی گتھی سلجھ سکتی ہے؟

ہاں دعاؤں کو شرف قبولیت بخشنے والا اگر چاہے تو

اور وہ کیا چاہتا ہے، یہ کون جان سکتا ہے؟

سہل بن عبد اللہ تسری کا مرتبہ اس کے خیال و خواب سے کہیں بلند تھا۔ وہ زاہد طریقت تھے۔ بے ریا اور بے عیب جو کچھ وہ پا چکے تھے۔ اس کا چرچا نہیں کرتے تھے اس لئے کم گو تھے بلکہ بولتے ہی نہیں تھے۔ دروس میں بھی شریک ہوتے اور رواں رہنے

والے شاگردوں کو سر کے اشارے سے صحیح اور غلط بتا دیتے، مگر وارفتگی دیوانگی اور کم رہنے کی جگہ بیدار اور ہوشیار تھے۔ وہ ہوشیاری کی کوئی منزل پر تھے۔ کہاں سے گزرے تھے، اسے کیا معلوم تھا۔ وہ کم علم بے مایا تہی دست انسان تھے جسے اپنے شوق بے اختیار کے سوا کسی کا پتہ نہ تھا۔ اسے کبھی کبھار سینے کے اندر دل گھٹا ہوا محسوس ہوتا۔ اس کا جی چاہتا اس کے پر ہوتے، وہ ایک پرندہ ہوتا جو طویل مسافتیں اور لمبی اڑانیں کر سکتا۔ پھر وہ خاک پاک مدینہ دیکھ سکتا مگر وہ تو ایک ادنیٰ دنیا دار تھا۔ ریشم بنتا اور خواب دیکھتا ہوا۔ اس کی تو خواب میں بھی کبھی وہ آرزو پوری نہ ہوئی تھی۔ وہ بری طرح دنیا سے بندھا ہوا تھا جس کی روح پا بہ زنجیری قیدی کی طرح بس مقید تھی۔ کیا ہل اس کی رہنمائی کریں گے؟ کیا وہ اسے اپنے حلقہ ارادت میں قبول کر لیں گے؟ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سرائے اور ریشم کے کاروبار کو اونے پونے بیچ کر تستر چلا جائے۔ اس نے اپنے جی سے یہ بات طے کر لی۔

اس نے اپن طور پر تو یہ سوچ لیا تھا مگر حسین کا معاملہ ابھی اسی طرح تھا۔ خط سے یہ ظاہر ہاتا تھا کہ وہ زیادہ دن وہاں نہیں رہے گا۔ وہ جہاں بھی پڑھنے کے لئے گیا جس مدرسے میں بھی رہا، کسی نہ کسی طور اسے اطمینان نہیں ہوا۔ اگر وہ تستر چلا بھی جائے اور وہاں رہائش پذیر ہو پھر بھی حسین کو روک کر رکھنے میں تو وہ کامیاب نہیں ہوگا۔ وہ عجیب بے چین روح تھا۔ ہل جو کڑی ریاضتیں کرتے تھے اسے ان سے کیوں خوف آتا تھا۔ ہاں وہ خوفزدہ ہی تھا ورنہ ایک سال کے عرصے میں اس خط کا کیا مطلب۔ منصور کو اپنے بیٹے کو سمجھنے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔ انسان ایک دوسرے کو سمجھ نہیں سکتے، وہ کیا کرے؟ وہ جو سوچا کرتا تھا مگر اس کی سوچ سے کیا بنتا ہے اللہ چاہے گا۔ اس نے خط اٹھا کر پاس ہی پڑے چھوٹے صندوق میں رکھ دیا جس میں وہ نقدی رکھا کرتا تھا اور کتاب کو وہیں سے کھولا جہاں صادق کے آنے سے پہلے اس نے پڑھنا شروع کیا تھا۔

”اگر تمہارے پاس کوئی ہوا میں اڑتا ہوا آئے اور وہ شریعت پر عمل پیرا نہ ہو تو اس پر اعتبار نہ کرو۔“

اس نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ تحصیل علم دینی میں گزارا تھا۔ وہ باطن میں اترنے اور اسلاف سے سند پانے کو کسی قول کی صحت سمجھتا تھا۔ ہر وہ کام جو اسلاف نے کیا ہوا اور جس طور سے انجام دیا ہو۔ منصور کے لئے اس کا اتباع ضروری ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی عقل سے زیادہ اس رحمت کی تلاش میں رہتا تھا جو مدام خدائے تعالیٰ اپنے بندوں پر کرتا ہے جبکہ وہ خاص نہیں تھا۔ اسے سیر اسماء کا شوق تھا۔ گو اس کے مرشد نے اسے ان سارے بظاہر روشن اور دل فریب راستوں سے منع کیا تھا مگر اسے حیرت کے ساتھ ساتھ ایک لگن تھی کہ وہ ان راہوں سے گزرے، خود بھی وہ تجربات کرے۔ اسے اپنی کم مائیگی کا احساس تھا۔ وہ خلاف شرع کوئی کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ سیر اسماء خلاف شرع ہے؟ اگر تخت بلقیس کا حضرت سلیمان کے دربار میں لایا جانا ممکن تھا تو اور کیا بات ناممکن تھی۔ وہ اساطیر الاولین پر

سارے یقین کے باوجود کبھی سخت متذبذب ہوتا۔ اس کے مرشد ذکر اور مرقع پہننے کو اہم سمجھتے تھے مگر وہ باپ کی زندگی تک مرقع پہننے کی جرات نہیں کر سکا۔ محمی کے بعد زندگی کے کاموں نے اسے الجھائے رکھا۔ کیا ہی اچھا ہوا اگر روز روز کے فتنوں سے بچنے کی خاطر وہ اپنے مرشد کے زاویے میں ذکر کی محفلوں کا حصہ بن جائے۔ ہر شے سے بے نیاز اور بے پروا خود حسین بھی آزاد ہو جائے۔ اس کے لئے فکر مند نہ ہو۔ اسے وہی کرنے دے جو وہ چاہتا تھا۔ زندگی اور اس کے علائق جو ان چیزوں کی صورت میں اس کے گرد پھیلے تھے وہ ان سے تو قطع تعلق کر سکتا تھا مگر حسین؟

کیا تستر میں اس کے قریب رہنے سے وہ اپنے بیٹے پر کوئی فیصلہ مسلط کر سکتا ہے؟ خون میں صاعل کی ہوئی امانتوں سے کہیں بھی فرار نہیں۔ اب اسے محمی اکثر یاد آتا۔ سرائے میں اس کا اکیلا رہ جانا اور کاروبار حیات میں عدم دلچسپی کے باوجود چلتے جانا۔ آدمی جب تک زندہ ہے اسے اپنا سفر جاری رکھنا ہوتا ہے۔ یہ مجبوری ہے اور اس کی تقدیر کہہ لیجئے یا خدا کی مرضی۔ منصور نے معتزلہ مختلف فرقوں اور عقائد کا مطالعہ کیا تھا۔ خلفاء کی مجلسوں میں بے تک ان کو بار بار ہاتھ اور وہ خود سمجھتا تھا کہ جو کچھ وہ مباحث کی مجلسوں میں ثابت کر سکتے تھے اس سے کوئی خاص فرق عام زندگی پر نہیں پڑتا تھا۔ زندگی اپنی مجبوریوں مقہوریوں کے ساتھ رواں رہتی تھی اور فلسفے کی تاویلات کے باوصف ختم ہوتی تھی۔ کئی زندگیاں چراغ کی وی طرح گھٹی بڑھتی اور کئی بھڑک کر بجھ جاتی تھیں۔ ایک نسل پیچھلی نسل سے عقائد اور فلسفے خیالات اور مسائل ورثے میں لے کر اس پر اپنی طرف سے اضافے کر کے اپنے سے اگلی نسل کو دیتی تھی۔

اس نے حسین کو ایک بہتر صورت حال دی تھی۔ بت پرست سے آتش پرست اور پھر خدا پرست۔ فاصلہ زیادہ تو نہیں تھا اس لئے کہ بہر حال خدا پتھروں کو پیدا کرنے والا تھا، آتش کو بنانے والا تھا۔ وہ تو خود ہی تھا۔ اس نے ابلیس کو پیدا کیا تھا۔ مجرم مغرور سزا یافتہ آسمانوں کی بادشاہت سے نکلا ہوا راندہ درگاہ۔ پتہ نہیں اس بادشاہت میں اپنی بے بضاعتی کو سمجھتے ہوئے وہ کس شے پر نازاں ہوا تھا۔ کیوں نازاں ہوا تھا۔ اس یہ حوصلہ کس نے عطا کیا تھا؟

گہرے عقیق رنگ سحاب شام چاروں طرف سے بستی اور باغوں پر جھکے ہوئے تھے اور آسمان ایک الاؤ کی روشنی سے لپکتی آگ اور بھڑکتے شعلوں سے پرتور کی طرح تھا۔ جب عربی ناقہ پر سوار کوئی اونچے دروازے میں ذرا سا جھک کر اندر آیا۔

”میں ہندی سوداگر ہوں اور یہاں کی شہرت سن کر دور سے آیا ہوں۔ کیا عمدہ ریشم دستیاب ہو سکتا ہے؟“

منصور یونہی خالی الذہن اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جیسے بھول گیا ہو کہ وہ کپڑا بننے والا بھی ہے اور اس کی شہرت بہر حال لوگ سن

چکے ہیں۔

”خوش آمدید خوش آمدید۔“ منصور نے جھک کر کہا۔ ناقہ نے پہلے اپنے اگلے پاؤں موڑے اور تھوڑا سا جھکی پھر پشت کو جھکایا۔ اگلے پاؤں کو تھوڑا اور موڑا اور پھٹی اور پھٹی کوزمین کے ساتھ لگا دیا۔ ہندی سوداگر کو دکر نیچے اترا۔ منصور کے ساتھ اندرونی کمرے کی طرف آ گیا۔

”آپ کا ورود مسعود کہاں سے ہوا ہے؟“ منصور نے قالین پر نکلنے کے سہارے بٹھا کر آنے والے سے پوچھا۔

”میں بغداد سے آ رہا ہوں۔؟“ اس نے ٹوپی اتاری تو لمبی چوٹی پیچھے لباس پر جا پڑی جسے اس نے ہاتھ سے سنوار کر برابر کیا۔ اس کا گھٹنا ہوا سر پینے سے بھیگا ہوا تھا اور ٹوپی بھی گیلی تھی۔ لگتا تھا وہ منزلیں مارتا ہوا آیا ہے اور تھکا ہوا ہے۔

”آب دز کے ساتھ پل سے اتر کر جو بستی ہے وہاں سے آپ نے کام تقریباً ختم کر دیا ہے کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”تقریباً۔“ منصور نے تھوڑی دیر چپ رہ کر پھر کہا۔ ”آدمی بیک وقت دو جگہ تو نہیں رہ سکتا نا۔ پدر محترم کے بعد یہاں مجھے زیادہ کام رہتا ہے۔“

”میں نے تو سنا ہے آدمی بیک وقت کئی جگہ رہ سکتا ہے۔“ اس نے ہنس کر کہا۔ ”آپ کے ہاں بھی ایسی روایتیں اور کہانیاں ہیں۔ بزرگوں کی کرامات اور ہمارے ہاں تو بہت کچھ ہے۔ عام زندگی میں اس پر عمل ہوتے دیکھا تو نہیں مگر پر اسرار باتیں اور ناممکن العمل کام بہر حال ہوتے ہیں۔ دنیا ایسے واقعات سے بھر پڑی ہے۔ ابھی میں بغداد سے آیا ہوں۔ وہاں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا جو کسی طرح کم نہیں ہوتا۔“ وہ چپ ہو گیا۔

”کیا ہوا تھا؟“ منصور نے پوچھا۔

”دجلہ کا پانی تین دن تک اتنا زرد تھا جیسے کوہستان اس میں گھل کر بہہ رہے ہوں۔ اتنا گہرا تھا اور یہ دیکھنے اس نے اپنے چغے کے دامن کو لہراتے ہوئے کہا۔ ”میں کشتی میں نیچے کی طرف جا رہا تھا کہ یہ حصہ پانی سے بھیگ گیا۔ دھونے کے باوجود یہ رنگ چھٹتا نہیں۔“

بہت مضطرب ہو کر منصور نے پوچھا۔ ”لوگ کیا کہہ رہے تھے؟“

”اس لئے کہ خلیفۃ المسلمین متوکل نے معتزلہ کو دربار سے نکال دیا ہے اور ان پر ظلم و ستم روا رکھا۔“

”معتزلہ نے آج تک جو کچھ کیا ہے دربار پر جس طرح قابض رہے ہیں اپنے عقائد سے انہوں نے جس طرح اسلام میں رخنہ اندازی کی ہے اس کا کوئی جواب نہیں۔“ منصور نے اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

”ایک گروہ اپنے نفع کی وجہ سے دوسرے کو شکست دیتا ہے اس میں شاید دربار کی سیاست ہی ہو۔“ ہندی نے پھر کہا۔

”نہیں یوں نہیں۔ اگر خلیفہ متوکل علی اللہ نے ان کو جلاوطن کیا ہے اور بغداد سے نکل جانے کا حکم دیا ہے ان کی املاک ضبط کی ہیں تو پھر بات سیاست سے کچھ آگے ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ عقائد میں جو تبدیلی ایک صدی میں آئی ہے اس کو بدل دیں اور شاید ایسا کرنا ناممکن ہو۔“ منصور نے بڑی مایوسی سے کہا۔

”ایک دم تبدیلی یکسر ناممکن ہے۔“ اس نے ہندی کو خاموش پا کر کہا۔

”آخر کیوں؟“ ہندی نے پوچھا۔

”اس لئے کہ جو دربار آج تک علماء اور امرا تک ان کے زیر اثر تھا اس میں ان کا اثر نفوذ اس حد تک ہو گا کہ ایک دم ختم نہ ہو سکے۔ تم کسی چھوٹے پودے کو تو جڑوں سمیت اکھاڑ سکتے ہو مگر درخت کو نہیں۔“

”یہ تو ہے آپ نے ٹھیک فرمایا۔“ منصور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”میں آپ کے لئے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کروں۔“

”روٹی اور دودھ آپ کو پسند ہے؟“

”بیشک، بیشک۔“ اس نے اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ”میں پہلے منہ ہاتھ دھونا چاہوں گا۔ اگر ہنیز بھی میسر آ سکے

تو.....“

منصور جاتے ہوئے سوچتا جا رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے خواجہ حسن بھری کی مجلس علمی تھی اور واصل بن عطاء نے اس میں سے اعتزال کیا تھا۔ وہ چند مسائل کے الجھاؤ کی وجہ سے ان سے الگ ہوئے تھے۔

”گناہ کبیرہ کیا ہے؟“

پھر اس ایک سوال نے اور بہت سے سوال پیدا کئے۔ یونانی فلسفہ دین اور فلسفہ کی آویزش کلام پاک کے مزاج کے مطابق اس کو بنانے کی سعی، جہنم و جنت، قدر و جب اور اتنے بہت سے الجھاؤ سے جو علماء کی مجلسوں میں بحث و مباحث کے دوران پیدا ہوتے تھے۔ مرتکب گناہ کبیرہ کے لئے درمیانی منزل کا مسلک معتزلہ میں سب سے زیادہ اہم اور بنیادی مسلک تھا۔ یہی وہ بنیاد تھی جس پر یہ جماعت قائم رہی۔

پھر یہودیوں اور نصرانیوں سے معتزلہ نے اکتساب فیض کیا۔ نسطوری عیسائی جن کے سینوں میں مسلمانوں کے خلاف آتش سوزاں تھی۔ معبد الجہنمی اور اس کا استاد یحییٰ دمشقی جو قدر کی نفرت کرتا اور حریت ارادہ کا داعی تھا۔ اس کا بیٹا ابو فرہ جو خلیفہ مامون الرشید کے حضور مجاہدات دینی برپا کرتے تھے۔ آخر معبد الجہنمی کو حجاج نے عذاب دے کر سولی پر چڑھا دیا۔ پھر غیلانی دمشقی کے ہاتھ پاؤں قطع

کئے گئے یا اسے زندہ دار پر چڑھا دیا گیا۔ حریت ارادہ انسان ان کا سب سے بڑا دعویٰ تھا جس کا یہ سب پر چار کرتے تھے۔ امویوں کے زمانے میں یہ بیدردی اور شقاوت سے قتل کر دیئے جاتے تھے۔ اس لئے اس پر پختہ اعتقاد رکھنے کے باوجود یہ اس کا اعلان کم از کم کرتے تھے۔

دربار بغداد میں خلفاء کے مزاج میں معتزلہ بہت پہلے دخیل ہو چکے تھے۔ منصور جب آل علی کی بجائے خلیفہ ہوا اور ابو مسلم خراسانی کی ساری کوششوں کا نتیجہ خلافت کے بنو عباس میں منتقل ہو جانے کی شکل میں نکلا۔ آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ظلم و ستم کا باب کھلا۔ وہ جو اہل علم تھے اور اہل فضل تھے۔ عافیت کی خاطر نظروں سے پوشیدہ ہوئے۔ پھر کمتر لوگوں نے دربار خلافت تک رسائی حاصل کی۔ وہ برتر تونہ تھے مگر ان کی مدد فلسفہ یونان نے اور یوں دین اور فلسفہ مل کر ایک نیا طرز خیال ترتیب دیا جانے لگا۔ آزادی خیالی، حریت خیال بجائے خود قابل نفیر نہیں تھی مگر اس کے نتائج لرزہ خیز تھے۔ ان کے لئے بھی جو اس میں یقین رکھتے تھے اور ان کے لئے بھی جو اس پر عمل کرتے تھے۔

علماء اور فقہاء کا ایک بڑا طبقہ گوشہ نشین ہونے کے باوجود خیالات پر کھلی تیار اختیار رکھتا تھا۔ ہندی تاجر کی نظر بہت گہری اور اس کا تجربہ وسیع تھا۔ ریشم کو دیکھتے ہوئے اس نے ریشم کے کیڑوں، ان کی خوراک، موسموں اور شدتوں، برف اور بارشوں اور خود پانی کی گرمی اور نیم سرد ہونے کے درجات تک پر اپنے مکمل علم اور معلومات سے منصور کو بہت مرعوب کیا۔ اس نے جو حاضر اور تیار مال تھا، سب کا سب خرید لیا۔ قافلہ دشوار گزار پہاڑی راستوں سے جو ہندوستان سے قریب تر تھے اس کا سامان لے کر روانہ ہونے والا تھا۔ وہ کم عمر اور دلیر تھا اور آزاد خیال تھا مگر جتنے دنوں وہ سرائے میں ٹھہرا، اپنے سامان میں سے ایک بت نکالا اور اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر دعا کرتا اور پھر اسے سامان میں رکھ دیتا۔

منصور نے اس کے باوجود کہ کسی کے عقائد میں دخل اندازی پسند نہیں کرتا تھا سوچا کرتا کہ یہ اچھی بات ہے کہ اپنے خداؤں کو یہ لوگ یوں ہمراہ رکھتے ہیں۔ یہ ان کے تابع ہوتے ہیں کہ جب جی چاہا ان کو نکالا جھاڑ پونچے کر سامنے سجالیا۔ دعا کی ہاتھ جوڑے، مراقبہ کی سی کیفیت میں رہے۔ پھر اپنی زندگی کو وہیں سے جوڑ لیاں جہاں سے چلی تھی۔ ان کے نزدیک مذہب عام زندگی میں روز مرہ کے لئے کام آسکے بس اسی قدر کافی ہوتا ہے۔

”ہمارے ہاں مظاہر قدرت اتنے بہت ہوتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کی الگ الگ پوجا کرتے ہیں۔“ ہندی نے جس کا نام کرشن تھا، کہا: ”ہم ہوا کی دیوی کی پانی اور بارش کے دیوتا کی پرستش کرتے ہیں اور انہیں خوش رکھنے کے لئے ان کی پوجا کرتے رہتے

ہیں۔“

”پھر یہ بدھمت کیا ہے جس کا چرچا چین اور جاپان تک ہے؟“ منصور نے پوچھا۔

”وہ ایک الگ خیال ہے، شکتی پانے کا الگ طریقہ۔ رحم اور امن سے رہنے کا سلیقہ۔“ کرشن نے کہا۔

”تمہارے ہاں سب سے دلاویز کوئی چیز ہے؟“ منصور نے پوچھا۔

”ہمارے موسم اور ہماری عورتیں۔ موسم شدید اور دلاویز ہوتے ہیں۔ پاگل کر دینے والے دلفریب راتیں۔ سیاہ اور ستاروں بھری اور ہماری عورتیں بھی شدید چاہت سے لبریز دل رکھتی ہیں۔ پتی ورتا شوہر کے ساتھ جل مرنے والی ایسی عورتیں سارے جہان میں کہیں نہیں ہیں۔“

جب قافہ جانے کے لئے تیار ہوا اونٹوں پر سامان بار کیا جا چکا۔ سالار کارواں نے سب سے اگلی ناقہ کی مہار پکڑ لی تو منصور نے ہندی کو دعا دیتے ہوئے کہا۔

”خدا کرے تمہاری بیوی کو جلنا نہ پڑے وہ اس افیت سے کبھی نہ گزرے۔“

ہندی نے لپٹ کر منصور سے رخصت لی اور نیم شب کو زردی مائل نیلا ہٹ میں جب آخری راتوں کا چاند ہولے ہولے افق پر طلوع ہو رہا تھا وہ آب دژ کے ساتھ ساتھ جنوب کی طرف چل دیا۔۔ دیر تک شاہراہ سے پرے اس کے اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی مٹنا ہٹیں سنائی دیتی رہیں جیسے زندگی گزرنے کے بعد بھی آدمی ماضی میں دور تک گمشدہ آوازوں کو سنا کرتا ہے۔

تستر اتیک کی وسیع سرزمین کے ایک سرے پر ہے۔ پر رونق اوشاداب نفیس اور اعلیٰ درجہ کے باغوں سے گھرا ہوا منہر الارزق کا پانی گرمیوں میں نہایت ٹھنڈا اور شفاف اور گہرائی کی وجہ سے پر لطف مسافروں کے داخلے کے لئے اس پر کشتیوں کا پل ہے۔ منصور نے پل کو عبور کیا ہے تو رات ہو چکی تھی۔ دودن کی طویل مسافت کے بعد وہ اپنی حالت درست کر کے اپنے حواس مجتمع کر کے مکتب میں جانا چاہتا تھا۔ گرد سفر کو جھٹک کر اپنے آپ کو بیٹے کی ملاقات کے لئے تیار کر کے زاویہ جس میں وہ ٹھہرنا چاہتا تھا شہر کے وسط میں لا جواب بازاروں اور جاری پانی کے ستونوں اور نہایت عمدگی سے بنی مسجدوں کے عین مرکز میں تھا۔ رہٹوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ پانی پر سفید جھاگ ستاروں کی روشنی میں چاندی کے زیوروں کی طرح سطح آب پر رواں تھا۔

اس زاویے پر درویش اور مسافر سب کو نہایت عمدہ کھانا دیا گیا۔ نماز کے بعد جن لوگوں کو کوڈ کر کا شوق تھا وہ پاس کی مسجد میں چلے گئے۔ ہوا اس قدر پرسکون تھی کہ نیند آنے لگی اور تسبیح ہاتھ میل ہے ہوئے منصور کو بھی چھپکی آ گئی۔ اس نے دیکھا کہ قیامت قائم ہے اور

لوگ جمع ہیں، سب چپ ہیں، ہر طرف خاموشی ہے سانس تک چلنے کی آواز نہیں آتی۔ پھر کچھ لوگوں کو پابجولاں لایا جا رہا ہے۔ وہ منہ چھپائے ہیں سر برہنہ ہیں اور ان کے گرد اڑدھام ہے جو لحظہ بہ لحظہ بڑھتا جا رہا ہے۔ پھر ایک تیز اور ہر شے پر چھا جانے والی صدا ہے جو سنتا ہے بے ہوش کر رہا ہے۔ کسی کو ہوش نہیں رہتا۔ جن کے چہرے پوشیدہ تھے وہ کھل جاتے ہیں اور ایک چہرہ حسین کا ہے۔ منصور نہایت مضطرب ہو کر آگے بڑھنا چاہتا ہے مگر وہ چہرہ اس سے چھپا لیا جاتا ہے اور وہ حیران کھڑا ہے۔ پھر ایک جھٹکے سے وہ بیدار ہو گیا۔ اسے یہ نظارہ کیوں کروایا گیا تھا۔ حسین کیوں اس حالت میں تھا؟ منصور کا دل بہت ہی پریشان ہوا۔ باقی رات اس نے بیٹے کے لئے دعائیں کرتے اور خود مرشد میں مناجاتیں کرتے گزاری۔

جب وہ پہاڑی کے اوپر سیدھیاں طے کر کے پہنچا ہے تو حسین کو اپنا منتظر پایا۔ وہ اسے خانقاہ کے دروازے پر مل گیا۔ پدرمحترم آپ اگر شام ہی تشریف لے آتے تو یہاں ہماری اقامت گاہ میں بھی مسافروں کے لئے خاطر خواہ انتظام ہے۔ منصور نے کوئی جواب دیئے بنا اسے گلے سے لگا لیا، دھڑکتے دل کے ساتھ۔ حسُن نے اتنے دنوں میں خوب قد کیا تھا۔ وہ اس سے نکلتے ہوئے کندھے اور سر سے بلند تھا مگر نہایت دبلا، تقریباً غر جسم۔ منصور کو یاد آیا تستر میں تربیت دینی کے ساتھ تربیت نفس پر ساری توجہ صرف کی جاتی تھی۔ برگزیدہ بندوں اور زاہدوں کے سے اطوار پر خصوصی توجہ صرف ہوتی تھی تا کہ نفس جاگتا رہے۔ ریاضتوں اور شب بیداری سے اس کی سرکشی دور ہو۔

حسین نے کہا ”شیخ مدر سے میں تشریف رکھتے ہیں آپ ان سے ملنا چاہیں گے نا؟ مگر آپ ان سے میرے خط کا ذکر نہیں کریں گے۔ میں نے جو دیکھا تھا وہ آپ کو لکھ دیا۔ میں ان کا اتباع کرنے کے لاء اپنے آپ کو نہیں پاتا اور منافقت میری فطرت میں نہیں۔“ وہ بنار کے بول رہا تھا جیسے مدتوں بعد اس پر بولنے کا دورہ پڑا ہو وہ اداس ہو اور اپنے جی کی بات کسی سے کہنا چاہتا ہو۔ ”جان پدر میرے نہ کہنے کے باوجود سہل جو شیخ کامل ہیں، میرے دل کا حال جانتے ہیں اور تمہاری حالت بھی ان سے پوشیدہ نہیں ہوگی۔“

”خیر“ حسین نے اپنا سر جھٹک کر کہا۔ ”آپ ان سے ذکر نہ کریں۔ اگر وہ از خود استفسار کریں تو مجبوری ہے۔“

”تم ایسا سوچتے کیوں ہو ایسا کرتے کیوں ہو؟“ منصور نے نہایت نرمی سے پوچھا۔

”میں قدم قدم نہیں چل سکتا اس میں ایک عمر صرف ہو جاتی ہے۔ میرے پاس اتنا وقت کہاں ہے؟ اگر آپ میری بات پر ہمدردی سے غور کریں گے تو سب باپ آپ پر واضح ہو جائے گی۔“

منصور کو صادق کی بات یاد آئی کہ ”تمہارا بیٹا غیر معمولی ہے۔“ وہ اب متذبذب کھڑا تھا۔ کیا وہ در پر سے لوٹ جائے اور شیخ کو ملے بنا چلا جائے؟

خانقاہ کے دروازے پر کسی نے اسے پکارا۔ ”ابو حسین! آپ کو شیخ یاد فرماتے ہیں۔“ منصور حیران ہوا جیسے اہل عبد اللہ آئینوں کے آ رہا دیکھ رہے ہوں۔ وہ آئینہ خانے کے باہر کھڑا ہوا یا شیخ خود آئینہ ہوں۔ انہیں سب دکھائی دے رہا ہو، ظاہر و باطن۔ وہ معمولی آدمی تھا اور اسے ان کی اس دسترس کامل سے بہت خوف محسوس ہوا۔ اسے لگا وجود تحلیل ہو رہا ہے، خیالات اور دل کوئی شے بھی اس کے اپنے اختیار میں نہ ہو۔

منصور سر جھکا کر اس پیغام لانے والے عقب میں شیخ کامل کی نگاہ دور بین کا سامنا کرنے کے لئے چلا۔ حسین کی طرف دیکھے بنا جیسے وہ بیٹھا ہے اسی لئے آیا ہو۔ یہی حاضری اس کی جان اور دل کی حاضری بہت ضروری ہو۔ طالب علموں کو رخصت کر کے جب شیخ اور منصور آئے سامنے بیٹھے تو اس کی نگاہ اس جمال کا سامنا نہ کر سکتی تھی۔ ان کے جلال سے وہ از حد مرعوب تھا اور آنکھ اٹھا کر دیکھنے بات کرنے کی جرات اس میں نہ تھی۔ وہ سر جھکائے رہا۔ نہایت ملائمت سے اسے مخاطب کر کے انہوں نے کہا۔

”دعائیں مقدر بدل سکتی ہیں اور جب شفاعت ان کے ہاتھ میں ہو جو وجہ وجود کائنات ہیں۔ تم ہر گز پریشان نہ ہو۔ حسین خود سرتو ضرور ہے مگر بالآخر“ اور وہ بات ادھوری چھوڑ کر چپ ہو گئے۔ منصور کا دل بری طرح دھڑکا۔ آنے والے وقت سے، مقدر سے اور قبولیت دعا کے احساس سے ایک شعلہ سا اس کی جان کو چا پ گیا جیسے وہ قبل از وقت ان سب باتوں کا مشاہدہ کر رہا ہو۔

اس نے دوزانوں ہو کر شیخ کے سامنے کی زمین کو بوسہ دیا اور کہا ”خواب کی ہر بات اگر حرف بہ حرف پوری ہوگی تو.....“ وہ بھی آدھی بات کہہ کر چپ ہو گیا۔

”حسین کی رفتار بہت تیز ہے، وہ ضرورت سے زیادہ مضطرب ہے۔ اس کے اشواق شدید ہیں اور اس کے مقاصد جلیل، مگر وقت سے کون لڑ سکتا ہے؟ اسے چاہئے شرع کی حدود میں رہ کر ہر بات سوچے۔ مسلمان شرع پر ہے تو مسلمان ہے ورنہ پر شور آدمی کے لئے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔“

منصور نے سر جھکا لیا۔

”تم تستر میں نہیں رہ سکو گے اس لئے کہ تمہارا پیشہ اس کی اجازت نہیں دیتا اور حسین کے لئے احکام دوسری جگہوں کے ہیں۔“ شیخ

کی آواز نہایت صاف مگر مدہم تھی۔

”علائق دنیوی سے جان بچانا مشکل ہے۔“ شیخ نے پھر کہا۔ ”جو ہے جہاں ہے اس پر قانع رہو۔“ تسبیح کے دانے پر گردش کر رہے تھے اور ان کی انگلیوں سے بارش کے قطروں کی طرح پھسل رہے تھے۔ پتہ نہیں اب ان کے آئینے میں کیا منعکس ہو رہا تھا۔ اس کے خیال اور اس کے وسوسوں کی موہوم پر چھائیں۔ اس کے خواب میں دیکھی ہوئی قیامت اور باجولاں منہ چھپائے ننگے سر لائے جانے والے لوگ۔

چوڑی سیرھیاں اتر کر جب وہ آخری زینے پر پہنچا تو حسین نے کہا۔

”پدر محترم کیا آپ خوفزدہ ہو کر چلے آئے۔ آپ نے شیخ کامل سے کچھ پوچھا انہوں نے کچھ بتایا؟“

”کیا آپ نے دیکھا ہے کہ شیخ کی حفاظت ایک ماریاہ کرتا ہے۔“

منصر نے نہایت بے یقینی سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”اچھا تو وہ ماریاہ آپ سے پوشیدہ رہا؟“ پھر نہایت فکر مندی سے اس نے کہا۔

”شیخ کو ایسے پاسبانوں کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جانے کیا دکھانا چاہتے ہیں؟“

”سوال نہیں کرتے یہ اصول خانقاہی کے خلاف ہے۔“ منصور نے اسے روکتے ہوئے کہا۔

”میں آزادی کا قائل ہوں اور کسی اصول کی پابندی سوائے شروع کے ضروری نہیں ہے۔“ وہ ذرا جوش میں تھا۔

منصور نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”جان پدر ہر آزادی کی ایک پابندی ہے۔ خود یہ روایت طرح کی پابندی ہے۔ کبھی

تم نے سوچا ہے؟“

”آہستہ روی کا یہ راستہ میرے لئے نہیں۔“ حسین نے دل برداشتگی سے جواب دیا۔ ”اور شیخ اس بات کو جانتے ہیں۔“

”جانتے ہوں گے مگر انہوں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ میں چاہتا تھا کہ کاروبار ختم کر کے تمہارے قریب تستر میں آ رہوں

مگر.....“ وہ چپ ہو گیا۔

”تستر ساری دنیا نہیں ہے اور آپ میرے پیچھے کب تک سرگرداں ہوں گے؟“

”تو حسن کو یہاں قرا نہیں ہوگا۔“ منصور سوچتا ہوا حسین کی اقامت گاہ کی طرف گیا۔

”پدر محترم میں نہایت ہی عاجزی سے اپنی کم مائیگی کا اقرار تو کر سکتا ہوں۔ اپنے ذرہ ناچیز ہونے کا فنا کی زد میں ہونے کا، مگر میرا

دل سیاحت عالم میں پڑا ہے اور شیخ تو سیر اسماء تک سے منع فرماتے ہیں۔ مجھے ان کے حکم سے سرتابی کی تو مجال نہیں۔ یہاں رہ کر میں یہ سب نہیں کر سکتا۔“ منصور اپنے بیٹے کی بات سمجھتا تھا اور اس کی بے چینی کا بھی اسے کچھ اندازہ تھا۔

”آقصائے عالم میں ہواؤں کی طرح آزاد گھومنے کو میرا جی چاہتا ہے۔ ہواؤں پر حکمرانی کرنے کو بادلوں پر سوار ہونے کو۔ میں آپ کو کیا بتاؤں میں کیا کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ کبھی سوچتا ہوں میرے بازو پھیلیں تو مشرق اور مغرب کو چھو لیں۔ برقانی چوٹیاں میرے قدموں میں ہوں۔ کوہسار میرے زیر نگین ہوں۔ عرش کی نیلاہٹ ستاروں کی جگہ گاہٹ کو چھو کر دیکھوں۔ دنیا میرے قدموں تلے سمٹ جائے۔ فاصلے ایک نکتے کی طرح ہوں۔“

منصور سحر زدہ سا بیٹے کی باتیں سنتا رہا جو اگر کوئی اور سنے جو اسے سمجھتا نہ ہو تو جانے کیا کہے۔

”یہ سب انسان کی پہنچ سے باہر ہے۔“ منصور نے کہا۔ ”اور ایسے دیوانے خواب نہ دیکھا کرو۔ ناممکن الحصول خوابوں کے پیچھے مت گردش کرو۔ میں چاہتا ہوں کہ تعلیم مکمل کر کے تم بیضا کی بستی میں اقامت گزریں ہو جاؤں۔“

”اور دادا کی سرائے کے دروازے کھول کر مسافروں کی خوشنودی حاصل کروں؟“ حسین نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

اس کی توجہ ہٹانے کے لئے منصور نے کہا۔ ”ایک ہندی تاجر جو ریشم کا خریدار تھا سرائے میں آن ٹھہرا تھا۔ وہ نہایت عجیب و غریب رسم رواج کا ذکر کرتا تھا۔ کیا تم اس بات پر یقین کر سکتے ہو کہ عورتیں اگر ان کا شوہر مر جائے تو زندہ ہی اس کے ساتھ جلائی جاتی ہیں؟“

حسین کو جیسے ایک جھٹکا لگا۔ وہ ایک دم سیدھا بیٹھ گیا

”ایک زندہ سانس لیتی ہوئی تندرست زن ہوش مند؟“ اس نے بے یقینی سے پوچھا۔

”ہاں بالکل۔“

”راہ محبت میں یہ سب ممکن ہو سکتا ہوگا۔“ اس نے جیسے اپنے آپ سے نہایت آہستگی سے کہا۔

”یہ راہ محبت نہ بھی ہو تو بھی ان کے ہاں کا دستور زندگی ہے۔“ منصور نے جواب دیا۔

حسین بہت دیر سوچتا رہا سوچتا ہی رہا۔

”کیا اس ہندی سوداگر نے بتایا تھا کہ زنان سوختنی کو کیا پابجولاں اس آتش کی طرف لایا جاتا ہے؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”یہ تو زبردستی ہوگی وہ اپنی مرضی سے نہایت آزادی سے صبر و تحمل سے مرنے والے کے ساتھ جل جاتی ہے۔ ہے نا عجیب بات؟“

اور وہ کہتا تھا ہمارے موسم اور ہماری عورتیں شدید ہیں۔“

”کمال باشد۔“ حسین کے چہرے پر سے جیسے بادل ہٹ گئے۔ پھر وہ ہنسا اس نے کمال ادب سے منصور کے ہاتھ کو چھو کر کہا۔
”میں سیر عالم میں اب ہندوستان کو بھی شامل کئے لیتا ہوں۔“ اور اس نے گہری نگاہ سے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو عاشق زار باپ تھا اور اس سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ محبت آدمی کو کبھی کبھار ہمت اور ہوصلہ عطا کرتی ہے اور کبھی نہایت بزدل اور بہت بیچارہ بنا دیتی ہے۔

حسین نے بتایا ”نہایت سخت احکامات دربار خلافت سے معتزلہ کے خلاف گرد کرائے گئے ہیں اور ہر وہ شخص جس پر معتزلہ ہونے کا شک ہے اپنی جان چھپاتا پھرتا ہے۔ بیخ کنی کرنی اگر مقصود ہی ہے تو دربار سے شروع ہونی چاہئے۔ متوکل علی اللہ ایک عمدہ حاکم اور ایک سچا مسلمان ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

”نسطوری عیسائی اور یہودی اور مجوسی سب کسی نہ کسی طور معتزلہ کے ہمدرد ہیں۔“

”جان پدر تم کچھ اور نہ سوچو سوائے اس کے تمہیں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد بیضا میں مدرستہ قائم کرنا ہے۔ ان علاقوں میں بہت ضرورت ہے۔“

حسین نے سر جھکا لیا اور منصور نے سوچا شاید وہ اس کی بات پر غور کر رہا ہے۔ پھر وہ ریشم کے کاروبار کی اور ان کتابوں کی جو منصور کے زیر مطالعہ رہی تھیں اور بستی کے باقی لوگ کا ذکر کرتے رہے جو حسین کو کسی نہ کسی طور یاد کرتے تھے۔ اس کے ماموں کی بیٹیاں اب بڑی ہو گئی تھیں اور اسے پوچھتی تھیں۔ عام زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتیں۔ بیضا کے باغوں اور پھلوں اور دشت سوس کی آندھیوں کی بات کرتے کراتے دن ڈھل گیا۔ سائے لمبے ہو گئے۔ تستر کی کمال خوشگوار ہوا خوشبو سے پر پانی کی نمی پر سے آتے ہوئے اذانوں کے شکوہ سے رک رک کر ان کی طرف بہنے لگی۔

خليفة متوکل علی اللہ نے جب نماز جمعہ کی امامت کے لئے سوارنا ہونا چاہا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ چل نہیں سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے اور پسینہ ہر بن مو سے نکل رہا تھا جو اس کی جان کو گھلا رہا تھا۔ غلام متوحش کھڑے تھے اور حکم کے منتظر تھے۔ پہلی اذانیں کب کی ہو چکی تھیں۔ تب فتح بن خاقان اور عبید اللہ بن یحییٰ اس کے دونوں وزیروں نے کہا۔ ”اے امیر المومنین آپ کے اہل بیعت میں سے بہت سے لوگ جمع ہیں اور دادا کے طالب ہیں۔ امیر المومنین کو ضیق صدر اور حرارت کی شکایت ہے اس لئے حکم دیں کہ معتز باللہ ولی عہد نماز پڑھائیں اور اس یوم شریف سے شرف حاصل کریں۔“

معزز باللہ نماز کے بعد اس طرح کہ فتح بن خاقان اور عبید اللہ بن یحییٰ اس کے ساتھ دائیں اور بائیں اور سارا عالم اس کے سامنے تھا۔ متوکل کے پاس واپس آئے۔ دونوں نے معزز کی تعریف کی کہ ”نہ کوئی اس قدر اچھا تھا با اعتبار حاجت روائی کے اور فی البدیہہ تقریر کرنے میں بلند آواز شیریں بیان اور اچھی فصاحت کرنے والا۔“

متوکل خوش ہوا اور کہا۔ ”معزز باللہ اللہ تعالیٰ تمہیں خیر سنائے اور ہمیں تمہاری زندگی سے فائدہ مند کرے۔“

طیب بختیشوع نے معجون کو پہلے خود چکھا اور پھر خلیفہ کو حلوی شیشے کی طشتری میں جس میں سونے کا چمچ تھا نہایت نفاست سے پیش کیا۔ یہ ضیق صدر کا دوا تھا۔ متوکل نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا شہدرنگ طلیساں اور شہدرنگ عمامہ۔ ”خواب!“ اس نے جی ہی جی میں کہا۔ ابھی کچھ دن پہلے اس کے ایک حکم میں کہا گیا تھا کہ ذمی اور مسلمان اپنے لباس سے پہچانے جائیں ان کے گھروں پر بھی نشان ہوں۔ پھر اس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ شہدرنگ عماموں کی کثرت اسے گھیرے تھی۔

وہ دجلہ کے کنارے کھلنے والے درتپے میں بیٹھ کر نظارہ کرتا تو جوق در جوق لوگ شاہراہوں پر سے گزر رہے ہوتے۔ ذمی غلام خچروں پر اور اپنے لباسوں پر سینے اور پشت کی طرف شہدرنگ کپڑوں کے پوند لگائے تاکہ وہ نمایاں ہوں ذمی عورتیں شہدرنگ چادروں میں ملبوس ذمی جوانوں کے عمامے سے سوار یوں سے بلندی پر ڈوبتے سورج کی سرخی کو پکڑتے ہوئے اور چمکتے ہوئے ایک خلقت رواں دواں۔ لائے قدوں والے ممتاز ہاشمی سہمے ہوئے جھکے ہوئے جیسے اپنے آپ چھپانا چاہتے ہوں۔ عجمی دور دراز ملکوں سے آنے والے جو یہیں بس گئے تھے۔ یہودی جن کی وفاداریاں مشکوک تھیں، نسطوری بطریق جو اپنے مدرسوں کے لئے سامان خریدنے نکلتے تھے اور اقامت گاہوں میں رہنے والے طالب علموں کے اخراجات خود برداشت کرتے تھے۔ ترک جو دوستانہ اعانت کے لئے آئے تو دربار کے سیاہ و سفید کے مالک بن گئے۔ مغربی جو سر زمین اندلس کے فسانوں میں سے زندہ ہو کر خوابوں کے کرداروں کی طرح اپنے مختلف لباسوں کی وجہ سے الگ دکھائی دیتے۔ دجلہ خود ہزاروں حسن پیدا کرتا ہوا جیسے چوکھٹے میں آئینہ لگا ہو۔ اس کی ہوا طرب و نشاط پیدا کرتی ہوئی، پھر باشندگان شہر عجب و نحوۃ سے سر بلند کئے ہوئے لباس کا دامن غرور سے زمین پر گھیٹتے ہوئے۔ ایک میلہ سا اس کے سامنے سے گزرتا۔

اس کے مشیروں کی طرح اس کے بیٹے بھی عزت و جاہ اور دولت کے دیوانے تھے۔ وہ اپنے ضمیر اور دماغ میں کسی مفاہمت کے قائل نہ تھے۔ بے خرد بے بصر اور بے ضمیر۔ انہیں اپنے اجداد کی اس سلطنت کے لئے اٹھائی ہوئی سختیاں بھول چکی تھیں۔ وہ متوکل کے خلاف ساری ریشہ دوانیوں میں کسی نہ کسی طور شریک تھے۔ وہ اپنے دور حکومت میں مختلف مسائل میں الجھ کر ان کی تربیت حسب

دلوخوا نہ کر سکا تھا، کہیں نہ کہیں کوئی غلطی رہ گئی تھی۔ کوئی کڑی گم ہو گئی تھی۔ اس نے استادوں کے انتخاب میں احتیاط سے کام نہیں لیا تھا اور ان میں سے بیشتر یہودی اور عیسائی تھے جنہوں نے ان کے دل میں نفرتوں کے بیج بوئے تھے اور اس کے اپنے دل میں وسوسے سے تھے مگر نہایت نجی محفلوں میں بھی وہ انہیں دہرانے سے احتراز کرتا تھا۔ اس کے دوست تقریباً نہ ہونے کے برابر تھے۔ عبید اللہ بن یحییٰ اور فتح بن خاقان نے کسی نہ کسی طور اسے حاصل کر لیا تھا، وہ ان کے قابو میں تھا۔ مگر ایسا تو پہلے بھی کئی بار ہو چکا تھا۔

اس کا جدا امجد مانون الرشید اس سے کہیں زیادہ جلال اور ذہن و فراست کا مالک تھا مگر برا مکہ اس پر غلبہ پاسکے تھے۔ برا مکہ کے محل ان کی فراست، ان کی سخاوت اور ہر دلعزیزی نے اس کا چین و سکون تباہ کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ پیالے میں ایک قطرے کی گنجائش نہ رہ گئی اور وہ جعفر برکی کے سر پر الٹ دیا گیا۔ مامون نے آخری گھڑی اسے گلے سے لگا یا تھا۔ وہ پر اعتماد پروقار بیکی برکی کا بیٹا اور ماموں کا رضاعی بھائی تھا۔ وہ نہایت خوبصورت سراں بوسے کی قیمت تھا جو خلیفہ نے اس پیشانی پر ثبت کیا تھا۔ وہ کانپ اٹھا۔

کیا وہ اس فتنے کو جو ”معتزلہ“ تھے بنخ و بن سے اکھیڑ سکتا ہے؟ اس میں اتنی قوت فیصلہ تو تھی مگر سلطنت کے رگ و پے میں وہ خون کی طرح تھے۔ اسے صحیح اعداد و شمار تو یاد نہ تھے مگر ہر شعبہ زندگی پر وہ مسلط تھے جاری پانی کی طرح اور خود الحاد کی طرف مائل تھے۔ مامون کے وقتوں بلکہ اس سے بھی بہت پہلے یونانی فلسفے کے تراجم نے عرب و عجم کے اختلاف نے عقائد کی صورت کو بالکل بدل دیا تھا۔ رواداری ایک حد تک تو ایک دور دراز تک پھیلی ہوئی سلطنت کے لئے بہت ضروری تھی مگر پھر آندھی سی چلی جس میں پوری زندگی ریت کے ٹیلوں کی طرح یہاں وہاں منتقل ہو گئی تھی۔ آزادی رائے تو قابل قدر شے تھی مگر زیادہ آزادی بے راہ روی بن گئی تھی۔ نئے نئے فتنے یہاں وہاں بھڑکنے ولای آگ کی طرح جلتے اور بجھتے رہتے۔ پھر آل علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جو خلافت کے مدعی تھے اور ان کے دعوات گاؤں گاؤں قریہ قریہ پھرتے، نامانوس راستوں سے سفر کرتے راتوں کو بستیوں میں وارد ہوتے اور اپنے معاونین کے گروہ ترتیب دے رہے تھے۔ ان کی دلائی ہوئی جسارتوں سے ہوشیار ہو کر کئی جھوٹے بنی پیدا ہو کر اسلام میں رخنہ اندازی کرتے تھے۔ اسلام ایک ایسی عمارت کی طرح ہو گیا تھا جس میں در پیچے ہی در پیچے ہوں اور یوں دیوار کمزور ہو گئی ہو۔ حصن حصین کی حفاظت کی خاطر ان کھلے در پیچوں کا وجود ان کے بند ہو جانے میں مضر تھا۔

مگر اکیلا متوکل علی اللہ کیا کر سکتا تھا؟

مامون الرشید کے دربار میں جس کشت الحاد کی آبیاری کی گئی تھی وہ اس کو ویران کرنے کے در پے تھا۔ اسے معلوم تھا وہ اپنے کفن

میں آخری کیل گاڑ رہا ہے۔ وہ اس ہجوم پر شور میں اکیلا تھا اور ان اقدامات کو عملی جامہ پہنا رہا تھا جن کا انجام بھی اسے معلوم تھا۔ وہ نہ صرف اپنی بلکہ مستحکم اور نہایت گراں قدر عباسی سلطنت کی شکست کے سامان پیدا کر رہا تھا۔ مگر سلطنتیں، قومیں آخر عروج سے زوال کی طرف اور زوال سے فنا کی طرف رواں رہتی ہیں۔ یہ سفر بہر طور جاری رہنا چاہئے۔ کبھی کبھار اسے محسوس ہوتا کہ اس کی کشتی نہایت تیزی سے عمیق سمندروں کی طرف بہتی جا رہی ہے اور آخر الٹ جائے گی۔

نچی محفلوں میں وہ بنیذ پیتا اور اپنی بیماری سے بے پروا رہتا۔ اسے خون کی بیماری تھی۔ سامرہ سے اس کا جی اکتا گیا تھا۔ اس لئے اس نے جعفریہ کی بنیاد رکھی تھی۔ وہ اپنی زندگی میں اس شہر کو آباد دیکھنا چاہتا تھا اور اس کے لئے وہ ایسے سب لوگوں سے دولت اگلوانا چاہتا تھا جنہوں نے جائز ذرائع سے سلطنت کے ہر شعبے کو تاراج کیا تھا۔ ایٹاخ ابن الزیات، نباح سب اس کے وزیروں کے ہاتھوں اپنے اپنے انجام کو پہنچے تھے اور جعفریہ کی بنیادوں میں ان کی دولت اور ان کا خون صرف ہو رہا تھا۔ اس کے اپنے بیٹے اس کی موت کے متمنی تھے اور معتز باللہ نے تو بخشتشوع کے ساتھ مل کر ایک دوا تیار کروائی تھی جس کی خبر اسے پرچہ نویسوں نے دی تھی۔ ذمیوں پر سے اس کا رہا سہا اعتبار بھی اٹھ گیا تھا۔ وہ ہر چہرے کی طرف کنکھیوں سے دیکھتا اور ہر بات کو خشک کی نگاہ سے دیکھنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بیماری میں کسی بھی دوا کے استعمال سے انکار کر دیا تھا۔

کیا اس طرح سے وہ حالات پر قابو پاسکتا ہے؟ اس نے طیب کو پابجولاں زنداں میں ڈال دیا تھا۔ اسے حیرت البتہ تھی۔ لوگ گروہوں میں بٹ گئے تھے اور قیاس آرائیاں کرتے تھے۔ پتہ نہیں اس کے جی میں کیا تھا؟ چاندنی رات میں باب بدر کے سامنے مجلس وعظ منعقد ہونے والی تھی۔ ایک خلقت جمع تھی۔ خلیفہ کے محل کا دروازہ کھلا تھا اور چلمنوں کے پیچھے خلیفہ اور اس کی ماں اور دوسری بیبیاں اور کنیزیں بیٹھی تھیں۔ امام نے اس مقام کی حرمت کی خاطر اپنے سر سے سیاہ چادر سر کاٹی اور منبر پر بیٹھا۔ اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھے قاریوں نے قرأت شروع کی۔ یہ خوش الحان پڑھنے والے تھے کہ دل ان کی صداؤں سے اور اعجاز قرآن سے سینوں میں پانی ہوئے جاتے تھے۔ پھر شیخ نے متانت سے تفسیر وحدیث پر گفتگو کی۔ ہر طرف سے مسائل آنے لگے۔ پرچوں پر لکھے ہوئے سوالوں کے لئے کرشیخ صاحب نے سب کی تسکین فرمائی۔ چشم و ابرو سے کسی طرح کا انقباض ظاہر نہیں کیا۔ خیر و برکت کی یہ مجلس اختتام کو پہنچی تو متمحل سے متمحل آدمی کے آنسو بھی رواں تھے۔ چاروں طرف سے توبہ کا شور بلند ہوا۔ خلیفہ نے بھی لوگوں کے ساتھ اپنی پیشانی کے بال ترسوائے اور حکیم دیا کہ ایسی مجالس سلطنت کے طول و عرض میں اکثر ہپاکی جایا کریں۔ کیا اس سے لوگوں کے قلوب کو بدلا جاسکتا ہے۔

ذمیوں، یہودیوں اور مجوسیوں کی بڑی تعداد سلطنت کی کلیدی جگہوں پر قابض تھی۔ معتزلہ جو بظاہر اسلام کے محافظ اور متکلمین تھے، وہ منصور کے زمانوں کو واپس لانے میں ناکام رہا تھا اور پھر قدرت بھی شاید اس کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ سازشوں کو پنپنے کا موقع مل رہا تھا۔ ترک سردار پر اعتماد اور انہیں خوش رکھنا ان کے مطالبات ماننا، بکھرنے اور ٹوٹنے کی کیفیت سب طرح ظاہر تھی۔

آسمان صاف اور ستاروں سے بھرا تھا۔ ہوا خوشگوار تھی۔ جب پنج شنبہ کی رات کو یکا یک فضا آوازوں اور چنگاریوں سے بھر گئی۔ ستارے ٹوٹے اور زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی بکھر جاتے۔ راکھ کی بارش سی ہونے لگی۔ لوگوں نے مسجدوں میں اذانیں دینا شروع کر دی تھیں۔ توبہ واستغفار اور خدا کے قہر سے ڈرنے سب کی جانوں کو مصیبت میں مبتلا کر دیا۔ منصور اور اس کی ماں جو ایک قطبی لونڈی تھی، اپنے محل میں ایک سازش کا نقشہ بنا رہے تھے۔

”متوکل کو خون کی بیماری نے لاغر اور دیوانہ کر دیا۔“ اس کی ماں نے کہا۔

”طیب بختیشوع کی دوا اسے تندرست کر دیتی جو پابجولاں بندی خانے میں ہے۔“ طیب کے ذمی ساتھی نے کہا۔ وہ ہنسی جیسے بہت کچھ جانتی ہو۔

”اب اسے معاملات سلطنت میں دیر تک دخل اندازی کا بوجھ اٹھانا نہیں پڑے گا۔“ منصور کی ماں نے کہا۔ منصور نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ بہت بڑی اور واضح بات تو نہیں کہہ گئی۔

”رات کا اکثر حصہ وہ مے نوشی میں صرف کرتا ہے۔ دجلہ کی طرف کھلنے والے درپچوں کے سامنے بیٹھا رہتا۔ سوائے فتح بن خاقان کے اور عبید اللہ بن یحییٰ کے کوئی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ رات کے پچھلے حصے میں کبھی صرف ہوتا ہے اور سدا پردوں کے پیچھے غلام اوگھتے رہتے ہیں۔“

”کیا غلاموں کو وہاں سے ہٹایا نہیں جاسکتا؟“ ذمی نے پھر پوچھا۔

”یہ مشکل تو نہیں مگر فتح بن خاقان بہت ہوشیار اور ناپینا دیا نندار اور باوقا ہے۔“ منصور نے کہا۔

آسمان ایک دم سیاہ ہو گیا جیسے ستاروں کے غبار سے ڈھک گیا ہو۔ ایک زبردست دھماکہ ہوا اور کوئی بھاری چیز چھت پر آن گری۔

وہ سب باہر کی طرف بھاگے اور وہ کاغذ اس رستخیز میں کہیں ادھر ادھر ہو گیا۔ ٹوٹے ہوئے ستاروں کی قیامت سے اگلے دن جب مطلع صاف ہوا تو منصور کو یاد آئی کہ بہت کچھ کھویا ہے۔

متوکل علی اللہ کے پاس مختصر کی طرف سے جب سفیر شالی رومال تحفے کے طور پر آیا تو وہ ہنسا اور اسے دیکھتا رہا۔ جیسے اب اور کسی شے کو نہیں دیکھے گا۔

”اس نے تلوار سے رومال کو دو ٹکڑے کر کے اسی طشت میں رکھ دیا۔ اس زہر آلودخون آشام نہایت بے ضرر تحفہ محبت کو پتہ نہیں کیوں متوکل علی اللہ نے بغیر ہاتھ سے چھوئے قبطنی لونڈی کو جو اس کے دوسرے ولی عہد کی ماں نہایت خوبصورت اور بہت دانشمند تھی اس کا تحفہ لوٹا دیا۔“

موید کے ساتھیوں نے کنار آب درختوں میں اپنی کشتیاں چھپا دیں اور خود پیدل بارگاہ خلافت کی طرف بڑھے۔ رات ہمیشہ سے زیادہ سیاہ تھی۔

جب تلواریں ان کے سر پر چمکیں تو فتح بن خاقان نے خلیفہ متوکل علی اللہ کو چھپا لیا اور وہ دونوں زندگی کی طرح موت بھی ایک ہی تیر میں پروئے گئے۔

معتز، مختصر اور موید نے الگ الگ اپنے اپنے یہودی، قبطنی، عیسائی اور ذمی دوستوں کی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے اس ایک آدمی کو ختم کر دیا جو ان کا باپ اور نئے خیالات رکھنے کی وجہ سے ناقابل قبول تھا۔ جو شراب کو ام الخبائث سمجھتا تھا مگر جو اپنے نہاں خانہ دل میں زندگی سے ناامید ہو کر ساتھیوں سے مایوس ہو کر اپنے ارادوں میں ناکام ہو کر اس کی صحبت میں اپنے آپ کو برباد کرنا چاہتا تھا۔ متوکل علی اللہ جو خلیفہ بننے سے پہلے جعفر بن معصوم تھا اور ترک بچوں کے ساتھ کھیلتا تھا اور اپنے بھائی واثق سے ڈرتا تھا اس کے مشیروں کی نظر کرم کا منتظر رہا کرتا تھا۔ خلیفہ بننے کے بعد خدا سے ڈرتا رہا اور اس نے وہ سب ناممکن کام کرنا چاہے جو اسے خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کی نظر کرم کے قابل بنادیں مگر اس سعادت بزور بازوئے نیست۔

وعظ کی درہم برہم مجالس میں فقہاء اور شیخ ہر اس شخصی کے نام کا خطبہ پڑھتے اور اس کے لئے دعا کرتے رہے جو امیر المومنین بن جاتا تھا اور ترکوں کی بادشاہ گری اور شعبہ بازی سے بارگاہ خلافت پر قابض ہو جاتا تھا۔ سرحدیں دور تھیں۔ اندلس میں اموی سلطنت کب سے اپنے مضبوط قلعوں کی وجہ سے ناقابل تسخیر تھی اور اسماعیل مصر پر قابض تھے۔ مشرق کی ریاستیں ایک ایک کر کے الگ الگ قرویں بن گئی تھیں اور خلافت عباسیہ کو ان سب لوگوں کے الگ ہو جانے سخت نقصان پہنچا۔

طوائف الملوکی کے اس دور میں صومعہ نشینوں نے اپنی توجہ علم و فن کی طرف رکھی۔ یہ قرب قیامت کی نشانیاں تھیں اور شب زندہ دار خدا کے خوف سے لرزاں ترساں اپنے اشواق میں شدید ہوتے گئے۔ امام مہدی کے انتظار میں ان کی نگاہیں عرش کی طرف

دیکھتیں اور دل اس موعودہ آمد کے لئے فرش راہ رہتے۔ اگر دنیا یہی تھی جو ایک کے بعد دوسرے خلیفہ کے قتل پر دم سادھے تھی تو اس دنیا پر تلف ہے۔

”سہل بن عبد اللہ تستری تمہیں یاد فرماتے ہیں۔“ اقامت گاہ میں اس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے خطیب نے آخر اس گوشے میں جھانکا جہاں کبھی کبھار حسین ساتھیوں سے چھپ کر جا بیٹھتا تھا۔ یہ اس کا اپنا گوشہ اس کی دنیا اس کا جہاں تھا۔ نہر جوزاویے میں سے ہو کر نکلتی اور اقامت گاہ کے حوض میں گرتی تھی، موڑ پر درختوں کے اس کنج میں اچانک سایوں میں گنگنائی ہوئی غائب ہو جاتی۔ شاخیں جھکی ہوئی اور پانی کو چھو کر جیسے آئینہ آب میں اپنا عکس دیکھتی ہوں۔ مرداد کے آخری دنوں میں رنگ برنگ چڑیاں شور مچاتیں اور زمستان کو خوش آمدید کہنے لگتیں۔ ہوا خوشگوار جو سرد ہونے پر مائل ہو مگر سرد نہ ہو۔ اس اندھیرے موڑ پر پتوں کے جھولے میں جھولتی راہ تلاش کرتی اور یہیں پر حسین خیالوں میں منہمک۔

”شیخ خفا تھے کیا؟“ اس نے خطیب سے باہر نکل کر اپنے کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے پوچھا۔

”بس نہ خفا تھے اور نہ خوش۔ انہوں نے اپنے ذاتی صندوق کو دیکھا اور مجھے حکم فرمایا: ”حسین کو بلاؤ۔“ پھر اس نے حسین کی طرف گہری نظر سے دیکھتے ہوئے کہا: ”تم نے کچھ چرایا ہے کیا؟“

”ہم یہاں علم حاصل کرنے آئے ہیں۔ کتابیں سب کی مشترکہ میراث ہیں۔“ حسین نے سیزھیوں پر قدم رکھا۔
 ”مگر شیخ کامل سے اجازت حاصل کرنا ضروری ہوتا ہے اور اگر کتاب بطور خاص ان کی ہو تو۔“ خطیب نے کہا۔
 ”شیخ زیادہ سے زیادہ مجھے سزا کا مستحق قرار دیں گے۔“ حسین نے کہا۔

”تمہیں خوف نہیں کہ وہ شاید خفا نہ ہوں مگر کوئی اور سزا دیں؟“ خطیب اس کے آگے تھا۔

”زیادہ سے زیادہ یہی کہ بددعا کریں گے۔“ حسین نے ایک کی بجائے دو دو سیزھیاں پھلا نگتے ہوئے کہا۔

”تمہیں بدمعاشی سے خوف نہیں آتا حسین؟“ خطیب وہیں کھڑا ہو گیا۔

”آؤ جلد آؤ سب کچھ کرنے والا تو خدا ہے جو ہر شے میں جاری و ساری، نفسی زندگی کا مالک ہے۔“ حسین نے خوشدلی سے

جواب دیا۔

”یہ صحیح ہے کہ خدا سب کچھ مگر بزرگوں کی دعائیں ان کی خوشنودی.....“ خطیب خوفزدہ تھا۔

”میں شیخ کامل کی خوشنودی اور دعائیں تو چاہتا ہوں مگر شخصی آزادی اور کتابوں پر اپنے تصرف کی قیمت پر نہیں۔“

”حسین تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں، کیا دیوانوں کی سی گفتگو ہے۔ اگر تم نے شیخ کی ذاتی کتابوں پر اپنے تصرف سے انہیں ناخوش کیا ہے تو وہ بہت ناخوش ہوں گے۔ بہت ہی۔“ خطیب یوں سمجھ رہا تھا کہ غلطی اس سے ہوئی ہے۔ شیخ وہیں پر تشریف فرماتے تھے جہاں درس کے دوران وہ ہمیشہ تھے۔ ان کی پیشانی پر سلوٹیں تھیں اور وہ بہت گہری سوچ میں تھے۔ وہ تنہا تھے۔

حسین کا سایہ دہلیز کے اندر پڑ رہا تھا۔ سورج اس کے دائیں کندھے کے قریب مغرب کی طرف جھکا ہوا تھا۔ لگتا تھا وہ سایہ اس کے پاؤں میں ہی لوٹ رہا ہے۔ ذرا سا بالکل ناقابل ذکر۔ شیخ نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ ”حسین اندر آؤ۔“ وہ نہ خفا تھے اور نہ ہی خوش۔

اس نے سر جھکا لیا اور تقریباً دو ہرا ہوتا ہوا پاس ادب سے آہستہ چلتا ان سے دور ٹھہر گیا۔ ”تمہیں معلوم ہے تمہارے غلطی کیوں ہوئی ہے؟“ انہوں نے بہت نرمی سے پوچھا۔ اس نے گردن جھکا لی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ انہوں نے ہاتھ سے اپنے سامنے کی زمین کی طرف اشارہ کیا۔

”تم نے ایسا کیوں کیا حسین؟ یہ سب رسالے ابھی تمہاری فہم اور ادراک سے پرے ہیں، یہ تمہارے لئے نہیں ہیں۔“ جی.....“ اس نے کہا۔ ”مگر میں انہیں سمجھنے کی کوشش تو کر سکتا ہوں۔“

اس دلیرانہ جواب سے اس نے ایک دم اوپر دیکھا۔ وہ حیران تھے اس کو مدرسے سے میں آئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ ایک غیر معمولی طالب علم تھا۔ انہیں اس کا بھی معلوم تھا کہ مجوسی الاصل تھا اور اپنے باپ کی وجہ سے جو بہت عمدہ خصلتوں اور اچھے کردار کا مالک تھا، ان کے پاس آیا تھا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ علم کی ایک بالکل انوکھی دوسروں سے الگ تڑپ اس کے دل میں تھی۔ ان کی نظروں سے یہ بھی پوشیدہ نہ تھا کہ وہ بہت تیز رفتار تھا، مگر ان رسائل تک اس کی رسائی اور پھر وہ کہتا تھا کہ انہیں سمجھنے کی کوشش کر سکتا ہے، وہ حیران تھے کہ اس راز درون خانہ کو وہ ذرا سا بچہ طفل مکتب کیا سمجھ سکے گا؟ وہ اسے کچھ سمجھانا بھی نہ چاہتے تھے۔

ایسے انکشافات تو صدیوں میں نہایت بانصیب لوگوں پر منکشف ہوتے ہیں۔

دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ شیخ جو متواضع، متوکل، حلیم اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کامل سے عشق کرتے تھے

جو ہمیشہ با وضو رہتے تھے۔ حسین کم عمر بے خبر اور اس لئے پر غرور۔ اپنے فہم کی قوت سے نا آشنا اور اپنی ذات کے عشق میں گرفتار۔

شیخ نے کہا ”میرے قریب آؤ۔“ پہلی بار اس سارے وقت میں حسین کانپا۔ اس کی ہمت جیسے جواب دے رہی تھی مگر کمزوری کا اظہار کرنا بھی اس کے مزاج کا حصہ نہیں تھا۔ وہ ایک انچ آگے بڑھا۔ محسوس ہوتا تھا جیسے صدیوں سے وہ اس خانقاہ میں اپنے شیخ کے سامنے ہے اور آگے بڑھنے کی کوشش میں ہے۔ مگر جب تک فضل خداوندی اس کے حال پر مہربان نہ ہو شیخ کی نگاہیں اس کی اعانت نہ کریں وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی عقل اس کی قوت مدرکہ اس کی قوت نمو قوت فیصلہ سب شیخ کی ایک نگاہ محبت کے تابع فرمان ہیں۔ جب تک شیخ نظر کرم سے اس کو نہ دیکھیں گے یہ فاصلہ کبھی طے نہیں کر سکے گا۔ ان تک اس کی رسائی مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اس کی کوئی مرضی نہ تھی وہ کچھ نہ تھا۔ ایک ذرہ نا چیز جس کی تاریکی کو تابندگی کی ضرورت تھی۔ ذرے کو پیش ک خواہش تھی تاکہ وہ شمس حیات سے استفادہ کر سکے۔ تخلیق کائنات کرنے والے دنیاؤں کو پیدا کرنے والے کے سامنے وہ مضحکہ خیز تھا۔ نظر نہ آنے والا بے بضاعت وہ تو کہیں نہیں تھا۔ سب طرف شیخ کی نگاہوں کی روشنی تھی اور وہ ایک سیاہ مکثہ بھی نہیں تھا۔ اس کی علیحدہ ہستی کہاں تھی؟ زمانے اور دنیا میں خزانے اور فرش زمین کی پہنائیاں عرش بے ستون کے اور ساتوں درجے جانے وہ کہاں تھا؟ کیا دیکھ رہا تھا؟ جنت اور جہنم نظارے ہی نظارے دنگہ تک نوری ہی نور۔ شیخ نے دیکھا اور اسے نگاہ کی نرمی سے چھوا۔

اس نے محسوس کیا کہ وہ زمانوں صحرانوردی میں اپنے آپ کو بھلا رہا ہے اور اب لوٹ رہا ہے۔ وہ بوڑھا ہے اس کی روح حیرت انگیز طور پر نو خیز ہے۔ وقت ٹھہرا ہوا ہے اور اس شیخ کی طرف بڑھتے ایک لمحہ بھی نہیں ہوا۔ لمحے کا ہزار واں حصہ بھی نہیں۔ اس نے ابھی صرف سوچا ہے کہ وہ شیخ سے عفو طلب کرے آخر اسے ان کی ذاتی کتابوں اور رسائل کو دیکھنے کا تو حق نہ تھا۔

”جاؤ۔“ شیخ نے کہا۔ ”ہر شے کا وقت معین ہوتا ہے۔ ازل سے جو مقدمات قائم ہو چکے ہیں ان پر خوش رہو۔“

وہ سیڑھیوں کے نیچے کھڑا تھا حالانکہ اس نے انہیں طے نہیں کیا تھا۔ دھوپ اور سائے اور ہر شے اسی طرح تھی۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ تھی اور اسے یہ بھی سمجھ آ گیا تھا کہ سب کچھ سمجھنے کی کوشش کرنا ناممکن نہیں اور آدمی کی ذات عرش اور فرش ذرہ بیک وقت ہے اور ممکنات ذات کا ادراک فہم سے نہیں ہو سکتا۔

ایک ایسی حالت پر جو سونے اور جاگنے کی درمیانی کیفیت تھی حسین قائم رہا۔ وہ ایسی کشتی کی طرح تھا جو نہ ڈوبتی ہے اور نہ تیرتی ہے۔ جو محبت تھی بھی اور نہیں بھی۔ جو توفیق بھی تھی اور توفیق عشق نہیں بھی۔ اسے لگتا تھا وہ مکمل فنا ہو چکا ہے مگر کس میں کس کے لئے؟ شیخ کی نظر کرم اسے چھو کر نکل بھی گئی تھی اور اس کا لمس وہ اپنے اندر کھوجتا تھا۔ وہ اپنی طبیعت کے ناقہ کو کشاں کشاں قطار کی طرف لا رہا

تھا۔ مگر کس قطار کی طرف؟ جیسے تیز روشنی میں آنکھیں کچھ نہیں دیکھ سکتیں، ایک دم چکا چوند سے بند ہوئی جاتی ہیں۔ کھلی آنکھوں سے اس کے خواب کیا تھے؟

خطیب نے پوچھا: ”شیخ تم نے بہت ناخوش ہوئے ہوں گے؟“

”پتہ نہیں، وہ خوش ہوئے تھے یا ناخوش۔“ حسین نے مبہم سا جواب دیا۔

”تم کسی شے سے ڈرتے نہیں ہو۔ شیخ کی خفگی تو بری ہوتی ہے۔“ خطیب نے اسے سہا دیا۔

”کیا شیخ تم سے کبھی ناراض ہوئے ہیں؟“ اس نے کافی دیر چپ رہنے کے بعد پوچھا۔

”جب اشکال کا جواب دیں اور ہماری توجہ کسی اور طرف ہوتی ہے۔“ خطیب نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”تمہیں کبھی اشکال کی وضاحت کی ضرورت نہیں ہوئی؟“

”اچھا۔“ حسین جانے کن مقامات پر تھا کہ اسے وہ گیت یاد آیا جو اس کا داسا اسے گا کر سنایا کرتا تھا۔

جینے والے جانے والے اور سب آنے والے

آنے والے اس دنیا کے اور دنیاؤں کے

نیک اور پاک جوان اور بوڑھے مرد اور عورت سب

ہم تم کو جو نیکی ہو اور نیک فراوشی ہو

یاد ہیں کرتے اے گن والو اٹھو اٹھو اٹھو

وہ گیت بار بار اس بجلی کے لہریے کی طرح جو بادلوں کی سیاہی کو لٹختے لٹختے روشن کرتی ہے، اسے کیوں یاد آ رہا تھا۔ اس کے دادا نے

آگ کی پوجا کی تھی۔ آگ جو دکھائی دیتی ہے، لپکتی ہے، شعلہ ہے، جلاتی ہے۔

مگر اس کے جی کے اندر یہ آتش سوزاں کس کے لئے تھی؟

وہ کس سے کہے کیسے بتائے؟

شیخ تو پہلے دنوں کی طرح دور تھے اور سبق میں اس کے انہماک یا اس کی بے توجہی کسی حالت میں بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوتے

تھے۔ وہ چاہتا تھا شوخ گستاخ اور بے پروا ہو کر پھر کسی دن بارگاہ میں طلب کیا جائے اور اسی طرح پھر اس نگاہ سے چھو ا جائے۔ وقت

تھم جائے اور پھر وہ شیخ سے غفو طلب کرے۔ ان کے قرب کے لئے، ان تک پہنچنے کے لئے۔ اس کے شوق شدید کی کوئی انتہا نہ تھی۔

جب بے قراری بڑھ جاتی تو وہ سوچتا، کیا ہی اچھا ہوتا ہو ریشم کے کاروبار میں باپ کا شریک ہوتا۔ ریشم کے کپڑوں کی پرداخت، ان کی زندگی، ان کی قسمیں اور ان کے زردی مائل کویوں سے وہ دھاگے کو الگ ہوتے دیکھتا۔ پھرتا نے بانے میں نقش و نگار ابھرتے۔ فنکار کے خوابوں کی پرچھائیں سی اس میں بنی جاتی۔ بافندگی کے اس پیشے میں وہ خوش رہتا اور اس کے اپنے خواب بھی گم نہ ہوتے مگر اب؟ اس کا جی چاہا وہ یہاں سے فرار ہو جائے۔

تستر کل دنیا تو نہیں؟

مگر کون سی زمین اس کو پناہ دے گی۔ یہ زمین خدا نے بنائی ہے، اسے بھی اور اس کو آزادی نہ تھی۔ اس کی روح اتنی بے چین کیوں ہو گئی تھی؟ وہ اس محبت میں اپنے آپ کو فنا کر دینا چاہتا تھا۔ کاش وہ نہ ہو۔ نماز میں کبھی کبھار اس کی یہ کیفیت بدل کر ایک کیف و سرور سا اس پر چھا جاتا۔ وہ اپنے آپ کو بھولنے لگتا۔ رکوع سے سجود اور سجود سے قیام تک بھول بھول جاتا۔ کھڑا رہتا اور ہم سبق کبھی اسے ٹھوکا دیتے، کبھی نماز کے بعد اس کا مذاق اڑاتے۔ وہ ان سب سے الگ کیوں ہو گیا؟ شیخ نے کہا تھا۔ ”مقدرات پر خوش ہو۔“

مگر اس کے مقدرات کیا تھے۔ ہر طرف سوال ہی سوال تھے۔ روشنی میں اور اندھیرے میں، دن میں اور رات میں، صبح اور شام میں، اپنے اس گوشے میں جو اس کی دنیا تھا، اب اسے آرام نہیں ملتا تھا۔ وہ جا کر وہاں روپوش ہوتا تو لگتا ہر پتے پر آنکھ ہے اور اسے دیکھ رہی ہے۔ ہر جھونکا جب اسے چھو کر ٹکٹا تو مسکراتا، ہوا پکارتی حسین، حسین، پرندے چھپے ہوئے پکارتے حسین حسین۔ یہ کیا ظلم تھا کہ ہر شے اسے پکارتی تھی، وہ کہاں جائے؟

ان ساری آوازوں سے اپنے کان بند کرنے پر بھی کوئی مفر نہ تھا۔

تستر سے اور آوازوں سے بچنے کے لئے وہ بصرہ بھاگ گیا۔

بصرہ اپنے زاویوں، دلدلوں، خانقاہوں اور شفیق استادوں کے لئے اقصائے عالم میں ایک خاص مقام رکھتا تھا۔ اقامت گاہوں میں طالب علم آباد، مسجدوں کے حجروں میں درویش اور مسافر قافلوں کے لئے سرائیں اور بازاروں کی چہل پہل اس کی حیثیت ایک علمی چھاؤنی کی سی ہے۔ دریا اور بحر یہاں ہمکنار ہوتے تھے۔ ملاحوں کی آبادیاں، مچھلی پکڑنے والوں کی بستیاں اور پھر بڑی بڑی کشتیوں پر سامان تجارت لادنے کے لئے مزدوروں کے قریے، روزی تلاش کرنے والوں کا مجمع جس میں بساںد اور مدو جزر کا شور اور لہروں کے اوپر سے زمین پر برسے والی نمی تھی اور ساحل پر اترتی ہوئی ریت بھی شامل رہتی تھی۔

اور یہاں کی علمی فضا جو بہت وقیع ہے، اصحاب علم و فضل کے طائفے یہاں موجود ہیں اور یہ اسلام کے عہد خلافت راشدہ کا آباد کیا

ہوا شہر بانسوں کے جنگلوں میں عرب راہزن رہتے ہیں اور قافلے سے بچھڑ جانے والوں کو لوٹ لیتے تھے مگر حسین کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ جب تستر سے نکلا تو عجیب دیوانگی اس پر مسلط تھی۔ زادراہ کے نام کچھ دینار تھے جو اس کے پاس باقی بچ گئے تھے۔ ہوں بھی مدرسے کے سارے اخراجات سمجھل برداشت کرتے تھے۔ بظاہر ان کے پاس کوئی دنیاوی دولت نہ تھی مگر یہ دست غیب کا تصرف تھا کہ وہ اپنی حاجتوں کے لئے سوائے خدا کے کسی کے محتاج نہ تھے۔

رودکاروں کے ساتھ شاہراہ پر اسے ایک قافلہ مل گیا جو نسطوری عیسائیوں کا تھا۔ وہ دشت لوط سے بھی پرے کسی دور دراز علاقے سے آئے تھے اور گردشگران کے چہروں پر تھی۔ لمبے چنے پہنے سروں پر عجیب و غریب عمامے سجائے جن میں قوس قزح کے رنگوں کے پتھر لکے تھے۔ وہ پاؤں میں جوتا نہیں پہنتے تھے۔ لمبی تسبیح ہاتھ میں لئے مناجاتیں پڑھتے وہ بس چپ چاپ رواں رہتے۔ قافلہ ٹھہرتا وہ سر سے عمامے اتار کر ایک حلقہ میں بیٹھ جاتے اور مادر عیسیٰ کا ایک چھوٹا سائب درمیان میں رکھ لیتے۔ اس گروہ میں ملیح رنگ، تھکے نقوش اور نیلی آنکھوں والی لڑکیاں اور عورتیں بھی تھیں۔ ان کے بال سنہرے لہراتے ہوئے اور ٹخنوں تک پہنچتے ہوئے تھے۔ ان کی نگاہوں میں شوخی نہ تھی جیسے خوابوں میں گم ہوں۔ سوچتی ہوئیں وہ اپنے لبادوں سے اپنے آپ کو لپیٹے رکھتیں۔ لگتا تھا ان کے سراپے اس سردی اور برف سے بنے ہیں۔ جن علاقوں میں ابتدا میں ان کی رہائش تھی۔

سالار کارواں نے اسے اپنے ساتھ شامل کرتے ہوئے کہا تھا۔

”تم ابھی کمسن ہو اور کچھ تجربہ نہیں رکھتے۔ اس لئے تم ہمارے ساتھ تو چل سکتے ہو مگر سننے کے بعد بولنے کی منافی ہے دیکھنے کے بعد کہنے کی منافی ہے، ٹوہ لینے اور راز جاننے کی منافی ہے۔ ہم صرف اناج کھاتے ہیں اس لئے تمہیں گوشت نہیں مل سکے گا۔ جہاں قافلہ اترے وہاں تم کو مزدوری کرنے کی اجازت ہے مگر ہمارے ساتھ رہتے ہوئے تم کو اس کی ضرورت پیش نہ آئے گی کیونکہ تمہارے جسم پر لباس ٹھیک ہے اور اگر تم کچھ خریدنا چاہو تو کیا خریدنا پسند کرو گے؟“

حسین نے آنکھیں جھپکائیں مگر کچھ جواب نہ دیا۔

بطریق نے کہا: ”میں نے یہ جاننا نہیں چاہا کہ تم کہاں سے آئے ہو مگر یہ قافلہ بصرہ جائے گا۔ یہ ایک لمبی مسافت ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارا معاملہ ایک خاندان سے کروادیتا ہوں جس میں دولڑکیاں ہیں اور ایک بیوہ عورت ہے۔ تم ان کے چھوٹے موٹے کام کر سکتے ہو۔“

حسین نے سر جھکا دیا اور اس بربط کی طرف دیکھنے لگا جو اونٹ کی پشت پر پیچھے کی طرف لٹک رہا تھا۔ پھر ہوا ان بنے ہوئے ریشم کے تاروں کو چھیڑنے لگی اور ان میں سے مدھم سی صدا آنے لگی جیسے وہ شاہین کے پنچے کے بنے ہوئے مضرب سے انہیں چھو رہی ہو۔ اس کے ذمے پانی کی فراہمی اور ساریوں کی دیکھ بال تھی۔ وہ فارغ ہو کر جاری پانی کے کنارے بیٹھ جاتا اور قافلے کے بازاروں کی گہما گہمی لوگوں کی چلت پھرت دیکھتا۔ پھر گہرہ رات میں اجنبی باجے بجاتے جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھے تھے۔ مناجاتیں اور گیت سنتا۔ وہ سمجھ میں نہ آنے والی دعائیں ہر پڑاؤ رادھر ادھر سے کوئی آ کر شریک ہو جاتا اور کوئی مانوس چہرہ غائب ہو جاتا۔ یہ تباد لے ہوتے رہتے اس پر کوئی راز نہ کھلتا مگر وہ کسی انکشاف کی جستجو میں بھی نہیں تھا۔

”تم جانتے ہو ہم کہاں جا رہے ہیں۔“ ایک شام جب وہ چاند کو حوض کہ تہہ میں لہروں کے ساتھ جھولا جھولتے دیکھ رہا تھا اس سے ان سوال نے پوچھا۔

”نہیں۔“ حسین نے بدستور پانی پر ہنسی اور آگے بڑھتی ہوا کے ساتھ پیدا ہوتے لہریوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہیں معلوم ہے ہمیں بھرہ کیوں لے جایا جا رہا ہے؟“ وہ اپنے کتے کو گود میں لئے بیٹھی تھی۔

”نہیں اور مجھے یہ جاننے کا ایسا شوق بھی نہیں۔“ حسین نے اسے بے رخی سے کہا۔

”تم انسانوں میں ذرا دلچسپی نہیں لیتے؟“ اس نے ہنس کر پوچھا۔ جب وہ ہنسی تو اس کے سانوں کی سفیدی چاندنی میں بڑی دلاویز تھی۔

وہ چپ رہا تو اس نے کہا۔

”سب سے اعلیٰ مخلوق انسان ہے اور اگر خدا توفیق دے تو اس کو ضرور غور سے دیکھو۔ ہو سکتا ہے خدا کا جلوہ کسی طور کسی چہرے میں کسی سراپے میں تمہیں دکھائی دے۔“

حسین نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بال زردی مائل سنہرے تھے۔ جیسے چاندنی ان میں گندھی ہوئی ہو۔ چہرہ اور آنکھیں بخدا اس نے ایسا حسن پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا یا پھر یہ اس کی غریب الوطنی تھی۔ بے راحلہ ہونے کا احساس تھا۔ وہ احسان مند تھا۔ اس کی ماں سے مرعوب تھا جو بنا کہ اس کے آرام کا خیال رکھتی تھی۔ نسطوری قافلے سے اس کے مختلف ہونے کی وجہ تھی۔ کچھ تو تھا۔ ایک لمحے کے لئے اسے دیکھتا رہا۔ بنا پلکیں جھپکائے بنا نظریں ہٹائے۔

وہ دوبارہ ہنسی ہے تو حسین نے گھبرا کر اپنی نظریں جھکا لیں۔

”میں نے ان بے پناہ آنکھوں سے یوں دیکھنے کا نہیں کہا تھا۔ میں نے تو یونہی بات کی تھی۔ میری ذات تو ہونے نہ ہونے کے برابر ہے۔“ وہ ایک اداس ہو گئی۔

”کیوں؟“

”اس لئے کہ بصرہ سے ہم بغداد کے لئے روانہ ہوں گے۔ مجھے کینزوں کے سودا گروں کے پاس بیچ دیا جائے گا۔ پھر میں کسی حرم کی محل کی چار دیواری میں بند ہو جاؤں گی اور یہی میری زندگی ہوگی۔“ وہ چپ ہو گئی۔

”شمع کے گرد پروانے کی سی نہایت مختصر زندگی“ حسین نے دل میں سوچا مگر وہ چپ رہا۔

”مجھے اپنے آبائی وطن کے مرغزار اور چراگا ہیں بہت یاد آئیں گی۔ کھلے آسمان تلے ہواؤں کی طرح بے پرواہ گزرا ہوا اپنا بچپن یاد آئے گا۔“ پھر اس نے کندھے اچکا کر کہا: ”مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔“

”تم انکار کر سکتی ہو۔“ حسین نے بہت کچھ دکھ سے کہا۔

”ہمارے چہرے ہماری قسمت ہوتے ہیں۔ اگر میرے بال کم لمبے ہوتے اور میں کم رو ہوتی تو شاید میرا مقدر کچھ اور ہوتا مگر قبیلے میں تو میں پھر بھی رہ نہ سکتی۔ اب میرا نصیب یہ ہوگا کہ میں خلیفہ کو پسند آ جاؤں۔ تمہیں پتہ ہے ہمیں اس لئے تربیت دی جاتی ہے کہ ہم نستوری راہبائیں اسلام میں آنے والی نسلوں کی رگوں میں زہر بھر سکیں۔ ان کی رگوں میں ہمارا خون ہوگا تو وہ اپنے ایمان میں کمزور اور اپنے ارادوں میں ڈگمگاتے ہوئے اور نستوری راہبوں کی ریشہ دوانیوں سے اغماض کر سکیں۔“

حسین حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”تمہاری ماں تمہاری مدد نہیں کر سکتی؟“ بہت دیر کے بعد اس نے پوچھا۔

”نہیں، کوئی بھی نہیں، خدا بھی نہیں۔ اپنے مقدر سے بھاگ کر کوئی کہاں جاسکتا ہے؟ کوئی ہماری مدد نہیں کر سکتا۔“ وہ اپنے کتے کے بالوں میں منہ دے کر بیٹھی تھی شاید وہ رورہی تھی۔

”یہ تو ایک طرح کی قربانی ہے۔“ حسین نے کہا۔

”ہاں ہم اپنے مذہبی جنون کے لئے مسلمانوں کو برباد کرنے کے لئے دنیاوی زندگی کے لئے یہ قربانیاں دیتے آئے ہیں۔“ اس نے آنسوؤں سے بوجھل آواز میں جواب دیا۔

”مگر تم سب مجھے کیوں بتا رہی ہو؟“ حسین نے کہا۔

”تا کہ آئندہ زندگی میں آنے والے دنوں میں کبھی تم مجھے یاد کر سکو، میرے لئے دعا کر سکو۔ مجھے بھلا نہ سکو۔“ وہ بہت آہستہ بول رہی تھی۔ بالکل سرگوشی کرنے والوں کی طرح۔

اور حسین کو یاد آیا، اس کے شیخ نے کہا تھا۔ ”مقدرات جو ہیں ان پر خوش رہو۔“

کیا انسان کا مقدر اس کی مجبوری تھا۔ آسمان حد نگاہ تک پھیلا ہوا بلند عظیم پر شوکت تھا۔ زمین جاہ و جلال سے بھری ہوئی۔ درختوں اور سبزے کو صحرا سے مزین، دریاؤں اور سمندروں کو اپنے اندر سمیٹے تھی اور اس پر اگر ایک انسان بھی بے بس مجبوری سے رہائی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرنا چاہئے۔ مقدر سے لڑنا چاہے۔ جو جی میں ہے اسے کہنے کی تو آزادی آدمی کو ہو۔ خدا کی بادشاہی میں بھلا انسان اتنا مقہور و مجبور کیوں ہو؟ اغوال مجبور کیوں ہو؟ حسین مجبور کیاں ہو؟ کوئی ذی روح بھی مجبور کیوں ہو۔ ہاں کیوں؟ کیوں؟ آخر کیوں؟

بصرہ میں یک یک حسین نے اپے نہال خانہ دل میں ایک دوسرے حسین کو بے تاب محسوس کیا جس کے سینے میں طوفان بحر محیط کے ساتھ گھٹتے اور بڑھتے تھے۔ لہروں کی طرح پھیل جاتے۔ اس کی پسلیوں میں آگ بھڑکتی اور وجود شعلوں کی لپیٹ میں ہوتا۔ کیا وہ اغوال کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ مٹھیاں بھینچ کر بیٹھ جاتا اور بیٹھا رہتا۔ خون کی روانی اس کی رگوں میں ٹھہرنے لگتی۔ غبار سا اس کی آنکھوں کے سامنے چھا جاتا۔ بس ایک رات اور اس کا ایک پہر نہیں پہر کا ذرا سا حصہ اس کی ساری کائنات تھا۔ پھر وہ کائنات پھیلتی اور اس کی ہستی پر بادلوں کی سیاہی بن کر محیط ہو جاتی۔ بجلی کے لہریئے بن کر لفظ اس کے ذہن کو روشن کرتے، تاریک کرتے۔ اپنی گرج سے دہلاتے۔ اس پر پورش کرتے، اس پر گرتے اس کے خرم ہوش و خرد کو جلاتے۔

ہجر کا خوف میرے دل میں دسو سے ڈالتا ہے۔

کاش چاندان آسمانوں پر دکھائی نہ دیتے۔

اس چقماق سے کوئی چنگاری شعلہ بننے کے لئے نہ جھڑت۔

ساربان آہستہ چل کہ میری پسلیوں میں آگ ہے۔

ہجر کی گھڑی میرے آنسو خشک ہیں۔

اور کوئی تنکھ جدائی کے غم میں نہیں روتی۔

لہریا ریت میری موت کی وادی کے راستے پر ہے۔

جاری پانیوں کے قریب وہ ہیں جنہیں میرا دل محبت سے یاد کرتا ہے۔

انہیں پکارو کون ایک نیم سوختہ جوان کی مدد کرے گا۔

غم نے اسے گہرے غاروں میں تباہی کی تاریکی میں پھینک دیا ہے۔

یادوں کے چراغ جلاؤ کہ یہاں اندھیرا ہے۔

انتقا اور لعلہ کے درمیان جہاں خوشبودار گھاس والی چراگا ہیں ہیں۔

ہجر کا خوف میرے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔

کیا وہ اغول کو بھلانا چاہے گا؟ بھلا سکے گا؟ وہ اس کے لئے دعا کرے؟

اور اس کی اپنی منزل کہاں تھی؟

وہ اغول کو ایک نظر دیکھنے کے لئے اپنا آپ لٹانے کے لئے تیار تھا۔ اس کی جان پر سوز دل بے تاب اس کی خواہشیں کیا وہ

دیوانہ ہو گیا تھا؟

وہ نہ سوتا تھا اور نہ جاتا تھا۔ دروس میں شریک ہونے کے لئے جو تو جیتھی وہ کہاں سے لائے۔ وہ دوسرے طالب علموں کو دیکھتا

زاویے کے دالان در دالان صحنوں میں بیٹھے ہیں۔ خوش گپیوں میں مصروف ایک دوسرے سے اشکال کی وضاحت میں منہمک اسباق

میں دل و جان سے لگے ہوئے جھکے ہوئے۔ کتابوں کے اوراق کو حرز جان بنائے ہوئے۔ آموختہ دہراتے ہوئے فلسفے کی گتھیاں

سلجھانے میں غور و غوض کرتے ہوئے قدم قدم جیسے پایاب پانیوں میں اتر رہے ہوں۔ پیشانیوں پر سلوٹیں آنکھیں سوچتی ہوئیں

الجھنوں کو سلجھانے میں لگے ہوئے اور اس کے ذہن کے افق پر ایک تپش تھی۔ وہ چہرہ لودیتا ہوا چاروں طرف سے اگے گھیرے ہوئے

وہ اس سے بھاگ کر کہاں جائے؟

نسطوری راہبوں کا وہ قافلہ جب پانی لے کر روانہ ہوا تھا تو صبح قریب تھی۔ زنجیوں کے کسی آوارہ گروہ نے جوان دنوں ملک کے

طول و عرض میں اور بالخصوص بصرہ کے گرد و نواح میں بہت سرگرم تھے اس پر حملہ کر دیا۔ ایک بھگدڑ مچ گئی۔ اونٹوں نے اچھلنا شروع

کر دیا۔ گھوڑے بے قابو ہو گئے۔ شفق کی لہورنگ سرخی میں یہ تماشا اور بھی خوں میں ہو گیا۔ مردوں میں سے جنہوں نے مزاحمت کی انہیں

آقل کر دیا گیا۔ لڑکیوں کو انہوں نے اپنے گھوڑوں پر رکھ لیا جیسے قندیلوں کی روشنی میں فاتح فوج کا جلوس ہو۔

اغول نے کہا تھا ”ہمارے چہرے ہماری قسمت ہیں۔ پتہ نہیں وہ کن پانیوں میں اپنے نصیب کی کشتی پر سوار تھی اور اس کا رخ

کدھر تھا؟ اس رستخیز کی گھڑی میں وہ اسے دیکھ بھی نہ سکا تھا۔ ایک آخری الوداعی نظر بھی نہیں دینا ایک دم قیامت کے ہنگامے میں گرفتار ہو گئی تھی۔

راہزنوں نے اس سے تعرض نہیں کیا تھا، اسے آزاد کر دیا تھا۔ اجازت دی تھی کہ وہ جہاں چاہے چلا جائے، یہ کیسی آزادی تھی؟ غبار اور دھند لگا اس کے اور اغول کے درمیان اوٹ ک طرح حائل ہو جاتا۔ وہ آنکھوں کو ملتا، انہیں جھپکاتا تا کہ دور تک دیکھ سکے۔ حدنگاہ تک اس ایک چہرے کو جو آئینوں سے گھرے ہوئے اس کے وجود خاکی کو گھیرے تھا۔

ایک رات اور اس کا ایک پہر پہر کا ذرا سالحہ اس کی کل کائنات تھا۔ پھر وہ کائنات پھلتی اور اس کی ہستی پر بادلوں کی سیاہی بن کر محیط ہو جاتی۔ لفظ سیاہ بوندوں کی طرح بڑے بڑے قطروں کی طرح تیز بو چھاڑ بن کر اس کے گرد برستے، لولوئے لالہ کی چادر بن کر اسے ڈھانپ لیتے، کبھی سفید پروں کی طرح فضا ان سے بھر جاتی، وہ اسے کیا کہنا چاہتے تھے۔ لفظ اسے کیوں اپنے تنگ گھیرے میں مقید کئے تھے؟

ان کی ممکنات کیا تھی؟

تہہ در تہہ پرے باندھے جیسے فوج اپنے سالار اعلیٰ کے سامنے سلامی دینے کے لئے کھڑی ہو اور شام کی آخری سرخی میں ان کے تیروں کی انیاں چمک پکڑ کر لہورنگ ہو رہی ہوں۔ جاہ و جلال، شان و شوکت، ہیبت و سطوت سے اسے مرعوب کرتے ہوئے۔ وہ ان کا کیا کرے؟

لفظ اپنی بہترین صورتوں میں اس کے سامنے جلوہ گر ہوتے، غم و اندوہ کے مارے سر جھکائے ہوئے۔ آنسوؤں کا بوجھ گھٹاؤں کی طرح سمیٹے ہوئے۔ سنجیدہ پروقار، سوز درون سے لپکتے ہوئے آگ پکڑنے کو تیار خس و خاشاک کا ڈھیر۔ زاویئے اور مسجد کی دیواریں اس شہرہ پناہ ایک حصہ تھیں جو زنجیوں کے حملوں سے بچنے کے لئے بصرہ کے گرد تعمیر کی گئی تھیں۔ اس سے پرے بانس کے جنگل تھے جو دلدلوں کے درمیان جزیروں کی طرح تھے اور نہایت پر اسرار اور بھیدوں بھرے۔ عرب لٹیروں کے گروہ ان میں پوشیدہ رہتے۔ درختوں پر رہنے والے پرندوں کی چہکار صبح کے وقت اور شام کی سرخی میں سنائی دیتی اور نیلے دھوئیں کی طرف کی دھند میں ہاؤ ہو کی صدا بھی آتیں۔ پھر دلدلوں پر کی بساند اور پھولوں کی خوشبو کو ساتھ لیتی جب تیز ہوا چلتی تو جنگلوں می ارغنون سے بچ اٹھتے۔ سازوں کے لہریوں پر کائنات اپنے گیت سناتے ہوئے نے نواز کے گرد فٹار ہوتی۔ حسین کی جان بے تاب ہو جاتی۔ شیخ صومعہ سہل عبداللہ تستری کے درس سے آئے ہوئے اس طالب علم کو اپنی گہری نظروں سے دیکھتے انہوں نے ابھی اس کے متعلق کوئی رائے قائم

نہ کی تھی۔ کیونکہ وہ دوس کے دوران جانے کہاں ہوتا تھا مگر جب آموختہ سنانے اور اشکال پر بحث کرنے کا وقت آتا تو عجیب و غریب دلائل سے وہ اپنا مطلب سلجھانے کی کوشش کرتا اور اپنا نقطہ نظر واضح کر ہی لیتا۔ ابہام اور اغلاط کا شکار قطعاً نہ ہوتا۔ جو سمجھ نہ سکتا بلا جھجک اس کی وضاحت چاہتا۔ اکثر چپ رہتا۔ دوسروں سے الگ تھلگ اور اپنی رنگت کی زردی کی وجہ سے اپنے لاغر تن کی وجہ سے سب سے الگ پہچانا جاتا۔ بڑی بڑی آنکھوں میں وحشت تنہائی اور کرب تھا۔ اس کی طرف دیکھ کر دکھ کا شدید احساس ہوتا۔ اس کی جان بے تاب کو کیا تھا؟ بے قرار۔

ان تک یہ بات بھی شدہ شدہ پہنچی کہ وہ شب بیدار ہے اور نمازیوں کے جانے کے بعد مسجد میں آتا اور بہت طویل سجدوں میں ناصیہ فرسائی کرتا۔ اس کم عمری میں اس کا طرز عمل حیان کن تھا۔ انہوں نے ایک زمانہ دیکھا تھا اور لوگوں کی تربیت کی تھی اپنی جوانی یہاں لگائی تھی۔ ملکوں ملکوں گھومے تھے۔ درباروں سے منسلک رہے تھے۔ شورشوں اور عقائد کے طوفان میں سے نکلے تھے۔ روز گار کے اتنے نادر تماشے دیکھ چکے تھے۔ دلیر بزدل سب طرح کے انسانوں کو گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ بادشاہتیں بدلیں اور تخت گرد زمین ہوئے تھے دیوانوں اور فرزانوں کو دنیا داری میں گم ہوتے پایا تھا۔ کاروان سالاروں کو پس کارواں رہتے اور بھٹکتے دیکھا تھا۔ شرق و غرب کو پھلتے اور سکڑتے اور خوانین کو خاک نشین بننے اور بے نام لوگوں کے طالع کو طلوع ہوتے دیکھا تھا۔ فقیران کے سامنے اوج ثریا پر پہنچے تھے اور راہ ہدایت کو چھوڑ کر بڑے عمدہ دنیا دار بنے تھے مگر انہیں حسین کو سمجھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ نہایت بیدار اور بے حد لاپرواہ تھا اور ان سے کسی معامل میں کبھی اعانت کا طالب نہیں ہوا تھا۔ اپنی عبادت میں غلو کے باوجود اس نے کبھی ان سے راستے کی دشواریوں کا گلہ نہیں کیا تھا۔ ان کی راہبری سے استفادہ نہیں کیا تھا۔

حسین نے لفظوں کے اس طوفان میں فنا ہونے سے بچنے کے لئے قلم کا سہارا لیا۔ لفظ رنگین اور بے کیف اس کے گرد پھیلے تھے۔ لفظوں کے اس صحرا میں اس نے جس حوض کے کنارے اپنے آپ کو آب حیات سیراب ہوتے پایا وہ شاعری تھی۔

ان کی بستیاں ویران ہو گئیں

مگر ان کی خواہش میرے دل کو دیرانہ نہیں بنے دیتی

میری وح پگھل کر ان کی یاد میں رواں ہوتی ہے

ان کے کارواں کے تعاقب میں میں نے ساربان کو پکارا

”حسن کے دربار میں ایک گدا حاضر ہے“

میں نے خاک پر اپنے جذبہ شوق کے لئے پیشانی رکھی
تمہیں محبت کا واسطہ مجھے ناامید نہ لوٹاؤ
تم جو آتش شوق بھڑکاتے ہو
اس میں سے اپنا خراج تو وصول کرلو۔

پر شور رو دو کو ہسار کی طرح لفظ اس کے جذبوں کو بہائے لئے جاتے تھے اور وہ جذبوں کا قیدی تھا۔ اس کی محبت ایک رہوار شوق پر
سوار تھی اور اس کی طبیعت کی باگیں اس کے ہاتھ میں تھیں۔ طبل جنگ بج چکا تھا۔ نقارے پر چوٹ پڑ چکی تھی۔ خیالوں کے تیروں کی
تیز دھار پر اسے رکھے وہ ان ویرانوں میں دوڑایا جا رہا تھا جہاں ہر طرف گرد تھی۔ خاک اڑتی تھی اور زمین زیادہ پکے ہوئے پھل کی
طرح جگہ جگہ سے چٹخ گئی تھی۔

جب بال آخر منصور اسے جگہ جگہ ڈھونڈتا منزلیں مارتا تھا کاہار ابصرہ پہنچا ہے تو حسین دفتر کے دفتر سیاہ کر چکا تھا۔ ویران بستیوں
کے نوح ۶، زردی مائل چاندنی، سنہرے بالوں پر اترتی ہوئی گیتوں میں ڈھلتی ہوئی قافلہ سالاروں اور حدی خوانوں کے نغمے۔ صحرا
میں اترتی گرد میں چھپ جانے والے حسین چہرے دل کی طرف رواں ہو کر اسے بھول جانے والے خون کی سرد مہری اور پھر مجبور
دو شیزاؤں کے نوے جو وطن کو بھلا نہ سکیں گی۔

ان سرزمینوں کے فسانے جو خواب میں دیکھی گئی تھیں اور جوش جنون سے دیوانہ بنے ہوئے اس انسان کی حالتوں کا بیان جو ایک
لمحے میں اپنا آپ لٹا بیٹھا بھلا بیٹھا۔ شکست خوردہ نوجوان کی تمناؤں کی آگ نے اس کا سینہ جلا ڈالا تھا۔
جب ہوا چلتی اور بانس کے جنگل نے نواز کے نغموں کی طرح پر اسرار ان دیکھی پوشیدہ زمین دو شیزاہ کی طرح ہریالی اور
اندھیرے کے پردے میں چھپی ہوئی۔

وہ کتنا بے بس تھا جو صرف اپنے صے کے دکھ کو محسوس کر سکتا تھا۔ کیا کبھی اسے یاد کیا جاتا ہوگا؟
نیزے کی انی کی طرح یہ نوک اس کے سینے کے آر پار ہو جاتی۔

آنے والا زمانہ کتنے اندھیرے میں تھا۔ آوارہ گردوں کے گروہ نے اسے کہیں نہ کہیں فروخت کر دیا ہوگا۔ کن زمینوں، کن
دیواروں، کن محل سراؤں میں وہ ہوگی۔

اس کا جی چاہتا سینہ کو بی کرے شدت غم سے نڈھال، نے والی گھڑی کی بے یقینی اور ناامیدی نے مل کر اسے روئی کی طرح دھنک

دیا۔ پارہ پارہ وہ اپنے ذروں کو لفظوں میں سمیٹنے میں لگا رہتا مگر کہاں تک؟

منصور نے ایک عاشق زار باپ کی طرح حسین کے دل کا ڈوبنا محسوس کیا۔ اس کی زمانہ شناس نگاہوں نے اس مرض کو بھی شناخت کر لیا۔ اپنے بچے کے چہرے پر بکھری زردی اور ناامیدی نے اس کی آنی غم آشناروح کو نہایت مضطرب کیا۔ اس کی کھوئی ہوئی اداس نگاہیں ویران تھیں۔ وہ کس طرح اپنے بیٹے کے دکھ میں شریک ہو۔ زخم خوردہ معصومت کو کس طرح یقین دلانے کہ دنیا میں ابھی بہت کچھ باقی ہے اور یہی زندگی کا آخر نہیں تھا۔

تستر اور بصرہ کے درمیان جو کچھ ہوا ہوگا، اپنی ژوف نگاہی سے اس نے سمجھ تو لیا تھا مگر حسین اگر اسے بتا دے تو شاید اس کے جی کا بوجھ کچھ ہلکا ہو۔ وہ اپنے نور نظر کا غم بانٹنا چاہتا تھا مگر وہ اتنا دور اور تقریباً اجنبی لگتا تھا اس سے آنکھ ملا کر بات نہ کرتا۔

”حسین کیا تم کچھ دنوں کے لئے واپس بیضا چلو گے؟“ منصور نے ایک دن اس سے پوچھا۔

”قافلے لٹ جاتے ہیں پدر محترم اور زنجیوں کی شورش سے کہاں امان ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”ہر کارواں نہیں لٹتا حسین اور اب تو خلیفہ وقت نے راستوں کی حفاظت کے لئے کچھ بندوبست کیا ہے۔“

منصور کی بات سن کر وہ کچھ دیر چپ رہا اور پھر دروس میں شریک ہونے کے لئے جاتے ہوئے اس نے کہا۔

”نہیں ہر کارواں نہیں لٹتا، ہر کارواں کہاں لٹ سکتا ہے پدر محترم؟“

اس کے جانے کے بعد دیر تک منصور سوچتا رہا۔ پھر اٹھ کر اس نے یونہی کتابیں دیکھنے کے لئے کھولیں تو اس نے وہ گنج شایگان دیکھا جسے حسین نے ہر فانی نگاہ سے چھپا کر بالکل محفوظ رکھا تھا۔ محبت کا گہرہ اور مندمل نہ ہونے والا زخم اس کے بیٹے کو لگ کیسے گیا؟ وہ سوچتا رہا۔

شام کو جب چراغ جلے اور ہوا میں فتنکی بڑھی تو وہ اس کے شیخ سے رخصت طلب کرنے کے لئے مسجد کے اس حجرے میں گیا جہاں وہ نماز عشاء سے صبح تک تشریف فرما ہوتے تھے۔ وہ ان سے حسین کے لئے دعا کا طالب بھی ہوا۔

شیخ بہت متردد تھے یا خفا، انہوں نے ہاتھ نہیں اٹھائے حالانکہ وہ ضرور طالب دعا کی تسلی کے لئے عام روش اختیار کرتے تھے۔ منصور بیٹھا رہا۔ لوگوں کا مجمع کم ہو گیا تو شیخ نے کہا۔

”ابو حسین تمہارے بیٹے کو چاہئے کہ اپنے لئے خود دعا کرے۔“

”یا شیخ وہ آپ کے حضور حاضر ہے۔ آپ کی خاک پا ہے۔“ منصور دوزانوں ہونے کے باوجود جھکا اور اپنا سر ان کے قدموں

سے لگا دیا۔

شیخ نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ ”ابو حسین سا سے چاہئے اپنے لئے خود دعا کرے مگر ابھی اسے دعاؤں کی حاجت بھی نہیں۔“ منصور جھکا رہا، پتہ نہیں شیخ کیوں یہ کہہ رہے تھے؟ حسین نادان تھا، کم عمر تھا اور شدید جذبات کا شکار تھا۔ شاید اسے پرستش کی عادت اپنے اجداد سے ورثے میں ملی تھی؟ اس کی طبیعت شروع سے جمال پسند تھی۔ ظاہری اور دینی محبتوں کا خود بھی تجربہ رکھتا تھا۔ اوائل خوانی میں اسے بھی اپنی بنت عم سے شدید لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا حسن و جمال اس کا رخ روشن، اس کا سراپا سب منصور کے دل میں ہلچل مچا دیتے تھے۔ مہینوں فراز کا خیال سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے اس کی روح کو رنج و الم سے بھر دیا کرتا تھا۔ محی سے اس نے کچھ نہ کہا کیونکہ فرازے کو اس کی ذات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ عجیب گم سم لڑکی تھی جسے نہ اپنے حسن سے آگاہی تھی اور نہ ہی دوسروں کے دلوں میں لپکتی آتش شوق کی پروا اور پھر منصور کو اس سے بس اتنا ہی انس تھا کہ وہ اس کو اپنی ملکیت بنانا چاہتا تھا۔ عام معمولی لڑکی کی طرح وہ اس کے گھر کی زینت بن جائے۔ ایسا چراغ جس سے وہ اپنی زندگی میں روشنی اور سکون پاسکے۔ جب بال آخر وہ اسے پاچکا تو اس گونہ تسلی اور طمانیت کے ساتھ ایک ناامیدی بھی ہوئی۔ اس میں زندگی کی گرمجوشی پیدا نہ ہوئی۔ وہ خوشی اور ولولہ شوق مفقود ہی رہا۔ یہاں تک کہ حسین پیدا ہوا اور وہ اسی طرح گم سم اس کی زندگی سے نکل گئی۔

حسین کی پلکیں اسے سوختہ لگتی تھیں۔ جیسے تیز آنچ اور تپش سے جھلس گئی ہوں۔ سرخ و سفید رنگت سیاں پڑ گئی تھی اور زردی مائل خشک جلد کے اندر سے یوں حدت چھلکتی تھی جیسے پردوں کے پیچھے کوئی الاؤ جل رہا ہو۔ وہ رات دیر تک صومعہ کے دالان میں اگ تھلگ مدھم سے چراغ کے سامنے لکھتا رہتا یا سوچ میں ڈوبا مراقبہ کی حالت میں اپنے آپ سے گم دکھائی دیتا۔

درستوں کی زمردیں شاخیں نئے شگوفوں، نئی کونپلوں سے پر بہا رہیں۔ صومعہ کی عمارت میں تازگی اور ندرت کیف تھی۔ دریا، پہاڑوں پر برف پگھلنے کی وجہ سے کناروں سے چھلکے پڑتے تھے اور انہیں دیکھنے سے آنکھوں میں ٹھنڈک اترتی تھی۔ کشتیاں فصیل شہر کے ساتھ ساتھ ہتھیاروں سے بھری ہوئی زنجیوں کی شور شول کو فرو کرنے والے ترکوں اور کبھی کبھار کرد سپاہیوں سے پر ہوتیں جو ان نامساعد حالات میں بھی جب کہیں لنگر انداز ہوتے تو گیت گاتے۔ ان کے پڑاؤ کی روشنیاں دیواروں پر پڑتیں اور برہم نواز کرخت آوازوں سے جو کہتے، وہ کبھی سمجھ میں آتا اور کبھی نہیں مگر سازوں کو سن کر دماغ ہلکا ہو جاتا جیسے عناصر کہیں یکجا ہو کر دعا گو ہیں۔ چاہتوں اور محبتوں کے ارمان جی میں جاگتے۔

آدمی کی زندگی کا کیا اعتبار ہے۔ یہ جو دو گھڑی ہنس بول رہے ہیں، جانے کل ہوں گے کہ نہیں دل ان کی چلت پھرت سے وسوسوں

میں ڈوب جاتا۔ ہوا چلتی تو ان کی سمجھ میں نہ آنے والی باتوں کا شور سنائی دیتا۔ جیسے جیسے ستاروں کے قافلے اپنے سفر پر جھکتے سناٹا گہرا ہوتا جاتا۔ صرف پہرہ دینے والوں کی آوازیں ہی آتی رہتیں مگر حسین سب سے بے نیاز دالانوں میں کاغذوں پر جھکا رہتا۔

”شیخ نے کہا تھا حسین کو چاہیے وہ اپنے لئے خود دعا کرے۔“

”حسین تم اپنے لئے خود دعا کرو۔“ ایک دن منصور نے اس سے کہا۔

”میں اپنی کوئی التجا لے کر اس کے حضور حاضر ہوں۔“ ”پدر محترم کے خدا تمہیں صحت دے۔“ منصور کو سمجھ نہیں رہا تھا کہ وہ کیا

کہے۔

حسین نے ہنس کر اوپر دیکھا۔ ”مگر میں بیمار نہیں ہوں۔ میری صحت تو اچھی ہے۔“

منصور کی آنکھوں میں آنسو آ گئے: ”حسین میرا حاصل زندگی تم ہو۔“

”پدر محترم آپ کو حاصل سے اتنا لگاؤ کیوں ہے؟ اور پھر ہر حاصل آخر کہیں نہ کہیں مصرف میں لایا جاتا ہے۔“ حسین نے ایک

ایسی بے نیازی سے کہا جو منصور کے دل کے آر پار ہو گئی۔

”حسین میں چاہتا ہوں تم میرے ساتھ چلو۔ کاروبار میں میرے شریک بنو میں اپنی ہڈیوں میں درد محسوس کرتا ہوں۔ تمہارے

دادا کے بعد سے یہاں (اس نے دل کی طرف اشارہ کیا) ایک خلا سا ہو گیا ہے جسے نہ مطالعہ اور نہ ہی مصروفیت کچھ پر کر نہیں سکتا اور

پھر تمہارے ماموں کی لڑکیاں تمہیں دیکھنا چاہتی ہیں۔“ منصور نے بہت گہری نظروں سے بیٹے کی آنکھوں میں ملتی نگاہوں سے

دیکھا۔

”ماموں کی لڑکیاں جب میں گھر لوٹوں گا مجھے ضرور دیکھ لیں گی مگر آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ کسی اچھے طبیب کا علاج ہوا چاہئے۔“ وہ قلم

وہیں ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ ”ہمارے صومعہ کے پاس ایک نہایت عمدہ اور تجربہ کار یہودی طبیب ہے۔ چلئے اسے ملتے ہیں۔“

”تم کبھی اس کے پاس گئے ہو؟“ منصور نے کہا۔

”کس کئے پدر محترم؟“

”تم نے محسوس نہیں کیا تم کتنے لاغر ہو گئے۔ تمہاری رنگت زردی مائل سیاہ ہو گئی ہے اور ہاتھوں کی ہڈیاں پتلی کھال میں سے

صاف دکھائی دیتی ہیں۔“ منصور نے اس کا ہتھ تھام کر کہا۔

حسین نے بہت غور سے الٹ پلٹ کر ہاتھوں کو دیکھا۔

”تم نے محبتوں کی طرح اپنا آپ گھلانا کیوں شروع کر دیا ہے؟ کیا کسی لیلیٰ کی نظر میں آگئے ہو؟“ منصور نے آخروہ بات کہہ ہی دی جس کے بھاری بوجھ کو اٹھانا اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔

”کیا میں آپ کو دیوانہ لگتا ہوں؟ مجنوں کو تو خود پر لیلیٰ کا گمان ہونے لگا تھا۔ وہ تو خود لیلیٰ بن گیا تھا اور میں تو حسین بن منصور ہوں۔ بخدا پدر محترم آپ کو کیونکر ایسا محسوس ہوا ہے؟“ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے باپ کے پاؤں پکڑ لئے۔ ”میں آپ کی زندگی میں دیوانہ ہونے کی گستاخی نہیں کر سکتا۔“

منصور نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا ”شاعری ایک اذیت ناک پرالم تجربہ ہے بے چین اور کر بناک اور انجام کار روح اس سے سیراب نہیں ہو سکتی۔ تم کلام پاک میں اپنی سعادت تلاش کرو!“

حسین کو ایک جھٹکا لگا جیسے اس کی جان نکلنے والی ہو اور اس کا وجود ایک دم سرد ہو گیا۔ وہ پیٹنے میں نہا گیا تھا۔
تولیل کی یاد کو چھوڑ دے

اور اپنے غم و افکار دور کرنے کے لئے

ایک مضبوط قد آور اونٹنی کے ذریعے سفر کر۔

جو سوار کے پیچھے سوار کو لے کر تیرے فکر کی تیزی سے دوڑے

منصور کے ذہن میں زمانہ جاہلیت کی عربی شاعری کے نمونے اشعار اور لفظ تیز آندھیوں کی سرسراہٹ پیدا کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔

”تم تتر چلے جاؤ۔“ منصور نے لمبی خاموشی کو توڑنے کے لئے کہا۔

”نہیں۔“ حسین نے زمانوں کے بعد اپنے آپ میں لوٹتے ہوئے گویا کہا۔ ”اگر آپ پسند نہیں کرتے تو میں شاعر تلف کر دوں

گا۔“

”اس سے کیا ہوتا ہے؟“ منصور نے نہایت وقار سے کہا۔ ”اگر تمہیں بصرہ میں قیام کرنا ہی ہے تو میری کوئی شرط نہیں سوائے اس کے کہ تم کلام اللہ سے محبت کرو۔ یہ ابتدا اور انتہا ہے۔ محبت کرنا سیکھو اور دل میں وسعت پیدا کرو۔ دنیاوی محبتیں بھی گو توفیق کے بغیر نہیں اور دل کو گرم رکھتی ہیں۔ دن گزارنے کے بہانے ہیں اور اولیں مقام یہی ہے مگر جن رحمت خداوندی ہو وہ ثابت و سالم یہاں سے گزر جاتے ہیں۔“

”جی پدر محترم! اس کی آواز نہایت پست تھی اور سینے میں سے گویا گھٹ گھٹ کر نکل رہی تھی۔

اگر غور سے دیکھو تو سارے چہرے ایک سے ہوتے ہیں۔ لیلیٰ اور سلمیٰ اور عذرا۔ ان سب کو غرہ ہوتا ہے کہ لوگ ان کی محبت کے قاتل ہیں اور ان کے اشارہ پر ناپتے ہیں اور ان کی محبت سے کنار کش نہیں ہوتے۔

حسین نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ”میں دو حرقہ جانا چاہتا ہوں اپنی تربیت نفس کے لئے۔“

صومعہ میں درخت پھولوں سے سفید ہو رہے تھے جیسے برفباری کے بعد پہلی دھوپ میں دکھائی دیں اور ہوا خوشبو سے بھری تھی۔ جب منصور نے شیخ سے حسین کے لئے رخصت طلب کرنے کے بعد رخت سفر باندھا۔ شیخ نے حسین سے کہا تھا۔ ”جو توفیق تمہیں نصیب ہوئی ہے وہ دہلیز ہے۔ اس کو پار کر کے جو کچھ پاسکو گے وہ تمہارے مقدر سے بہت زیادہ ہوگا بہت زیادہ۔“

پھر وہ دونوں اس پر آشوب شہر اور پرسکون مسجد اور مدرسہ کو چھوڑ کر دو حرقہ جانے والے ایک قافلے میں شامل ہو گئے اور بصرہ بانسوں کے گھنے جنگلوں، دلدلوں اور پر شکوہ مدرسوں پر جلال مسجدوں سرسبز کنجوں سمیت بہت پیچھے رہ گیا۔

اے ساربان آہستہ چل
کہ میری پیلیوں میں آگ ہے

رات آہستہ چلنے والے ستاروں کے ہم رکاب غم و اندوہ کے صحرا میں اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ زنجی پیغمبر نے اپنے ساتھیوں سے جوشورہ نکالنے والے زندگی اور جہشی فوج سے بھاگے ہوئے سپاہی مجرم اور سزا یافتہ بدکردار تھے کہا تھا کہ اگر وہ بغداد پر قبضہ کر سکا تو ان سب کی زندگیاں بدل جائیں گی۔ وہ انہیں آسودگی اور رہنے کے عمدہ ٹھکانے دے گا۔ وہ ان کے لئے اپنی جان تک لڑا دے گا۔ اسے اپنے لئے کسی شے کی ضرورت نہیں۔ وہ ان کے لئے ہی سرگراں ہے۔ بصرہ کے گرد نواح میں ان کی شورشوں سے زندگی ایک دم پریشان ہو گئی تھی جیسے کوئی پھلوں سے بھرا ٹوکڑہ زمین پر الٹ دے۔ قافلے جوشاہراہوں پر اتہائے مشرق سے مغرب اقصیٰ کو جاتے ہوئے اپنی حفاظت کا پورا انتظام کرنے کے باوصف خوفزدہ ہوتے تھے اور کرائے کے لوگوں کو پاسبانی کے لئے رکھتے تھے۔ مسلح سوار جو ہر طرف سے گھیر کر چلتے۔ موسم بدلنے کی وجہ سے سفر ممکن تھا۔ اس لئے کوچ کا نفاذ صبح صادق کے وقت بجایا جاتا۔ راتیں سخت سرد ہو چلی تھیں۔ مگر زنجیوں کے ڈر سے آگ کو سرشام ہی بجھا دیا جاتا تھا۔ سنائے اور خوف سے گھبرائے ہوئے کاروان بھاگے رہتے۔ مائیں بچوں کو سلالتے ہوئے لوریاں نہ گاتیں۔ نانگیں پھیلا کر چین سے سونے کو تو خوب سمجھا جانے لگا تھا۔

دو حرقہ پہنچ کر منصور نے کہا: ”حسین سوچ لو یہ نسطوری عیسائیوں کا قریہ ہے۔ کلیساؤں کے سوا صرف ایک شہری انتظام کا مدرسہ

ہے جس میں کلام اللہ پڑھایا جاتا ہے۔ اس کی تفسیر اور حدیث کی تعلیم دی تو جاتی ہے مگر تمہارے حسب منشا شاید نہ ہو۔“

حسین نے کہا: ”میں اسی مدرسے میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ ستاروں اور مقدر کے فیصلے کیا کہیں گے؟“

منصرا سے دیکھتا رہا۔ یہ بے چین روح آخر چاہتی کیا ہے؟ کس شے کی طالب ہے؟ یا شاید محض تجسس اسے ایک سے دوسری جگہ لئے پھرتا ہے۔ وکب تک اس کے تعقاب میں یونہی سرگرداں رہے گا؟ وہ اس پر اپنی مرضی مسلط بھی نہیں کر سکتا۔ کر سکتا ہے کیا؟ جو ان اولاد آزمائش ہوتی ہے۔ آپ انہیں کسی کام پر مجبور نہیں کر سکتے۔ سوال تو کر سکتے ہیں مگر جواب کی امید کے بغیر۔ ان کی اور ہماری سوچ میں کتنا فاصلہ ہے۔ وہ یونہی چیزوں توڑنے اور جوڑنے اور تربیت دینے کے مراحل کس آسانی سے طے کر لیتے ہیں اور ہم کسی ٹوٹی ہوئی شے کے تصور سے بھی لرزاں ہیں۔ چہ جائیکہ کسی زندگی کے؟ ایک ایسی سواری کی طرح جو کارواں سے بچھڑ گئی ہو اور صحرا میں بے نام و نشان مسافتوں کے باوجود راہ تلاش کرنے میں ناکام رہی ہو۔ ہو کیا کرے؟ حسین نے اسے کتنا بے بس کر دی تھا۔ ایک غلام کی طرح اس کے پیچھے کھنچا چلا آتا تھا۔ آرام کی زندگی خواب ہو گئی تھی۔ تتر سے حسن کے بغیر اطلاع دیئے چلے آنے کے بعد وہ پورے علاقے کے ایک ایک صومعہ کو چھانگا پھرا تھا اور اس کے اپنے وقت کی تنگی داماں کے باوجود ارادے۔ وہ کیا کر سکتا ہے؟ اسے حسین کو مقدور کے حوالے کر دینا چاہئے۔ آخر مقدر کے سوا وہ کس شے کا سہارا لے سکتا ہے؟

حسین نے پھر کہا۔ ”پدر محترم زاوی کی زندگی تن آسانی ہے۔ صرف اومحض تن آسانی میں نے کسی جگہ پڑھا ہے کہ بھکشا اور برہمن اپنا گزارہ اس خیرات پر کرتے ہیں جو انہیں گھر گھر جا کر لانی پڑتی ہے۔“ ”بھکشا“ کے ناطے اور صومعہ نشینوں کی زندگی بھی کچھ اسی طرز کی ہوت ہے۔ آدمی کو پہلے اچھا دنیا دار بننا ضروری ہے۔ ان لمنا لکیوں اور مصیبتوں کا جھیلنا جو ایک عام آدمی جھیلتا ہے اور پھر خدا اس پر اپنی عنایت کرے تو ہر شے جب اس کی بنائی ہے تو اس سے اجتناب کیوں؟ ساری صورت گری جب اس کی ہے تو بھاگنا کیسا؟

منصور کو یک بیک یہ تاویل کچھ عجیب سی لگی۔ جیسے اس نے ٹھوکر کھائی ہو مگر اس نے حسین کو ٹوکا نہیں۔ ”کیا آپ بہت ناخوش ہیں؟“ حسین نے منصور کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

منصور کو لگا وہ خود اور اس کے دوسوے سب تحلیل ہو گئے ہیں۔ حسین اگر تجربہ کرنا ایک اور طرح کی زندگی گزارنا اور اچھا دنیا دار بننا چاہتا ہے تو اسے کیا اعتراض؟ صرف اسے اس کا سفر اس کی منزلیں معلوم ہوں تاکہ وہ نامعلوم کے خلا میں بھٹکتا نہ پھرے۔

دو حرقہ کا مدرسہ ایک بڑی درس گاہ تھی جس میں داخلے کی شرط صرف عمر اور کمال فن حرب کے لئے شوق وافر تھی۔ یہاں سے بہترین

تر بیت یافتہ لوگ حکومت کے نظم و نسق میں معاوب نائے جاتے تھے۔ بہادری اور تلواروں سے کھیلنے کا حوصلہ رکھنے والے نوجوان یہاں عزت پاتے تھے۔ دیانت، شرافت اور حوصلہ مندی کو بے تعصبی سے پرکھا جاتا تھا۔ ذہانت اور معاملہ فہمی ضروری تھی۔ خوددار اور غیور لوگ یہاں کا سرمایہ تھے۔ ذاتی وجاہت لازم تھی کہ عوام سے رابطہ کے لئے یہ فخر و مباہات کے بغیر اپنا اثر رکھتی تھی۔ خدش خلقی اور خوش اطواری سے جودل جیتے جائیں وہ تلواروں سے بھی ناممکن ہوتے تھے۔ آگے بڑھتے رہنے کا عزم حوصلہ اور نامساعد حالات میں بھی شکست خوردگی سے بچنے کے لئے کوئی راہ تلاش کرنے والے پسندیدہ ہوتے تھے۔ کوئی کام بھی ناممکن نہیں یہاں کا نعرہ تھا۔ خلیفہ وقت سے عقیدت و محبت تمنغیہ امتیاز تھا۔

حسین نے منصور کو الوداع کہتے وقت نہایت خوشدلی سے کہا ”پدر محترم آپ حسین کو کسی عقب میں نہیں پائیں گے۔“ وہ ہنس رہا تھا اور لمبی دوڑ کے بعد اس کا چہرہ متمایا ہوا تھا۔ سپاہیانہ لباس اس پر خوب بچ رہا تھا۔ ان چند دنوں میں ہی اس کی پڑمردگی خاموشی، خوشی اور مسکراہٹ میں بدل گئی تھی مگر اس کی طبیعت کا خاصا غلو تو موجود ہی تھا۔ دوسروں پر سبقت لے جانے کے وہ محنت اور مزید محنت کرتا تھا۔

”پدر محترم یہ تربیت نفس کے لئے عمدہ جگہ ہے۔ میں معین وقت پر یہاں پہنچا ہوں۔“ اس نے باپ کے سامنے جھکتے ہوئے کہا۔ اس کے پسینے کی خوشبو نے جو مشقت اور صحت یابی سے مل کر پیدا ہوئی تھی، منصور کو انگلی ملاقات تک مدہوش رکھا۔ منصور نے سوچا، وہ یہودی اطباء کی اس شہادت پر اعتبار کر سکتا ہے کہ پسینے کی خوشبو انسان کی کیفیات کی سفیر ہوتی ہے۔ وہ ہجر کی اذیتوں کی شاعری اور المناک جدائیوں کے نوے کسی حسین کے قلم سے نکلے تھے جو اپنی ساری شدت کے باوجود نرم و نازک اور ریشمی جذبات سے بنے ہوئے تھے۔ ادھورے اور ناتجربہ کار سے لفظ جن میں نبضوں پر گزر رہے ہوئے کا کوئی ذکر نہ تھا۔ ہو سکتا ہے وہ محض ایک عارضی کیفیت ہو۔ اب اسے حسین کی طرف سے سکون تھا اور وہ مضطرب لمحے ایک گزر رہے ہوئے دکھ کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ شاہراہ پر ٹھوکر کھا کر وہ سنبھل گیا تھا؟

تند و تیز دور حیات جیسے گرداب میں گرفتار کشتی ہو۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ایک نوجوان کے ضمیر کو نئے سرے سے گوندھا اور بنایا جاتا تھا۔ بظاہر یہ کسی قدر ناممکن تھا مگر اس مدرسے کی روایات ایسی ہی تھیں۔ سپاہی کا کام صرف اور محض احکام پر آنکھ بند کر کے چلنا تھا۔ حسین نے آج تک کتابوں اور نمازوں کے مراقبوں اور ضبط نفس کی تربیت حاصل کی تھی۔ وہ بھی اس کے اپنے خیالات کے مطابق ایک صورتحال تھی جسے اس نے اپنے لئے خود پسند کیا تھا۔ اس پر کار بند رہا۔ یہاں تک کہ وہ دو حرقہ آیا اور سرفروشنوں کے جذبے سے

اس مدرسہ میں شامل ہو گیا۔ دوحرقہ نے بڑے بڑے سالار اور دلاور حکمران پیدا کئے تھے کیونکہ جب کوئی نوجوان یہاں پر شامل ہوتا تو اس کی نس کو کڑی آزمائشوں اور مشقتوں کو چور چور کیا جاتا تھا اور پھر کسی قسم کی ہمدردی اور شفقت روا نہیں رکھی جاتی تھی۔

حسین نہای نازک اور تقریباً بیمار تھا۔ جب وہ یہاں آیا ہے مگر پہاڑی نالوں کو پھلانگنے اور ڈھلوانوں کو بنار کے معینہ وقت میں عبور کرنے میں اس سے کوئی رعایت نہیں برتی گئی۔ سخت جان اور مضبوط بنانے کے لئے یہ بہت ضروری تھا کہ طبیعت کو روں رکھنے کی عادت ڈالی جائے۔ کڑے مجاہدے کی یہ زندگی ریاضت اور محنت سے عبارت تھی۔ جسم و جان کو ایک کرنا ہر گرمی اور سردی کو برداشت کرنا، میلوں پیدل چلنا، آدمی کو اپنے ساتھ اکیلے ہونے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ عبادت میں جو لذت ہوتی ہے، نفس کے ساتھ جنگ کی حالت میں رہنے سے جو ایک گونہ بے خودی حاصل ہوتی ہے وہ کہاں تھی؟ وہ خواب و خیال، ماضی کی عیش کو شمی تھی۔ جاگنے اور سونے کے وقفوں میں اپنے ذاتی اور ضروری کاموں کے لئے بھی مشکل سے کوئی پل نصیب ہوتا۔ تھکے ہوئے جسم کو آرام نہیں سختی کا عادی بنایا جاتا تھا تا کہ ایک کبھی نہ شرمندہ ہونے والی روح کی پناہ گاہ بن سکے۔

ان مشقتوں اور مشقوں نے اعصاب پر بھی عمدہ اثر ڈالا اور حسین کی نظر تیز اور عقل چالاک ہو گئی۔ جب اے ہوش قیا اور امتحان ہو چکا تو آذر گزر چکا تھا۔ سارے پہاڑ برف سے ڈھک چکے تھے اور تیز سرد ہواؤں میں فرات کے پانیوں کی بہتی ہوئی تندی اور نیلا ہٹ تھی۔ وہی فرات جس کے کناروں پر نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دم گھڑا اور اس کے کناروں پر وہ خونیں جگن لڑی گئی جس کو وقت کبھی بھلا نہ سکے گا۔ فرات بیچارگی اور تشنگی اور موت ہے اور دنیا میں ساری جنگیں کسی نہ کسی طور استبداد اور زیادتی ظلم اور ستم کے خلاف جہاد ہیں۔ حسین نے سوچا، میں جو خلیفہ وقت کی عزتوں کا امانت دار ہوں۔ میں پتہ نہیں کس فوج میں شریک ہوں۔ حسین ابن علی کے مخالفوں کی صفوں میں یا ان کی معاونت کرنے والوں میں مگر حسین ابن علی کی معاونت کے لئے کون پہنچا تھا؟ صحرا کی تندو ظالم آندھیاں، پانی جو سامنے تھا، مگر سراب تھا کہ ان پر بند کر دیا تھا اور وہ خلیفہ وقت کا تمغہ امتیاز اپنی سینے پر سجائے پھرتا تھا۔ وہ خلیفہ وقت! حسین بن منصور نے سوچا، اگر اہل بیت کی دعوت آج کامیاب ہو تو وقت کے دامن سے خون کے دھبے مٹائے جاسکتے ہیں۔ بتوں کی کھیتی ہری ہو سکتی ہے تو خاک کر بلا بھی دھل سکتی ہے۔ نواح کاظمہ کی ریت مثل پریاں نرم ہو سکتی ہے تو کنار فرات کی ریت تو ملاحت میں کوئی نظیر نہیں رکھتی۔

مگر کیا ابن علی عمدہ سپاہی نہ تھے؟ اس کی سوچ یونہی کبھی کبھار اسے پریشان کرتی تھی۔

حسین ابن علی کا روان حجاز کے قافلہ سالار کر بلا کے شاہ شہیداں۔ وہ سر جو کبھی دوش رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زینت تھا اور

پھر خاک کر بلا اس سے سرفراز ہوئی۔ وہ سر جو فخر جہاں تھا، کیوں شکست سے دوچار ہوا؟

آل عباس نے کیا آل علی کا حق غضب کیا تھا؟

بنو امیہ نے کیا آل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیچھے دھکیلا تھا؟

ایسے میں ایک سپاہی کا منصب کیا ہے۔ اس کی فراست اسے کیا کرنے کی اجازت دیتی ہے؟

ایک عام آدمی جب سوچتا ہے کہ دریا سراب بن گئے تو وہ ان کی بے بسی پر روتا ہے جو سربابوں کو دریا بنانے کا حوصلہ رکھتے تھے، وہ جن کی نگاہوں سے تقدیریں بدل سکتی تھیں۔ کس وعدے کو نبھانے کی خاطر کس چراغ کو فرواں کرنے کے لئے کر بلا میں تیروں کا نشانہ بنے۔ پانی کے لئے پریشان ہوئے اور ایک بڑی فوج کے مقابلے میں ڈٹے رہے۔ ایک ایک کر کے نوخیز اور جوان کٹ کٹ کر گرتے رہے۔ کب بارگاہ خداوندی میں طوفان نہ آیا؟

کیا عرش ہل نہ گیا؟

رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگران نگاہوں نے دیکھا کہ فاطمہ کے درمیتیم کو فدی کی طرف کوچ کرتے ہوئے گھیر لئے گئے۔ زندگی اتنی اہم کہاں ہے؟

زندگی کیا ہے کہ حسین ابن علی کو بچا یا نہ گیا اور حسین اپنے کس وعدے کو نبھا رہے تھے۔ ان کو یہ قربانی بہر حال دینا تھا تا کہ قربانیوں اور سرفروشیوں کا مذہب رواج پاسکے۔ مذہب عشق کی تبلیغ اس سے سوا آخر کیسے ہوتی؟ اگر کوئی کمتر شخص دست کر بلا میں کنارہ فرات اپنے خاندان کی حفاظت کرتا ہو امارا جاتا تو اس کے اتباع کے لئے کون نکلتا؟

اہل بیت کو پوری زندگی کے اضطراب کے بالواسطہ باعث تھے کہ ان کی وجہ سے فرقے اور خیال اور فرقیں معرض وجود میں آئیں مگر وہ تو علم و مذہب کی ترقی کے لئے مزاج خانقاہی میں پختہ ہو گئے۔ رقص زندگی میں ان کا حصہ کم تھا۔ سیاست کے کھیل میں وہ چوگان بازی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ فضیلتیں ان پر قربان اور وجاہتیں ان پر نثار تھیں۔ وہ سارے واسطوں سے اس سلطنت کے رکن رکین تھے مگر دنیا کو اپنی ٹھوکر پر سمجھتے تھے۔ وہ اس کے حصول کے لئے ہر گز سرگرداں نہ تھے مگر جب کبھی جو ر و ظلم زیادتی اور استبداد نے پاؤں پھیلائے انہوں نے اپنی تلوار نیام سے باہر نکالی۔ ان کا نام اور لوگوں نے سر منبر سجا کر مقعد حاصل کئے اور ابو مسلم خراسانی نے آل عباد کے لئے راہ استوار کی۔ پھر خود دعویٰ خدائی کیا اور مارا گیا۔

واقعات کا سمجھ میں نہ آنے والا ایک بحر محیط تھا۔ سیاہ اور بے موج اندھیروں سے عبارت جو روشنی کے ساحلوں کو کہیں چھو جاتا

تھا۔ سو سوچتا رہتا ”کیا آل عباس حق پر ہیں؟“ کیا وہ خلیفہ وقت کا تمغہ امتیاز اپنے کندھے پر سجائے ہوئے وفاداری کا ثبوت دے رہا ہے۔ دو حرقہ نے اسے بے سوال وفاداری کا سبق سکھایا تھا۔ اسے اتنا زگید اتنا زامروڑا اور ایک نئے شخص میں تبدیل کر دیا تھا مگر اس کا دماغ اب بھی سوچتا تھا ’غلط یا صحیح مگر سوچتا تھا‘ وہ کیا کرے؟
اسے وہ شعر یاد آئے۔

پھر مجھے میرے بھائی نے آواز دی اور یہ اس وقت جب
شہسوار میرے اور اس کے درمیان حال ہو چکے تھے
اس کی آواز پر لپیک کہتے ہوئے جب میں اس کے پاس پہنچا تو
نیزے اس کے بدن میں اس طرح پیوست ہو چکے تھے جیسے
جولا ہے کے آہنی کنگھے بنے جانے والے پھیلائے ہوئے
کپڑے میں پیوست ہو جاتے ہیں

ملک کے طول و عرض میں بغاوتیں پھیلی تھیں اور دو حرقہ کے نواح میں قرمطی اپنے عقائد اور ایمان کی وجہ سے امن و امان کے لئے
خطرہ بنے ہوئے تھے۔ یہ فتنہ اس فتنے کے سوا تھا جو بصرہ کے نواح بحرین اور خلیج کی ریاستوں میں پھیلا تھا۔ اس وسیع سلطنت کے
لئے ایک نہایت باہوش اور بلند حوصلہ خلیفہ کی جو فراست سیاست اور تدبیر میں ارفع ہو ضرورت تھی۔ خود دربار بنی ہوئی وفاداریوں اور
دولت کی لپیٹ میں تھا۔ ایسے میں کسی کی وفاداری ضروری تھی۔ سپاہی جب حق کے لئے لڑے تو بے تنغ بھی لڑ سکتا ہے، مگر حق کس طرف
تھا؟

ایسے وقتوں میں تلوار سب سے زیادہ بے نیام ہوتی تھی جب اسے نیام میں رہنچ کی ضرورت تھی!
قرمطی اپنی دعوت اتنی سرعت سے پھیلا رہے تھے کہ گمان ہوتا تھا ایک نیا دین یورش کر کے آیا ہے اور اسلام کو صرف بغداد کے
نواح میں محدود کر دے گا۔ حاجیوپ کے قافلے لوٹ لئے جاتے تھے۔ یہ قرامطہ کون تھے؟
عیسائیوں اور یہودیوں کی مشترکہ کوششیں تھیں کہ اسلام میں رخنہ اندازی کی جائے۔ وہ صحرائشینوں، بدویوں اور ساداتوں پر اگر
کسی عظمت کو مسلط کر دیں جو بظاہر اسلام سے میل رکھتی ہو مگر اصل میں اس سے جدا ہو تو لوگوں کے دلوں کو پھیرا جاسکتا ہے۔ ان
سازشوں نے نئے مذاہب ایزاد کئے تھے۔ نئے پیغمبر نئے راستے۔

”قطائیت، عدنائیت، بکریت، ہاشمیت، امویت، عربیت اور قومیت کی آگ مسلمانوں میں کوہ آتش فشاں کے لاوے کی طرح اندر ہی اندر سلگ رہی تھی جو حکام کی سیاست اور نظام حکومت کے لحاظ سے ہلکی اور تیز ہوتی رہتی تھی اور اس ساری تنگ و دو کا مطلب قیادت اور امامت تھا۔ جو شخص زمانہ جاہلیت میں سردار تھا وہ اسلام میں بھی سردار بننا چاہتا تھا۔“

سرداری کی اس آرزو نے نئی راہیں کھولیں۔ پھیلی ہوئی سلطنت جیسے دریا کا پانی منبع پر تو شفاف اور میٹھا ہوتا ہے مگر اندریوں نالوں کے ملنے سے جیسے گدلا ہوتا چلا گیا اور تیسری صدی ہجرت تک تو اس کی غلاظت کیچڑ کے مشابہ تھی جس میں نہ گھاس اگتی ہے نہ پھول کھلتے ہیں۔

جب معتضد بڑے بڑے جوئی مدرسوں کا معائنہ کر چکا تو دوحرقہ کی باری بھی آئی۔ خلیفہ بنفس نفیس کسی درسگاہ کا معائنہ کرے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔ نسطوریوں نے اپنی خانقاہوں میں خلیفہ کی درازی عمر کے لئے خصوصی دعائیں کروائیں اور اس بہادر و دلیر اور دانا حکمران کے لئے جو سپاہیانہ اوصاف رکھتا تھا دوحرقہ کے مدرسے میں آمد پر سب اضطراب اور چہل پہل تھی۔ قرے کو آراستہ کیا گیا تھا اور اس کے لئے جو سفاح ثنائی کہلاتا اور عباسیوں کی نشاۃ ثانیہ کا باث ہوا تھا۔ بہت گرمجوشی کا مظاہرہ کیا گیا۔

حسین کو یہاں آئے ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا تھا۔ طلبہ چھوٹے چھوٹے دستوں میں بٹے تھے۔ پیشوائی کے لئے تیار ضبط و نظم سے بہترین قطاروں میں ایستادہ جوانوں کے چہرے پر صبح کی تیز دھوپ میں متمنائے ہوئے اور تلواروں کی طرح چمک رہے تھے جو ان کے ہاتھوں میں بے نیام تھیں۔ خلیفہ کا گھوڑا بڑے دروازے کے سامنے ٹھہر گیا۔ یہ ایک بہترین عربی شہسوار کا مرکب تھا۔ سدھا ہوا پتلی کمر والا شیر کی طرح پر غرور چتون جنگ میں بجلی کی طرح دشمن کی صفوں کو چپنے والا۔ سارے سپاہی خلیفہ کے سامنے سے گزرتے رہے۔ حسین بھی گزر رہی جاتا مگر معتضد نے اسے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

”کیا تم اس گھوڑے پر سوار ہو سکتے ہو؟“ اس بے باکیوں اس کے ہاتھ میں دینے کا حکم دیا۔

حسین نے دائیں بائیں دیکھا کہ وہ کیا کرے؟

خلیفہ نے پھر حکم دیا۔ ”اس پر سوار ہو کر اقامت گاہ اور مدرسے کا ایک چکر لگاؤ۔“

پتہ نہیں ایسا عجیب و غریب حکم کیوں دیا تھا۔ حسین نے ابھی گھڑسواری کی وہ تربیت حاصل نہیں کی تھی مگر نہ ہی کوئی درس اور نہ ہی کوئی تربیت دینے والا اس کی کوئی مدد کر سکتا تھا۔ وہ اس کی کمزوری کو جانتے تھے۔

حسین نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کیں اور اسے تستر میں بہل بن عبد اللہ کے درس میں گزارا وقت یاد آیا۔ اپنی گستاخی یاد

آئی اور وہ وسائل جن کو سمجھنے کی کوشش اس نے کی تھی۔ مخفی رازوں کے وہ حروف یاد آئے اور ان کے درپردہ قوتیں اس پر تجلی کہ طرح منکشف ہوئیں۔ ان سارے اسموں میں وہ اسم اعظم جو لڑکپن کی وجہ سے اس کی ذہن سے پھسل گیا تھا اور گھوڑے نے اس کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔ اس کی سرکشی غائب ہو گئی۔ بھیڑ کے بچے کی طرح نرم خون کراس نے حسین کو اپنے پر سواری کی اجازت دی اور اقامت گاہ مدرسہ سب بیک وقت اس کا ایک قدم تھے۔ وہ سنہری ایال پکڑ کر اتر اور خلیفہ کے سامنے زمین بوس ہونے کے لئے جھکا ہی تھا کہ متعصّد نے اپنے ہاتھ سے اسے اپنے سامنے کھڑا کر لیا اور حیرت سے اس کی ان بے پناہ آنکھوں میں دیکھا جن میں دیکھنے سے لگتا تھا کہ آدمی ان میں ڈوب رہا ہے۔ سحر کرتی ہوئی مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ بہت کچھ جانتی ہوئی اور پھر بھی دھلی دھلی معصوم لگا ہیں۔

”کیا تم اس سے پہلے ایسے گھوڑے پر سوار ہوئے ہو؟“ اس نے سنہری ایال پر ہاتھ پھرتے ہوئے پوچھا۔

”امیر المومنین یہ اس درس گاہ میں میرا پہلا سال ہے۔“ حسین نے ادب سے سر جھکا کر جواب دیا۔

متعصّد حیران ہوا۔

”کیا تم کسی اور گھوڑے پر سوار ہو سکتے ہو؟“ اس کی آنکھوں میں دلیری کے لئے تحسین تھی اور تجسس بھی۔

حسین نے سرخم کیا تو یہ اس کا امتحان تھا۔ آزمائش۔ تستر میں گزرے ہوئے ماہ و سال شیخ کامل کی نظر کرم سب اس کے ساتھیوں کی خاطر جمع ہو گئے۔ ہمت بندھاتے ہوئے بلند و بالا اور سرکش گھوڑا لایا گیا۔ ساری نگاہیں حسین پر مرکوز تھیں اور حسین کی نگاہ کسی اور پر تھی۔ ملتی بھی نہیں صرف منتظر۔ وہ امیدوار اور یقین کامل کے ساتھ کھڑا تھا۔ جیسے کھلنڈرے لڑکوں کی ٹولی میں آن پھنسا ہو۔ اس کی پیشانی پر شکن تک نہ تھی۔ وہ خوفزدہ نہ تھا اور آنے والوں کو یہی بات پریشان کر رہی تھی۔ مدرس دل ہی دل میں اس کے لئے دعا کر رہے تھے۔

پھر سارا راستہ ایک قدم ساری نگاہیں دم بخود اور غضبناک جانور پالتو کتے کی طرح جو خانہ بدوشوں کے قافلوں کے عقب میں دم دبائے چلتے ہیں اس کے سامنے بے ضرر تھا اور حسین نہ ہی پر غرور اور نہ ہی فاتح، صرف خدا کے احسان کا پروردہ ناظرہ۔ وہ اسم اعظم بار بار اس کی رگوں میں خون کی روانی کے ساتھ اس کی رگ جاں جان کی روشنی روح میں ان سن سنے نغمے کی طرح تھا۔ الست برکم قالو ملی۔

محبت کا کبھی نہ ختم ہونے والا نغمہ جو عرش فرش ارد گرد ایستادہ لوگوں کے دلوں پر مادی اور غیر مادی شے میں جاری و ساری تھا۔ محبت

جو فاتح عالم ہے اور دنیا جو بس ایک قدم ہے۔ ایک جست، دنیا دار بننے کی مشقت کتنی مضحکہ خیز ہے۔ کیا اس کی تربیت نفس ہو سکتی تھی؟ خلافتیں، بادشاہتیں، شورشیں، جدوجہد اس سب کی ماہیت کیا تھا؟ خالق کل نے کتنے تماشے بنائے تھے۔ سب سے بڑا تماشا تو انسان تھا کہ یزدان کو کمند میں لانا چاہتا تھا۔ ہمت مردانہ مضحکہ خیز!

مگر اغول مضحکہ نہ تھی۔ وہ تو تھی کہ اس کی ہستی کو تہس نہس کرے۔ اس کے انہماک کو درہم برہم کرے۔ اس کے اندر روشن آگ کو لپکتے ہوئے شعلوں میں بدل دے۔ محبت کا نغمہ اس کی وجہ سے تھا۔ اسم اعظم کا ساز اس کے اندر منجمد تھا۔ جیسے برف باری میں ہر شے جہاں ہے وہاں پر ہوتی ہے۔ پھر وہ نام اسے طوفان سے آشنا کرتا۔ موت کی مانند زبردست شور قیامت سنا اور سیاہ گھٹاؤں کے اندھیرے کی طرح اس پر چھا گیا۔ وہ ایک لمحہ جب اس کی آنکھوں نے ان آنکھوں میں جھانکا تھا۔ گزری اور آنے والی قیامتوں کی تفسیر بنا۔

مرغزاروں کی قمریو

میں اس بوجھ تلے اسیر ہوں جو تم نے مجھ پر رکھا

عشق کے عذاب کو برداشت کرنا نوشتہ تقدیر کو مٹانا

کون کر سکتا ہے

غم عشق اور سوز نہاں دینے والے

اے کاش تیار دار بھی ہوتے

اس کی بے رخی نے میرا دل پارہ پارہ کر دیا

ہاں مرغزاروں کی قمریو

میں عشق کا اسیر ہوں

اس کے دل کی مسجائی کون کرے گا کہ وہ اس مکمل محبت کی گھڑی میں پھر اس کے دل میں در آئی تھی۔ وہ کبھی اس پر فتح نہ پاسکے گا۔ کبھی اپنی اسیری سے رہائی کی طرف ایک جست ایک قدم میں جانہ سکے گا۔ کیا اسے تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ وہ کہیں تو ہوگی۔ اپنے باطن کی دھندلائی ہوئی آنکھ سے وہ اسے ڈھونڈے گا۔ کمزور بینائی والی اس کے اندرون کی آنکھ۔

معتضد نے ایک لمبی خاموشی کے بعد جو ہزاروں سالوں پر محیط تھی، کہا ”میں چاہتا ہوں اس نوجوان کو دربار خلافت میں کوئی

نہایت عمدہ عہدہ دیا جائے اسے ہمارے قریب رکھا جائے۔ اس کے فرائض کا ہم پھر تعین کریں گے۔“

وہ جانے کے لئے مڑا، رکا، پھر چلا، پھر حسین کی طرف آیا۔

تم پر خدا کی خاص رحمت ہے۔ میں اس کے لئے تمہیں مبارک دیتا ہوں۔ حسین نے سر جھکا لیا۔

نسطوری عیسائیوں کے قریے دو حرقہ میں جہاں کلیساؤں کی تعداد زیادہ تھی، خصوصی عبادت کی گئی۔ شادیانے بجائے گئے اس قریے کی خوش بختی تھی کہ وہاں وقت گزار تھا۔ اپنا خاص گھوڑا اس کو سواری کے لئے عنایت کیا تھا، وہ کتنے مہربان تھے۔

دو حرقہ کے مدرسہ کو امیر المومنین کے حکم سے ایک بڑی فوجی چھاؤنی میں تبدیل کرنے کے احکامات صادر کر دیئے گئے اور مدرس اعلیٰ کو اس کا سربراہ بنادیا گیا۔

حسین پر خود اپنا راز آشکار ہو رہا تھا۔ جیسے صبح کا ذب میں سفیدی کی ایک موہوم لکیر دن کے آنے کی خبر دے۔

دو حرقہ سے وہ منصور کے ہمراہ بیٹھا آیا تھا۔ وہ ساری مانوس چیزیں جو سرائے کے ضمن میں اس نے اپنے بچپن میں دیکھی تھیں، ابھی تک وہیں تھیں۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ وقت ٹھہرا ہوا تھا اور بستی کی آوازوں، خوشبوؤں میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بہمن کے ان دنوں میں پرندے ایسے چچکھاتے تھے جیسے احسان کا بوجھ اتار رہے ہوں۔ نیند سے بوجھل دبی دبی آوازیں خوشی کی چپکاروں کی جگہ ڈال ڈال پھدکنا اور مل کر شور مچانا جیسے جھگڑا قبیلہ ہو موقوف۔ دشت سوس کی طرف سے بخ کرنے والی ہوائیں چلتی ہیں اور گاہ گاہ برف گرتی ہے۔ اس انتہائی شدید موسم میں آگ بہت مزہ دیتی ہے۔ درمیان کے کمرے میں الاؤ کے سے ڈھیرے جلتے ہوئے مظہر زندگی، راحت بخش سکون اور طمانیت، قابل پرستش بستی کے لوگ اس سے ملنے دیکھنے کے لئے آ رہے تھے۔ اس کے ماموں کی بیٹیاں چھوٹی اور بڑی نہایت خوش گھوم رہی تھیں۔ ایک تقریب کا سماں تھا۔ محبت کی گہما گہمی اور شوخی۔ باتیں اور حالات اور ذرا ذرا اسے واقعے، ایسے اور سریتیں وہ سب کے لے باعث فخر تھا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ دار الخلافہ روانہ ہونے والا تھا۔ ہو سکتا ہے وہاں جا کر وہ سب کو بھول جائے۔ دربار بڑا شہر، اخلاق عادات، آداب رکھ رکھاؤ، منصور اس اعزاز پر مسرور ضرور تھا مگر ایک خوشی وہ بھی تو ہوتی ہے جو آدمی کے جی کے اندر سے نکلتی ہے۔ وہ کہیں نہیں تھی۔ ایسے مکمل وقت میں اس کو کیا چاہئے تھا؟

جب رات بھیگ گئی، مہمان سو گئے۔ روشنیاں بجھا دی گئیں تو حسین نے پوچھا ”میں دادا کے اس آتش کدے کو دیکھنا چاہتا

ہوں۔ میں دادا کی خوشبو اپنے گرد محسوس کرتا ہوں۔“

منصور نے کمرے میں قالینوں کے نقش و نگار کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”جان پدر! اب رات گہری ہو گئی ہے پھر کسی وقت چلے جانا۔“ حسین نے کہا ”نہیں“ میں ابھی اسی وقت وہاں جانا چاہتا ہوں۔ آدمی کے پاس ہوتا ہی کیا ہے سوائے خوشبو کے۔“ منصور دل گرفتہ سا بچھے ہوئے الاؤ کے پاس بیٹھا رہا جس میں کوئی چنگاری سفید راکھ کا پردہ اٹھا کر جھانکتی۔ بجھی ہوئی آگ میں سے صرف یہی راکھ کا دل رکھنے کو مسکراتی۔ مسکراہٹ اور خوشبو محمی کی موجودگی میں سے صرف حسین نے کیوں محسوس کیا۔ اس نے کیوں یہ نہیں جانا کہ ایک عمر گزارنے کے بعد روحیں کبھی کبھار اپنے مسکنوں کو دیکھنے آیا کرتی ہیں۔ مکینوں کو چاہتیں بانٹی ہیں۔ یاد کے لہریں میں رنگ بھرتی ہیں۔ جو زندہ ہیں وہ گزر رہے ہیں جو گزر گئے ہیں وہ اب کہیں نہیں جائیں گے۔ موت ان کے لئے اب نہیں ہے۔ اپنی افادتی کھو چکی ہے۔ ایک قدم اور جیسے پہاڑے کی اوٹ سے ایک موڑ سے نکلے تو دور تک پھیلی وادیاں ہوں۔ سرسبز اور گنگنا تے چشموں سے سیراب ہوتی ہوئیں۔ اب ان کے لئے خوف کی کیفیت اور حزب سب کچھ ختم ہو گیا۔ وہ نظروں سے اوجھل تو ہیں مگر اس بیکراں کائنات کا حصہ ہیں۔ وقت پر اور فاصلے پر ان کا تصرف ہے اور اس کے جی میں موت کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ مقید سے بیکراں بننے کی فضا میں آزاد گھومنے کی۔ موت کی زندگی بخش خواہش لامتناہی لامتناہی عظیم خواہش۔

حسین واپس آ کر قالین کے حاشیے پر بیٹھ گیا۔ کچھ کہے بنا خاموش افسردہ۔ اچانک وہ لمحہ کہیں سے آن دھمکا تھا اور منصور گاڑی لے کر واپس آئے تو محمی نہیں تھا۔ وہ گاڑی جو کسی ہندی سوداگر سے خریدی گئی تھی بیلوں اور پردوں والا رتھ اور صورتیں جو ابھی نکل کر باہر آئیں گی۔ پھر کرشن کہیں سے کسی کنج میں سے برآمد ہوں گے۔ یلے بدن والے مرلی کتان والے کنہیا اور وہ ان گویوں کے ساتھ راس رچائیں گے۔ کاہنا کی مرلی کی تان پر ساری دنیا ناچتی ہے۔ اس دھن کو سن کر مدہوشی طاری ہوتی ہے اور اس کے اندر کے کمرے میں جہاں کبھی آتش فروزاں رہتی تھی اب مکمل اندھیرا تھا۔ جیسے اس پر بھی مدہوشی طاری ہو۔ دادا کی یاد میں اسے ہمیشہ جلائے رکھنا چاہئے تھا۔ یاد جہنم ہی نہیں جنت بھی ہے۔

”تمہیں دادا یاد آ رہے ہوں گے؟“ منصور نے بالآخر پوچھا۔

”آپ نے تو وہ ان کی یاد کو مٹا دیا ہے۔ رہنے کہاں دیا ہے؟“ حسین نے آہستہ آہستہ کہا۔

منصور بڑی پھسکی ہنسی ہنسا۔ ”یاد تو یہاں ہوتی ہے۔“ اس نے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

”چیزوں کی اپنی عصمت ہوتی ہے۔ حسین نے کہا۔

”جب میں ایک یقین سے دستبردار ہو گیا ہوں تو اس کو برقرار رکھنا نہیں چاہتا۔“ منصور نے کہا۔

”میں اس قطعیت کے خلاف ہوں، وہ داد کا مسلک تھا۔ یہ سرائے ان کی ہے۔ یہ ان کا مسلک و مولد ہے۔ آثار مٹا دینے سے چیزیں مٹ نہیں جایا کرتیں۔ دلوں میں زندہ رہتی ہیں۔ ہم اپنے خون کو اپنی رگوں سے کیسے الٹ دیں گے۔ ہم ان امانتوں کو بہتر صورت تو دے سکتے ہیں، جھٹلا نہیں سکتے۔“ وہ سانس لینے کو رکا۔ ”سارے مذہب خدا کی عثمت و بزرگی پر دلالت کرتے اور گواہی دیتے ہیں۔ آگ خدا کی ایک عظمت ہے مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنی ذرا سی فروگزاشت کا اتنا برا منا لو گے۔“ منصور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”پدر محترم! میں برا منانے کی جرات نہیں کر سکتا۔ صرف اس بات سے مجھے تکلیف پہنچی ہے۔“ وہ بھی اٹھا۔ ”چلو آتش کو تمہارے دادا کی یاد میں پھر فروزاں کریں۔“ منصور نے بیٹے کا ہاتھ پکڑا۔ ”برزواہ وہاں ہے۔“ حسین نے سر جھکا کر کہا۔

منصور دیر تک اپنے بیٹے کی طرف دیکھتا رہا جو اس کے لئے ایک معمر سے کم نہیں تھا۔ جسے کلام پاک سے عشق تھا جو اپنی عبادتوں، ریاضتوں، مجاہدوں میں غلو کرتا تھا۔ جو نہایت نیک دل اور پاک باز تھا اور جس کی شاعری لودیتے ہوئے جذبات لاوے کی طرح آگ پھینکتے ہوئے خیالات اور نغمے سے عبارت تھی۔

رات ایک پہر باقی رہی ہوگی جب سرائے کا بڑا دروازہ زور زور سے پینا گیا۔ منصور نوافل میں مصروف اور اپنے پروردگار کے حضور جھکا ہوا اپنی جان کی ساری پکاروں سے اپنی خاکساری طاقتوں سے اپنے جذبوں کی ساری شدت سے اپنی سوچ کی ساری عظمتوں سے اپنی جبین نیاز کے پر شوق سجدوں سے ایک سجدے کی قبولیت کی دعا کر رہا تھا۔ اس بے پناہ خاموشی میں اس کا دل بیدار اور آنکھیں دجلہ و فرات تھیں۔ بارالہی میری خاموشی میں اس کا دل بیدار اور آنکھیں دجلہ و فرات تھیں۔ بارالہی میری خاموشی کو زبان دے۔ میری عاجزی کو میری دعا کو سن۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والا مکالمہ جو اس کی جان کو کبھی کبھار عطا ہوتا تھا۔ قوت گویائی کے بنا لفظوں کے الٹ پھیر سے ماوراء ہوتا تھا۔

جبشی غلام نے پٹ کھولا تو طوفان کے طاقتور جھونکنے کے ساتھ سردی اور دشت سوس کا خشک غبار اور آب ذریعی سے بھری جھاڑیوں اور روئیدگی اور بستی کے باغوں اور برف اور صحن میں سرشام ختم ہونے والی دعوت کی بہاری خوشبو ایک ساتھ درآئے۔ آقائے رازی کنیزوں کے ایک غول کے ساتھ اترے ہیں۔

منصور نے کردستانی اولن کا نرم جبہ اپنے گرد لپیٹا اور دالان میں نکلا۔ اسے آقائے رازی سے ملے زمانہ ہو گیا تھا۔

منصور نے خوش آمدید کہہ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ اس سے لپٹ گیا۔

کنیزیں، محمی کی آتش فروازں سے فیض یاب ہونے کے لئے جب نیچے جا چکیں تو وہ دونوں دالان میں ہو بیٹھے۔ تندہ و تیزی

شوریدہ سری اور ہڈیوں کا گودا جمادینے والی برف بار ہوا کا زور کچھ کم ہوا تھا۔ قبوے کے فجان میں سے خوشگوار بھاپ نکل کر بننا بھکے اور روشنی میں بنانا کیس بائیں لرزے اور کانپے سیدھی اٹھ رہی تھی۔

”دنیا کی شاہراہوں پر گھومتے ہوئے مزرع گلاب تک آپ پہنچ ہی گئے۔“ منصور نے سادگی سے کہا۔

”آقائے رازی نے قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنستا رہا۔“ آپ کیا سمجھے ہیں؟“

”یہی کہ آخر آپ کی تلاش بار آور ہوئی۔“ منصور نے جیسے اسے یاد دلایا۔

”برادر م تلاش کا ایک عجیب فلسفہ ہے اور یہ سفر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ آپ ایک شے تک پہنچتے ہیں کہ اس سے آگے منزل کا شوق آپ کا اچک لیتا ہے۔ آگے اور آگے رواں دواں بھاگتے رہنا جیسے سراہوں کی طرف بڑھتے رہنا۔ آپ کا خیال ہے؟“ آئے رازی ایک دم خاموش ہو گیا۔

دونوں چپ چاپ فجائنوں میں سے جرمہ جرمہ قبوہ پیتے رہے۔ پھر اذانی سنائی دیں۔ عرش و فرش کو بیک وقت چھوٹی ہوئی صدا مکان وزمان سے بلند۔

دلوں کے دروازوں کو ہولے ہولے دھکیلتی ہوئی۔

دماغ کو سکون بخشی ہوئی بیدار کرتی ہوئی۔

روحوں کو میثاق ازل کا فراموش عہد یاد دلاتی ہوئی۔

انسانوں سے اس کی محبت کا ثبوت کہ وہ اولاد آدم کو اب بھی یاد رکھے ہوئے ہے اور سمجھتا ہے کہ جن ناتوں ذروں کو اس نے خود حسن جاودانی عطا کیا ہے اس کی چمک ماند نہ پڑنے پائے۔

نماز کے بعد آقائے رازی نے کہا ”برادر م! میری تلاش ابھی جاری ہے۔ گو مصر میں رقصاں درویشوں کی دعوت نے جو نتائج پیدا کئے ہیں وہ آل عباس کے لئے نیک فال نہیں ہیں اور آل عباس کا دائرہ اختیار اب سکڑ رہا ہے۔ اندلس کی مغربی خلافت شہنشاہیت بن گئی ہے جو یورپ کے بحر ظلمات کے لئے نور کا مینارہ ہے اور خود ہمارے آس پاس بادشاہتیں ریگستان میں برف باری کے بعد روئیدگی کی طرح اذ آئی ہیں۔ میری اپنی آرزو ایک مضبوط مرکز کی ہے اور میری ساری دعائیں اور دل کی تمنائیں خلیفہ معتضد کے ساتھ ہیں۔ اگر خلافت کا مرد بیمار اب صحت کی طرف لوٹ آئے تو آئندہ کے لئے اسلام کو استحکام نصیب ہوگا۔“

منصور نے کہا ”خلیفہ نہایت پر جوش اور دانش مند ہے۔ جو ہر شناس ہے۔“

”صرف یہی سب کافی نہیں اس کو بے پناہ طاقت اور مضبوط ارادے کے ساتھ اچھے مشیروں اور بے لوث دوستوں کی بھی ضرورت ہے جو اسے میسر نہیں ہیں۔“ رازی نے کہا۔

”قط الرجال تو نہیں ہے۔“ منصور نے کہا۔

”ایک طرح سے تو ہے کیونکہ خلیفہ کے گرد ترکوں کا گھیرا ہے جن کا دربار پر اثر و رسوخ یہودی اور نصرانی طبیبوں اور فلسفیوں کی وجہ سے ہے۔ ہاشمی جن کو خلافت سے ہمدردی ہو سکتی ہے راندہ درگاہ ہیں اور اب ان کا اجتماع مغرب میں ہو رہا ہے جہاں فاطمی حکومت قائم ہو کر رہے گی اور وہ مذہباً اسماعیلی ہیں۔ میں ایرانی نژاد ہوں اور متعصب بھی نہیں مگر دعا کرتا ہوں کہ عربی النسل لوگ دربار میں مضبوط ہوں تاکہ اپنے مفاد کی وجہ سے وہ سلطنت کو بکھیرنے نہ دیں۔“ وہ چپ ہو گیا اور دیر تک سوچتا ہوا خاموش رہا۔

”اصل بات عرب و عجم کی نہیں آقائے رازی۔“ منصور نے کہا۔ ”میرا خیال ہے اسلام سے محبت اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے عشق کافی ہے۔“

”مگر ہر داعی یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے عشق میں استوار ہے اور ہر خود مختار صوبے کا حاکم روح اسلام کا امین بنتا ہے۔ اس سے انفرادی طور پر تو طاقت ہے مگر اجتماعی زور گھٹتا ہے۔ جیسے آپ رودکارواں کو پر آب اور وسیع و عریض نہروں میں تقسیم کر دیں۔“ رازی نے بات ختم کی۔

”منع تو پھر بھی رودکارواں ہی رہے گا۔ نہروں کی آبیاری تو وہیں سے ہوگی۔“ منصور پر امید تھا۔

”نہیں بخدا نہیں یہی تو سب گے بڑا خطرہ اور عذاب ہے۔“ رازی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”آپ بہت مضطرب ہیں کیا کسی بڑے طوفان کی آمد آمد ہے؟“ منصور نے پوچھا۔

باہر سورج دبیز بادلوں کے کناروں کو رنگ دے رہا تھا اور ہوا اپنی چادر کو جھلکتی سرخی کے ذروں کو آفتابوں کی طرح چمکا رہی تھی۔ برف پر قدم دھرتی وہ رقص کے چکروں میں گھومت بجلی کا لہریا کوڑا لہراتی اپنی کمر کو لچکاتی اور سر کو جھکا کر اسے دوبارہ بلند کرتی درباری رقاصہ کی طرح اس کے پاؤں بے آواز ہی دائرے بدل دیتے۔

یہ جوان رعنا منصور کا بیٹا بھی کا پوتا تھا۔ اس کے لودیتے ہوئے سراپے میں کیا تھا کہ دل اسے دیکھ کر بے اختیار ہو گیا۔ محبت سے گھر گیا۔ جیسے نرم جھونکوں کی خشبو مشام جان کو معطر کرے۔ مودب دوزانوں قالین کے حاشیے پر بیٹھے اس جوان ہتے لڑکے کی نگاہ میں مسخر کرنے کی قوت یقیناً ہوگی کہ وہ اس کے لئے دعا گو تھا اور اس سے مخاطب ہونا چاہتا تھا۔

منصور نے دو حرقہ کا چھاؤنی بننے اور حسین کے دربار کے لئے منتخب کئے جانے کا مختصر واقعہ سنایا۔ رازی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نہ اظہار خوشی نہ مبارک باد کا ایک لفظ۔

منتظر اور افسردہ منصور نے بال آخر کہا۔ ”آقائے رازی میں مہمانوں کی خیر خیریت دریافت کروں۔“ اور وہ اندرونی دالانوں کی طرف نکل گیا۔

بہت دیر کے بعد آقائے رازی نے کہا۔ ”برخوردار! کیا تم دربار سے منسلک ہونا پسند کرتے ہو؟ دربار ایک الگ دنیا ہے۔ ایک تاریک سمندر جہاں بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں۔ سیاست کی بساط پر نووارد کے لئے شکست کا امکان زیادہ اور جیت کے مواقع کم ہوتے ہیں، بہت ہی کم۔ اسلام کے سوا وہاں سب کچھ ہے۔“

”کیا تقدیری بدلی نہیں جاسکتی۔“ حسین نے بڑے ادب سے کہا۔

رازی نے بہت غور سے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اس میں جان کا زیاں ہوتا ہے اور وقت کا بھی۔“

”کیا حالات اتنے مخدوش ہیں؟“ حسین نے پھر پوچھا۔

”بظاہر سب ٹھیک ہے، ہوتا ہے رہے گا مگر درون خانہ اتنی بہت سازشیں اور ریشہ دوانیاں ہیں۔ لوگوں کے اپنے مفاد دولت کی دوڑ، پہلی خلافتوں کی سیاسی غلطیاں، داد و دہش کی زیادتی یا کمی، آزاد روی، شراب و شعر سے محبت، راگ رنگ، شخصی اختیارات کی افزائش، اتنے بڑے جال میں یہ سب گرفتار ہیں کہ مجھے اس کے خیال سے ہی خوف آتا ہے۔“ رازی پھر پریشان ہو رہا تھا۔ ”آپ خود سیاست میں شریک کیوں نہیں ہوتے؟“

”میں مشک نافوں اور ریسیم کا سوداگر ہوں۔ ملک ملک گھومتا اور سیر کرتا ہوں۔ مختلف لوگوں سے ملنا سیاست میرا موضوع سخن رہتا ہے مگر اس سیر دینا کو میں کسی شے کے بدلے دینا نہیں چاہتا۔ اس سے ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا۔ اتنی حسین اور بے پناہ چیزیں کائنات میں ہیں کہ ان نارسائیوں کی جو دربار کا شیوہ ہے، میری زندگی میں کہا گنجائش ہے۔“

”بظاہر دربار میں ترقی کے مواقع ہوتے ہیں، اس لئے بہتری اور نیکی کے بھی زیادہ امکان ہیں۔“ حسین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”دریا میں منافع تو بے شمار ہوتا ہے مگر عافیت کنارے پر ہے۔“ رازی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”جان کا زیاں،“ حسین نے سوچا اور جی ہی جی میں ہنسا۔

جب تمہیں سلام محبت پہنچے تو

محبت کے سلام کا جواب تو دو

اور سلام محبت کا جواب ملنا چاہئے

ان کے کارواں نے رخت سفر باندھا جب رات نے اپنے سارے پردے گرا دیئے مجھ پر نظر التفات کرو

وہ ہنسی اور بجلی کے لہریئے کی سی دانتوں کی چمک نے میرے غم کے نہاں خانے میں جھانکا۔ اسے روشن کیا۔ میں اس کے دل میں ہوں یہ کافی نہیں کہ وہ مجھے دیکھ لیتا ہے۔

اغول کو وہ بھی نہیں بھلا سکے گا۔ دربار میں ٹھہرنا اور منتظر رہنا۔ سفر کرتے رہنے اور ہر لمحہ ناممکن سے ناقابل حصول سے ملنے کے امکانات۔ سفر کرنا اور ہواؤں کی طرح دنیا کے کناروں تک گھومنا۔ سوداگر بننے میں سودو زیاں ہے۔ حاصل سے محبت ہے۔ سب کچھ لٹا دینے اور بدلے میں کچھ نہ چاہنے میں کتنا مزہ ہے۔ کبھی کبھار یہ دل جو جل اٹھتا ہے جیسے خس و خاشاک کو چولے کا قرب حاصل ہو جائے۔ آخر یہ کیا ہے۔ وہ کیوں اغول کو بھلا نہیں سکتا؟ جب وہ سونے کے لئے لیٹتا تو سنہری بالوں کا دھارا جس میں زرد چاندنی گندھی ہوتی اس پر گرنے لگتا۔ یہاں تک کہ وہ بحرِ خار کی طرح اسے ڈھانپ لیتا۔ موجیں اور لہریں اسے ایک تنکے کی طرح پٹختیں اٹھاتیں کبھی جھولا جھلاتیں یہاں تک کہ چھوٹے کتے کے بالوں میں سسکیاں لیتی رات مد ہوش ہو جاتی اور وہ سو جاتا۔ وہ آزاد ہونا چاہتا تھا۔

قافلے ایک جگہ دے دوسری جگہ رواں رہتے تھے۔

لئے ہوئے کاروانوں کا مال غنیمت بھی کہیں بکتا تھا۔

حسین نے سوچا وہ کیوں نہ سفر کرے اور اپنا نصیب آزمائے۔

منصور اور آقائے رازی دونوں واپس آئے تو اسے ایک قالمین کے پاددو زانوں پایا۔ مستعد اور ہوشیار۔

برادرِ م میں نے ان کے لئے جو دیا ہے سودیا ہے اور چونکہ یہ راہباکس ہیں میں چاہتا ہوں انہیں نصیبین پہنچا دوں اور خود اپنے راہ جاؤں۔ کیا کوئی کارواں یہاں سے نصیبین جانے والا نہیں ہوگا؟

”آج کل شاہراہیں خاموش ہیں۔ قافلے کم ہی کم ایسے راستوں پر چلتے ہیں جہاں انہیں دوسرے قافلوں سے ملنے کا امکان نہ

ہو۔ ہو سکتا ہے ایک دورِ روز میں کوئی بڑا کارواں آ ہی جائے۔“ منصور نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

بادل دھوئیں کے مرغولے چکروں میں اوپر ہی اوپر چڑھ رہے تھے۔ رات کی برفباری کے بعد سورج نکلا اور پھر بوندیں پڑنے لگیں۔ آسمان نظروں سے پوشیدہ ہو گیا اور اندھیرے کے ساتھ جو ماریاہ کی صورت بستی کے باغوں پر جھکا ہوا تھا، گھروں میں رات ہو گئی۔ پرندے بے چین ہو کر اپنی لمبی اڑانوں سے واپس پلٹنے کی کوئی صورت نہ پا کر چیختے چلاتے پتوں میں چھپنے لگے اور زور زور سے بولنے لگے جیسے کوئی آفت آنے والی ہو۔ ایک دم بوندیں اور اگلے چاروں طرف یورش کر کے آنے والی فوجوں کی طرح برسنے لگے۔

آقائے رازی نے کہا: ”ہماری بد قسمتی اب راستے نہریں بن جائیں گے اور روانگی نہایت مشکل ہو جائے گی۔ آپ یہاں پر امن و حفاظت سے ہیں۔ یہ آپ کا گھر ہے۔“ منصور نے جواب دیا۔

”نہیں بردارم! میں تو اپنی منزل کا سوچ رہا ہوں۔ سردی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اگر برفباری اور طوفان یونہی رہے تو راستے بند ہو جائیں گے۔“ رازی نے بے صبری سے بارش کر دیکھتے اور دعا کے لئے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ حسین نے نہایت دلچسپی اور آنکھوں میں ہنسی لئے اس سوداگر کو دیکھا جو سیر جہاں پر فخر کرتا تھا مگر خطرات سے گھبراتا تھا۔ دلیر تو تھا مگر حوصلہ مند نہیں تھا۔ یقیناً اس نے برف کا طوفان اور بارش پہلی بار تو نہیں دیکھے ہوں گی۔ ایک راستہ آدمی اپنے لئے منتخب کرتا ہے۔ پھر اس کی دشواریوں سے گھبراتا کیسا؟ آدمی کی ممکنات اور بردات کا اسے خود کوئی تجربہ نہیں تھا۔ وہ اتنا کم عمر تو نہیں تھا مگر اس نے پر امن وقت گزارا تھا۔ صومعہ اور اسباق دو حرقہ اور تھکا دینے والی مشقیں۔ اب تک اس نے ایک گنبد میں رہ کر لڑکپن سے جوانی کا سفر کیا تھا اور اسے اپن آپ کی آزمائش کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ اپنی آزمائش بہر حال ضروری تھی۔ اپنے ساتھ مصالحت سے تو وقت گزارا تھا اب جنگ بھی ہونا چاہئے۔

اغول کی یاد اور اس کا عشق بھی اپنے ساتھ محبت کی دلیل تھا۔ ایک چہرے کی یاد جو دیکھنے پر اچھا لگا اور ذہن پر نقش ہو گیا۔ ہو سکتا ہے اگر اغول اس چاندنی رات میں حوض کے کنارے اسے نہ ملتی اسے یہ کہتی کہ دوسروں کو دیکھا کرو۔ اگر اسے یہ نہ کہتی کہ ”مجھے بھلا نہ سکو۔“ اگر وہ مجبور نہ ہوتی اور اپنے مقدر کی بات نہ کرتی تو یہ چاہت جو اس کی جان کو بیماری کی طرح لگ گئی ہے نہ لگتی۔ سفر کے دوران اس نے اغول کو دیکھا ہی کہاں تھا؟

اسے اپنے آپ سے شدید محبت تھی اور اب بھی اسے اپنے آپ سے محبت تھی۔ اپنا دل اور اپنی جان ہی عزیز تھی۔ اغول کی آخری بات سن کر اس نے ہتھار پھینک دیئے تھے۔ وہ ایک لباد لئے کھڑا تھا اور اغول اس کے خوابوں میں اتر آئی تھی۔ عشق کا ”اسیر“ اس کا جی چاہا اپنا مضحکہ اڑائے۔ اغول نے اس سے کب کہا تھا کہ وہ اسے چاہے۔ اس کی یاد میں سرگرداں رہے۔ اغول نے تو کچھ چاہا ہی

نہیں تھا۔ یہ یکطرفہ غم جاناں بے کار۔ اصل میں اسے اس عیش کوشی کی عادت سی ہو گئی تھی۔ غم کی مئے ناب اسے پلائی گئی تھی اور ایک جرہ ہی اسے مدہوش کر گیا تھا تو میرا ظرف اتنا کم ہے؟ اتھلا؟ نہ گہرا نہ پھیلا ہوا بس ایسے ہی جیسے چیونٹی کے لئے ایک پیالہ دریا ہوتا ہے۔

پانی پر جہابوں کے قافلے رواں تھے خالی پیا لے اوندھے۔

تو اب اس کا دل بھی اغول کی یاد کے بنایوں ہوگا خالی۔ خالی۔ خالی۔

کیا وہ اس ویران دل کو بردشات کر سکے گا۔ اسے لگا جیسے وہ ایک کھنڈر کے کنارے کھڑا شاعر ہے اور محبوب کی بستی کے پاس کھڑا رورہا ہے۔

”اے رفیقوں ٹھہر دتا کہ ہم دخول و جمل کے درمیان سقط الطویٰ میں اپنے محبوب اور اس کے مکان کی یاد میں رو لیں۔“

اسے امرؤ القیس کے قصیدے کا مطلع یاد آیا۔

اور پھر ابن مختر کے اشعار

میری آنکھ کو کیا ہو گیا ہے کہ دیکھنے سے چندھیا جاتی ہے

میرے بعد چاندنی بھی اسے نہیں بھاتی

یا

تیز بارش کے بعد اس باغ کے آذریوں بھول ایسے معلوم ہو رہے ہیں جیسے سونے کی تیل رکھنے کی کنوریاں جن کی تہہ میں خوشبودار مسالے کا گاد بیٹھا ہوا ہو۔

خلیفہ نے معتضد کا دربار جہاں ابن الرومی کی شاعری میں فکری گہرائی اور تخیل کی برتری یکجا تھی اور جسے بدخوا اور خونخوار وزیر ابو الحسین قاسم بن عبد اللہ نے زہر دے کر مار ڈالا تھا۔ یہ ایسی ریشہ دوانیوں کی سرزمین تھی۔ کیا وہ خوش رہ سکتا تھا؟ سیاست اس کا مزاج نہ تھی اور اب وہ دربار کے آداب و اخلاق سیکھنے کے لئے بہت سی عمر گزار چکا تھا۔ دربار کی زندگی جیسے آدمی دریا کے کنارے بیٹھا ہو اور کشتیوں میں سوار لوگوں کو دیکھ رہا ہو جو طمع اور لالچ کے مارے حصول زر کے لئے بے قناعت بے مبر عہدوں اور دولت اور خلیفہ کی نظر کرم کے منتظر ہوں۔ خلافت خود طوفان کی راہ پر تھی۔ طوائف الملوکی اور بد نظمی اس کے باوجود کہ معتضد نے اسے استحکام بخشا تھا مگر رعایا انقلاب چاہتی تھی۔ آل عباسی کی بدخواہی میں نہیں اور نہ ہی اہل بیت کی محبت میں بس یونہی یہ سارے نئے فرقوں کے تماشے جو

ہور ہے تھے ان میں سب سے بڑا فتنہ قمر مطی تھے جن کی طاقت مجتمع اور ارادے بلند تھے۔ وہ مسلمان کے لئے مصیبت کا باعث تھے اور فسق و فجور پھیلانے کا سبب تھے۔

اس نے سوچا آدمی ایک ہی بار پیدا ہوتا ہے۔ ایک ہی بار اپنی پوری قوتوں اور جذبوں کے ساتھ عشق کرتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ وہ عشق سے تمناؤں سے اور جاہ کی خواہش سے بلند بھی ہو سکتا ہے۔ گزر سکتا ہے۔

”اغول“ اس کے دل میں کسی نے پکارا۔

اغول اور خدا وہ اپنا کیا کرے؟ اس دیوانے جذبے کا کیا کرے۔ اس ایک لمحے کا کیا کرے جس نے اسے گرفتار بلا کیا تھا۔ وہ پھر دل ہی دل میں ہنسا۔

میں اپنے مقابلے میں کیسا کمزور ہوں اور کتنا بے بس۔ ہاں وہ خود ہی تو تھا کوئی دوسرا کہاں تھا۔ دوسرا کبھی کوئی نہیں ہوتا۔ ہاں دشمن جاں تو خود حسین تھا۔ حسین بن منصور جسے خلیفہ وقت نے اپنے حضور طلب کیا تھا۔ جو اپنا دوست نہیں بن سکتا تھا وہ بھلا کسی اور کا دوست کیسے بن سکے گا۔

بوڑھے قصہ گو نے سنبانہ کو درست کیا اور اسے کندھوں سے لگایا۔ آنکھیں بند کیں اور گایا

جو جاگتا ہے اسے نیند آ جاتی ہے
جو بنتا ہے اسے گہڑنا ہوتا ہے
بستیوں کے مقدر میں کھنڈر بننا
اور آدمیوں کے مقدر میں موت ہے
یہ الم کی بات نہیں کون ہمیشہ رہا ہے

صرف قصے باقی رہ جاتے ہیں اور داستان سننے اور سنانے والوں کے لئے عبرت کی کہانیاں۔

جو جاگتا ہے اسے نیند آ جاتی ہے۔ کون زندہ جاوید ہے سوائے اس کے جسے نہ نیند ہے اور نہ اونگھ۔

وہ اس گیت کو بار بار دہراتا رہا۔ خود اس کی لے میں کھویا ہوا حالانکہ یہ قصے کا آغاز تھا۔ زرتشتی مغنی مہی کا دوست تھا اور اس کے گزر جانے کے بعد سے کبھی کبھار منصور کے پاس آنکلتا۔ دنوں سرائے میں رہتا۔ برز سواہ کو فروزاں کرتا۔ اپنی عاقبت کے لئے دست بدعا ہوتا۔ اس کے پوٹے آنکھوں پر ڈھلکے ہوئے اور گھنی سفید بھنویں پوٹوں کو ڈھانپنے تھیں۔ چہرہ جھریوں کے باوجود بہت شاداب تھا

جیسے اندرون میں کوئی روشنی اسے چمک عطا کرتی ہو۔ سفید مونچھیں داڑی سے ملی ہوئیں۔ ہالے کی طرح اس چہرے کو گویا گھیرے میں لیے تھیں۔ ہاتھوں میں رعشہ نہیں تھا اور آواز حیرانگیز طور پر بلند تھی اور پر جوش۔ اسے بات کہنے کا سلیقہ تھا جو اس کے سارے سراپے سے مترشح ہوتا تھا۔

حسن نے گیت کے اختتام پر سبنا نہ اس کے ہاتھ سے لے کر قریب پڑے ہوئے چھوٹے سے تخت پر رکھ دیا کیونکہ آقائے رازی اور مہمان قالین پر بیٹھے تھے۔ بستی کے بیشتر لوگ قصہ سننے کے لئے بھیڑ کئے ہوئے تھے۔ گرجتے بادلوں کی وجہ سے لہریئے کے سیاہی کو چہرے نے اور کڑک کی وجہ سے جیسے بجلی کہیں نہ کہیں زمین پر گر رہی ہو۔ دل رہ رہ کر کانپ جاتے۔

سیرغ کے پالے ہوئے سام کے سفید بالوں اور سرخ رنگت والے بیٹے زال کے لئے روداہ کے دراز گیسوؤں نے یہ سارا ہنگامہ کیا تھا۔ یہ قصہ آپ سب لوگوں کی توجہ کا طالب ہے۔

کونوں میں چراغ روشن تھے اور دالان کبھی محل بن جاتا جس میں روداہ تھی۔ سیاہ رات میں زلفوں کی ریشمی سبزھی۔ اس کے لمبے سیاہ بالوں کا دھارا سا اس کے کندھے سے بہنے لگتا جس کے سہارے وہ پیل تن روئیں وژ پہلوان اپنے مقدر کے لکھے تک پہنچا۔ داستان طراز بوڑھا کبھی روتا اور کبھی ہنستا۔ کبھی گرجتا اور کبھی سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگتا۔ کبھی بال نوچتا اور کبھی اکڑ کر بیٹھ جاتا اور گردن دائیں بائیں گھما کر فخر و مباہات سے اپنے چاروں طرف نظر کرتا اور پھر جھک جاتا اور سینہ کو بی کرتا۔

سننے والے اس داستان طراز کے سحر میں گرفتار تھے۔ جذبات اور خیالات، آ حالات و واقعات کے منجھدار میں۔ حسین اپنا سر جھٹکتا، کبھی آنکھیں ملتا۔ کچھ اور سوچنے کی کوشش کرتا مگر وہ گرجدار آواز سے واپس بلائی، اسے مجمعے میں شامل کر لیتی۔ وہ بے چین ہو کر جیسے بھاگنے کے لئے تیار ہو۔ قصہ گو نے ایک لمحہ توقف کیا، اس کی طرف بہت گہری نظروں سے دیکھا۔

”محی کے پوتے حسین دراز زلفوں والی دو شیرازوں سے بچ کر رہنا۔“

آقائے رازی کا قبضہ سب سے بلند تھا۔ لوگ ہنسنے لگے۔ حسین جھینپ کر خاموش اور ساکت بیٹھ گیا۔ دوزانوں ہو کر اس نے سر جھکا لیا جیسے ہمہ تن گوش ہو۔

قصہ گو نے پھر کہا۔ ”وہ ہوش و خرد چھین لینے والیاں تمہاری راہوں سے بھی گزریں گی۔“ وہ بھی آقائے رازی کی طرح ہنسنے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا سفید سر ہنسی کی شدت سے چمک پھیریاں کھانے والی گیند کی طرح گھومتا ہوا لگا۔

منصور نے کہا ”محترم عم اس کے لئے اچھی دعا کیجئے۔ کیا عورتیں ہمارے لئے قابل عزت نہیں ہوتیں؟“

قصہ گو نے ہنسی روک لی۔ ”کیا عورت کی چاہت اس کی بے عزتی ہے؟ کوئی گھنیا بات ہے؟ کوئی کمتر شے ہے محی کے بیٹے؟ جس سمیں تن کے لئے دل جاگتا ہے جس کی محبت پسلیوں میں آگ بھرتی ہے جس کی تمنا میں تم اپنا آپ آربان کرتے اور بھول جاتے ہو۔ وہ تمہیں بیدار رکھتی ہے۔ تم اس کے لئے آنسو بہاتے ہو۔ دنیا کی ساری رنگینی ساری خوشبو اسی ایک جذبے کے دم سے تو ہے۔ محب کو کبھی کمتر نہ سمجھو بیٹھے۔“

منصور نے کوئی جواب نہ دیا۔ لوگ اس دلچسپ گفتگو کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔ باہر ایک دم شور ہوا۔ دالام گھوم گیا جیسے زلزلہ آیا ہو۔ رعد کی کڑک نے دل بدلا دیئے۔ پھر جانوروں کے ہنگامے کتوں کے رونے اور اونٹوں کے بلبلائے گدھوں اور خچروں کے زور زور سے بولنے کی آوازوں سے دالان بھر گیا۔ بجلی صحن کے سب سے صاعقہ قہر بلا کے بعد قیامت پپا تھی۔ محفل درہم برہم ہو گئی۔

آقائے رازی کے رخصت ہونے کے وقت حسین سیادش قصہ گو کے ساتھ اس کمرے میں تھا جہاں آگ کی چنگاریاں مدہم مدہم بس دکھائی دے رہی تھیں اور برز سواہ کے پاس ان دونوں کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ سیادش نے کہا ”میں نے اس دن جو بات کہی تھی تم نے اس کا برا تو نہیں مانا حسین؟“

”نہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔

”تمہیں معلوم ہے جب پھول کھلتا ہے تو اسے دھوپ کے بوسوں کی تپش پہنچتی ہے۔“ بوپنے نے سرگوشی میں کہا۔

”جی۔“ حسین نے سر جھکا کر کہا۔

”آدمی کے دل کے پھول کے لئے محبت بھی ایسا شہد آگیں بوسہ ہے۔“

”اگر میرا آجائے تو۔“ حسین نے بہت ہولے کہا۔ ”آدمی کوشش سے کبھی کسی پر فدا نہیں ہوا۔ آدمی محض اپنی کوشش اور طلب سے خدا سے بھی محبت نہیں کر سکتا۔ ہاں اگر خدا اس پر اپنی رحمت کرے۔ اپنا یہ بہت بڑا راز اس پر آشکار کرے۔ اسے اپنی طرف بلائے۔ اس کے جی میں اپنی چاہت جگائے۔ عشق اول در دل معشوق پیدا مے شود۔“

سیادش بغیر کوئی جواب دیئے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”تم دربار خلافت میں جا رہے ہو؟ میرا مطلب ہے اس اعزاز اور سرفرازی کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہے ہو؟“ اس نے بال آخر پوچھا۔

”حسین چپ رہا تو اس نے پھر کہا: ”دربار ریشہ دوانیوں پر اسرا قوتوں زمین دوز تحریکوں اور درپردہ سازشوں کی جگہ ہے۔ پھر وہاں طالع آزمائوں کا ہجوم رہتا ہے۔“

”آپ کا خیال ہے مجھے انکار کر دینا چاہئے۔ دربار کی حاضری بالکل غیر ضروری ہے؟“ حسین نے سادگی سے پوچھا۔

”نہیں نہیں پوتے! تمہاری طبیعت کی تلوار کو اس سان پر چڑھنا ہی چاہئے۔ اسے قتل ہونا ہی چاہئے۔“

”کیوں؟“ حسین نے بے صبری سے پوچھا۔

”اس لئے کہ تم مقدر کے لکھے کو پورا کر سکو۔“ سیاوش نے تقریباً بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

”مقدر کا لکھا کیا ہے دادا؟“ اس نے جھک کر قریب ہوتے ہوئے کہا۔ ”آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟“

”وقت سب بھیدوں کو جاننے والا اور انہیں کھولنے والا ہے۔ تم ار میں اور ہم سب یہ ساری کائنات اسی کے تابع ہیں اور پھر بھی

آدمی کبھی کبھار صدیوں میں ایک بار وقت سے آگے نکل جاتا ہے۔ وقت پیچھے رہ جاتا ہے۔ وقت اور آدمی آنکھ مچولی کھیلتے ہیں۔“

”کیسے؟“ حسین نے محفوظ ہوتے ہوئے کہا۔

”کہیں دنیا کے کسی خطے میں کسی گوشے میں پہاڑوں کی بلندیوں سے پرے وادیوں کے گہرے میں ایک آدمی پیدا ہوتا ہے جو

اس وقت کے بہتے دھارے کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔“ سیاوش حسین سے زیادہ اپنے آپ سے بات کر رہا تھا۔ ”دھارے کو روک

دیتا ہے۔ وقت تھم جاتا ہے۔“

”عجیب بات ہے۔“ حسین نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ ”پھر کیا ہوتا ہے؟ کیا سب چیزیں ٹھہری رہتی ہیں؟ رک جاتی ہیں؟

سورج اور چاند ستارے ان کا کیا ہوتا ہے؟ کیا آدمی خدا سے بھی بڑا ہوتا ہے؟“

”آدمی خدا سے بڑا کہا ہوتا ہے؟ نہیں پوتے، بس وہ ایسا ہو جاتا ہے۔“ سیاوش کو جیسے ہوش آ گیا ہو۔ ”تم کچھ خیال نہ کرنا بچے

میں بہک جایا کرتا ہوں۔ ایسی باتیں جو سراپردہ اسرار سے وقت آنے پر ظاہر ہونے والی ہوتی ہیں مجھے ان کی بھلا کیا خبر ہو سکتی ہے۔“

بڈھے ذہن کی لاف زنی، بہکاوے۔ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ سر ہلتا ہوا اور جسم مرتعش۔

”دادا آپ مجھے یوں ٹال نہیں سکتے۔ مجھے بتائیں آخر کون ہے جو وقت کے سیل کو تھام لیتا ہے؟“

”کوئی بھی، کوئی بھی۔“ سیاوش نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ”اتنی بڑی کائنات ہے کہیں بھی کوئی بھی۔“ حسین نے بجھتی

ہوئی دم توڑتی آگ پر پتلی پتلی لکڑیوں کا ایک اور ڈھیر لگاتے ہوئے کہا۔

”آپ کو تو معلوم ہو جائے گا نا۔ آپ تو اسے جان لیں گے دادا۔ جب ایسا ہو تو مجھے خبردار کر دیجئے گا۔“ سیاوش نے ڈھلکے ہوئے پہوٹوں تلے نیلی جھیلوں کی سی شفاف آنکھوں سے حسین کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔ بنا پلکیں جھپکائے بنا نظریں ہٹائے۔ بہت نہیں وہ کیا دیکھ رہا تھا؟ کہاں دیکھ رہا تھا؟ گھبراہر حسین ہنس پڑا۔

سیاوش نے سوچا اس کی ہنسی میں کتنی دلکشی ہے۔ دلبرائی کی یہ صفت جس پر اس سے پہلے اس نے غور نہیں کیا تھا۔ یہ ہنسی حسین کو مچی سے ورثے میں ملی تھی۔ منصور کو اس نے کبھی مسکراتے نہیں دیکھا۔ عجیب کی طرح نیاز مندی سے گھلتا پگھلتا ہوا وہ سراپا۔ سنجیدہ خدا پرست غمناک کا بوجھ اٹھائے ہوئے نئے مذہب کی روح کو پکڑنے کی کوشش میں تھکا ہوا آتش پرست۔ جو گئے وقتوں کی تلافی کی خاطر اپنی جان کو اذیتیں دیتا تھا۔ نیکی خوشی اور حسن کو سمجھ کے پردوں میں چھپانا جانتا تھا اور اس لئے ان سے ورے رہتا تھا۔ اپنی عبادت کی طاقت سے ان مسائل کو حل کرنا چاہتا تھا جن کو صرف فضل ربانی سے پایا جاسکتا ہے۔ پت نہیں اسے کیوں یہ معلوم نہیں تھا کہ نیکی اپنے لئے کی جائے تو خود غرضی دوسروں کے لئے کی جائے تو خدمت خلق اور خدا کی خوشنودی کے لئے کیا جائے تو کبھی کبھار ریا کاری کہلاتی ہے اور خوشی بھی ایک ماورائی کیفیت ہے بدلتی رہتی ہے اور دنیا ایک حالت پر قائم نہیں رہتی اور حسن تو ہر شے میں ہے۔ صرف دیکھنے والی آنکھ چاہئے جو اس کی بے پناہی کو احاطہ کر سکے اور آنکھ سب کچھ احاطہ کہاں کر سکتی ہے؟

آہورا مزداحسین کی حفاظت کرے۔ سیاوش نے اس کے لئے اپنے جی بے کنار محبت محسوس کی اور حسین آگ کی طرف دیکھ رہا تھا جو خوشیوں کے مرغولوں میں سرفی میں لپک اور تیزی میں بے مثال تھی۔ جس ک طاقت سمیٹنے راکھ کرنے مٹانے میں ان مٹ تھی۔ یہ شعلہ لکڑیوں کا شوق بے پروا تھے۔ خوشبو کی طرح اس کے اندر پوشیدہ اور اس کے لپکتے شعلوں کو دیکھنا اچھا لگتا تھا۔ بھڑکتے ہوئے الاؤ جس کا نشان اس کے ماتھے پر تھا۔ اس نے نشان پر انگلیاں پھریں نشان دلربائی جو اسے آگ نے عطا کیا تھا اسے آگ اگلے ہوئے پہاڑوں کا تصور دلفریب لگتا تھا۔ بہتا ہوا الاؤ۔ اسے آگ سے عشق تھا اور اس لئے اپنی اندر جلتی ہوئی ہر جذ بے کو بھسم کرتی ہوئی آتش شوق کو بھی بجھانا نہیں چاہتا تھا۔ کیا کوئی آگ بجھ سکتی ہے؟

”تم بغداد کے لئے کب روانہ ہو رہے ہو حسین؟“ سیاوش نے پوچھا۔ ”وہاں بے ہنر آدمی کی کوئی جگہ نہیں۔ گواہ زمانہ بدل گیا ہے اور علوم و فنون کا وہ چرچا نہیں رہا پھر بھی دریا میں اس کی رسائی آسان ہے جو اپنے اندر قدر دانی کے لئے اوصاف پیدا کرے۔ ذاتی وجاہت اور امیر المومنین کی دعائیں ہی کافی نہیں ہوتیں۔ تم نے اپنے آپ کو کون ہتھیاروں سے مسلح کیا ہے؟“

میں اپنی تربیت کر رہا ہوں۔ ایسے علوم جو امیر المومنین کی نگاہوں میں قابل احترام ہیں۔“

بات کاٹ کر سیاوش نے کہا۔

”پوتے علوم اپنی عزت آپ ہیں، صرف انہیں اپنی نبضوں پر آزمانا اور ان میں دسترس حاصل کرنا، سیاق و سباق سے ان پر نگاہ رکھنا آدمی کو عزت بخشتا ہے۔ ہر مکتبہ خیال کے آدمی دربار میں جمع ہیں، اس لئے مذاہب کا تقابلی مطالعہ جو مباحث میں تمہارے کام آسکے، تمہیں ان میں طاق ہونا چاہئے۔“

”یہ سب اپنی جگہ مگر میں تو ایک سپاہی کی حیثیت سے جا رہا ہوں۔ خلیفہ وق کی علمی صحبتوں میں میں صرف ان کے عقب میں کھڑا ہونے والا ہو سکتا ہوں۔ ہاں مجھے سننے، دیکھنے اور سمجھنے کی قوتوں کو سنوارنا چاہئے۔ جیسے گھوڑے کے ایال۔“

”تم ترک سپاہیوں کا مقابلہ کہاں کر سکو گے؟ اپنی ساری دعاؤں کے باوجود تمہارا مستقل دربار میں مخدوش ہی دکھائی دیتا ہے۔ تم نے دربار کی ایک جھلک تک تو کبھی دیکھی نہیں تھی۔ کیا معلوم ہے سیاست کی بساط پر کون مہرے رکھتا ہے، کون اٹھاتا ہے، کون پٹتا ہے، کون پینا جاتا ہے۔ یہ سب ایک بڑے راز کی طرح ہے جسے کوئی نہیں سمجھ پاتا۔ جاہ کی دوڑ اور خلیفہ کے گرد دولت سمیٹنے والوں کا گھیرا ٹنگ ہے۔ تمہیں معلوم نہیں پوتے کیسے سمندر میں اپنی کشتی کھینے جا رہے ہو۔ جہاں ہر طرف بلاؤں کا ڈیرہ ہے۔ میں اس کے باوجود چاہتا ہوں کہ تم وہاں جاؤ۔ دے یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم نہ جاؤ۔ تماری جوانی بھداغ رہے۔

سیاوش یک لخت چپ ہو گیا۔

”میرے لئے دعا کیجئے اب کہ میں نے وہاں کے بلاؤں میں اپنا دل الجھا لیا ہے۔ میرا خیال ہے زیادہ خوفزدہ ہونا بیکار ہے۔“ حسین نے مسکراتے ہوئے سیاوش کی طرف دیکھا۔

”دیکھو دیکھو پوتے! تم مجھے غلط سمجھے ہو۔ میں ہر گز تمہیں خوفزدہ نہیں کر رہا مگر تمہارے سیاہ بالوں کے مقابلے میں میرا سفید سران سب تفصیلات کا متقاضی تھا۔ میں نے جو دیکھا ہے، تم نے نہیں دیکھا۔ تم خواب دیکھ رہے ہو اور میں خواب بسر کر چکا ہوں، مگر کوئی کسی کے تجربے سے فائدہ نہیں اٹھایا کرتا۔“ سیاوش نے سر جھکا لیا۔

”دادا برا نہ منائیں۔“ حسین نے عاجزی سے کہا۔

سیاوش نے سبناہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

حسین نے باجا اٹھا کر اسے اپنے قبا کے دامن سے صاف کیا اور جھک کر سیاوش کو پیش کر دیا۔

معبداہید کے پاس کھنڈروں میں سورج کی روشنی سے دھلے سفید مرمر کے بت ہیں۔

میں ستاروں کا پرستار معبدہ کا متولی اور بہار میں رنگین چراگا ہوں کا رکھوالا ہوں۔ صحرا کے غزالوں کا چرواہا منجم اور معبدہ ہوں۔ میرے تینوں محبوب یکجان ہیں۔

مجھ سے خفا ہوا ہے دوست۔ اگر میں بتوں کے گرد گھومنے والے غزالوں کے گیت گاتا ہوں۔

کیونکہ غزال کی گردن سورج کا چہرہ اور بتوں کے سفید سینے استعارے ہیں۔ اور مسکراتے ہونٹوں کی ہنسی روشنی ہے۔

میں معبدہ ناہید کے پاس روشنی سے دھلے سفید مرم کے بتوں کا پجاری ہوں۔

”حسین تم یہاں ہو۔“ منصور کی آواز سیڑھیوں کے سرے پر سے سنائی دی۔

”جی پدر محترم!“ حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”کیا آپ کو میری ضرورت ہے؟“

”گھوڑوں کا سودا گرا آیا ہے۔ میرا خیال تھا تم اپنے لئے پسند کرو تو سواری کے لائق جانور خرید لو۔“

”جاؤ جاؤ“ سیاوش نے ہاتھ کے اشارے سے کہا ”مگر دیکھو عربی النسل گھوڑا موزوں رہے گا۔“ پھر گھٹنوں پر زور دے کر وہ اٹھا

اور حسین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جوان مضطرب بے چین جسموں سے بھرا تھا۔

جب قافلہ روانہ ہوا آغاز بہار کے دن تھے۔ زمین گھاس اور پھولوں اور ہریالی سے بہشت بنی ہوئی تھی۔ دشت سوس کے

نخلستانوں کی ہوا خوشبو سے بھری تھی جس میں خشک ریت کی مہک سی تھی اور سیاہ اور زرد مٹی کا ہلکا سا غبار کبھی کبھار اڑ کر گولوں میں

شامل ہو جاتا جو دشت کے رنگ میں اپنا رقص دکھا رہے تھے۔ چکروں میں گھومتے ہوئے پھولے ہوئے جبوں کو پہنے جیسے رقصاں

درویشوں کا ایک الگ گروہ۔

گھوڑے شروع ہونے والے سفر کی وجہ سے مضطرب تھے اور کچنی ہوئی باگوں کے باوجود گول گول گھوم رہے تھے۔ یہ چاہتے

ہوئے کہ انہیں آزادی ہو اور وہ خون گرم کرنے والی دوڑ میں شریک ہوں۔ ان کے جسم پسینے سے بھیگے ہوں اور وہ اپنی نمائش کریں۔

اونٹوں پر ہودے کسے جا رہے تھے اور خرام کے لئے تیار تھے۔ لمبی گردنوں کو ایک انداز جنون سے آگے پیچھے گھماتے ہوئے اپنے

گلوں میں پڑی گھنٹیوں کی آواز سنتے ہوئے۔ فخریں اور گدھے بار کئے جانے کی وجہ سے چپ چاپ کھڑے تھے اور سر ہلا کر اپنے

چوڑے نتھنوں سے سانس نکالتے اور اندر کھینچتے تھے۔ قافلے کا بازار سمیٹا جا رہا تھا اور بستی کے لوگ جلد جلد دودھ، مکھن، گھی، مرغیاں اور

روزمرہ ضرورت کی چیزیں بیچ رہے تھے۔

منصور کا سر جھکا ہوا تھا۔ غلام حسین کے سیاہ عربی گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ گھوڑے کی پیٹھ چھوٹی، نتھنے کھلے، گردن دراز

پچھلی ٹانگوں کے پٹھے چوڑے اور لمبے تھے اور فاصلہ طے کرنے کے لئے اس سے موزوں جانور کوئی نہ تھا۔ حود حسین کی کمر میں تیغ اور دائیں ہاتھ میں نیزہ تھا۔ بائیں میں ڈھال اور کمان کمر سے آویزاں تھی۔ وہ ایک جنگجو سپاہی کی شان سے اپنی دھڑکنے والی سیکنی مشقوں کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا۔ تقریباً زربادے میں وہ دوسروں سے نمایاں تھا۔ وہ اپنا آپ آزمانا چاہتا تھا۔

کوچ کا طبل بج گیا۔ منصور نے بیٹے کو سینے سے لگایا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تو نہیں ان کی چمک تھی۔ سیاوش نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”پوتے آہو! مزداتمہاری حفاظت کرے۔ فراموش تمہارا ساتھ دیں۔ بیضا کے لئے تم عزت کا باعث بنو۔ منصور کے لئے لئے فخر اور میرے لئے خوشی کا۔“

حسین نے کہا۔ ”دادا آپ جیسا کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔“

پھر قافلہ پر شور آوازوں کو سمیٹتا ہوا دلہلوں سے ہٹ کر پہاڑوں کے تنگ دروں کی طرف کوچ کر گیا جہاں سے وہ تقریباً غیر آباد اور بہت کم قابل استعمال چھوٹی چھوٹی شاہراہوں کو چھوتے ہوئے بستوں اور قریوں میں ذرا ذرا ٹھہرتے سامان رسد اور ضرورت کی چیزیں خریدتے کنارہ جلہ نکلیں گے۔ یہ راستہ کم آباد مگر طویل نہیں تھا اور موسم اگر خوشگوار رہے دن کے وقت سفر کیا جاسکے۔ راہ میں پانی کی قلت نہ ہو تو ایک ماہ سے بھی کم عرصے میں انہیں بغداد میں ہونا چاہئے۔ اگر راہ میں کہیں قمر مطیوں سے آنا سامنا ہو جائے تو۔

قمر مطیوں نے مکنتی باللہ اور خلیفہ معتمد کے وقت میں ایک نہایت زبردست دشمن قوت کے طور پر ابھرنا شروع کیا تھا۔ یہ لوگ شدت سے حملہ کرتے اور امان دینے کے باوجود بچوں اور عورتوں کو بلا تخصیص قتل کر دیتے تھے۔ انہوں نے بستیاں ویران کر دی تھیں اور موت کی آواز بن کر شام اور عراق میں غارت گری کرتے تھے۔ لوگ سفر پر کم نکلتے تھے۔ بڑے بڑے کارواں بنا کر چلتے تھے۔ یوں کاروان حیات کا خوف حیات کے باوصف چلتا ہی رہتا تھا۔

معتضد جاہ و جلال، عدل و انصاف اور زیر کی رعب ہیبت عباسی سلطنت کے استحکام کا باعث تھے۔ وہ سفاح کی طرح اپنی بات منوانا اور اپنی سلطنت کی نشاۃ ثانی کرنا چاہتا تھا۔ وہ مصیبت کی پکار سننے والا حاکم اور غیرت و حمیت میں بے مثال تھا۔ دور دراز قلعوں کی کشوداس کے لئے ایک کھیل تھی۔ وہ ناممکن مہموں میں فوج کی قیادت کرتا اور بے مثال جرات سے فتوحات میں منہمک ہو جاتا۔ وہ جو ہر شناس اور نہایت مدبر تھا۔ اس کی ہیبت سے لرزاں رہنے کے باوجود بغداد اقصائے عالم سے آنے والوں کا مرجع تھا۔ ہر رنگ و نسل کے لوگوں کا مجمع دربار میں باریابی کا منتظر رہتا۔ کاروان سراؤں میں رونق رہتی۔ ایک دنیا وہاں جمع ہوتی۔

بغداد کی طرف رواں اس قافل میں سوداگر تھے جو اپنا مال بغداد کے بازاروں کی شہرت سن کر لئے جاتے تھے۔ انہوں نے دنیا گھوم کر تجربہ اور دولت حاصل کی تھی۔ شاہراہوں کے رازدان اور قریوں کی شہرتوں سے واقف تھے۔ مختلف موسموں، زمینوں اور آب و ہوا سے انہیں سب آگاہی رہتی تھی۔ نہایت پر اعتماد اور بے خوف تھے۔ مزاج آشنا اور مشکلوں کا مقابلہ کرنے میں دلیر تھے۔ مطلب برآری کے لئے فیاض بھی ہو سکتے تھے مگر درہم و دینار کی انہیں بہت فکر رہتی تھی۔

پھران کے ہمراہ غلام تھے جو بظاہر خوش مگر دراصل رنجیدہ ہوتے تھے۔ انہیں صرف آزاد ہونے کی شدید آرزو تھی اور یہی خیال ان کی زندگی کا محور تھا۔ وہ خواب لیت ہوئے جاگتے ہوئے بے ہوش لوگ تھے۔ ان میں بعض نہایت ہوشیار اور بہت غفلت مند تھے۔ اپنے مالک کی خوشنودی کے لئے وہ سامنے کی زمین تک چاٹنے کو تیار تھے۔ مذہب و ملت سے علیحدہ ان سے اچھا سلوک کیا جاتا تھا مگر اس سے وہ کبھی اندرون دل خوش نہیں ہو سکتے تھے۔

چند خواتین نجف اشرف اور کربلائے معلیٰ کی زیارت کے لئے جا رہی تھیں۔ پھران کا ارادہ امرا کے گھروں میں ملازمت اختیار کرنے کا بھی تھا۔ یہ جنوبی کوہستان سے آئی تھیں اور ان کی باتوں کو کوئی سمجھ نہیں سکتا تھا۔ وہ نقابوں سے چہرے چھپائے اکثر لمبی تسبیح پر کچھ پڑھتی تھیں۔ ان کے ہودے آرام دہ اور اونٹ تند اور تیز تھے۔ قافلے میں کچھ معززین خواتین بھی تھیں۔ کسی حاکم کی بیوہ اور بہن تھیں اور جو اپنی جاگیر کی بازیابی کے لئے خلیفہ وقت سے ملنا ضروری سمجھتی تھیں۔

حکیم شعبہ باز، معلوم، مبلغ، قصہ گو، منجم، لکڑی کا کام کرنے والے، کشتی بان، باورچی بھی قسم کے لوگوں کا مجمع تھا۔ فوجی سپاہی قسمت آزمائی کے لئے دارالحکومت جا رہے تھے۔ یہ خوابوں کی پرچھائیں میں چلنے والا کارواں تھا جس کا کاروان سالار ایک عجمی یہودی تھا۔

رات کے پہلے پہر کوچ سے قبل مغنی اپنے ساتھ دور کے ٹیلوں پر محفل جماتا اور گاتا۔ اس کے گلے میں تاثیر تھی اور اس کی آواز بلند تھی اور وہ درباری مغنی بننے کے خواب دیکھ رہا تھا اور ابھی سے اپنے آپ کو تقریباً اخلق موصلی کا معصر سمجھتا تھا۔ کہتا تھا کہ میں نے کئی راگ ایجاد کئے ہیں مگر جب تک کسی دربار میں ان کی نمائش نہ کر لوں، کسی عام آدمی کو نہیں سناؤں گا۔ سند ملنے کی شرط ہے۔ پھر محفل آرائی ہوگی۔ وہ چلتا تو لباس کے دامن پیچھے گھسٹتے تھے۔ داستان کے شہزادوں کی طرح بنے سنور نے میں لگا رہتا۔ اس کی جیب میں آئینہ ہوتا اور گردش کو اپنے چہرے سے بار بار ایک ریشمی رومال سے جو شاید محبوبہ کا تحفہ ہو صاف کرتا۔ اس کے ساتھ کمتر اور خوشامد میں لگے رہنے والے آدمی تھے جو اس کے ساتھ دربار میں باریاب ہونے کی سوچ میں تھے۔ یہ سب لوگ دوسروں سے الگ تھلگ

رہتے۔ ان کی سواریوں کے ٹو بار برادری کے جانوروں کی طرح کمزور اور بد صورت تھے مگر وہ انہیں رستم کا رخ سمجھتے۔

مبلغ آواز نہایت پست اور خرخراتی ہوئی تھی جیسے اس کا حلق اندر سے کسی مہلک بیمار کی وجہ سے بند ہو رہا ہو۔ وہ خود نحیف و نثار تھا۔ اپنی تبلیغ کے دانے شمار کرتا تھا۔ مذہب کو دوسروں کے دل میں اتارنے والوں کو ظاہری زیبائش سے تو نہیں مگر خشکی سے بچنا چاہئے۔ مذہب کی سطوت و ہیبت اس کے تقدس اور اس کے احترام کا نمائندہ تو ہونا چاہئے۔

راستے میں کاروان سرائیں اس موسم میں بھی تقریباً خالی تھیں اور جب دلدلوں کو پار کر کے وہ اشرقیہ میں پہنچے ہیں تو سب طرف ویرانی تھی۔ کوئی ذی روح تک نہیں تھا۔ لٹیرے ایک دن پہلے اس قریے کو لوٹ کر قتل عام کر کے جا چکے تھے۔ بے گور و کفن لاشے کھلے دروازوں سے دکھائی دیتے تھے اور مسجد جہاں پر شاید نمازیوں کا جہوم یا پناہ لینے چھپنے والوں کا گروہ ہوگا، بری طرح برباد کی گئی تھی۔ شاید صاحب الزنج کے جشی غلاموں نے یہاں سے گزر کیا تھا یا فرج بن عثمان کے داعی سے مثیل مسیح اور روح القدس سمجھنے والے اپنا پیغام لائے تھے اور دعوت مذہب دے کر گئے تھے۔

پھیل کر چلنے والا کارواں اب سمٹ کر چل رہا تھا۔

کچھ لوگ باری باری پہرہ دیتے تھے۔ دور تک آگے آگے چلتے تاکہ خطرے سے آگاہ کر سکیں۔ خواتین جو شروع میں نہایت کم آمیز تھیں اب باقی مسافروں سے گھل مل کر بات کرتیں اور خوف نے ان کے ظاہری رکھ رکھاؤ کو عام روش میں تبدیل کر دیا تھا۔ ان پر ہی کیا منحصر ہے۔ سب چہروں پر ہر وقت خوف ہراس کا سایہ ہوتا۔ اگر جنگلی جانور بھی راستہ کاٹ کر نکل جاتے تو لوگوں کے چہرے زرد ہو جاتے۔

حسین نے منجم سے کہا ”کیا تم اپنے ستاروں کے حساب سے بتا نہیں سکتے کہ کل کیا ہونے والا ہے؟“

”کل تو وہی ہوگا جو مقدر ہوگا۔“ اس نے اپنے اضطراب لاب کو کپڑے میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

”پو پھر ستاروں کا علم کیا شے ہے اور تم کس بات کے منجم ہو؟ اگر بات مقدر پر آ کر ہی ٹھہرتی ہے تو کسی علم کے بنا بھی وہی ہوگا اور اسے جان لینے سے فائدہ؟“ حسین نے نرمی سے کہا۔

”صاحبزادے مقدر کو بدلنے والا علم ابھی کہیں دریافت نہیں ہوا۔ صرف بزرگوں کی نگاہوں میں طاقت ہوتی ہے۔ کوئی خدا

شناس، فطرت شناس، رمز شناس۔“

”تمہیں دعا میں تو یقین ہوگا؟“ اس نے پوچھا۔

پھر؟“ حسین نے کہا۔

”ہر دکھ اور مصیبت سے صرف دعا ہی بچا سکتی ہے۔“ منجم نے مختصراً کہا۔

”یہ کیا ہے؟“ اضطراب اور زانچے وغیرہ کو کپڑے کے باہر سے چھو کر حسین نے کہا۔

”یہ روزی کا بہانہ ہے۔ آدمی کا رزق عمل میں رکھا گیا ہے۔ کچھ نہ کچھ کرنے میں کرتے رہنے میں اور پھر سارے علوم ایک جگہ آ کر ختم ہو جاتے ہیں اور وہاں سے روح کی اقلیم شروع ہوتی ہے۔ جیسے ستاروں کی اپنی الگ اقلیم ہے۔ بحر و بر کی اقلیمیں جدا جدا ہیں۔ اتنے بہت سے علوم ہیں اور انسان کی رسائی بس ایک حد سے آگے نہیں۔“ وہ چپ ہو گیا۔

حسین کم عمر تھا اور منجم تقریباً آدھی زندگی گزار چکا تھا۔ ایک بنیادی نیکی اور خوبصورتی اس میں تھی جو اس سے بات کرنے میں ظاہر ہوتی تھی۔ پھر اسے داستانیں سنانے کا ڈھنگ آتا تھا۔ سادہ سے واقعے کو رنگین اور قابل یقین بنادینا تو اس کے لئے مشکل نہ تھا۔ ہر واقعہ کی فضا باندھنا غم اور خوشی کی کیفیات کو بیان کرنا۔

جب پہاڑی دروں کا دشوار گزار راستہ ختم ہو گیا اور چھدرے جنگلوں میں سے نکل کر قافلہ کھلے شاہراہ پر آیا ہے تو راستوں کے کنارے پھول گرمی کی تیزی سے مرجھا رہے تھے۔ پانی کے حوض اور تالاب تین چوتھائی پانی سے خالی تھے اور بارشوں کا موسم گزر چکا تھا۔ لوگ بستوں کے گرد حفاظت کے لئے کانٹے دار جھاڑیوں کے قلعے سے تعمیر کر رہے تھے۔ سادہ لوگ انہیں شاید سفاکی سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ دشمن نہایت زور اور شدت سے حملہ کرتا ہے۔ وہ غیر مسلح بستیوں پر اس لئے حملہ آور ہوتا ہے کہ عام بے چینی پھیلے مدافعات کی کمی کی وجہ سے لوگ حکومت کے خلاف ہوں۔ انتشار اور پریشانی سے حکومت کے کارندے آگاہ ہوں تو خوفزدہ ہوں اور ان کے راستے صاف ہوں۔ ظاہر ہے خلافت کی فوجیں اور دستے ہر جگہ تو نہیں پہنچ سکتے۔

دجلہ کے ساتھ شاہراہ پر بصرہ کی طرف سے اور قافلے بھی تھے جو بغداد جا رہے تھے اور نہروں میں کشتیوں کے بیڑے کھڑے تھے۔ کھجور کے درختوں کے جھنڈوں میں شام کی سرخیاں چھپنے کی کوشش میں ناکام ہو جاتیں تو پانی میں اتر آتیں۔ ان جنگی کشتیوں میں نیلا دھواں آسمان کی طرف دست دعا کی طرح اٹھتا۔ فوجی گرمی کے باوجود سر سے پاؤں تک وردیوں میں ملبوس ہوتے۔ شاہراہوں اور آبی راستوں کی حفاظت ہو رہی تھی۔

کشتی بنانے والے کی معلومات نہایت وسیع تھیں۔ ہر ہر کشتی کی شکل و صورت اس کی تعمیر میں استعمال کی گئی لکڑی اور رال اور روغن مقرر کا حساب و کتاب جانتا تھا۔ پرانے زمانے میں ایرانی کشتیوں کی ساخت کا اندازہ اور زمان حال کی تہذیبوں سے بخوبی آشنا

تھا۔ اپنے ہنر میں یکتا دکھائی دیتا تھا اور دیوانوں کی طرح کشتیوں کی باتیں کرتا تھا جیسے اس کی زبان کسی چکر سے نکل آئی ہو اور اب رکے گی نہیں۔

مغنی نے بے حوصلہ ہو کر ایک دن کہا ”استاذی شان کیا تمہارے فن کے کوئی قدردان تمہارے اپنے شہر میں نہیں رہے؟“ وہ زور سے ہنسا اور اس کے ساتھ اس کے ساتھی بھی ہنسے۔

”یہی سوال میں تم سے پوچھ رہا ہوں تم کیونکہ اوجار ہے ہو؟“

”گانے اور شاعری کے قدردان سوائے درباروں کے اور کہیں نہیں ہوتے محترم۔“ مغنی نے کہا۔

”کشتیاں جو میں بنا سکتا ہوں ان کے قدردان بھی سوائے امرا اور بڑے بڑے سپہ سالاروں کے اور کوئی نہیں کر سکتا۔“

وہ سب پھر ہنسے اور ترک سرداروں کے نام گنوائے لگے جو اس کی مہارت سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ پھر ترکوں اور دربان پران کے اثر کی عام لوگوں کی بے وقعتی کی باتیں ہونے لگیں۔ خلاف راشدہ کے زمانوں میں کیا ہوتا تھا؟ خود ہارون اور مانون کے عہد میں عباسی خلفا کے جاہ و جلال کی کہانیاں خواب خواب و خیال بن گئی تھیں اور معتز کا دردناک قصہ جو اپنی ماں کی وجہ سے دربار سے باہر گھسیٹا اور مارا گیا تھا اور جس کی نصرانی ماں کا خزانہ خلفا کے خزانے سے بھی بڑا تھا۔ پھر نصرانی عورتوں اور لونڈیوں کے اثر و نفوذ کا دربار کی زندگی پر ان کے اثر کا تذکرہ ہونے لگا۔ ہر زبان پر شکایت تھی اور ہر دل تلخی سے لبریز تھا۔ اسلام میں دوسرے ملکوں کی عورتیں نے جو ریشہ و انیاں کیں ان پر تبصرہ ہوا۔ لوگ سوائے خواتین کے تقریباً حالات کو سنسنی خیز بتاتے تھے اور نئے خلیفہ کی سختی کو پسند کرتے تھے۔

نئے مذاہب کی بات پر مبلغ نے کہا۔ ”مذہب کو پیش کرنے کا طریقہ اگر صحیح ہو تو سچائی دور نہیں ہوتی؟“

”تم کیا قمر مطی نقیب ہو؟“ کسی نے پوچھا۔

”نہیں، نہیں، بخدا نہیں۔“ اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لئے جیسے اپنے آپ کو بچا رہا ہو۔

مغنی اور اس کے ساتھی جو مذاق اڑاتے اور ہر بات کو پکڑتے تھے اس کی حالت سے خوب محفوظ ہوئے۔

جو بستیاں محفوظ تھیں ان میں قافلہ کے پڑاؤ پر خوب رونق ہو جاتی۔ ضرورت کی چیزیں خریدی جاتیں۔ اگر کوئی جانور بیمار یا کمزور ہوتا اور سفر کرنے کے ناقابل ہوتا تو دوسرا خریدا جاتا۔ جانوروں کے طبیب، مسجدوں کے موزن، چھوٹے چھوٹے دکاندار ایک بھیڑ لگ جاتی۔ چراغوں کی قطاریں ہنسی اور داستان طرازی سحر سے ایک ایسی گہما گہمی پیدا ہو جاتی جس کی یاد بستی والوں کو آئینہ کے لئے منتظر

رکھتی۔ چاندنی میں میدانوں میں بکھرے ہوئے کہیں کہیں مدھم جلتے چراغ اکا دکا اکیلے گھروں کی خبر دیتے۔ جانوروں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کا بجنا عجیب خوابناک ہوتا اور زرد چاندنی کا دھارا حسین کو اغول کی یاد دلاتا۔ جانے وہ کہاں ہوگی۔ وہ دو ذروں کی طرح غبار میں اڑتے اڑتے ایک دوسرے سے ملے اور مخالف سمتوں میں اپنا سفر جاری رکھنے کے لئے جدا ہو گئے۔ کیا ہوتا اگر وہ صرف ایک ذرہ ہوتا اور اغول کے دامن سے لپٹ سکتا۔ اس کے بالوں کے سنہرے میں کہیں انک کر سکتا۔ اس کی پلکوں کے سرے پر آنسو بن کر کپکپا سکتا۔ اس نے اپنے جی کو کیسے کیسے سمجھایا تھا کہ اغول ایک خواب تھی اور جلدی میں دیکھتے ہوئے بس آنکھ بند کر کے خیالوں کے سوتے جاگتے لہریوں پر چھو لے خواب کوئی خواب نہیں ہوتے۔ ذہن کے کھلتے ہوئے ہولے ہولے دراز ہوتے خیالوں کے گیسو ہوتے ہیں۔ رود آہ کے گیسوؤں کی طرح جس کی سیڑھی پر قدم قدم آدمی چھت کے جھروکوں تک پہنچ سکتا ہے مگر وہاں پر ضروری نہیں کہ اغول ہو مل سکے۔ اغول اس کا ایک وہم تھی اور آدمی کے جی میں چاہت کہاں سے آن بستی ہے، ٹھہر جاتی ہے۔ ٹھہری رہتی ہے کہاں سے؟ وہ اکیلا بیٹھ کر غور کرتا۔ مقدر نے اس کے لئے کیا حکم دیا ہے؟ میں اپنے لئے کیا دعا کروں؟ اغول کو ملنے کی دعا؟ اسے ڈھونڈ لینے کی دعا۔

پھر وہ رات آخری رات، آخری گھڑی، اسے یاد آ جاتی۔ دوحرقہ میں مشقوں کے درمیان وہ اسے یاد رہتی۔ وہ اس کی رگوں میں اس کے خون میں اس کی سانس میں رچ بس گئی تھی۔ وہ اسے بھلا نہیں سکے گا، کبھی بھی نہیں۔۔۔ آدمی بھلا تو اسے ہے جسے یاد کیا جائے اور اغول اس کی یاد کہاں تھی، وہ تو حسین تھی یا حسین خود اغول تھا۔ ہاں وہ حسین تھی وہ اغول کہاں تھی۔ جب اس کی ہستی اس سے الگ اس سے پرے کوئی دوسری نہ تھی تو پھر اور کچھ نہیں تھا۔ وہ آج تک اپنے آپ سے برسر پیکار رہا تھا، اپنے آپ سے۔ اور اسے ایک گونہ طمانیت ہوئی۔ اب اس کی تلاش کہیں اور نہیں تھی، اپنے اندر تھی مگر ایسا تو اس نے کئی بار سوچا تھا۔ اس کی جنگیں اپنے اندر جاری رہتیں۔ وہ ہنسا۔

منجم نے کہا، ”حسین کیا تم دیوانے ہو کہ ہنستے ہو؟“ مجھے اپنے آپ سے عشق ہے، بے پناہ محبت۔ شدید جذبات میرا سانس روکتے ہیں اور میں ان سے بچنے کے لئے ہنستا ہوں۔“ حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”کسی اور سے یہ بات نہ کہنا، لوگ تمہیں دیوانہ سمجھ لیں گے۔“ پھر ذرا توقف کے بعد اس نے کہا۔ ”میرا خیال ہے میں تمہارا زانچہ بناؤں اور ستاروں کے حساب بھی تمہارا مستقبل معلوم کروں۔“

”ہوگا تو وہی جو مقدر ہوگا۔“ حسین نے اس کی بات دہرائی۔

”ہاں ہاں نیک فرجام ہوگا تو ہی مگر معلوم ہو جائے تو شاید تمہیں قرار آ جائے۔“ اس نے سر اٹھائے میں اپنی کوٹھڑی میں جاتے ہوئے کہا۔

حسین کو اس زائچے کا انتظار نہیں تھا مگر منجم کا یوں آنکھوں سے اوجھل ہو جانا اسے اچھا نہ لگا۔ سر اٹھائے سے باہر اس نے قصہ گو کے پاس بیٹھنے کی کوشش کی۔ قصہ گو اپنی لوچ دار اور بلند آواز میں بادشاہ کی مصیبت کا واقعہ بیان کر رہا تھا۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ درختوں کے سائے رات میں اندھے سایوں کی طرح تھے کہ سارے رازوں کو سمیٹے ہوئے تھے اور کچھ کھلتا نہیں تھا۔ اس کی طبیعت بہت بدمزہ ہو رہی تھی۔ کیا وہ آنے والے وقت سے خائف تھا۔ اسے سیاوش یاد آ رہا تھا۔ دادا سیاوش۔

اس کا اپنا دادا مچی۔ آخری گھڑی آدمی کو تیس الگ کر دیتی ہے۔ پر تو سے اصل کی طرف لے جاتی ہے۔ موت کیا ہے؟ جب کائنات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نہ ایک سے نہ ہزاروں سے نہ قوموں سے ملکوں سے اور خدا نے آدم کو تخلیق کیا تھا۔ اسے زمین میں اپنا خلیفہ بنایا تھا اور اتنا بے بضاعت بنایا تھا؟ خدا جب خود حد ادر اک سے ماورا ہے تو اسے آدم کو بھ عظیم بنانا چاہئے تھا قابل تخلیق۔ یہ روتے آہ زاری کرتے انسان کیا تھے؟ خدا کو انسان اپنے شایان شان بنانا چاہئے تھا جو اس کی طرح تو نہیں مگر کسی شے پر تو قادر ہو جو اگر اس کو حمد کرے تو پکارے تو اس کی صدا جواب کے لائق تو ہو۔ کائنات کے دروبست میں اس کی کوئی اہمیت تو ہو۔ وہ بھی کسی شے پر قادر تو ہوا اپنے بگاڑنے پر ہی سہی۔

پھر یک بیک وہ کانپ اٹھا۔ وہ کتنا گستاخ تھا۔ اس کی سوچ بے لگام تھی۔ وہ ایک ذرہ ناچیز کس دیدہ دلیری سے سوچ رہا تھا۔ کیوں؟ اس کے ذہن میں یہ ساری تپش کون بھر رہا تھا؟ کون؟

اس نے کہا میں اب سوچوں گا نہیں اور وہ قصہ گو کی محفل میں سروں پر سے پھلانگتا ہوا اس کے قریب ہونے کے لئے لوگوں کی بڑبڑاہٹ کی پروا کئے بنا بیٹھ گیا۔

”طلسمی گھوڑا چکر لگا کر نیچے اترتا تو شہزادے نے دیکھا کہ وہ کسی اور اقلیم میں ہے۔ کسی اور بادشاہت میں اور یہ ساتویں اور سب سے آخری اقلیم تھی جہاں چاروں طرف برف تھی اور اندھیرا تھا۔ کوئی روشنی ہی نہ تھی۔ وہاں نہ پرودت تھی اور نہ ہی حدت۔ پھر جب اس کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ درخت برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ گھر برف سے بنے تھے۔ اچانک افق پر ایک سپیدہ نمودار ہوا جو نہ پھیلا نہ بڑھا مگر ہزاروں پرندوں کی چہکاروں سے فضا ایک دم گونجنے لگی۔ یہ سوچ شاید ان چڑیوں اور برف کے صحرا کے پرندوں کے خون میں طلوع ہوا تھا۔ اس شہر برف کے باسیوں کے لباس بھی برف کے تھے اور ہر شے

برف کی تھی۔ بحر محیط حد نظر تک پھیلا برف کا میدان تھا جس کو کہیں کہیں سے کاٹ کر نیچے کے پانی تک رسائی حاصل کی گئی تھی۔ حسین نے اپنے خون میں کچکی محسوس کی جیسے وہ بھی شہزادے کے ساتھ برفستان اور ساتویں اقلیم میں جا اتر اور باہر نکلنے کی ساری راہوں پر پہرے ہوں۔

قصہ گو نے یہ سب حالت بیان کر کے آہستہ آہستہ سورج طلوع کیا جو اگر ایک دم چڑھتا تو لوگ اندھے ہو جاتے اور چمک ٹگا ہوں کی خیرہ کر دیتی۔ داستان طرازی تو اس پر بس ختم تھی۔ حسین بھی قصے میں ڈوب گیا۔ جب منجم نے اسے پکارا۔
”حسین، حسین۔“

اسے ایک دم ہوش آ گیا تو یہ اس کے ستاروں کا احوال تھا جسے لکھنے کے لئے اسے پکارا جا رہا تھا۔ شہزادے کے ستاروں سے وہ ہاتھ اٹھا کر اپنے مقدر کی طرف گیا۔ چاروں طرف اندھیرا ہے۔ بالکل منجم اس نے اس کے پاس آ کر کہا۔
حسین حیران تھا کہ وہ تو داستان گو کی بات نہیں سن رہا تھا پھر اسے کیسے پتہ چلا کہ برف کے اس ویرانے میں چاروں طرف اندھیرا ہے۔ وہ اس کے سر کے سفید بالوں میں گھلتی ہوئی چاندنی کو دیکھتا رہا۔

نوجوان میں کیا کہہ سکتا ہوں، تم پریشان نہ ہونا۔ ستارے بھی کبھی کبھار کائنات میں کسی نئی تخلیق کی وجہ سے ہجرت میں ہوتے ہیں اور حساب ٹھیک نہیں بیٹھتا۔
”میں سمجھا نہیں۔“ حسین نے کہا۔

”پس تم تمہارے ستاروں کے گرد کوئی روشنی نہیں، کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ سب طرف اندھیرا ہے۔“ اس نے الگ الگ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ ادا کیا۔

”کیا“ حسین نے حیرت سے کہا۔ ”تمہیں ستاروں کے حساب شناسائی بھی ہے؟ کسی بھی انسان کے ستارے کسی طرح مکمل اندھیرے میں ہو سکتے ہیں؟ ٹھہرے ہوئے جیسے وہاں نہ ہوں ناممکن۔“ اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا۔

”تم بھی صحیح سمجھتے ہو اور میں بھی حیران ہوں تم زندگی سے پر تندرست سلامت سانس لیتے لیتے ہوئے ہو اور ایک خاص وقت کے بعد تمہاراے لئے بھلا روشنی کیوں نہ ہوگی جب زندگی ہے۔“ اس نے رک کر کہا۔ ”کچھ تو ہونا چاہئے کچھ تو!“
”یہ روشنی کتنے برسوں تک رہے گی؟“ حسین نے عام بات کی طرح پوچھا۔

”ہمارے ہاں وقت اس طرح شمار نہیں ہوتا جیسے عام زندگی میں پلوں، دنوں، ہفتوں اور مہینوں، سالوں کے حساب سے۔“ منجم

نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”پھر بھی۔“

”یہی ایک اترتے ہوئے ذرے کی طرح روشنی دس بیس سال کا شمار ہوا کرتی ہے۔“ اس نے افسوس سے جواب دیا۔ ”ایک لمحہ ایک پل بھی روشن ہو تو بہت ہوتا ہے اور یہ تو دس بیس سال ہیں۔ اگرچہ اس پر اب بھی میرا یقین نہیں ہے۔ آئیں برفستان میں شہزادے کا قصہ سنیں۔“ اور وہ دونوں پھر اس محفل میں جا شامل ہوئے۔

ستاروں کے غبار سے بنا کہکشاں کا رستہ روشن تھا اور کوچ کا نقارہ جب بج رہا ہے تو چاندنی پہلی راتوں کے چاند کے ساتھ رخصت ہو چکی تھی۔ بستی کے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں برابر آ رہی تھیں کیونکہ گدھوں کے ریٹکنے سے خبردار ہو گئے تھے اور ہوا میں جانوروں کے موت اور گوبر کی بوسونجھ کران کی حسین تیز ہو گئی تھیں۔ چراغوں کی لویں بھڑک رہی تھیں۔ روشنی اور اندھیرا آنکھ مچولی کھیل رہے تھے یا جیسے کر مک شب تاب اکا دکا راہ بھول کر بستی کی طرف لوٹ رہے ہوں۔

حسین نے جی میں کہا۔ روشنی ہے تو سہی بس یہی کافی ہے۔ منجم نے تو مجھے گھبرانا چاہا تھا مگر میں گھبرانے والا کہاں ہوں۔ وہ جی ہی جی میں ہنسا۔

قافلہ دوسری منزل کے لئے روانہ ہوا۔

بجہت آباد اپنی آب و ہوا کی عمدگی اور دریاؤں کے سنگھم پر ہونے کی وجہ سے دجلہ کے کنارے اناج اور پھل ریشم اور چینی دیا کی بہت بڑی منڈی تھی۔ یہاں کے لوگ نرم خور با اخلاق پر مذاق اور خوش لباس تھے۔ شہر کے اندر سے نہروں گزرتی تھیں اور پانی اتنا شیریں تھا کہ باغوں سے گھرے ہونے کی وجہ سے اس بستی پر بہشت کا گمان ہوتا تھا۔

مغنی نے اپنے سازندوں کو لے کر ایک باغ میں پڑاؤ ڈالا۔ اس کی لاشانی دھنیں فضا کو نغے اور موسیقی سے خوابناک بنا رہی تھیں۔ یہاں تک کہ معمار نے جو اس کے پر اعتماد رویے سے چڑھتا تھا، جھوم جھوم کر رقص کیا۔

معمار بھی دیوانہ آدمی تھا۔ ہر عمارت کو جو راہ میں دکھائی دیتی تھی، نہایت غور سے دیکھتا اور اس کی عمر کا اندازہ لگاتا۔ اس میں جو لکڑی اور مصالح صرف ہوا تھا، اس کا حساب لگاتا۔ انگلیوں پر شمار کرتا یہاں تک کہ کھنڈروں میں گھس کر غائب ہو گیا۔ جب ہم چوٹی پل کو پار کر کے دوسری طرف نینوادیکھنے گئے، یہ ایوان اور دربار کے بڑے بڑے دالان در دالان کمرے اور پتلی غلام گردشوں والے محلات تھے جن پر زمانے کی گرد نے اپنی تہیں جمالی تھیں۔ ستونوں کے جنگلوں پر چھتیں گر گئی تھیں۔ اونچی بنیادوں میں سے اینٹیں اور

مصالحہ جھڑ گیا تھا اور تہہ خانوں میں چمگاڑوں نے مسکن بنا رکھ تھے۔ جگہ جگی جھاڑیوں نے سر نکالا تھا۔ رقص گاہوں میں اب ہوا میں ریت کے ساتھ آوارہ بگولوں کے جلو میں رقص کرتی تھیں۔ جہاں بادشاہوں کی حضوری میں شہزادیاں رقص کناں ہو کر اپنی مراد کو پہنچتی تھیں۔ بیٹوں کے سروں کو اس لئے گردن سے جدا کیا جاتا تھا کہ ان نارسا بوں میں موت اور خون اور بربادی کا ذائقہ چکھا جاسکے۔ وہ سرجو فخر عاجزی کا مرقع تھے خاک میں لوٹائے جانے سے پہلے لوٹے جائیں۔ وہ آنکھیں جو جہان کو دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھتی تھی ان پر چھائے ہوئے پوٹوں کو عشق کے ناپید کنارے مجاہد اور نارسا ہونے کی سزا دی جائے۔ تھال میں سجائے اس سر کی قیمت سانچے میں ڈھلے سراپے کی دیوانگی ٹھہرے۔ خدا اپنے بندوں کو یوں رسوا کیوں کرتا ہے؟ اپنی محبت کا مذاق کیوں اڑواتا ہے۔ وہ کسی آزمائش سے اپنے دوستوں کو دو چار کرتا ہے۔ ایفائے عہد کرنے کے اس کے عجیب ڈھنگ ہیں اور وہ سرفروشی کی قیمت بھی کیا دلواتا ہے۔ سرجو کندھوں کے لئے بار ہو جاتے ہیں تاکہ رسوا کئے جائیں۔ بڑے بڑے تاج سروں پر سجائے حسین و جمیل کنیزوں کے جلو میں مل جائیں ہوا کی سی نازک شہزادیاں کنجوں میں معطر جھونکوں میں عشق کے گیت گاتے مغنی۔ دربار میں حاضر بھاری زریں پہنے اور خود سجائے سپہ سالار روشنیاں اور خوشیاں اور یلغار کرتی فوجیں اور آخرب کو نیند آ جاتی ہے اور کوئی معمار انگلیوں پر اس کا حساب شمار نہیں کر سکتا کتنے سر بنیادوں میں دفن ہوئے ہیں اور کون بتا سکتا ہے کہ چنائی میں استعمال ہونے والی اینٹیں جس مٹی سے بنائی گئی تھیں وہاں کتنے بدن پیوند خاک ہوئے تھے اور یہ محفل جاننا نہ جو آ باد ہوئی تھی تو کس خون سے اس کی آبیاری کی گئی تھی؟ حساب لگانے کا اختیار کسی کو نہیں دیا گیا اور نہ ہی دنیا کی عمر کا اندازہ کوئی لگا سکتا ہے۔ سلطنتوں کے الٹ پھیر زمانے کی شکست و ریخت شاہوں کی بیچارگی سب ہوا کی راہ گزر میں ہے۔

مبلغ نے جب بغداد قریب آ رہا تھا اور منزل در منزل سفر باقی تھا ایک دن حسین سے کہا۔

”برخوردار! تم کیا حصول زر اور تلاش معاش کے لئے خلیفہ وقت کے روبرو بایابی چاہو گے؟ کیا تمہارا کوئی دوست وہاں ہے؟ میں کئی دن سے دیکھ رہا ہوں کہ تم منجم اور مغنی کے زیادہ قریب ہو رہے ہو۔ ان کی صحبت تمہیں کوئی فائدہ نہیں دے سکتی۔ یہ سب بیکار لوگ ہیں۔ شیطان کے شاگرد۔ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتے ہیں۔ منجم کیا ہے؟ گپ اور ستاروں کے جھوٹے سچے حساب اور زائچے بنانے والا اور وہ مغنی خدا اس سے محفوظ رکھ، فسق و فجور پھیلانے والا، گندگی کا کیرا۔“

حسین حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”اگر تمہیں کسی مدد کی ضرورت ہو تو دربار تک رسائی حاصل کرنا چاہو تو میں محلہ کرخ میں اپنے دوستوں سے کہہ کر تمہاری مدد کر سکتا

ہوں۔ بغداد میں میرے بہت سے جاننے والے ہیں اور دربار تو خیر ہر کلیدی عہدے پر میرے خیر خواہ ہیں۔“

وہ چپ ہوا تو حسین نے کہا۔

”مگر مجھے تو امیر المومنین نے خود دربار میں طلب کیا ہے۔“

”کیا کیا؟“ مبلغ نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

”یہ کہ مجھے بلایا گیا ہے میں طلب کیا ہوا آیا ہوں اور میرے لئے کچھ بھی مشکل نہیں ہوگی۔“ حسین نے نہایت قطعیت سے کہا۔

مبلغ جس کا نام زبیر تھا اپنی تسبیح بھول کر اس کی طرف بنا پلکیں جھپکائے دیکھتا رہا۔ حیرت سے اس کی زبان گنگ ہو گئی تھی۔ کافی

دیر بعد اس نے کہا۔

”اس صورت میں تم دربار کے علماء تک پہنچنے میں میری مدد کرو! مجھے تبلیغ کے مختلف کاموں اور اداروں کے لئے زر کثیر کی ضرورت

ہے اگر کوئی دوست دربار میں ہو تو آسانی رہتی ہے۔“

اس کی بات کاٹ کر حسین نے کہا ”آپ کے وہ دوست جو کلیدی عہدوں پر ہیں؟“

”وہ سب ٹھیک ہے۔“ زبیر نے چکنی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لاتے ہوئے کہا۔ ”مگر تم جوان ہو اور خلیفہ وقت کے منظور نظر ہو

گے۔ تم تو سب پر سبقت لے جاؤ گے۔“

حسین بنا جواب دیئے گھوڑا بڑھا کر قصہ گو کے ساتھ ہولیا۔ چونکہ وہ جب قصہ سنا رہا ہوتا تھا تو خواب دیکھنا لگتا تھا اور جب

خاموش ہوتا تھا تو خواب بنتا ہوا محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی کے پھیلے ہوئے کرگھے پر اس نے پر چھائیگیں سے مرفعے اور فسانے بن رکھے

ہوں اور انہیں غور سے دیکھ رہا ہو۔ ان کی بہتر صورت کے لئے ہر وقت فکر مند ہو سوچ میں ڈوبا ہوا۔

ہندی سوداگر جو بھت قباد سے آکر کارواں میں شامل ہوا تھا بہت ہنس مجھ اور لطیفہ گو تھا۔ ہر خوف کی گھڑی میں ہی مذاق ڈوھنڈ

لیتا جبکہ لوگ اس کی ناگلوں کے اندر سے پیچھے کی طرف اڑے ہوئے جبے کو دیکھ کر ہنستے تھے مگر معلوم ہوتا ہے اسے کسی کی پرواہ نہ تھی۔

سیاہ آنکھیں کسی نہ کسی خیال سے چمکتیں جیسے کوئی نہایت اچھی بات سوچھی ہو۔ خود ہی ہنستا گردیوانہ نہیں تھا۔ اس کے آنے سی ایک دم

فضا بدل سی گئی تھی۔ اپنے روزمرہ کے کاموں کے علاوہ خواتین کے کام بھی انجام دیتا۔ کسی کو ذرا تکلیف ہوتی اسے معلوم رہتا اور اس

لئے بغداد جب دودن کے فاصلے پر تھا تو طبیب کی طبیعت ایک دم مالش کرنے لگی تو اس نے ہندوستانی طریقہ علاج سے جڑی بوٹیوں کو

اونٹا کر اسے پلایا تو وہ تندرست ہو گیا۔ وہ نیلے کوہستانوں اور نہایت بلند برف سے ڈھکے کوہساروں کی باتیں کرتا تھا اور یہ بھی سناتا تھا

کہ سمندروں کے سے بڑے ذخائر دریا ان پہاڑوں سے نیچے میدانوں میں آتے ہیں اور ایک دریا تو سیدھا بہشت سے ایک دیوتا کی جباؤں میں گرتا ہے اور پھر وہاں سے چوٹیوں، بلند وادیوں میں سے ہوتا ہوا نیچے اترتا ہے۔

”کیا وہ دجلہ سے بھی بڑا ہے؟“ حسین نے پوچھا۔

ہنس کر ہندی نے کہا ”وجہ تو اس کے سامنے ایک جو ہے اور پھر اس میں ڈکبی لگانے سے آدمی ایسا پاک ہو جاتا ہے جیسے پیدا ہونے کے وقت تھا۔“

”ہر آدمی کا کام اس عمل اس کی زندگی اسے پاک یا ناپاک بناتی ہے۔ کوئچپانی بھی انسان کے گناہوں کی سیاہی کو نہیں دھو سکتا۔“ حسین نے کہا۔

”معلوم ہوتا ہے تم خوابوں اور مفروضوں اور خوبصورتیوں میں یقین نہیں رکھتے۔“ اس نے حسین نے کہا۔

”شاید میں اچھے مفروضوں سے اور خواب کی رعنائیوں سے تھک گیا ہوں۔“ حسین نے جواب دیا۔

”تم ابھی بیس برس کے تو ہوئے نہیں ہو گے۔ جیسا کہ تمہیں دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا ہے اور تم ایسے میں تھکن کی باتیں کر رہے ہو۔ اب جبکہ تمہارے لئے سورج طلوع ہوگا، تم زندگی اور رعنائی اور حسن سے دوچار ہو گے۔ تمہارے دل میں نئی دنیا عین نئی ممکنات کے ساتھ ظاہر ہوں گی۔ تم کنول کی پھول ہو، جو آج تک کینچ میں رہا ہے۔ گلابی پنکھڑیوں کو کھول کر اب لبریز تالاب پر تیرنے کا تمہارا وقت آیا ہے اور مجھے یہ کہنے میں ڈر نہیں کہ تم اپنے عشق میں بری طرح مبتلا ہو۔ دربار میں تو تمہیں اپنے ساتھ اکیلے ہونے کا وقت ہی نہیں ملے گا۔ برخوردار! سخت عمل میں مصروف رہو ورنہ مایوسی تمہیں یوں نگل لے گی جیسے آگ لکڑیوں کو۔“



نغمہ شوق

یہ عروس البلاد بغداد ہے۔ بال آخر ایک زمانے کے بعد وہ آن پہنچا۔ حسین نے سوچا اس سارے کاروبار حیات اور بے پناہ ہجوم میں آدمی کی حیثیت کیا ہوگی۔ عرب کے بطن سے ایک نور ہویدا ہوا۔ قیصر و کسریٰ کی بے بضاعتی پر عاصی قہر بلا بن کر گرا اور شرق و غرب کی ساری سلطنتیں اس روشنی سے منور ہوئیں۔ بنو امیہ کے زمانوں کی بدویت آل عباس کے وقتوں میں جمی بجائی شہری زندگی میں بدلی۔ مزاج بدلے سادگی کی جگہ پر کاری نے لی، عمارتوں میں جاہ و جلال شان و شوکت اپنے انتہائے کام کو پہنچے علم و فضل کے بحر ذخار یونان اور روما کے علوم سے لولولے لالہ سے پر ہوئے۔ ہیبت و سطوت میں شرافت و نجات میں سخاوت و دولت میں ساری دنیا کم تر تھی اور بغداد اپنے مدرسوں، خانقاہوں، مسجدوں میں پھیلی ہوئی بھول بھلیوں جیسی گلیوں بازاروں اور شاہراہوں کے سبب دنیا کو سمیٹے ہوئے تھا۔

شہد رنگ طلیساں پہنے نصرانی اور یہودی ترک اور تاتاری ہندی اور چینی علماء اور حکما کے لئے بغداد ایک مقاطیس تھا کہ لوگ اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ دربار زندگی کا محور تھا اور اس تک رسائی مشکل نہ ہونے کے باوجود تقریباً ناممکن تھی۔ جیسے حجاب اندر حجاب دیوار در دیوار احاطے ہوں سیاست کے اپنے اصول ہیں اور انہیں کا کھیل تھا کہ عام لوگوں کی پہنچ سے حاکم اور حاکم کی رسائی عام لوگوں تک محال ہو تا کہ اصل واقعات کا ناخوشگوار یوں کا علم نہ حاکم کو ہو سکے اور نہ ہی عوام اپنی داوری تک پہنچیں۔ اگر عام آدمی اپنے حاکم کی محفل میں جا پہنچے اور یا شیخ کہہ کر اسے مخاطب کر سکے تو پھر وہ لوگ جو واسطہ بننے سے ہی زندہ رہتے ہیں ان کی جگہ زیر آسمان کہاں ہو۔

پریشانی، تنگی، دلازاری کا کاروبار بھی جو حاجت روائیوں، فراخیوں اور دل داریوں کی تمنا سے فروغ پاتا ہے اور حاشیہ نشینوں کی زندگی اسی کے دم سے ہوتی ہے۔ ہر زمانہ اس سے عبارت ہے اور ہر دنیاوی شخصی حکومت ایسی ہے سوائے خلفائے راشدین کے وقتوں سے یا ان خلفائے بنو عباس سے جو خدا کے خوف سے لرزاں ترساں رہتے تھے اور عام لوگوں کی داوری خود کرتے تھے۔

جبشی غلاموں کے دورویہ پرے اپنے بہترین لباسوں اور ہتھیاروں سے سچے اس راہ پر تھے جو خلیفہ کے محل سے بارگاہ تک جاتا ہے۔ حسین کا باریابی کا دن جب آیا ہے تو معتضدا بھی فوجوں کے معائنے سے واپس آیا تھا اس کی پریشانی پر پسینے کے قطرے تھے اور

چہرہ متمایا ہوا تھا۔ بے چین گھوڑے سے اتر کر اس نے حسین کی طرف دیکھا جو فوجی لباس میں اور بھی کمسن معلوم ہوتا تھا۔ سر سے پاؤں تک اس نے سوچتی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”آج سہ پہر کی محفل میں اسے پھر حاضر کیا جائے۔“ اس نے اپنے غلام بدر سے کہا۔ ”اس نوجوان کی نہایت زیر کی اور بہادری کی وجہ سے ہم نے اسے اپنے خاص الخاص ملازموں میں شامل کیا ہے۔“

بدر نے سرخ میا اور خلیفہ بارگاہ خاص کی طرف چلا گیا۔ ترک سپاہیوں اور حبشی غلاموں اور سرداروں نے جو مقربین بارگاہ بننے کے زمانوں سے وہاں دیکھ کر نہایت کوشش سے یہاں تک پہنچے تھے اسے عجیب نظروں سے گھورا جیسے خوبی اور بہادری کسی تمنہ کی طرح اس کے لباس پر نگہ ہو اور انہیں معلوم ہو سکے کہ اس انتخاب کی وجہ دراصل کیا ہے؟

معتمد مردم شناس خلیفہ تھا اور اپنے دربار میں فن کاروں، مصوروں، شاعروں کا ہجوم اس کے عباسی دربار صفات و کمالات کا قلعہ بنا تھا۔ سرفروشوں اور وفاداروں کا قدردان تھا اور مخالفوں کو معاف کر دینا اس کی سب سے بڑی بہادری تھی، مگر جب دشمن جوش غضب میں مسجدوں کو برباد کرتے یا کسی عبادت گاہ کو منہدم کر دیتے تو وہ اپنی فطرت کے خلاف ان کی جانوں کی تلف کر دیتا۔

اس کے باپ معتمد کے وقتوں سے ہی زنجی اور قمر مطی مختلف علاقوں میں زور پکڑ رہے تھے۔ علوی بھی جہاں مدافعت کمزور پاتے یا ان کے داعی ان کے لئے راہ ہموار کر دیتے وہاں نمودار ہوتے اور فساد میں جہاں کو مبتلا کر دیتے۔ راستے میں ان سے محفوظ نہ تھے اور خول آل علی میں سے الحسین کے بیٹوں محمد علی نے مدینہ رسول میں خراج کا مطالبہ کیا اور چار جمعوں تک نہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نماز ہو سکی اور نہ ہی لوگ وہاں تک پہنچ سکے۔ پھر سرحدیں تھیں اور پھیلی ہوئی سلطنت میں فتنے سراٹھاتے رہتے تھے۔ خوبخدا میں عوام اور سرداروں میں فوج کے سپاہیوں اور سالاروں میں ٹھن جاتی تھی اور خلیفہ اور خلیفہ وقت امیر المومنین کو اتنی فرصت نہ ہوتی کہ اپنے جھروکوں میں بیٹھ کر دریا کا نظارہ کرے۔ کار جہاں بنی کتنا مشکل تھا۔

حسین یہ سب سنتا، دیکھتا اور سمجھتا اور اس کی وحشت بڑھتی۔ وہ منصور کو جو خط لکھتا ان میں اپنے آرام سے ہونے کا ذکر کرتا کیونکہ وہ دار البصرہ کے ایک خوبصورت مکان میں جس کے درتچے دریا کی طرف کھلتے تھے رہتا تھا اور یہ مکان چھاؤنی سے ملحق تھا۔ مگر اسے معلوم تھا کہ یہ اس کے مزاج کے خلاف ہے اور وہ زیادہ دیر یہاں نہیں رہے گا۔ اس کی طبیعت یوں بھی بے چین تھی۔ وہ ایک شعلہ مستقبل تھا ایک ستارے کی طرح جو محض اس لئے فضا میں ٹوٹ کر بکھرتا ہے کہ آسمانوں پر محو سفر رہنے کا اس میں حوصلہ نہیں ہوتا۔ خرام نازہ سے تو یہی بہتر ہے کہ بجھ جایا جائے۔

دجلہ کے ساتھ ساتھ حسین کی نگاہوں کے سامنے زندگی کا دریا رواں رہتا۔ حسین و جمیل شہزادے بہترین عربی گھوڑوں پر سوار، محمولوں میں کنیزیں اور خواتین جن کے چہرے کی تابانی چاند سے زیادہ تھی۔ حبشی غلام اپنے نازاں اور اپنی طاقت کے بوجھ سے عاجز، ساقی اور سرور و سوز کی محفلوں میں جاتے ہوئے لوگ۔ بازار جواہرات سے بھرے ہوئے فروخت کرنے والے غلاموں نے نہایت عمدہ دیباہ حریر کے لباس زیب تن کئے ہوئے۔ اور دنیا کے کونوں سے عجائبات کے ڈھیر جولا کر یہاں سجائے گئے تھے۔ علم و ادب کی محفلوں اور مسجدوں میں لوگوں کا مجمع مباحث اور وعظ کی محفلیں، فلسفے کی گتھیاں سلجھاتے ہوئے لوگ اور صوفیا کے مسالک کا مختلف النوع چرچا۔

چھاؤنیوں میں تیار ہوتے ہوئے جاں نثار کرنے والے سپاہی اور وفادار اور ان میں سے وہ بھی ایک تھا۔ پھر وہ معتضد کو دیکھتا کہ بے چین ہے مصروف ہے، جنگوں میں اپنی جان کھپاتا ہے۔ بغاوتیں اور شورشیں فرو کرتا ہے اس کا فائدہ۔ دجلہ کی لہروں میں سامان سے لیس کشتیاں کھڑی رہتیں، محبت ہو یا نفرت، دنیا پر کبھی کوئی حکومت کر سکتا، حکومتیں اس لئے قائم ہوتی ہیں کہ وہ بدلیں۔ سب طرف فنا کا ٹھل بچتا ہے۔ زندگی اور موت ہر آن برسر پیکار رہتی ہیں اور آخر میں فتح فنا کی ہوتی ہے۔ خلیفہ وقت کے گرد اس کے قریب جو بھیڑ رہتی تھی اس میں وہ بھی تھا، حسین بن منصور اور وہ بھی عام آدمیوں کی طرح ترقی کر جائے یہ ہو سکتا ہے عمر بن لیث کی طرح کبھی صاحب شرط بن جائے یا پھر دربار میں ایک خاص مقام حاصل کر لے تو اس کا حاصل؟ وہ اپنے سوال کرتا حاصل؟

شرقی غربی دجلہ کو ملانے والے پلوں پر روز لوگوں کو لٹکایا جاتا تھا۔ ان کو سزا دی جاتی تھی اور یوں وہ اپنے انجام کو پہنچتے تھے۔ یہ بھی کوئی انجام تھا۔

پتہ نہیں باگیوں کو کیوں معلوم نہیں ہوتا کہ اگر کامیاب نہ ہوئے تو ان کا انجام یہ ہوگا۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیئے جائیں گے۔ ان کو دار پر کھینچا جائے گا اور ان کے بے جان جسم دجلے کے باب البصرہ کے سامنے ہوا میں جھولتے رہیں گے تاکہ لوگ عبرت پکڑیں۔

اس کے ساتھ اس مکان میں ایک اور لڑکا بھی رہتا تھا۔ حامد کو حسین کا کھویا کھویا انداز اور کم گوئی پسند نہ تھی۔ وہ بہزاد کی حسین عورتوں کا شیدائی اور ظاہری تکلفات پر دم دیتا تھا۔ مستقف بازاروں میں وہ کنیزوں کا چچھا کرتا اور ان سے کہیں نہ کہیں ملنے میں بھی کامیاب ہو جاتا۔ یہ افسانے سننے کے لئے اس نے حسین کو کبھی بھی تیار نہیں پایا۔

”واللہ قبیحہ کا حسن جہاں سوز ہے۔“ حامد نے ایک دن کہا۔

”مگر میں اپنے آپ کو جلانے کے حق میں نہیں ہوں۔“ حسین نے جواب دیا۔

”اگر اس گھر میں وہ آ سکے تو آفتاب کی ضرورت نہیں۔“

”ساری کنیزیں وہ قبیحہ ہوں یا عذرا‘ سلمیٰ ہوں یا ہندہ‘ عربی ہو یا عجمی‘ آفتاب ہوتی ہیں۔“ حسین نے کہا۔

”تم اتنے بد مذاق ہو۔ مجھے معلوم نہیں۔“ حامد نے جل کر کہا۔

”اور یہ تمہاری بد مذاقی ہے کہ قبیحہ پر دم دیئے دیتے ہو۔“ حسین نے تیزی سے کہا۔

”وہ کوئی عام لونڈی نہیں خلیفہ کے گھر میں خادمہ ہے۔“

”اس سے تو اور بھی مشکل ہے تم خیانت کے لئے کیسی محفوظ ہستی کو تلاش کر سکے ہو۔“

”تمہاری طرف کبھی کسی نے توجہ ہی نہیں دی ہوگی۔“ حامد نے چڑ کر کہا۔

”ٹھیک کہتے ہو۔ میرے پاس کبھی اتنا وقت ہی نہیں رہا۔ سچ کہنا‘ کیا وقت ہوتا ہے؟“ حسین نے ہولے سے پوچھا۔

”تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ عجیب دیوانے آدمی ہو۔“ حامد نے منہ پھیر لیا۔ ”مجھے تم سے خوف آتا ہے۔ کہیں تم

یہ سب باتیں کسی سے کہہ نہ دو۔“

”نہیں۔ میری طرف سے مطمئن رہو۔ ہاں اپنے آپ سے خوفزدہ رہو اور ہر آدمی کو اپنے آپ سے ڈرنا چاہئے۔“

”مجھ میں وہ جنون نہیں جو تم میں ہے۔“ حامد نے کہا۔ ”اور اس لئے میں لباس ظاہری سے آزاد ہو کر دیوانہ نہیں ہو سکتا۔“

”مقدر کی بات ہے۔“ حسین نے کہا۔

مگر اس کے بعد حامد اور حسین کے درمیان ایک عجیب سے سرد مہری نے جگہ لے لی جو دشمنی تو نہ تھی مگر دوستی بھی نہ تھی۔ فارغ

اوقات میں حامد مضطرب رہتا اور انتظار کرتا رہتا کہ حسین باہر جائے۔ حسین کی شامیں جب اسے دربار سے فراغت ہوتی تو فن حرب کی

نمائشوں میں یا باغوں اور ڈھکے ہوئے راستوں والے بازاروں سے ہو کر مسجد میں گزرتیں۔ مسجد میں جو فن تعمیر اور ذوق و شوق کی انتہا

تھیں جن میں قوت ایمان اور جذبہ عشق کا فرما تھے‘ عشق جو سراپا دوام ہے جس میں رفت و بود نہیں ہے‘ عشق جس کے مضرب سے تار

حیات میں نغمے فروغ پاتے ہیں۔ نغمہ جو عرش سے فرش تک ہر شے میں جاری و ساری ہے۔ یہ آہنگ جس کو سننے کے لئے کوئی سامع

چاہئے۔ اس زیر بم کی صدا برق فنا ہے۔

یہ تماشوں سے بھرا شہر تھا۔ جہاں حسین تھا۔ ایک مکمل دنیا دار دھوکہ دہی اور فریب کے سبق سیکھتا ہے۔ دربار کی بھیڑ میں لوگ ایک دوسرے کو پھلانگ کر کس طرح بڑھتے تھے پاؤں میں رونتے ہوئے۔ یہاں کوئی جذبہ، کوئی خیال، کوئی بات بھی اصل نہ تھی۔ پر غرور پر نخوت بغداد کے باشندے جن کو سچ سے دشمنی تھی اور جو اپنے شہر کو سارے جہان سے اعلیٰ اور اپنے آداب کو عمدہ جانتے تھے اجنبیوں کو پسند نہیں کرتے تھے مگر چونکہ یہاں اجنبیوں کی زیادہ بھیڑ تھی اس لئے ان سے نفرت کرتے تھے۔

معتضد نے قصہ گو اور مغنی اور آوارہ گرد قال نکالنے والوں کی طرف متوجہ ہونا چھوڑ دیا تھا۔ باقی امرا بھی امیر المومنین کا مزاج سمجھتے ہوئے اپنے اطوار بدل رہے تھے۔

دریا کے کنارے حسین اور مغنی میں ملاقات ہو گئی۔

”کیا دربار میں ہماری رسائی نہیں ہو سکتی۔ تم ہمارے ہم سفر رہے ہو ہماری کوئی مدد کرو۔“ مغنی نے کہا۔

”امیر المومنین کو آرام کا وقت نہیں ملتا وہ اکثر بغداد سے باہر رہتے ہیں۔“ حسین نے کہا۔

”فوجوں کے ہوتے انہیں اتنی تکلیف اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔“ مغنی نے پوچھا۔

”کسی ملک کی حفاظت فوجوں کے ساتھ ساتھ خلفا بھی تو کرتے ہیں۔ یہی سمجھ لو جیسے سب سے بڑا راگ جب تک تم خود شریک نہ ہو سازندے نہیں گا سکتے۔“ حسین نے جواب دے دیا۔

مغنی اپنی وہی پر شوق ہنسی ہنسا۔

”بہت خوب۔ راگ کا اور فوجوں کا تعلق؟“

”یہی تعلق تو ہے کہ حکومت ایک بہت بڑی راگنی ہے جیسے کائنات۔“ حسین نے شرقی پل کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

”مجھے تمہاری باتیں سمجھ نہیں آتیں۔“ مغنی نے حیرت سے کہا۔

”جس دن میری یہ بات سمجھ لو گے کسی جگہ بھی رسائی مشکل نہیں رہے گی۔ نہایت معمولی سی بات ہے اور کوئی نکتہ نہیں کہ جس طرح

راگ میں لفظوں اور آوازوں اور زیر بم کی درستی ضروری ہے۔ بیعت ہر شے ہر کام کا توازن کا طلب گار ہے۔“

مغنی سوچنے لگا۔

حسین نے اس سے رخصت لی اور پل کی سیڑھیاں عبور کر کے شوق الثلاثا میں داخل ہو گیا جس کے وسط میں مدرسہ نظامیہ تھا اور جس کی شہرت اقصائے عالم میں تھی۔

اس ایک دال کے عرصے میں حسین نے بغداد کی زندگی کا مزہ چکھا تھا اور دربارے اس کی وابستگی کی وجہ سے کوئی جگہ بھی اس کے لئے ناقابل حصول نہ تھی۔ لوگ اس کی ذاتی وجاہت اور نفاست طبع کی وجہ سے اسے دوسروں سے الگ پہچانتے تھے کہ اس نے کبھی کسی سے کوئی چیز مفت طلب نہ کی تھی اور نہ ہی فخر و مباہات کا مظاہرہ کیا تھا جو دربار منسلک لوگوں کا خاصہ ہے۔ زرنگاہیں قبائیں پہنے ننگی تلواریں کے پہرے میں عمائدین سلطنت اکثر شرقی حصے سے غربی حصے کو جاتے جیاں باغوں کی بہتات تھی۔ قبرستان اور اولیاء اور صالحین کے مزارات تھے اور وہاں شاید عبرت کے لئے جاتے ہوں مگر زندوں نے مردوں سے کب عبرت حاصل کی ہے؟ جو زمین کے نیچے ہے وہ زمین پر چلنے والوں کو کوئی سبق نہیں سکھاتا کہ سیکھنے والاوں کے سرائے ہوئے اور نگاہی عرش کی طرف ہوتی ہیں۔

انہی دنوں یوم صد و بیست کی باد صرصر چلنی شروع ہو گئی تھی۔ جب عصر کے وقت افق پر غبار اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارے بغداد پر چھا گیا۔ شمال کی طرف سے برف بار ہوا چلی اور موسلا دھار بارش نے اسے چاروں طرف پھیلا دیا۔ یہاں تک کہ برودت اور شدید ٹھنڈک نے لوگوں کو باہر جانے سے روک دیا۔ راستے مسدود ہو گئے جو جہاں تھا وہیں رک گیا۔ حسین کو بھی مدرسہ میں رکنا پڑا۔ قاری الحان طرب کے ساتھ قرات میں مشغول ہو گئے کہ ان کے انفاس کی برکت سے یہ زمین عذاب آسمانی سے محفوظ رہے۔ دو یا تین آدمی مل کر ایک آواز میں قرات شروع کرتے۔ ایک آیت کے ختم پر دوسرے قاری فوراً شروع کر دیتے تھے۔ اس ترتیب سے آیات متشابہتا پڑھنے کا سلسلہ رات گئے تک جاری رہا۔ سننے والوں کے چہروں پر انفعال اور ندامت کے آثار نمایاں تھے۔ سب کے دل ہول قیامت سے خائف و ترساں تھے۔ نفوس پر کچھ ایسی حالت طاری ہوئی کہ سب کی زبان پر بے اختیار تو یہ جاری تھی۔

دل اب کیا ہے شوق نے اسے پگھلا دیا

قلب اب کہاں ہے جدائی نے اسے کھو دیا

اے ہدم تجھے خدا کی قسم اور تجھ پر جان قربان

ان کے ذکر سے میرے سوز و گداز کو بڑھا

پڑھنے والے نے ان اشعار کی اتنی بارنگراری کی کہ ہر آنکھ سے آنسو جاری تھے۔ خوف سے ہر دل کانپتا تھا اور آہ و بکا کی آوازیں سے دل بیقرار تھے۔ حسین پر وجد و کیف کا ایک عالم طاری تھا یہاں تک کہ گرمی شوق اور تپش دل نے اس کی جان کو گداز کر دیا اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

باب البصرہ اور محلہ شارع کے درمیان شوق المارستان تھا جس میں شفا خانہ کی عالی شان عمارت دجلہ کے کنارے تھی۔ اس کے

اندر جہاں شاہانہ آرائش کا سامان تھا، انہوں نے حسین کو ایک ایسے مکان میں ٹھہرایا جس کی کھڑکیاں اونچی اور کشادہ تھیں اور درجلہ کی نم ہوا، اگر مریض چاہے تو اس تک پہنچ سکتی تھی۔ پھر دوسری طرف کے درتے کے محلہ عشاہیہ میں کھلتے تھے، جیاں ریشم اور مختلف قسم کے سوتوں کو ملا کر کپڑا تیار کیا جاتا تھا اور کرگھوں کا مدھم مدھم شور جیسے ساز بج رہے ہوں، سنا جاسکتا تھا اور فرات کی وہ شاخ جو درجلہ میں گرتی تھی اس کے قریب سے گزرتی تھی۔

مدرسہ نظامیہ سے اس قیامت کی خیز بارش میں جب قبروں کے منہ کھل گئے تھے اور دن شدہ مردے گلیوں میں تیرتے پھرتے تھے، حسین کو لایا گیا۔ اس پر سخت بے ہوشی طاری تھی اور اس کے باوجود کہ طبیب اس کے گرد کھڑے ہر تدبیر کر رہے تھے، اسے ہوش میں لانے کے لئے کافی مصیبت اٹھانا پڑی۔ ہاتھ اور پاؤں بے جان تھے۔ رنگ زرد تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ صدمے نے اس کے حواس پر اپنا پنچہ مارا ہے۔

دو گھنٹہ داکٹر بائیں نہایت تاکید سے بٹھائے گئے اور طبیب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ شاید خداوند تعالیٰ اپنے بندے کو ہوش و خرد عطا کرنے والا اس شخص کو بھی بچالے۔ بجلی کا لہریا ایک ایک لمحہ کے بعد دستک دیتا تھا اور رعد کا شور کانوں کے پردے پھاڑے ڈالتا تھا جیسے عناصر کسی قید دے آزاد ہو کر زور آزمائی کر رہے ہوں۔ گلیاں رواں نہروں کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ یہ کیسے بے ہوشی تھی اور کوئی یہ بتانے والا بھی نہ تھا کہ آخر ہوا کیا تھا۔ پانی بنا کے پڑ رہا تھا گویا طوفان نوح ہر خشک و تر کو ڈھانپ لے گا۔

المارستان کے شفا خانے میں مریض اور طبیب سوچ رہے تھے شاید قیامت آگئی تھی گناہوں سے معافی اور توبہ کرنے کی یہی گھڑی تھی۔

حضرت عثمان مکی اپنی خانقاہ سے نکل کر بغداد کے محلہ عربیہ میں تھی شفا خانہ کی طرف آئے۔ ان کے عزیز ابویوب قطع بیمار تھے۔ کئی اطباء کے زیر علاج رہنے کے باوجود انہیں ابھی صحت نہیں ہوئی تھی۔ ایک ہفتے کی مسلسل بارشوں سے ذرائع آمد و رفت تقریباً ناپید ہو گئے تھے۔ شاہراہوں پر کشتیاں چل رہی تھیں۔ گھروں میں پانی گھس آیا تھا اور افراتفری کا عالم قیامت کا نمونہ تھا۔ ایسے میں بغداد کے دیہات سے قریب کوئی بھی معالج کہاں جاسکتا تھا۔ ابویوب کی حالت بگڑ گئی تھی۔

شفا خانے میں بہترین طبیب جمع ہوتے تھے جو جمعرات اور سوموار کو مریضوں کو ملاحظہ کرنے آتے تھے، اس لئے حضرت عثمان مکی نے بہتر سمجھا وہ خود تشریف لائیں اور ابویوب قطع کیلئے کسی کو زحمت دیں۔

لوگ ملے جلے خوف اور تجسس سے سب طرف یہ ذکر کر رہے تھے کہ بارش میں ایک چبوترہ کھلا ہے اور اس میں سے سات قبریں کھل گئی ہیں اور سات جسدِ خاکی اس میں ظاہر ہوئے ہیں یوں کی فضا ان کی قبروں کے کھلنے سے خوشبودار ہو گئی ہے اور ان صورتوں پر نظر نہیں ٹھہرتی۔ ہر چہرہ مخو خواب آفتاب ہے چمک دمک میں بے مثال اور جلالتِ آبی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر۔ شفا خانے کے ہجوم میں سن کے لوگ اللہ سبحانہ کی حمد و ثناء کر رہے تھے۔ موت اور زندگی سے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ اعمال کی پاکی اور رحمتِ خداوندی کے بنایا انجام قطعاً ناممکن تھا۔ خدا جانے وہ لوگ کس زمانے کے تھے کس مذہب سے ان کا تعلق تھا؟ نورانی صورتوں والے جوان رعنا جن کی موت پر سے پردہ اٹھاتا تھا اور خوشبو۔ لوگ صالحہ اور عمدہ اعمال کا ذکر کرتے رہے۔ ہر شخص جسے اپنی باری کا انتظار تھا ایسی موت کا طلب گار تھا۔ دولت دنیا اور دولتِ دین۔

طیب نے حضرت عثمان کو دیکھا تو ادب سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ وہ ان کی شان اور مقام سے واقف نہ ہونے کے باوجود ان کی بزرگانہ وضع قطع سے بہت متاثر ہوا تھا۔

”آپ نے کسی کو بھجوا دیا ہوتا میں خود حاضر ہو جاتا۔“

”مریض میں نہیں میرا ایک عزیز ہے۔“ انہوں نے نہایت نرمی سے کہا۔

حسین نے اس آواز کو سنا تو نگاہیں اٹھا کر دیکھا۔ کچکی سے اس کی جان کو جھٹکا لگا اور بدن کانپا۔ سر سے لے کر پاؤں کی ایڑیوں تک اسے سردی کی لہر اپنے اندر محسوس ہوئی۔

دوسری طرف بیٹھے ایک شخص نے بڑھ کر دست بوسی کے بعد کہا:

”حضور۔ میں یہ مسئلہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انسانی جسم ہزاروں سال تک دفن رہنے کے بعد بھی تروتازہ اور خوشبودار ہو

سکتا ہے۔“

سب لوگ متوجہ ہونے لگے تو حضرت عثمان مکی نے کہا:

”یہ خدا کے اپنے راز ہیں اور ان کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی جو ہوا وہ یقیناً ممکن ہو گا ہی اور یہ فنا ہونے والا وقت ہماری تقویم میں

ہے۔ ایک وقت اس سے باہر ہے جس سے ہم شاسا نہیں ہیں۔“

حسین نے پھر سردی کی شدید لہر اپنی ہڈیوں میں محسوس کی اور اوپر دیکھا۔

حضرت عثمان مکی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حسین پھر کانپا اور غبارِ اس کی آنکھوں کے سامنے چھا گیا جیسے تیز حدت سے

بھری ہو اس کے سر میں گھوم رہی ہوں۔ اس نے اپنے سامنے ہاتھ پھیلائے تو اسے محسوس ہوا اہل بن عبداللہ تستری نے سے سہارا دیا ہے۔ اس کا ہاتھ پکڑا ہے۔ اس کی آنکھوں پر اپنی انگلی پھیری ہے۔ بھاری پہوٹوں کی نیند غائب ہو گئی۔ چکراتا ہوا ذہن قائم ہو گیا۔ اس نے گھبرا کر پھر اوپر دیکھا، بخار کی کیفیت، سردی کی کپکپاہٹ سب رخصت ہو چکے تھے۔ اس نے مسکرا کر دیکھا حضرت عثمان مکی نہایت شفقت سے اس کی طرف نگاہ کئے ہوئے تھے۔

طیب کے ہمراہ شفا خانے سے جاتے ہوئے انہوں نے حسین سے کہا: ”عزیزم، محلہ حربیہ کی خانقاہ میں آؤ۔“ اس نے سر جھکا دیا۔

سات قبروں کا ایک چبوترے کے شق ہونے سے ظاہر ہونا اور ان کی وجہ سے پورے علاقے کا خوشبو سے معطر ہو جانا حسین کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا۔ وہ اعمال و افعال کی نیکی اور خلوص کو سمجھتا تھا، راست بازی کو یا کاری سے الگ جانتا تھا مگر عمل کی اس جہت سے نا آشنا تھا۔ اسے کس شے سے شناسائی تھی؟

آدمی آتش و آب و خاک و باد سے مل کر بنا ہے اور وہ ایک طرح سے مگ بچہ تھا۔ آتش پرستی اس کے خون میں رچی بسی تھی اور یہ آگ وہ نہیں تھی جس کو ہم دیکھتے تھے بلکہ یہ وہ آگ تھی جس کے اندر آتش و آب و خاک و باد تھی اور یہ حرارت، حرارت عشق تھی اور اس کی حرکت سے لوٹکتی تھی اور وہ عشق حقیقی کی لوٹتی۔ حسین نے اپنی ممکنات پر کب غور کیا تھا۔ یہ اس کے اندر کب درآئی تھی۔ ہلودیتا ہوا وجود وہ سارے کا سارا آگ کیوں بن گیا تھا اور پھر اس نگاہ درنگاہ سے جس میں نہ زمانوں کی دوری نہ مکان کی دوری مانع تھی۔ وہ تحلیل ہو کر پھر یکجا ہوا تھا۔

عناصر اس کے اندر یہ کیا کھیل کھیل رہے تھے۔ وہ فانی ہو رہا تھا۔ باقی ہو رہا تھا۔

حضرت عثمان مکی نے خانقاہ میں حسین کو دیکھ کر کہا:

”تم عدم وجود کے کھیل میں غیر جانبدار ہو۔ اپنی پوری توجہ صرف کرو گے تو یہ گتھیاں سلجھیں گی۔“

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا جیسے تستر میں شیخ کے سامنے دوزانو بیٹھا کرتا تھا۔

”تم اپنے اشواق کی شدت کو کبھی محسوس اور کبھی معدوم سمجھتے ہو۔ تہذیب نفس ضروری ہے تم ان مجالس میں وقتاً فوقتاً آ کر بیٹھ سکتے ہو مگر سالک راہ شوق اور سیرالی اللہ کے لئے اپنے آپ کو جب تک تیار نہ کر لو یہاں آنا تقریباً کوئی نفع نہ دے گا۔“ حضرت عمر بن عثمان اپنے مسالک میں اصول کی پابندی ضروری سمجھتے تھے۔

حسین نے زخمی نگاہ سے ان کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر سوئے ادب کے خیال نظر اٹھ نہ سکی۔

”تستر سے تم کیوں بھاگ آئے تھے۔“ انہوں نے پوچھا تو حسین نے چونک کر اوپر دیکھا۔ ان کی تادیب کرتی نگاہوں کی وہ تاب نہ لا سکا۔

”دربار خلافت میں بھی تہذیب نفس ہو سکتی ہے بشرطیکہ رحمت خداوندی شامل حال ہو۔“ وہ اس کے حال کی طرف خوب متوجہ تھے۔

”میں دربار کو چھوڑ دوں گا۔ آپ مجھے اپنے سائے میں رہنے کی اجازت دیں۔“ اس کی عاجزی دیدنی تھی۔ اس کا سارا وجود پانی بن کر خاک بن کر ہوا بن کر ان کے قدموں میں تھا۔

حضرت سوچتے رہے سوچتے رہے یہاں تک کہ غرغہ کھلا اور کسی نے کہا:

”عم بزرگوار! والد کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔“

حسین چونکا۔ یہ اغول کی آواز تھی کیا؟

اس کا سارا وجود پھر لوہے لگا جیسے الاؤ جل اٹھا ہو۔ اونچے شعلوں سے خانقاہ کا صحن بھر گیا ہو۔ اس سے اس کی ذات سے ہر شے لبریز ہو گئی۔ سب طرف وہ تھا۔ آنچ بھی اور جلن بھی، تپش بھی شعلہ بھی، یا سب طرف آگ تھی اور وہ کہیں نہیں تھا، وہ اغول تھا اور اغول اس میں سما گئی تھی۔ عجیب سا تجربہ تھا اور مشاہدہ تھا۔

اس کے اندر پھر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو گئی۔ کشمکش کہ کون رہے اور کون مٹ جائے..... دوئی کو مٹ جانا..... یہ آسیب کا نام تھا۔ ہاں بس نام ہی تھا۔ اس نے اسے دیکھا تھا؟

کیا دیکھنے کے لئے دو آنکھوں کی ضرورت ہوتی ہے؟

مگر خیال سے عشق کیا نہیں جاسکتا اور اس میں اپنا آپ تج دینے کی بھول جانے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ ہو کس سے عشق کے کدھر جائے۔

لگا زمانے گزر گئے ہیں۔

”حسین تم دروس میں شریک ہو سکتے ہو۔“

”جی۔“ اس نے ان کی نگاہوں کی نرمی کو محسوس کیا جیسے بیمار جان کو کہیں سے شربت شفا پلا یا جا رہا ہو۔

”مگر اس سلسلے کو سمجھنے کے لئے اور اس میں ایک مرید کی طرح شریک ہونے کے لئے وقت کی ضرورت ہوگی۔ تم میری بات سمجھتے ہو؟“

”جی۔“

اس نے رخصت لی اور جب حضرت اٹھ کر قطع کے گھر کی طرف اس غرنے میں سے پار ہوئے ہیں تو ان کی پشت پر سے ان کی نگاہ اٹھی اور اس نے اعیوب قطع کی بیٹی کو دیکھا۔ عجیب سوختہ چہرہ تھا۔ سیاہ رنگ، افسردہ، بے رونق، باپ کی بیماری سے پریشان، کتنے تضادات اس ایک چہرے میں جمع تھے۔ آواز کی نفیسی اور چہرے کی کڑنگی، جیسے کوئی مصفا چشمہ خس و خاشاک کے اندر سے پھوٹ رہے۔

حسین جب محلہ قراقہ میں جہاں دجلہ کے کنارے قافلوں کا پڑاؤں ہے پہنچا تو اسے ہندی سوداگر مل گیا۔ وہ دیار بکر اور شکریت کے شہر سے لوٹا تھا اور حمام کی طرف جا رہا تھا۔ اس حصہ بغداد میں نہایت عالی شان اور بڑے بڑے حمام ہیں جن پر سیاہ روغن کو اس طرح جمایا ہوا تھا گویا سنگ سیاہ سے تعمیر کئے گئے ہوں۔ فراواں گرم اور سرد آب فراہم اور نہانے والے کو پوری خلوت میسر۔

”تم یہیں پر میرا انتظار کرو اگر تمہیں کوئی اور نہایت ضروری کام نہ ہو تو۔“ اس نے حسین سے کہا۔

حسین نے سر کے اشارے سے پھمبھرنے کا اقرار کیا اور دل پر بڑی بڑی کشتیوں اور خلقت کے ہجوم کو اوپر سے اوپر آتے جاتے دیکھتا رہا۔ وہ ان محلات کے اندر رہتا تھا اور آج جب وہ انہیں باہر سے ذرا فاصلے سے دیکھ رہا تھا تو ایک دم ان کی شان و شوکت اس پر عیاں ہوئی۔ خلفاء نے بدویت سے شہریت کا اور عوام نے سادگی سے پرکاری کا راہ طے کیا تھا۔ یہ عمارتیں سنگ میل تھیں۔ مدرسے اور خانقاہیں، شفا خانے اور ستاروں کے مطالعے کے لئے دور مینیں۔ سائنس کے مطالعے کے لئے بڑے بڑے جامعے اور سیرگاہیں، باغات اور جری نہریں، عالی شان محلات اور دنیا کا سارا جاہ و جلال رونق اور خوبصورتی، شاہی خدام اور حبشی خواجہ سراؤں کی تلواروں کے حل آے میں چلتے ہوئے جلوس میں ترکی اور ویلیسی افسر، دجلہ کی سیر کرتی ہوئی رونق بچے اور خواتین۔ یہ زندگی کا کارواں رواں تھا اور بے خبر کہ اگلی گھڑی کیا ہونے والا ہے۔ وسیع بازار بے شمار باشندے مدرسے اور وہاں جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا، وسیع و معمور بات البصیلہ نظر آتا تھا۔

سوداگر نے کہا: ”سال سے زیادہ عرصہ ہوا جب میں نے اور تم نے اکٹھے سفر کیا تھا۔ اس وقت سے اب تک تم میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ آرام نے اور خلافت کی ملازمت نے البتہ تم کو نکھار دیا ہے۔ تم نے ذرا سا قد نکالا ہے۔ لباس بھی عمدہ ہے۔ مگر تم

کچھ خوش نہیں دکھائی دیتے۔ کیا بات ہے؟“

حسین اور وہ کشتیوں اور لوگوں کے درمیان چلتے رہے۔ خوشگوار ہوا میں سیر کرتے چہرے پر بہار تھے۔ دریا کے ساتھ ساتھ شاہراہ پر جہاں سواریاں نہیں آ سکتیں، پیدل چلنے والوں کا ہجوم تھا۔ بچے کاغذ کی خوش رنگ پتنگیں اڑا رہے تھے۔ گانے والوں کی ٹولیاں باغوں میں سبزے پر محو خوش الحانی تھیں اور اس کے باوجود کہ خلفی نے سب آوارہ گردوں، فال نکالنے والوں اور تماشہ بینوں کو شہر بدر کر دیا تھا۔ بغداد کی آبادی میں اور خوش دلی میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔

”تم کچھ کہتے نہیں ہو حسین۔ چپ کیوں ہوں۔ کیا عشق میں گرفتار ہو گئے ہو۔“ سوگا گرنے ازرہ مذاق کہا۔

”تم تو دنیا میں گھوم کر آئے ہو۔ تماشوں اور سیر اور واقعات سے پر ہو گے۔ تم ہی کچھ کہو۔ میں نہ عشق میں گرفتار ہوں اور نہ ہی ناخوش۔“ حسین نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا۔

”اس خطہ زمین میں تماشے اور سب جگہ سے زیادہ ہوتے ہیں۔“ سودا گرنے کہا۔

”کیا یہ اقلیم باقی جہان سے زیادہ مہیب ہے۔ تمہارے ہاں تو دریا چٹانوں سے نکلتے ہیں اس کی کچھ کہو۔“ حسین نے خوش دلی سے کہا۔

”وہاں تو صرف دریا ہی ایسے ہوتے ہیں تمہارے یہاں تو اور ہی تماشہ ہے، کسی نیک اور بزرگ کو خدا سیدہ اور معصوم سمجھو تو وہ کسی نہ کسی موہب کا داعی، حکومت کا باغی، کسی اور موہب کا مبلغ ہوتا ہے۔ سفر کے دوران تقریباً ہر گام پر مجھے ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے جن کی آنکھیں اندر دیکھتی ہوئی، شکلیں سادہ مگر کردار نہایت خوفناک تھا۔ قتل اور غارت گری ان کا پیشہ ہے۔ ہر قسم پر دھوکہ فریب، سلطنت کے خواب لیتے ہوئے آدمی، رقص کرتے ہوئے خدا شناس درویش اور خلافت کے نہایت شدید دشمن۔ آل علی کا نام لے کر علم کی آڑ میں ظلم و تشدد کرنے والے۔ مجھے کم از کم بیس سال اس گرد و نواح میں گھومتے ہو گئے ہیں۔ مگر اس زمانے سے زیادہ پریشان زمانہ میں نے نہیں دیکھا۔ راستے غیر محفوظ، شاہراہیں پر خطر اور ہر موڑ پر کوئی خوف گھات میں..... کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے کہ تمہارے مذہب میں اتنے مختلف خیالوں کے لوگ جمع ہیں اور ایک دوسرے کا گلہ کاٹنے اور جان سے مارنے کے درپے ہیں۔“

”کیا تمہارے ہاں چین ہی چین ہے۔ کوئی مذہب کے نام پر قتل و غارت نہیں کرتا۔“ حسین نے پوچھا۔

”ہم نے اپنی سرحدوں کو بند رکھا ہے۔ ہمارے پہاڑ برف سیڈھلے ہوئے اور عبور کئے جانے کے قابل نہیں۔ فوجوں کو کوئی سیدھا راستہ نہیں مل سکتا۔ اونچے درے ہیں جہاں سے ایک وقت میں بہت کم لوگ گزر سکتے ہیں اور پھر ہماری آب و ہوا سخت ہے۔ گرمی

میں بہت گرم۔ زیادہ بارشیں، شدید سردی، ہم نئے خیالوں کو اندر آنے کی اجازت نہیں دیتے کچھوے کی طرح ہم خطرے کے وقت اپنے عقائد اور مذہب سمیت وہاں چھپ جاتے ہیں۔ ہمارے ظاہری وجود کو چاہے آپ کسی شے سے بھی کاٹیں مگر اندرونی طور پر ہم کسی سے اثر قبول نہیں کرتے۔“

”بہت خوب۔ بہت خوب۔“ حسین حیران تھا۔

”ہمارے ہاں اوتار آتے ہیں جو سمجھ لو مذہب کو دھوکے سے سرے سے جھاڑ پونچھ کر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ سب سے بڑے اوتار کرشن کنہیا ہیں۔“ سوداگر نے کہا۔

”کیا وہ زندہ ہیں۔“ حسین نے پوچھا۔

”نہیں زندہ تو نہیں ہیں مگر ہر زمانے میں ان کی پوجا ہوتی ہے۔ ہر رنگ میں وہی ایک مرلی منوہر۔“

”تم لوگ محشیت قوم ایک تو نہیں ہو۔ تمہارے ہاں بھی بدھ ہیں اور کتنے اوتار ہیں۔ ان کی اپنی الگ الگ تعلیمات ہیں۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میرے دادا مجوسی تھے۔ میری رگوں میں آگ کو پوجنے والی نسلوں کا خون ہے بلکہ میری رگوں میں آگ ہے۔“ اس نے ہنس کر بات ختم کی۔

”اور تم..... تم تو شاید اسلام کے والد و شیداء ہو۔“ سوداگر نے کہا۔

”سمجھ لو میں ایک درخت ہوں جس میں آگ ہے اور آگ درخت طور میں ظاہر ہو سکتی ہے اور خدا کی وحدانیت پر گواہی دے سکتی ہے۔ تم نے شالیں وہ قصہ نہیں سنا۔“ حسین نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا۔

حضرت موسیٰ نے جب خدا سے مکالمہ بہت کیا تو انہیں دوست کو دیکھنے کی خواہش ہوئی۔ انہوں نے کہا: ”رب ارنی“ اے میرے رب، میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اور خدا نے کہا، تم میرا جلوہ دیکھ نہیں سکو گے۔ موسیٰ پھر بھی بضد رہے۔ آخر اللہ نے کہا، پھر اس درخت کی طرف دیکھو اور درخت طور میں سے آواز آئی۔ ”میں خدا ہوں۔“

”کیا وہ درخت خدا بن گیا تھا۔“ سوداگر نے حیران ہو کر پوچھا۔

”نہیں درخت خدا نہیں بنا تھا۔ خدا جس شے میں جلوہ گر ہوں وہ اس کے پر تو سے خدا بن جاتی ہے۔“ حسین نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”مگر جلوہ تو خدا کا ہوتا ہے۔ نور تو وہی ہوتا ہے۔ شے کی اپنی ہستی فنا نہیں ہوتی۔“

”چیزیں خدا نے پیدا کی ہیں۔“ حسین نے دجلہ کی ہوا میں اپنے رومال کے پھڑ پھڑاتے پلوؤں کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

”ہاں۔“ سوداگر نے کہا۔

”چیزوں کی ہستی خدا سے الگ ہے..... ہے نا۔“ حسین نے سوداگر کے سوچتے ہوئے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔

”ہاں۔“ بہت دیر کے بعد جواب ملا۔

”خدا کا جلوہ چیزوں کو اپنا نور اپنی جہت عطا کرتا ہے مگر وہ خدا نہیں ہو جاتیں۔ ڈاس نے ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”اسی طرح جیسے ہمارے ہاں بھگوان ہر شے میں ہوتا ہے اور چیزیں الگ ہوتی ہیں۔“ سوداگر نے کہا۔ ”تو پھر ہماری سوچ بھی وہی ہے۔ برہما، بھگوان، ایشور، نرنکار اتنے نام ہیں۔ سب ایک اس کے ہیں جسے تم خدا کہتے ہو۔ سنو حسین! ہر آدمی کو ہر جالے کو ہر اندھیرے کو اسی نے پیدا کیا ہے۔ دب کچھ ایک ہے۔ اسی کی ایکتا پر ساری دنیا کے، مشرق کے، مغرب کے مذہب کھڑے ہیں تو پھر جھگڑا کا ہے کا ہے۔“ وہ بچوں کی طرح خوش ہو رہا تھا جیسے اس نے کوئی بڑی بات کہہ دی ہو۔

حسین نے کہا: ”چلو یہ الجھاوے بہت ہیں طویل ہیں۔ آؤ میں تمہیں دجلہ کی خاص مچھلی کھلاؤں۔ مگر.....“ پھر اس نے مس کر سوداگر کی طرف دیکھا۔

”کوئی بات نہیں دوست۔ جب سے میں عرب ممالک میں آتا جاتا ہوں میں نے مچھلی کو بہت لذیو پایا ہے۔ مجھے تمہاری دعوت منظور ہے۔“

وہ ہاتھوں میں ہاتھ دیئے جنوب کی طرف روانہ ہو گئے جہاں شاہراہوں کے آخری مطبخ تھے اور لوگ لکڑی کی نشستوں پر بیٹھے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ دونوں بھی ایک نشست پر بیٹھے تھے اور سامنے دیہات کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نینوا کے کھنڈرات اور اس سے پہلے نجف اشرف کربلائے معلیٰ عراق اپنے دریاؤں، نہروں، باشندوں کی وجہ سے مشہور تھا اور اپنی فضیلتوں کی وجہ سے ایک عرش تھا۔ سوداگر نے ٹھیک ہی تو کہا تھا: ”اسلام میں وجہ نزاع صرف اور صرف اسلام تھا۔“ حسین کے سوچ بہت دور نکل گئی تھی۔

خاک پاک مدینہ جہاں پر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ وہ افضل کیوں تھے؟ اس لئے کہ وہ وجہ وجود کائنات تھے۔ عرش سے پہلے ہر شے سے پہلے اللہ نے انہیں مخلوق کیا تھا۔ اس نور کو اور پھر آفتابوں اور ستاروں کو اور دنیا کو اور آخر میں آدم کو۔ سجدہ کرنے سے انکار کیا تھا گو یا اس نور کو جو اس پیشانی میں رکھا گیا تھا وہ پہچان نہیں پایا تھا۔ اس نے اپنی عبادت سے اپنے مراقبوں سے کیا سیکھا تھا؟ اسے وہ آنکھ عطا نہیں ہوئی تھی جو دیکھ سکتی اور اسے اپنی عبادت کا غور تھا۔ اسے اپنے کچھ دکھانے نہ دینے پر سوائے ایک ناز تھا

اور وہ نازا سے لے ڈوبا۔ اسے عرش کے سب راز جانتے ہوئے بھی وہاں سے نکال دیا گیا۔

”سنو۔ تمہارے ہاں کوئی ایسا ہے جو آدمی کو بہکا تا ہے اسے نیکی سے بدی کی طرف بلاتا ہے۔“ حسین نے پوچھا۔

”اب نیکی اور بدی کو چھوڑو۔ یہ بحث بعد میں کر لیں گے۔ گمغ‘ بچے اور کنیزیں‘ گروتز سایہودی اور نصرانی‘ ہندوستانی اور عجیب عجیب لباس پہنے لوگ گھوم رہے ہیں اور بھگوان کے تو آدمی کسی وقت بھی سوچ سکتا ہے۔“

دکاندار نے دریا کے ساتھ مٹی کے حوضوں میں سے ایک میں ہاتھ ڈال کر ایک مچھلی پکڑی اور انہیں دکھائی۔

”آپ کے لئے یہ کافی رہے گی۔“ اس نے ان کی طرف دیکھے بنا کہا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ سوداگر نے تڑپتی مچھلی کی آنکھیں دیکھیں جو ان کی طرف دیکھنے کی کوشش کر رہی ہوگی۔ پھر اچھلی ہے تو

اس کا سفید چمکتا ہوا پیٹ نمایا ہوا۔

حسین ایک مسکور کرنے والی آنکھ میں دیکھ رہا تھا۔ تڑپ کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش میں اس پر کچی طاری ہو گئی۔ اندر سے کوئی شے تھی جو مل رہی تھی۔ لرزاں ترساں جیسے مقتل میں لے جانے سے پہلے کوئی پابجولاں قیدی اپنے انجام سے باخبر ہونے کے باوجود لرزاں ترساں ہو۔ رہائی کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔

کشتیاں سطح آب پر رواں تھیں۔ سامان سے بھری ہوئی، بڑی بڑی، دل کو فرحت بخش سیر دریا سے بہلانے والے لوگ۔ پرغوت جہشی اور ترک اور جھروکوں میں سے جھانکتی عورتیں، کشتیوں کے مکانوں میں سے سر نکال کر ادھر ادھر نظر دوڑاتی ہوئیں۔

انہیں وہیں لکڑی کے ایک میز پر بھاپ اڑاتی مچھلی اور تنور کی گرم روٹی دی گئی۔ ریزہ ریزہ الگ تھا اور مزے میں آج تک کی نوش جان کی گئی سب عمدہ ترکیبوں سے پکا ئی گئی مچھلی سے سوا۔ لوگ باری کا انتظار کر رہے تھے اور یہ سلسلہ جاری تھا اور ستارے گہرے نیلے آسمان کی پہنائیوں میں سے نیچے جھانک رہے تھے۔ لوگ سفر موت میں خراماں خراماں لگے ہوئے مست، سرود کی آواز کہیں قریب سے آئی اور پھر گانے والے نے گایا۔

لوگوں نے پوچھا کیا تم خوش ہو

اس ایک سے محبت کر کے جس کے دانتوں میں ریخیں ہیں

میں نے کہا ایسے چشموں سے سیرابی جنہیں دوسروں نے چھوڑ دیا

خس و خاشاک سے ڈھکے

جہاں لوگ اپانی کے لئے جمع ہوتے ہیں!

سننے والے سن رہے تھے۔ یہ بد صورتی کی خوب اچھی توجیہ تھی۔

سوداگر نے کہا: ”حسن کے تو سب دیوانے ہوتے ہیں۔ کوئی بد صورتی کو چاہے اس کی طرف کشاں کشاں کھنچا چلا جائے۔“

”ایسا بہت ممکن ہے مگر زشت کے قلب میں تو کچھ ہوتا ہے جو خوب ہوتا ہے اور یہ لبادے تو ظاہری ہیں۔“

حسین نے ہاتھ پانی سے دھو کر رومال سے صاف کئے جو دکاندار لئے کھڑا تھا۔

کوئی بھی نو جوان بد صورت دوشیزا کو پسند نہیں کر سکتا۔“ سوداگر نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ایسا ہو سکتا ہے۔ ہو جایا کرتا ہے۔“ حسین نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”تو یہ دیوانگی ہوگی۔“

”کبھی کبھار آدمی دیوانہ ہونا پسند کرتے ہیں۔“ حسین کی خوش دلی کو سوداگر نے مذاق سمجھا۔

کھڑے ہو کر انہوں نے دریا پر نظر کی۔ کشتیوں کی روشنیاں ستاروں کا عکس لہروں کی چمک سب ایک حسین تصویر کی طرح

تھے۔ ایک خواب جو جاگنے پر بھول جائے گا۔ ہوا میں کیف بھرا تھا۔ نیند لانے ولای فرحت انگیز نے نواز گھاس کے تختوں پر بیٹھے

تھے اور گانے والے اپنی اپنی زبانوں میں گارہے تھے۔ یہ رات اصل نہیں لگتی تھی کسی اور شے کا دھندلا پر تو تھی۔ زنجیوں اور قمر مٹیوں

کے فتنوں سے الگ یہ تو سب سے بڑا اور سچا پیغام لاتی ہوئی رات تھی کہ سب فنا کی راہ میں ہے۔

اپنے پڑاؤ پر جدا ہوتے ہوئے سوداگر نے کہا: ”حسین! تم بد صورتی کی تعریف میں آج بہت چمکے۔ کیا تم سنجیدہ تھے۔“

بالکل بالکل۔ حسین نے کہا۔

”اچھا خدا تمہیں تمہاری بد صورتی کے ساتھ سلامت رکھے۔“ اس نے ہنستے ہنستے کہا اور پھر وہ پڑاؤ کی طرف چلنے کے لئے الوداع

کہنے لگا کیونکہ اس کا قافلہ اگر کوئی معقول وجہ نہ ہوئی تو روانہ ہو جائے گا۔

سب قافلے رواں ہو جاتے ہیں اور حیات کا بھی۔ حیات جو فنا کی زد میں ہے۔ فنا سے بڑی کوئی حقیقت ہے؟ حسین نے سوچا

..... جب زشت و خوب کی اصل ایک ہے فنا و بقا بھی ای ہے۔ نیند اور خواب جاگنا بھی ایک ہے۔ ہر شے کا اصل ایک ہے تو وہ اس

صورت کو ڈھونڈنے کے لئے کہاں تک سرگرداں رہے جبکہ سب صورتیں ایک ہیں۔

حسین نے اپنے جی میں دو فیصلے کئے کہ وہ حضرت عمر بن عثمان مکی کے دروس میں شریک ہوگا اور یہ کہ وہ امیر المومنین کی ملازمت چھوڑ دے گا۔ دونوں کام اتنے آسان نہ تھے۔ اس کے باوجود کہ حضرت عثمان مکی نے اسے درس میں بیٹھنے اور استفادہ کرنے کی اجازت دے دی تھی وہ اسے اپنے سلسلے میں لینے کو تیار نہ تھے۔ یہ مغائرت کی دیوار تھی کہ اس کا منہدم کرنا اس کے نزدیک بہت ضروری تھا اس کا مقدر یہ کیوں تھا کہ وہ مکتب اور استاد اور اسباق بدلتا رہے خوار و سرگرداں اور بے قرار رہے۔

یہ سال بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ اس نے دربار خلافت میں زشت و خوب کی دید اور اس کے قرب میں صرف کئے تھے۔ اس عرصے میں ان بہار سے خزاں اور حدت و برودت کے موسموں میں اس نے اپنی جگہ سے سرمودا دھرا دھرتی اور تنزل نہیں کیا تھا گویا کہ یہاں وہ محض کھڑا ہوا تھا اس کے جی میں کبھی نہ ہی حصول زر کی نہ ہی حصول جاہ کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔ اس نے بہت دوست بھی نہیں بنائے تھے اور بارگاہ خلافت سے اندر اور باہر قہرمانہ اور خواصیں اور لونڈیوں اور کنیزوں کے پرے تھے۔ کسی طرف بھی اس نے کبھی نظر التفات سے نہیں دیکھا تھا۔ بارونق محلات اس کے لئے بس تھے۔ اس نے بلاچون و چراں بلا سولال کئے اطاعت کرنا سیکھا تھا۔ کیا یہ تربیت نفس تھی؟ اور اب وہ گھبرا گیا تھا۔ ایک تماشے کو اپنی نگاہوں کے سامنے زندہ دیکھنا اور ستون کی طرح سراپردوں کے ساتھ کھڑے رہنا، وہ تو اس تمثیل میں ایک ستون بھی نہیں تھا۔ تو وہ کیا تھا؟

پریشان لوگ تحریکوں میں الجھے اجنبی دنیا کی یہ ایک چھوٹی سی رنگین عکاسی تھی۔ ایم مرقع۔ بھلا وہ اس مرقعے میں کہاں تھا۔ کہیں بھی نہیں۔ یہ کارواں جو اس کی نگاہوں کے سامنے نکلا چلا جاتا تھا۔ گزرتے وقت کی پرچھائیں میں دھندلا سا دکھائی دیتا بھی تھا اور نہیں بھی۔ غربی بغداد میں وسیع قبرستان تھے اور بنو امیہ کی قبریں کھود ڈالی گئی تھیں۔ غصے اور تعصب اور قاتلانہ جذباتوں سے بھرے یہ عرب النسل لوگ جن پر شرافت کو ناز تھا ہاشمی اور عباسی اور ہاشمیوں کی پر اسرار زندگیاں اور علوی اور معتزلہ۔ سوچتے سوچتے وہ شل ہو جاتا تھک جاتا۔ اگر کسی وقت اس سے پوچھا جائے کہ وہ کس کا ساتھ دے گا تو وہ کس طرف ہو؟ وہ عباسی خلفاء کا ملازم تھا مگر اس کی ہمدردیاں ہاشمیوں کے ساتھ تھیں جو بغداد میں کم ہی دکھائی دیتے تھے۔ ایران میں اکثر ان کی بغاوتیں ہوتیں اور انہیں فرو کرنے کے لئے خلیفہ اکثر دار الخلافہ سے باہر ہوتا۔ وہ اپنی جان کی پروا نہ کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ ان دنوں یہ بات ہر خاص و عام کی زبان پر تھی کہ جب ایک قلعہ کا محاصرہ کئے مہینوں گزر گئے تو خلیفہ نے جان کو خطرات میں ڈال کر فسیل پر چڑھنا پسند کیا۔ محصورین نے جب اسے دیکھا اور پہچانا تو مارے دہشت کے وہ ہتھیار پھینک کر مطیع ہو گئے۔ وہ عجیب حاکم تھا جو بیک وقت ماضی اور مستقبل کے ملتے ہوئے وقت کے نکتے پر کھڑا تھا اور بہت زیادہ نما یا تھا۔ حسین کو فخر تھا کہ اس کو یہاں طلب کیا گیا تھا مگر اب وہ فخر بھی اسے بہت ہی

سطحی اور کم ظرفی کی طرح کا جذبہ دکھائی دیتا تھا۔ سینکڑوں لوگوں کا دار و مدار خلیفہ کی نظر کرم پر تھا۔ وہ کس بات پر نازاں تھا؟

ہر وقت کے سوالوں اور اپنے ساتھ جنگ کی حالت کو آخر عارضی معاہدے میں ختم کرنے کے لئے اس نے بغداد میں رہ جانے اور ابو یعقوب قطع کی لڑکی سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

بہت دنوں وہ قطع کے گھر کے اس غرفے کی طرف دیکھتا اور اس آواز کو سننے کا منتظر رہا۔ پتہ نہیں آواز کون سا لہریا حلق میں سے نکلتے بول کا کون سا زیر و بم دل کو دھڑکانے والا کیا لفظ تھا جو اسے بے خود کر دیتا تھا۔ وہ اس دلدل میں نہایت تیزی سے دھنستا جا رہا تھا۔ لہجہ کیچڑ کی شطح سے نیچے کھنچا چلا جا رہا تھا۔ کثافت۔ کثافت!

منصور جب بغداد میں وارد ہوا تو اپنی توقع کے خلاف اس نے حسین کو خانقاہ میں معتمد پایا۔ وہ تستر کی طرح ریاضتوں میں ڈوبا ہوا تو نہیں تھا اور نہ ہی اس کی شکل پر وہ جلن تھی مگر وہ خانقاہ سے بہت کم باہر نکلتا اور یوں محسوس ہوتا گویا وہ اپنی ساری ان سے ہر وقت منتظر ہے۔ بس منتظر جیسے فضا میں سے کسی بلاوے کا منتظر ہے۔ گیب سے کسی آواز کا، عرش سے کسی اشارے کا، ہوا میں سے کسی نغے کا۔ اس کے اعصاب میں ایک عجیب سا تناؤ ہوتا جسے منصور کبھی نہایت شدت سے محسوس کرتا اور کبھی یہ سمجھتا کہ یہ اس کے بیٹے کی ایک عارضی کیفیت ہے۔ وہ خود ہی سنبھل جائے گا۔ کسی راہ کی جو تلاش اسے ہے اسے پالے گا۔ وہ بھی تماشائی بننا چاہتا تھا۔ گیروں کی طرح محض باہر سے دیکھنیو والا۔ مگر یہ بات اس کے اختیار سے باہر تھی۔

وہ کتنی امیدیں لے کر بغداد آیا تھا۔ دربار اور عمائدین اور مصاحب اور زندگی کا ایک مختلف نقشہ مگر یہاں اس کے آنے سے پہلے بساط الٹ چکی تھی۔ اسے زیادہ ناامیدی بھی نہیں ہوئی۔ وہ راضی برضا تھا۔ یہ زندگی خود خدا نے حسین کو دی تھی اس کی اپنی تھی اور عزت و ذلت دینے والا بھی وہی تھا۔ پھر وہ کس بات کا جھگڑا اپنے سے کرے اور اپنے بیٹے سے کیا کہے؟

ہاں جب حسین نے اس سے پانا ارادہ بیان کیا اور اسے قطع سے بات کرنے کی گزارش کی تو وہ اس کی طرف دیکھتا رہا اور اس نے اس معاملے میں اس کی کوئی بھی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔

”تمہیں معلوم ہے حسین، کب سے میں چاہتا رہا ہوں کہ تمہارے ماموں کی لڑکیوں میں سے ایک میری بہو بنے اور پرتم خانقاہ میں مقیم ہو۔ تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ تم اسے کہاں رکھو گے، خانقاہ میں تو تمہیں رہنے کی اجازت اس کے بعد نہیں ملے گی۔“

”میں کوئی راہ سوچ لوں گا۔“ اس نے نہایت کمزور آواز میں کہا۔

”تم حضرت عمر بن عثمان مکی سے کیوں نہیں کہتے۔ شاید وہ اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد کر سکیں۔“ منصور نے دوستوں کی طرح

بات کی۔

”نہیں ہرگز نہیں۔ وہ کسی علاقے دنیوی میں لگے نو جوان کو وہ سارے اسباق اور مجاہدے نہیں سمجھائیں گے جو میں سمجھنا چاہتا ہوں۔“ حسین نے سوچتے ہوئے کہا۔

”تو پھر یہ بات تقریباً ناممکن ہی سمجھو۔ وہ قطع کے دوست ہیں اور تمہارے مہربان ہیں۔ جب وہ اس بات سے خوش نہ ہوں تو ایسا قدم اٹھانے کا فائدہ۔“ منصور نے مشورہ دیا۔

”میں کوئی راہ سوچ لوں گا۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔“ حسین نے بات ختم کر دی اور منصور نے بھی سوچ لیا کہ اس سے اور بحث بیکار ہے۔

منصور ریشم کے سودا گروں سے ملتا رہا۔ وہ پہلی بار بغداد آیا تھا اور یہاں کی شان و شوٹ نے اسے بہت متاثر کیا تھا۔ افرات تماشائے اور فرحت و انبساط خوشگوار ہوا، کنار آب کشتیاں اور تحفظ کے احساس کے ساتھ شاہراہوں پر چلے لوگوں کا ریلہ۔ شاندار محلات اور شرق و غرب میں پھیلا ہوا شہر۔ خوب صورت مسجدیں اور بازاروں کی آبادی دکانوں کی بہتات۔ زر و جواہر اور زر نگار لباس اور خوبصورت نازنین عورتیں، خچروں پر چڑھ کر خرید و فروخت کرتی لونڈیاں۔ ریشمی جھلملاتے لباسوں میں اپنے سپاہیوں کے حلقے میں سوار یوں پر نکلنے سردار محضے اور محمل اونٹوں کی قطاریں کھجور کے درختوں کے جھنڈوں میں سے دکھائی دیتے مسجدوں کے مینار بزرگوں کے مقابر اور خانقاہیں اور زاویے اور صومعے کارواں، سرائیں اور بھیڑ میں اپنا راستہ بناتے ہوئے لوگ۔ ایسی رونقیں جو صرف یہاں کے لئے مخصوص تھیں۔ اس نے ایران کی برتری اور سلطنت کا مصرف بزرگوں کی زبانی سنا تھا، عربوں نے جب سے ایران پر قبضہ کیا تھا اور بغداد مرکز بنا تھا دنیا کی ساری رونقیں یہاں آگئی تھیں۔ داریوش اور گشتاسپ اور کسرخ و اور لہر اسپ اور معبدناہید سب اپرا ایک مردنی چھا گئی تھی۔ گو کسی عبادت گاہ کو منہدم کرنے کا سرکاری حکم بھی دیا نہیں گیا، امن و امان سے اپنے اپنے طریقوں پر چلتے رہنے سے کبھی لوگ روکے نہیں گئے مگر وہی بات کہ حاکم وقت کا مذہب دلچسپی اور کشش کا باعث ہوتا ہے۔ پھر اس کی سچائیاں اس کی ہمہ گیری اس کی معجزاتی فتوحات، رسم سرفروشی جسے وہ شہادت کا نام دیتے تھے اور دشت و کوہ میں ایک ہی صدا گونجتی تھی۔ پرانے مذاہب کی ساری خوبیاں جب اس میں تھیں اور آسان راہ تھی بہشت اور دوزخ میں سے جو ستا سودا تھا وہ لوگوں نے خرید لیا تھا۔ خود منصور نے نہایت سادگی اور پاکیزگی کو سمجھ کر اسلام کو اپنے لئے چن لیا تھا۔ کاش محی کو پتہ چل سکتا۔ وہ آتش پرست سادہ دل محبت کرنے والا اس کا باپ جان سکتا تھا کہ اس کے بیٹے نے اس راہ کو کیوں چنا تھا؟ مگر اب وہ کسے بتائے۔ باپ اور بیٹوں کی راہیں اکثر جدا ہو جایا کرتی

ہیں۔ اس نے حسین کا سوچا۔

اس کے بعد منصور کے اور حسین کے درمیان کبھی اقطع کے گھر کی بات نہیں چلی۔ یہاں تک کہ منصور کے رخصت کا زمانہ قریب آ گیا۔

”کیا تم بیضا واپس نہیں چلتے۔“ اس نے بیٹے سے کہا۔

”نہیں پدر محترم۔ میرے لئے یہی جگہ مناسب ہے۔ مجھے اپنے اسباق ابھی حضرت عثمان بمکی کے ہاں سیکھنے ہیں مگر یہ تعجب کی بات ہے مجھے مرید بنانے سے انہوں نے انکار کر دیا ہے۔ اشکال کی وضاحت کوہ کرتے ہیں مگر میرا دل بے حضوری میں بھٹکتا رہتا ہے۔ کاش مجھ پر ان کی وہ توجہ ہو سکے جو ایک زمانے میں تستر میں عنایت کی نظر مجھ پر تھی۔“

تم تستر واپس کیوں نہیں چلے جاتے۔ ان میں درگزر اور عفو کی بہت طاقت ہے۔ ذکر کی محفلوں میں جب مرشد کی توجہ تمہاری طرف نہ ہو تو تم کامیاب ہو گے۔“

منصور نے بہت مایوسی سے کہا۔

”کبھی کبھی میں سمجھتا ہوں یا مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مرشد کی ضرورت مجھے نہیں ہے۔“ حسین نے دبے لفظوں میں بہت سہم کر کہا۔

منصور نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”تم کیا کہہ رہے ہو حسین۔ کیا بغیر استاد کے بغیر مرشد کے کسی نے یہ جان کوکھوں کا سفر طے کیا ہے۔ کبھی تم نے دیکھا ہے کہ کوئی کشتی بغیر ملّاح کے بحر محیط پر رواہ ہو سکتی ہے۔ ذکر کا اذن بھی جب تک اپنے مرشد سے نہیں ملتا اس میں کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکو گے۔“

”مگر پدر محترم میں کیا کر سکتا ہوں۔ وہ مجھے مرید بنانے سے انکاری نہیں ہیں مگر ہمیشہ نہایت عمدگی سے ٹال دیتے ہیں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اگر جنگل تاریک ہو اور راہ بتانے والا ایک کنارے پر کھڑا ہو تو بہر حال کوئی منزل تو کھوٹی نہیں کرتا۔ سفر جاری رہتا ہے۔“

حسین نے بات ختم کی۔

”جب سالار کارواں کے بنا چلو گے، تنہا چلو گے تو کسی مثل پر نہیں پہنچ پاؤ گے، نہ سلوک کی اور نہ طریقت کی۔“ منصور نے نہایت تلقینی سے کہا۔

”کچھ خزانے ہیں جو ہاتھ لگ جائیں تو بہت ہوتے ہیں۔ اپنا سفر آسانی سے طے کیا جاسکتا ہے۔“ حسین نے مبہم سا جواب دیا۔

”تم یہ کیوں معلوم کرنے کی کوشش نہیں کرتے کہ وہ تمہاری طرف اتنے ملتفت کیوں نہیں ہوتے۔“ منصور نے کہا۔

”جس طرح آپ کسی کو زبردستی اپنے ساتھ محبت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے اسی طرح سے آپ کسی خدا کے نیک برتر اور خود آشنا انسان کو بھی محبت پر مجبور نہیں کر سکتے۔ یہ بھی بباہمی کشش ہوتی ہے۔ پدر محترم اور عمر بن عثمان مکی میرے لئے وہ کشش نہیں پاتے۔ میں بھی مجبور ہوں۔“

”عجلت سے کام نہ لینا۔ حضرت جنید بغدادی یہیں ہیں۔ ان کے پاس زانوائے تلمذ تہہ کرو۔ ہمیشہ سے تم نے اپنے معاملت اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ اور تم‘ کیا تمہارے لئے اچھا بہتر سمجھتے ہو‘ میرے پاس تمہارے لئے صرف دعائیں ہیں اور یہ تمنا کہ تم بیضا آ سکو۔“

رمضان المبارک کی شب بیداریاں اور عبادات‘ خانقاہ میں ہجوم عاشقاں اور ذکر و فکر محفلوں میں شوریدہ سر لوگوں کا حلقہ۔ وہ رونق بھری راتیں جب شفیق و سعید و ب خدا کے خوف اور خلق کی شرم سے آباد مسجدوں میں آیام کرتے دیوانے اور دیوانے ہوتے۔ سرشاری و محبت کی راتیں بے خودی اور سرور کی نغمی صبح گاہی سے ملتا ہوا نالہ نیم شبی سحر کی خبر لاتی ہوئی شبیں اور شب کی سہای کو چاک کرتی ہوئی آائیں اور اپنی جان کو ہلاکت سے ملاتے ہوئے نمازی اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سینہ چاک کرتے ہوئے ساز سردی پر نثار ہوتے آدمی گرم دلوں پاک نگاہوں اور بے تاب جانوں کے ساتھ ناممکن کی تمنا کرتے انسان۔ غیب و شہود کے فرق کو سمجھنے کی کوششیں کرتے ناسمجھ اور مرغِ بکل کی طرح پھڑکتے ہوئے عاشق زار اور حیرت سے نیم بے ہوش حسین۔

یہ وجود کیا ہے؟ وہ اپنے آپ سے سوال کرتا ہے۔

یہ شہود کیا ہے؟ وہ اپنے آپ سے پوچھتا۔

اس کی رگ جاں کے قریب دھڑک کو کوئی کہتا: ”تمہاری پہنچ سے باہر‘ تمہاری سمجھ سے ماورا۔ اور تمہیں بتانے والا کوئی نہیں۔ تم ایک ایسا تار ہو جو کسی ساز پر بھی‘ کسی طنبور پر‘ کسی بربط پر کسی سنبالہ پر کبھی آزمائے نہیں جاؤ گے کہ کسی نغمے میں مل سکو۔ تمہاری آواز الگ اور تنہا اور سب سے دور یونہی دشت زندگی میں بھٹکتی رہے گی۔“

عمر بن عثمان مکی اس کا خیال رکھتے۔ اس کی سحر و افطار کی خبر گیری کی جاتی۔ اس کی ضروریات کا یوں خیال کیا جاتا جیسے وہ کوئی نہایت ہی نادر شے یا کوئی بیش بہا تحفہ یا کوئی عزیز ترین مہمان ہو۔ تراویح میں جب مستقل قیام اور نوافل سے پاؤں پرورم آ جاتا تو وہ بڑی محبت سے اس کی طرف دیکھتے۔ وی کیسے اپنی جان گھلا رہا تھا۔

وہ پتہ نہیں کہاں پہنچنا چاہتا تھا۔

جیسے آفتاب کی زد میں رہنے سے آئینے کا صیقل دھندلا جاتا ہے، جیسے آئینوں کی زد میں آدمی کی شکل سنولا جاتی ہے جیسے تیز روشنی سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور نظر پھٹ جاتی ہے حسین بھی آئینوں کی روشنیوں اور آفتابوں کی روشنی کے سنگم پر تھا اور وہ اپنا آپ معدوم کر رہا تھا۔ وہ اتنی لمبی جست کیوں لگانا چاہتا تھا؟ اسے اپنے بال و پر کی قوت اور اپنی ممکنات کا صحیح ادراک کیوں نہیں تھا؟ کبھی کبھار وہ سوچنے لگتے مگر ان کی نگاہ میں وہ سب تھا جو وہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ پردوں سے پرے جدا دراک تک ان کے نظر نے خود دیکھ لیا تھا جو دیکھ لیا تھا اور وہ رمضان المبارک کے اختتام پر اس سے یہ سب کہنا چاہتے تھے۔ وہ اسے اس بے راہرود یوگا سے باز رکھنا چاہتے تھے۔

وہ طہارت خانے کی طرف گئے اور پھر وضو کرتے ہوئے ایک طالب علم سے باتیں کرنے لگے جو ایک اشکال پر کسی ساتھی سے گفتگو کر رہا تھا۔ وضو کی اہمیت اور پاکی اور مختلف اوقات کے لئے احکامات اور قصا نمازوں سے متعلق احادیث، مختلف مکاتیب خیال اور قریطہ کا ہر واجب غسل مقام پر بھی صرف وضو سے کام چلا لینا اور یہ طرفہ تماشا جو ان کے مذہب کی عوام میں مقبولیت کا سبب ہوا، اس لئے کہ عام آدمی پہل پسند تھے اور عمر بن عثمان مکی وصاحت کی خاطر کافی ویران لوگوں کے درمیان رہے۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ درس دیتے رہے اور دیر تک بے تاب جانیں اپنی محرومی اور غفلت پر خون کے آنسو رو یا کیں۔ حضرت خود بھی بہت پریشان ہوئے۔ نالہ و شیون اور آنسوؤں کے درمیان تو بہ واستغفار کا جہاد ہوتا رہا۔ انہوں نے ایک نظر دیکھا۔ پھر دوبارہ دیکھا۔ ادھر ادھر نظر کی۔ حسین کہیں نہیں تھا۔ اور حضرت کو اس کی رونے والی آنکھ ساری آنکھوں سے زیادہ عزیز تھی۔ وہ بے پناہ آنکھیں بغیر نالہ و بکا کے یوں بہا کرتی تھیں جیسے دودر یا رواں ہوں۔ انہیں اس کا رونا بہت پسند تھا۔ خدا کے خوف سے جان کی ساری بے تابی سے الحاج وزاری سے عاجزی سے، آج محفل کی رونق جی کو نہیں لگی تو انہوں نے پاس ہی بیٹھے حبشی زادے سے کہا:

”حسین کہاں ہے۔“

”حسین کیاں ہے۔“ حلقے میں بیٹھے لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

زاویے کے گوشوں میں، خانقاہ کے دالانوں میں، مسجد کے حجروں میں ہر جگہ تلاش کیا گیا۔

کیا وہ بیمار ہو گیا تھا؟

پریشان لوگوں نے حضرت عثمان مکی کی تسلی کی خاطر اسے ہر جگہ ڈھونڈا۔ اس جگہ جہاں اس کا بستر اور کتابیں اور دو جوڑے

کپڑے رکھے رہتے تھے سب چیزیں موجود تھیں۔

نماز کے بعد بھی وہ نہیں تھا۔ حضرت نے باقی لوگوں کو تاکید کی کہ جب حسین آئے تو فوراً انہیں اطلاع کی جائے۔

نماز ظہر کے بعد جب حضرت جائے نماز پر تھوڑی استراحت کی خاطر گھڑی دو گھڑی لیٹ جاتے تھے، لیٹے ہیں تو انہیں بے چینی محسوس ہوئی اور لیٹنا نہ گیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ توجہ ہٹانے کی خاطر انہوں نے جائے نماز الٹا جہاں پر گنج نامہ رکھا رہتا تھا اور جس کو وہ کسی قیمتی راز کی طرح یہاں رکھتے تھے اور جو اکثر ان کے زیر مطالعہ رہتا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر جائے نماز الٹ دی۔ اس کو جھٹکا۔ ادھر ادھر دیکھا مگر گنج نامہ کہیں نہیں تھا۔ روح کا گنج گرا نہ آیا۔ جو اسرار و رموز الہی سے واقف نہ ہوں ان کے لئے سراسر ہلاکت اور جانتے ہوں ان کے لئے نہایت نازک مقامات تک بغیر راہ نما کے بیکار اور جون رازوں سے پردہ اٹھائے گا اس کے ہاتھ پاؤں کاٹے گائیں گے۔ اور اس کو دار پر کھنچا جائے گا۔ اس کا جسم باب النخبر پر جھوٹے گا۔ بغداد کی ساری ذلتیں اس کا نصیب ہوں گی۔ گنج نامہ کوئی معمولی راز نہ تھا۔ اس پر بے فیض کی دسترس اس کے لئے جان کا زیاں۔

ابوایوب اقطع کی بیٹی زینب سے حسین کا عقد ایک الگ داستان ہے۔ اقطع کی طبیعت زمانوں سے خراب تھی۔ کبھی وہ بہت ہی بیمار ہو جاتے اور اہل خانہ کے نالہ و شیون سے ہمسایوں کو بھی پریشانی لاحق ہو جاتی اور پھر یک بیک وہ سنبھل جاتے جیسے مرض الموت انہیں چھو کر نکل گیا۔ طبیبوں کا خیال تھا کہ انہیں ضیق النفس کی بیماری ہے اور اپنے طور پر وہ بہترین دواؤں سے انہیں بچانے کی کوشش کرتے رہتے۔

حسین وہاں سے گزرا تو اس نے باہر دروازے پر اقطع کے سب سے چھوٹے بیٹے کو روتے اور سکتے پایا۔ تسلی دینے اور سبب پوچھنے کے بعد وہ اس کے ساتھ ہی دو ایک مزاج پرسی کرنے والوں کے ساتھ اندرون خانہ چلا گیا۔ اقطع پر عجیب تشنج کی سی کیفیت طاری تھی اور اس میں جب جب انہیں ہوش آتا تو کہتے:

”یہ میرا آخری سانس ہے۔ اے کاش میں زینب کے فرض سے سبکدوش ہو کر جاتا۔“

گھبرا کر بغیر سوچے حسین نے کہا ”میں حاضر ہوں“ عم بزرگوار میں حاضر ہوں۔“

اقطع نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ خوش ہو گئے۔ اسی وقت قاضی بلائے گئے۔ نہایت خاموشی رازداری اور بے انتہا سادگی سے انہیں دو گواہوں کی موجودگی میں زینب بنت اقطع کا نکاح حسین بن منصور سے ہو گیا۔

وہ دن بھی عجیب تھا۔ گرد آلود آداس، روشنی اور اندھیرے کے درمیان کہیں بھٹکتا ہوا سارایت جیسے دشت سوس سے محض حسین کی

تنبہائی دور کرنے اور اس کی دلدادی کے لئے زرد اور سرخ سیاہ لہریوں میں آ کر برس رہی تھی۔ چیلپس اپنے کو ہوا کے سپرد کئے نہ اڑتیں اور نہ بولتیں نہ چھتوں اور منڈیروں پر منڈلاتیں اور نہ ہی جھپٹتیں۔ بے خودی کے عالم میں انہوں نے طوفان کے بہاؤ پر اپنے آپ کو چھوڑ رکھا تھا اور لہروں کے ساتھ تنکوں کی طرح بھی چلی جاتی۔ بے کیفی کی کیفیت سے یوں ہی دل سینوں میں سکڑے جاتے تھے۔ بوجھل طبیعت اور تقریباً جاتے ہوئے قطع۔ جب سانس اکھڑنے کی کیفیت ہوئی اور موت کی آخری گھڑی کی بے سکونی شروع ہوئی تو حسین ان کے قریب ہو بیٹھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ان کے سینے پر رکھا اور دعائیں پڑھنیلگا۔ جان کنی کی شدت میں وہ کانپنے اور انہیں لگا جیسے کسی نے ٹھہرتے ہوئے تڑپتے اور گھبراتے دل پر مرہم رکھ دیا ہو۔ انہیں سکون آ گیا۔ دل کی دھڑکنوں میں جیسے روانی پیدا ہوئی۔ موت کی زردی میں خون کی سرخی ملنے لگی۔ بے قراری دور ہوئی تو انہوں نے بیوی اور بچی اور حسین کو دیکھا۔ بیمار پرسی کے لئے آنے والے پھر وں پر طمانیت دیکھی۔ چھوٹے بیٹے کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے پر مسکراہٹ دیکھی۔ گو نہ تسلی سے ان پر تھکن کے بعد کمزور نیند چھا گئی۔

حسین نے زینب کو دیکھا۔ عجب سوختہ چہرہ جس پر خوشی تھی اور نہ ہی کوئی جذبہ۔ ایک اجنبی کے لئے کیا محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دکھ اور مصیبت کی طویل شب بیداری کے بعد ایک زلزلے اور انہدام سے بچ جانے کی حیرت جو معجزہ تھی۔ موت کی دہلیز کو پار کرنے کے بعد وہ پلٹ آئے تھے۔ حسین نے ہلاکت کے متوقع خوف کی وجہ سے اپنے آپ کو اس میں جھونک دیا تھا۔ اس کا ذاتی فیصلہ اس تعجیل سے اپنے آپ کو زندگی میں گرفتار کرنے کا نہیں تھا۔ منصور کے خواب؟

خوف اور موت کی بے پناہی سے بچے ہوئے قافلے کے مسافروں کی طرح ان سب کو اس گھڑی ایک دوسرے کے وجود کا احساس ہوا تھا۔ قطع کی بیوی نے سوچا اس غلت کو لوگ کیا کہیں گے؟ خلقت کا بے جا خوف جس سے انسان کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔ قطع بھی بیدار ہوں گے تو سچیں گے وہ اسے بس واجبی ہی جانتے تھے کہ وہ عمر بن عثمان مکی کے دروس میں شریک رہتا تھا اور خانقاہ میں مقیم تھا۔

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا جیسے اپنے انجام سے خوفزدہ ہو۔ کیا اس کی آرزو پوری ہو گئی تھی۔

اور باہر زرد غبار درختوں اور چھتوں، گھروں اور دریا کے گرجتے دھارے پر گرتا رہا۔

قطع اٹھے تو عثمان مکی کا فرستادہ ایک حبشی زادہ ان کی طبیعت دریافت کرنے آیا۔ قطع نحیف و نزار مگر رو بصحت تھے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مسکرا کر اسے خیریت کا بتایا مگر بولے کچھ نہیں۔ انہوں نے اپنے سامنے بیٹھے حسین کو دیکھا اور خواب کی دیکھی

صورت حال ان پر روشن ہوئی۔

انہوں نے اس سے پوچھا:

”تم کہاں کے رہنے والے ہو عزیزم۔“

”میں بیضا کا باشندہ ہوں۔ میرا باپ منصور ریشمی کپڑا بناتا اور بیچتا ہے۔ میرا دادا مچی مجوسی تھا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”اور تمہارا والد۔“ انہوں نے استفسار کیا۔

”وہ اور میں دونوں مدینہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذرات خاک ہیں۔ میں ایک سال دربار خلافت میں حاضر رہا ہوں اور اب حضرت عمر بن عثمان کے دروس میں شامل ہوتا ہوں۔ گوان کے سلسلے منسلک نہیں۔

اقطع خاموش رہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یہاں تک کہ نماز عصر کے وقت ذرا پہلے خود شیخ خانقاہ تشریف لائے۔ بیمار پرسی کے بعد اقطع سے کہنے لگے۔

”میں نے آج دروس میں حسین کو غیر حاضر پا کر اسے یہاں وہاں پوچھوایا تھا۔“

”میں نے زینب کا عقد اس سے کر دیا ہے۔“ اقطع نے معمولی روزمرہ کی بات کی طرح ان سے بیان کیا۔

حضرت عثمان مکی بیٹھے سے کھڑے ہو گئے۔ ”یہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ ناممکن۔ آخر کیوں؟“

”مگر صاحب سلوک یہ ہو چکا ہے۔“ اور انہوں نے واقعہ سنایا۔ وجہ بتائی۔

”اس کو اب بھی پھیرا جاسکتا ہے۔“ حضرت نے کہا۔

”ہرگز نہیں۔“ حسین نے سراونچا اٹھائے بنا جواب دیا۔ ”جو ہو چکا سو ہو چکا۔“

”مگر برخوردار۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ مطلب یہ ہے زندگی میں خوشیوں اور غلچوں سے اور چیزیں افضل ہیں۔“ وہ نہایت حیران

تھے۔

”یہ مقدر کا لکھا ہے اور ان مٹ ہے۔“ حسین نے کہا۔

”تمہیں مقدر کا کیا معلوم ہے۔ یہاں تقریباً اجنبی ہو۔ تمہارا ٹھکانہ نہیں ہے۔ کوئی ذریعہ روزگار نہیں ہے۔“

حسین نے نہایت ادب سے جھک کر کہا:

”میرا مقدر یہی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ اب میرا ٹھکانہ اقطع کا گھر ہے اور روز رساں خدا ہے۔“

حضرت عمر بن عثمان چپ چاپ اس کی طرف دیکھتے رہے جیسے کہنے کو کچھ باقی نہ رہا ہو۔

ان کے ماتھے کی لکیریں گہری فکر مندی کی حامل تھیں اور وہ درس کے دوران رک جاتے۔ گنج نامہ اپنی جگہ پر تھا اور انہیں واپس مل گیا تھا مگر کون اتنا جرات مند دلیر اور بے پرواہ تھا کہ اس نے ایک مخفی راز کو چرایا۔ انہیں یاد آتا۔ یونانی دیوتاؤں کی کہانیوں میں انہوں نے پڑھا تھا کہ آسمان سے آگ چرانے والے دیوتا کو زنجیروں سے باندھ کر سزا دی گئی تھی۔ اسے چٹان سے لڑھکا یا جتا۔

حسین اب ان کے دروس میں شریک ہوتا مگر مغائرت کی دیوار اب ان کے درمیان زیادہ اونچی ہو گئی تھی۔ اسے لگتا وہ دھند میں لپٹا چلا جاتا ہے اور راہوں پر کانٹے بکھرتے جاتے ہیں۔ اسباق کے اور اس کے درمیان مرشد کی دعا نہیں تھی اور وہ میدان کارزار میں اکیلا سپاہی تھا کیونکہ قطع اور حضرت کے تعلقات بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ نفرت کی بنیادیں اونچی ہونے لگیں اور اس کی طرف توجہ کم سے کم تر ہوتی گئی۔

وہ زاویہ میں بیٹھ کر غور و خوض کرتا۔ اشکال کی توجہ نہ کرنا چاہتا اور اس انکار کے بعد اب اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ ان کی وضاحت کے لئے شیخ کی طرف رجوع کرے۔ وہ اوراد و وظائف میں لگتا مگر دل اڑتا رہتا۔ منصور نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ مرشد کی دعا کے بغیر وہ کہیں نہیں پہنچ سکتا۔ وہ جب کسی سے دعا کا طالب نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنی مشکل میں مدد کی درخواست نہیں کر سکتا تھا۔ شیخ اس ک طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے تو وہ کیا کرے؟

گنج نامے کے مضامین میں لکھا تھا کہ فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا، ابلیس نے انکار کر دیا۔

فرشتوں کا اقرار ان کے ناواقف ہونے کی وجہ سے تھا اور ابلیس کا انکار محرم اسرار ہونے کی وجہ سے اور اس کے مردود ہونے کی بھی یہی وجہ ہے۔

زمین کے مخفی خزانوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور ابلیس ان کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ خزانہ اپنے والے کا تو سر قلم کر دیا جائے گا اور تجھے کاذب سمجھ کر لوگ تیری باتوں کا یقین نہیں کریں گے جو شخص جمال کعبہ کا مشاہدہ کرنا چاہے تو نفس کو شق کرنے سے قبل ایسا کرنا ممکن نہیں۔ قرب الہی کا خواہاں شخص روح کو شق کئے بنا قرب حاصل نہیں کر سکتا، مگر اس راستے میں دو ہزار آگ کے پہاڑ اور ایک ہزار ہلاکت خیز بیکراں ہیں جو ان دونوں سے خائف ہوئے بغیر راستہ طے کرنا چاہے وہی اس میں قدم رکھے۔

زمین کے مخفی خزانے اور ان کے اسرار ابلیس کے انکار سجدہ کا اسرار۔ فرشتوں کے سجدہ کا اسرار۔ روح کے شق کا اسرار۔ قرب الہی کا اسرار۔ نفس کے شق کا اسرار۔ اسے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ اسرار ہیں مگر وہ کیا ہیں اس کی خبر اسے نہیں ہو سکی تھی۔ اس نے گنج نامہ

کے سارے مطالب نقل کر لئے تھے مگر ان پر قادر ہونا یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔

زینب اسے دیکھتی اور اپنی ازدواجی زندگی کی بے بضاعتی پر غور کرتی۔ اس کے جی میں کتنے طوفان تھے اور حسین اس سے کتنا دور تھا۔ طبعاً وہ خاموش تھی اور سوال کرنا اس کی عادت نہ تھی۔ وہ اپنے والد کے گھر میں تھی اس لئے ضروریات زندگی کے لئے بھی وہ محتاج نہ تھی مگر جس زندگی کا تصور اس نے کیا تھا وہ کہاں تھی۔ کو گوشے میں۔ کس قریے میں۔ کس ملک میں۔ کیاں کیاں؟ کیا یہ زندگی تھی کہ وہ جو اس کا ساتھی تھا اپنی عبادت میں منہمک رہے۔ زاویے میں مشقیں کرے اور وہ محض حاشیہ نشین کی طرح اس کے آزار جان سے بے خبر اس کی حالت تباہ کو دیکھ کر اس کے لئے کچھ نہ کر سکے۔ وہ جب اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کرتی، بولتی تو اس کی آواز سن کر حسین پر کچکی ہو جاتی اور لگتا اسے لرزے سے بخار چڑھ رہا ہے۔ کیا اس کی آواز اتنی ناگوار تھی۔ اس نے بات کرنا بھی تقریباً ختم کر دیا اور وہ دیکھتی کہ حسین کو پروا نہیں تھی۔ اس نے آخر کیوں اس کے باپ پر رحم کھا کر محض عقد کیا تھا۔ اگر قطع نہ رہتے تو کیا وہ جی نہ سکتی تھی۔ اسے والد سے شکایت تھی مگر اب وہ وقت گزر چکا تھا۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ حسین کی ریاضتوں، اس کی عبادات، اس کا کھویا کھویا ہونا، کھانے سے بے رغبتی، لباس کی طرف سے بے پرواہی، یہ سب اس لڑکی کی آنکھوں کے سامنے دن رات ایک تماشے کی طرح ہوتا تھا۔ وہ کیا کرے؟

عقد سے پہلے عم بزرگوار عمر بن عثمان اس کے سر پر دشت شفقت رکھتے تھے مگر اب وہ بھی ان کے ہاں نہیں آتے تھے۔ وہ کس سے کہے اور اس نے اس جینے سے کیا پایا تھا۔ وہ کس سے کہے کہ اس جینے سے تو موت اسی تھی۔ یہ ہر گھڑی کی جلن تھی۔ وہ بے فکری، آزادی، بھولیوں کے ساتھ کھیل اور خوش گپیاں کسی دوسری دنیا کی باتیں تھیں وہ جاگی ہے تو یہ ایک جہان نو تھا۔ وہ اکیلی تھی اور چاروں طرف گرجتے ہوئے طوفان تھے۔ وہ جو اس کا ساتھی تھا اسے اکثر یوں بیٹھے بیٹھے ہنسی آتی۔ وہ بھلا اس کا ساتھی تھا ہی کہاں۔ اجنبی کسی اور سرزمین سے یہاں پر وارد ہوا اور اس گھڑی اس کے اپنے مقدر پر مہر لگ گئی تھی۔ عمر بن عثمان ٹھیک ہی کہتے تھے یہ نباہ کیاں ہو سکتا تھا۔ وہ بے قرار روح کی طرح تڑپتا ہوا، بے پناہ آنکھوں والی بے چین نگاہوں سے ہر طرف متلاشی اور گم کردہ راہ بھی۔ وہ شکایت کس سے کرے۔ یہ نو جوان تو خود اتنا بے بس اور تنہا لگتا تھا کہ اسے اس پر رحم آنے لگتا۔ پھر اسے اس کی چھٹی حس نے خبردار کرنا شروع کیا کہ اس کی آواز میں کچھ تھا۔ کسی بیتے ہوئے وقت کا پرتو، کس بھولی ہوئی راگنی کا لہریا، جو اسے کپکپا دیتا تھا۔ وہ کون تھی؟

ایک دن اسے بلوایا گیا۔ حضرت شیخ سخت جوش میں تھے اور وہ کئی دن سے دروس میں شریک ہونے کی بجائے زاویے کے الگ گوشے میں بیٹھا لکھ رہا تھا۔ عجیب بات تھی جب حسین غیر حاضر ہوتا تو شیخ الجھ جاتے۔ اس کی توجہ کے عادی ہو چکے تھے۔ ان کے سلسلے

وہ وہ داخل ہونا اس کے مقدر میں نہیں تھا۔ اس کی پیشانی پر لو کی طرح سلگتی ہوئی روشنی جو انہیں دکھائی دیتی تھی اس بات کی مقصدی تھی کہ وہ جذب و سلوک کی منزلیں از خود طے کر لے گا۔ وہ آج کل کیا لکھ رہا تھا، وہ یہ جاننا چاہتے تھے۔ وہ اس عقد سے بھی خوش نہ تھے۔ ان کے اور اقطع کے درمیان اس کی وجہ سے خلیج حال ہو گئی تھی۔ مگر وہ بہر حال ان کی امان میں تھا اور اس کی ترقی کے مدارج میں جب وہ زندگی حال نہیں ہوئی تو انہوں نے اس کی طرف توجہ کی۔

”حسین تم دروس میں شریک نہیں ہوتے۔ کیا وجہ ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”شیخ۔ میں چند اشکال کے مطالب جاننا چاہتا ہوں اور انہیں حل کرنے میں لگا ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

”کیا ایسی اشکال کا جواب تم خود تلاش کر سکتے ہو۔“ انہوں نے پوچھا۔

ہولے ہولے بہت دکھ سے اس نے سر پلند کیا جیسے تڑپتے ہوئے کسی وجود کو بالآخر اس کی تڑپ کا پوچھا گیا ہو۔

”کیا روح کے شق ہونے کا مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ روح اور دل کیونکر شق ہوتے ہیں۔“

شیخ عمر بن عثمان کے سارے وجود کو ایک جھٹکا لگا جیسے زلزلہ ان کے پورے جسم میں بجلی کا لہریا ان کے پاؤں سے سر کی طرف نکل گیا ہو۔ وہ اپنی پوری آنکھیں کھول کر حیرت زدہ اس کی طرف دیکھتے رہے۔

تو یہ حسین بن منصور تھا۔ شیخ نامہ کو لے جانے اور پھر لوٹا دینے والا۔

وہ جانے کن نگاہوں سے کب تک دیکھتے رہے کہ حسین پر غشی طاری ہو گئی اور وہ زخمی پرندے کی طرح وہیں ان کے آدموں میں گر گیا۔

حضرت جنید بغدادی مدرسہ نظامیہ کے استاد اعلیٰ عالم بے دل اور بغداد کی روح رواں تھے۔ انہیں علم و عمل کا سرچشمہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ بہر طریقت و شریعت کے شنور انور الہی کا مخزن اور مکمل علوم پر دسترس رکھتے تھے۔ وہ شیخ ایشیوخ، زاہد کامل اور سلطان المحققین تھے۔

حسین نے عمر بن عثمان کے دروس سے مراجعت کی اور اقطع سے مشورہ کر کے حضرت جنید کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کے لئے حاضر ہوا۔

غشی کا اثر اس پر اب بھی تھا۔ اڑی ہوئی رنگت، بہکی بہکی نگاہیں، سرمستی و بے خودی طاری جیسے بہت پئے ہوئے ہو۔

شیخ ایشیوخ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا: ”یہ کیا ہے؟“

حسین نے اپنے جھومتے ہوئے سر کو سنبھالنے کی کوشش میں کہا: ”میں ذات الہی میں فنا ہونا چاہتا ہوں۔ نظارگی میں میری ہوشیاری اور سرمستی حائل ہے۔“

شیخ دیر تک مسکراتے رہے جیسے بہت محظوظ ہو رہے ہوں۔

”تم نے ہوشیاری اور سرمستی کے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ کتنی بڑی بڑی باتیں کرتے ہو۔ یہ سب تم نے کہاں سے سیکھا ہے۔ جب تک اپنی نبضوں پر آ زمانہ لو کچھ مت کہو۔ یہ نمود و نمائش ہے جس میں تم گرفتار ہو۔ تم لوگوں سے کیا منوانا چاہتے ہو۔“ وہ اب خفا تھے۔ حسین نے سہم کر ان کی طرف دیکھا۔ اسے لگا اس کے حواس واپس آ رہے ہیں۔ اسے اپنی حالت پر بہت شرم محسوس ہوئی مگر اپنی غلطی مان لینے کے لئے جو حوصلہ چاہئے وہ اس میں نہیں تھا۔ آزادی اظہار کسی سلسلے سے منسلک ہونا یہ اس کے الجھاوے نہ تھے۔ گنج نامہ اس سے جو پایا تھا وہ سمجھتا جیسا کہ پہلے اس نے سمجھا تھا کہ اس کے لئے کافی ہے اور اسے کسی استاد کی ضرورت نہیں نہ شیخ نہ مرشد کی۔ عجیب سوچ تھی اس کی۔

جنید نے پھر کہا:

”تم جن منزلوں کا ذکر کرتے ہو۔ جن پر ہونے کا تمہیں دعویٰ ہے ابھی تم کو انراستوب پر چلنے والوں کی گرد راہ تک کی خبر نہیں! بہرو پیہ بن کر خلق خدا کو گمراہ مت کرنا! پہلی شرط تمہاری تربیت ہے۔“

حسین نے کہا۔

”میں تو آپ کے حضور عقیدت مندی سے حاضر ہوا ہوں! سرزنش کے لئے نہیں۔“

”میرا کام بھٹکے ہوئے لوگوں کی راہ نمائی کرنا اور کم از کم راہ کی نشاندہی کرنا ہے۔ تراحق کے مسافر ہو تو عقیدت مندی کیلئے دل کو فراغ رکھو۔ خدا جو مبداء فیاض مالک حقیقی ہے جو سب کی جانوں کا مالک اور میثاق ازل کیروسے ہم سب کا رب ہے کیا اس کی راہ اتنی آسان ہے کہ تم کتاب پڑھ لو! مناجاتیں سیکھ لو اور پہنچ جاؤ گے۔ یہ جان جو کھوں کا کام ہے اور ان میں سخت محنت ہے۔ سمجھ لو کہ جب تک اس کا اذان شامل حال نہ ہو کہیں پہنچ نہیں سکو گے۔ کیا یہ بچوں کا کھیل ہے۔“

حسین کے اندر کے سپاہی نے اس کے جامے میں چھپے درباردار نے سراٹھایا۔ ”میں ریا کار نہیں راہ طلب حق کا مسافر ہوں۔“

جنید پھر بنے اور دیر تک ہتے رہے۔

”یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی بچہ کہے کہ میں افلاطون ہوں۔ داؤد ہوں۔ مسیحا ہوں۔ مہدی ہوں۔ پیغمبر ہوں۔ کعبہ حق ہوں۔“

درخت طور ہوں۔“

”جب یہ ساری خدائی بنائی گئی اور انسان کو اشرف المخلوقات سمجھا گیا، ابلیس سے اسے سجدہ کروایا گیا تو پھر یہ سب باتیں آدمی سے پرے کیاں ہیں۔“ وہ بحث کرنے پر آیا۔

شیخ الشیوخ نے کہا:

”تمہیں ابھی تربیت نفس کی ضرورت ہے۔ مجاہدہ کرو۔ ریاضت کرو۔ غور کرو اور تم ابلیس کی حقیقت کو سمجھو۔ یہ بڑی بڑی باتیں تمہیں بھٹکا دیں گی۔ جاؤ اپنے مرشد کے پاس لوٹ جاؤ۔“

”مجھے یہ شرف آج تک حاصل نہیں ہو سکا۔“ اس نے جواب دیا جیسے شرمندہ ہو۔

جنید کے لئے مدرسہ نظامیہ ایک آئینہ خانہ ہی تھا کیونکہ اپنے سفر معرفت پر چلنے سے پہلے مری اقطی کے بھانجے ہونے کے باوصف وہ آئینوں کے سوداگر تھے۔ زنگ آلود آئینوں کو صیقل کرنا انہیں قابل استعمال بنانا ان کا پیشہ تھا۔ وہ سات سال کی عمر سے مجاہدہ و ریاضت کی منزلیں طے کر رہے تھے۔ سلوک و طریقت کے معلوم اور نامعلوم راستے وہ شناور دریائے معرفت تھے اور اب بھی آئینہ سازی ان کا پیشہ تھا مگر اب دلوں کے آئینوں پر روغن کرتے تھے جیسے آئینے کو قابل استعمال بنانے کے لئے اس کی ایک طرف کو کثیف کیا جاتا ہے۔ وہ دلوں کو دنیا داری کی کثافتوں کے درمیان سے اٹھاتے تھے۔ پانیوں کے اندھیروں پر جیسے کنول کا روشن پھول کھلتا ہے۔ اس طرح آدمی کی ہستی دنیا داری اور دنیا والوں کے درمیان لوٹتی ہے۔ جب وہ اپنا سفر عرش اور فرش کے درمیان اور عرش سے پرے اور ذات خداوندی تک اور ادراک سے درے تک کر چکتی ہے۔ پھر وہ اس سب معرفت کے ادراک کے ساتھ روح کی لطافت اور اس کے بے پایاں حسن کے ساتھ واپس آتی ہے۔

جنید حسین کی طرف دیکھتے رہے۔ اسے اپنے مجاہدے پر ناز اور اپنی طاقت کا غرہ تھا۔ اسے ابھی قرآن و حدیث کی تعلیم مکمل کرنا تھی۔ اپنی ذات و صفات اور اعمال کو دیکھ کر شناخت کرنا تھا۔ اس کی منزل ابھی دور تھی۔ ایک سپاہی کے غرور کے ساتھ جو اپنی مشقتوں اور مشقتوں پر نازاں ہو۔ یہ ناز اس کو کہاں سے ملا تھا وہ کیوں عاجزی کا راستہ اختیار نہیں کرتا تھا۔ اور حسین سوختہ دل تن سوختہ جان بجلی کی طرح اس کی نگاہوں کو ہوش و خرد کو دو نیم کرتا ہوا اغول کا سراپا کووند گیا۔ کیا یہ عشق تھا..... اس کا حاصل حیات۔ وہ حسین تھا کہ وہ اغول تھا۔ اگر وہ نہیں تھا تو پھر وہ کون تھا۔

اغول۔ حسین۔ اغول۔ اغول..... وہ چلانے لگا۔ اس کا صبر و قرار رخصت ہو گیا۔ لو بھڑکی۔ حول اور قیامت کی گرمی اس کے

تنفس میں شدت تھی۔ وہ قبض کی حالت میں تھا۔ حضرت جنید نے پانی پر پھونکا اور اسے پلایا تاکہ وہ رہائی حاصل کر سکے۔ محبت اس کی نوازش اس کی عطا اس کی طرف سے دی گئی توفیق اور مہربانی ہے۔ دائمی محبت کی تڑپ میں آدمی کی اپنی ہستی کو مٹ جانا چاہئے۔ نہ انمول رہے نہ حسین رہے۔

حضرت نے نہایت محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں خون کی بوتلیں تھیں۔ ان میں سے لہو پکتا لگتا تھا۔
 ”حسین۔ کیا تم بیضا نہیں چلے جاؤ گے۔ تمہارا باپ وہیں ہے اور نہایت سکون اور آسودگی سے وہاں تم اپنے اسباق پر غور و فکر کر سکو گے۔ سہل بن عبد اللہ ستری اگر مریدوں کی طرف تھوڑی توجہ کریں تو وہ جگہ تمہارے لئے موزوں رہے گی۔ تم پہلے بھی وہاں رہ چکے ہوں۔ یہاں بغداد میں تماشہ بن جاؤ گے۔ تم سمجھتے ہو نا، گوشہ نشینی تمہارے اسباق کے لئے نہایت ضروری ہے۔“
 جس شفقت سے انہوں نے اس کی مشکل کو سمجھا تھا قطع نے اس سے اتفاق کیا۔

تستر میں ایک سوئی اور وہ توجہ مل سکتی ہے جو یہاں مدرسے کے پھیلے ہوئے کاروبار اور درس و تدریس کی ذمہ داریوں میں حضرت جنید اسے نہیں دے سکتے تھے۔ اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ زینب اور حسن بیضا میں چھوڑ کر تستر جائے گا۔ علائق دنیوی کا نبھانا کھیل نہ تھا پھر بیضا میں منصور اکیلا تھا اور اس کا دل اپنے پوتے سے ضرور بہل جائے گا۔ تھوڑی سی طمانیت جیسے درخت کے پھولوں کو دیکھ کر مالی کو ہوتی ہے اس کے باپ کو بھی ہوگی۔ ریشم کے کپڑے پر خابوں کے مرقعے سجانے والے اس آدمی کو بھی تو کوئی حقیقی خواب چاہئے جس کی تعبیر اس کے سامنے ہو اور اس کے پاس وقت نہیں رہا تھا۔ یہ ایک اور ذاتی مسئلہ تھا جس کی الجھن وہ کسی سے بیان نہیں کر سکتا تھا۔

حسین نداف کی دکان بازار بزرگ کے ایک گھیارے میں تھی۔

روٹی دھننے کی آوازیں صبح اذان کے بعد شروع ہوتیں اور رات گئے تک آتی رہتیں جیسے ساز پر ایک ہی راگ گایا جا رہا ہو۔ کبھی وہ کسی ماہر مغنی کی طرف اس طنبور پر مختلف راگنیاں ترتیب دیتا ہوا لگتا۔ جب سورج کی سرخی ان پرانے مسقف بازاروں میں اترتی چراغ پل شروع ہوتی تو وہ دکان کو کھلا چھوڑ کر خانقاہ کی طرف جاتا دکھائی دیتا۔

سہل بن عبد اللہ ستری اپنے حجر میں ان لوگوں کو اذان بار یا بانی دیتے جو عبادت میں گے ہوتے یا ایسی اشکال کی وضاحت چاہتے تھے جو انہیں سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اس کی اشکال نہ تھیں۔ وہ تو ان کے حجرے سے دور سیزھیوں کے سرے پر بیٹھا رہتا۔ سر جھکائے نظر جھکائے بغداد میں اس کی تعجیل ایسی تھی جیسی برف پوش پہاڑوں میں سے رو دو جلہ آفتابوں اور ستاروں کے سے خرام ناز

میں داخل ہونے سے پہلے تندور تیز دھارے کی طرح پتھروں سے ٹکراتی اچھلتی، پھسلتی سنبھلتی اور بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی ہو۔ پہاڑوں کے دلوں کو چیرنے والے جوش اور ولولے سے۔ مگر یہاں آ کر ستر میں جو خاموش گہرے پانیوں کی سی نرمی اور روانی سے بہل بن عبد اللہ کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ اسے کچھ دریافت نہیں کرنا تھا۔ کچھ کہنا نہ تھا۔ وہ اپنے گوشہ دل میں نئے چراغ جلا رہا تھا۔ حب رسول کے۔ اپنی عاجزی اور اپنی بضاعتی کے اندھیروں کو روشن کرنے کے لئے۔

ستر میں کسی کو اس کے کام سے کبھی شکایت پیدا نہیں ہوئی۔ جو روئی وہ دھنسا اس میں کئی خوبیاں پیدا ہو جاتیں۔ نرمی اور گرمی بڑھ جاتی۔ پھیلاؤ میں زیادہ ہو کر بھی حدت میں خوب تر ہوتی اور اس کی تو شک اوڑھ کر ایک عجیب سکون ہوتا جیسے کوئی دوست سکون و تسلی دینے کے لئے قریب ہو۔ نماز میں جی لگنے لگتا اور عمدہ خوشبو اس میں سے پھیلتی جس کا کوئی نام نہ تھا، جس کو اس میں سے نکلتا ہوا نہیں پایا جاتا تھا مگر جو بس ٹھہری رہتی، مشام جان کو راحت بخشی۔ ہو سکتا ہے یہ سارے واقعات فسانے ہوں اور حسین کے روئی دھنسنے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

وہ کلام اللہ حفظ کر رہا تھا۔ اس کے سینے میں بحر محیط سا رہا تھا۔ متلاطم اور موج جذبے جن کا کوئی نام نہیں تھا مگر اسے فرحت و کشادگی کا احساس ہوتا۔ وہ روئی دھنسا اور ان سرور کی لہروں کو اپنے وجود سے آ کر ٹکراتا اور طمانیت سے پھیلتا ہوا پاتا۔ یہ ایک ایسا کا تھا جس میں اس کے اور لوگوں کے درمیان سے کم ملاقات کا امکان تھا۔ وہ خانقاہ میں ہوتا تو لوگ اپنے ڈھیر وہاں ڈال جاتے۔ جب وہ دوسری شام خانقاہ کی طرف جاتا دکھائی دیتا تو اٹھالے جاتے۔ وہ کھوئے ہوئے کم گوا اور اپنے میں گم اس نوجوان سے خوف زدہ سے رہتے۔ اس کے سراپے میں عجیب جاہ و جلال تھا۔ وہ چلتا تو لوگ راستہ چھوڑ کر الگ ہو جاتے۔ کوئی اس سے بات کرنے کی کوشش کرتا تو لگتا بات منہ سے نہیں نکلتی اور زبان لڑکھڑا جاتی۔ آوارہ بچوں نے اس کی کھلی دکان سے کچھ چرانے کی کوشش کی تو ان کے ہاتھوں نے جواب دے دیا اور وہ اپنے ارادے سے باز آئے تو تندرست ہو گئے۔ نہایت دبی زبان سے لوگوں نے اس کے اسرار کو موضوع سخن بنالیا۔

یہ حلاج کہاں سے آیا تھا؟

جن اس کے تابع تھے۔

اس کے روئی دھنسنے کی رفتار عام لوگوں سے بہت زیادہ تھی۔

لوگ کہتے وہ خود بیٹھا رہتا ہے سب کام دست یب سے ہوتا ہے۔

کبھی کسی نے اس راز کو جاننے کی خواہش تو اس کی آنکھوں نے کچھ دیکھا ہی نہیں۔ وہ خدا کا بندہ خاص تھا۔ دنیا فسق و فجور سے بھر گئی تھی اور وہ اللہ کی طرف سے سلامتی اور ان لے کر تستر میں وارد ہوا تھا۔ اس کے آنے سے باغوں میں پھل کا بارز یادہ ہو گیا تھا۔ اگر وہ بیمار بچے کے پاس بھی بھگڑ جائے تو شفا ہو جاتی تھی۔

ایسی ہی اور کہانیاں تستر میں گشت کرنے لگیں۔ بازاروں اور گلیاروں سے نکل کر صومعہ اور زاویوں مسجد اور اقامت گاہوں میں چرچا ہونے لگا اور اس کی بے خبری میں شدہ شدہ یہ خبر حضرت اہل بن عبد اللہ تستری تک بھی پہنچ گئی۔

مغرب کی نماز کب کی ہو چکی تھی۔ مدھم چراغ کی روشنی میں جوان کے حجرے کے نیچے دروازے کو بھی نہیں چھو رہی تھی، انہوں نے سیرھیوں کے سرے پر بیٹھے حسین کو دیکھا۔

”قریب آؤ۔“ انہوں نے اسے کہا۔

وہ نہایت سہا ہوا اور ادب سے تقریباً دہرا ہو کر حجرے میں داخل ہوا۔

”حسین بن منصور۔ تم طالب راہ حق ہو۔“

اس نے وہیں زمین کو بوسہ دیا۔ شدت گریہ سے اس کی آواز بند ہوئی جاتی تھی۔

”جواب دو۔“ انہوں نے نرمی سے پوچھا۔ ”تم سے منسوب یہ شعبہ کیا ہیں۔“

”مجھے سیراہ اسماء کا شوق تھا حضرت اعلیٰ۔“ اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔

”نفس کے ہاتھوں بچوں کے اس کھیل میں منہمک نہ رہو حسین۔ کیا محض اس لئے کہ اس تماشے سے تم سے سوا تمہارے گرد کے لوگ خوش ہوتے ہیں تم اپنی جان گھلاتے ہو۔ یہ گمراہی ہے۔ حسین۔ اس سے بچو۔“

وہ حجرے کی زمین پر اوندھا پڑا رہا۔ اس کا تصور اب بھی عرش پر تھا۔ جیسے چل چل کر بار بار ان گلیاروں میں نکل جاتا ہوں جہاں کھیل کود سے جی بہلایا جاتا تھا۔ پردوں کے پیچھے کیا ہے، جھانکنے کی تمنا لئے بے قرار دل۔

شیخ کامل نے کہا۔

”نفس کو سزا دو حسین۔ باگیں اپنے ہاتھ میں رکھو۔ اس کی تربیت کرو۔“ وہ افسردگی سے اس کی طرف دیکھتے تھے۔

باہر بیرا کرنے والے پرندوں میں سے کسی چڑیا نے بے وقت نغمہ سرائی کی۔ شاید اس نے خواب میں ان مہینوں میں اذان شروع کی تھی۔ جب ہوا پھولوں کی بو سے لبریز تھی اور باد شمال کے جھونکے سردی کی لہر لاتے اور جنوبی ہواؤں کے گرم تھپڑوں میں مل

جاتے تھے۔ یہ تیرنیم کش کی ہی صدا سرسراہٹوں میں گم ہو گئی بجھ گئی۔

خدا بان کے درخت پر اس پرندے کو خوش رکھے۔

اس کے نغمہ جانفزا نے مجھے یہ افسانہ سمجھایا۔

کہ پیاروں نے اونٹوں پر ہودے کے اور صبح دم رخصت ہو گئے

ان کی جدائی کی آگ کو سینے میں لئے میں نے دشتِ پیما کی کی۔

خدا بان کے درخت پر اس پرندے کو خوش رکھے۔

مسجد سے پرلی طرف شاہراہ پر اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹن ٹن سنائی دے رہی تھی۔ قافلے کا سفر ختم ہو رہا تھا یا کوئی قافلہ رو دکاروں کے ساتھ مشرقی کو ہستانوں سے پرے شاہراہِ خطار اور خوزستان کو جا رہا تھا۔ مسلسل سفر کی صداؤں سے یہ شاہراہیں آباد رہتی تھیں۔ صدا سناٹے سے افضل ہوتی ہے مگر کبھی کبھار سناٹا اپنی ہولناکی سفاکی اپنی لبریزی سے بہت موثر ہوتا ہے۔

آبادشہر میں حسین کا دل سناٹوں کی ہولناکی اور ویرانوں کے خالی پن سے یوں معمور تھا جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہو۔

مگر شیخ کا حکم کیا تھا۔ وہ کیا چاہتے تھے۔

سیاوش اور منصور تشر آئے۔

بازار بزرگ کے وسطی گلیارے میں دکان کھلی تھی اور دھنکی ہوئی روٹی سے چھت تک بھری تھی مگر حسین نہیں تھا۔

”پتہ نہیں یہ جان کھپانے کی دھن اسے کیوں ہے۔“ منصور نے اپنے آپ سے کہا۔ ”ریشم کے کاروبار میں بیضا میں اس کا جی نہیں

لگتا۔“ اس نے سیاوش کو مخاطب کر کے کہا۔

دکاندار جمع ہو گئے اور ان کی خاطر داریاں کھلی گئیں۔

”حلاج خانقاہ میں ہوگا..... وہ اب رائے گئے واپس آئے گا..... آپ اس کے عزیز ہوں گے۔“ انہوں نے استفسار

کیا۔

”میں اس کا دادا ہوں اور یہ باپ ہے۔“ سیاوش نے بات کی۔

”بہت محنت کرتا ہے حلاج۔“ انہوں نے بتایا۔ ”رات عبادت میں گزارتا ہے اور دن کا اکثر حصہ وہ روٹی دھنکتا ہے۔ آپ دیکھ

رہے ہیں نا۔ یہ سب ایک ہی دن کا کام ہے۔ اتنی جان کیوں لگاتا ہے۔ اس طرح سے تو وہ بیمار ہو جائے گا۔“ انہوں نے اطلاع دی۔ یہ

خبر انہوں نے سوچا نہایت افسردہ کر دے گی دونوں کو۔

”اس کو خدا نے دس آدمیوں کی طاقت دی ہے۔“ ان میں سے ایک بولا۔

”روٹی ہی دھنکتا ہے کوئی مشکل کام تو نہیں کرتا۔“ سیاوش بولا۔

”بزرگوارم۔ یہ کام سب سے زیادہ محنت اور توجہ کا طالب ہے اور کوئی کام بھی ہو ہم سب یہاں اپنے اپنے طور محنت کرتے

ہیں۔“

سیاوش نے دونوں ہاتھ سر کے اوپر اٹھائے۔

”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ حسین کے باپ کا ریشم کا کاروبار ہے۔ وہ اس میں لگ سکتا ہے مگر شالیس بوجہ اسے یہی کام پسند

ہے۔ ہم اسے واپس لے جانے کے لئے آئے ہیں۔“

”آپ ایسا نہ ہی کریں تو احسان ہوگا۔ ہمارے درمیان باعث برکت ہے۔ بازار کی رونق اور ہماری آمدنی اس سے بڑھ گئی

ہے۔ وہ مبارک روح ہے۔“ سب نے یک زبان ہو کر کہا۔

”وہ جسے چھو دیتا ہے اسے شفا ہو جاتی ہے۔ وہ جس کی طرف دیکھ لیتا ہے اس کے کام بن جاتے ہیں۔“

سیاوش اور منصور نے ایک دوسرے کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔

”اب کیا ہو۔“

حسین بن منصور حلاج جب صومعہ سے واپس آیا تو اس نے ان دونوں کو منتظر پایا۔

”بیضا میں تمہاری بیوی اور بچہ ادا اس ہیں۔“ سیاوش نے جب وہ کھانے سے فار ہو چکے تو کہا۔

”میں تمہیں واپس لے جانے کے لئے آیا ہوں۔ مسافتوں سے گزر کر۔“ منصور نے کہا۔

تمہارا بچہ اب گھٹنوں چلتا ہے اور حسین حسین کہہ کر تمہیں پکارتا ہے۔“ سیاوش بولا۔

حسین کے چہرے پر ایک کرن سی پھوٹی جیسے اندھیرے میں روشنی آن بھٹکے۔“ میں ابھی اپنی تعلیم مکمل نہیں کر سکا۔“ اس نے

باپ سے کہا۔

”میں روٹی دھنکتا ہوں۔ کیا یہ دنیا داری نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ریشم خوابوں کے مرقعے اور پھولوں کے رنگ بننے کی جگہ

میں ریشہ اڑاتا اور صداؤں میں راگ ڈھونڈتا ہوں۔ لوگ مجھے حسین حلاج کہتے ہیں۔ حسین بن منصور حلاج.....“ اس نے

نہایت خوش دلی سے کہا۔

”اس میں ہم رفت و آں ہم رفت میں کیا ہے۔“ سیاوش نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔

حسین زور سے ہنسا۔

”یہ ایک نیاراگ مگر دربار کے معنی اسے نہیں گا سکتے۔ یہ آئینہ سازی سے بھی مشکل کام ہے۔ وقت طلب۔“

”یہ کام بیضا میں بھی ہو سکتا ہے۔“ منصور نے دل میں سمجھتے ہوئے کہ اس کی بات نہیں مانی جائے گی، کہا۔

”بیضا میں سہل تستری نہیں ہوں گے۔ وہاں تو بس دشت سوس کی زور ریت اور تنہائی ہے۔“

حسین نے اٹھ کر چرا جلایا۔ پھر مغرب کی اذان پہاڑیوں اور بلند یوں پر میدانوں اور نشیبوں پر میناروں سے اتری۔ منصور اور حسین خانقاہ کی طرف چلے۔ سیاوش لوگوں کے جھرمٹ میں اپنی قصہ گوئی میں لگ گیا۔

حجرے میں جب منصور کو سہل بن عبداللہ تستری سے اذان باریابی ملا تو حسین اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ایک زمانے کے بعد وہ حاضر ہوا تھا۔ ان کے رعب و ہیبت سے اسے ہول آتا تھا۔ اور وہ شرمندہ بھی تھا کہ اس کا بیٹا ان توقعات پر پورا نہیں اتر سکا جو اسے اس سے تھیں اور خود شیخ کامل کی شفقت سے اس نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ یہاں وہاں بھاگا ہوا پھرتا تھا، جیسے آوارہ گردی اس کی روح کو بیماری کی طرح لگ گئی ہو۔ اس بیماری کا علاج کیا ہو۔ کو کمرے؟ وہ یہ سب باتیں ان سے کرنا چاہتا تھا۔

”منصور۔ اسے اپنے لئے خود دعا کرنا چاہئے اور ان سب شعبہ بازیوں سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔ یہ پہلے پہل طاقت کی دلیل بن جاتے ہیں مگر آدمی کو اس طاقت پر تکیہ کر کے بیٹھ نہیں جانا چاہئے۔ اس کی منزل دور ہے اوپر ہے۔ ایسی طاقت حجاب بن کر منزل کے اور آدمی کے درمیان حائل ہو جاتی ہے۔“

منصور سر جھکائے سن رہا اور اس کے سر میں دھنکی کا وہ گیت گونجتا رہا۔

در پئے جاناں جاں ہم رفت

جان ہم رفت جاں ہم رفت

رفت رفت

جاں ہم رفت

اس میں ہم رفت و آں ہم رفت

ایہیں ہم رفت آں ہم آں ہم آں ہم آں ہم رفت

رفت

رفتن رفتن رفتن

دے دے دے

رفتن دے رفتن دے

رف رفتن دے

اور وہاں بیٹھے اس پر منکشف ہوا کہ حسین طفل مکتب کی طرح اپنے سبق سیکھ رہا ہے۔ ”در پئے جاناں جاں ہم رفت۔“ اس کی اپنی جان منصوری کی جان جو مٹی کا بیٹا تھا نہ کسی آگ کے رشتے سے اور نہ ہی کسی زمینی رشتے سے کہیں جاسکی تھی۔ وہ دنیا کی زنجیروں سے بندھا ہوا ایک جانور تھا۔ دنیا کے در پر اور درد دنیا سے باہر وہ کس شے کی حفاظت کر رہا تھا؟ دنیا کے باہر کیا ہے اور خود دنیا کے اندر کیا ہے؟ روشن سورج طلوع ہوتا ہے اور دن کا سفر شروع ہوتا ہے۔ روز سہ پہر اور ڈھلتی شام اور مغرب کے آسمان کی نیلا ہٹ میں اکیلا تارا اور پھر ستاروں کے جھرمٹ چاندنی اور اندھیری راتیں۔ اس نے زندگی سے کیا سیکھا تھا اور جاں ہم رفت۔ جاں ہم رفت۔ ایک ہم رفت و آں ہم رفت۔ رفتن رفتن میں وقت ختم ہو رہا تھا۔ سر کے بالوں کی سیاہی میں سفیدی نے ڈیرہ جما لیا تھا۔ وہ وہمہ وقت حسین کے لئے فکر مند رہتا تھا۔ اس کے لئے دعا کرتا تھا۔ اس کے بچوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ اس نے تو اپنے لئے کبھی دعا بھی نہ کی تھی۔ دنیا نے اسے کیا دیا تھا؟ اور اب اس کا حسین اگر وہ اپنے طور پر زندگی گزارنا چاہے تو وہ اس سے تعرض نہیں کرے گا۔ ہر شخص مقدر کے لکھے کو پورا کرتا ہے۔

شیخ کامل نے جیسے اس کے خیالت پڑھ لئے ہوں۔ کہنے لگے۔

”منصور۔ تم کو بارگاہ خداوندی سے ایمان کی دولت نصیب ہوئی اور یہ اس کا کرم تھا کہ تم کثرت سے وحدت کی طرف آئے۔ تم نے محبت کا راستہ اختیار کیا۔“

منصور نے سر جھکا کر کہا۔ ”بے شک بے شک۔ خدا نے مجھ پر بہت انعام کیا۔ میں اس کا شکریہ کیسے ادا کروں۔“

”تمہیں ایک دل دیا جو الجھاؤ میں نہیں ہے۔ تمہاری امیدیں پوری ہوں گی۔“ انہوں نے پھر کہا۔

”میرے لئے دعا کریں میں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے لئے جانا چاہتا ہوں مگر حسین کی بیوی اور بچے

میرے پاس ہیں۔ یہ علاقے دنیوی بہت ہیں۔ اگر حسین گھروٹ آئے تو اگلے سال حج کی سعادت حاصل کر لوں۔“ منصور کا جی بھر آیا۔

اس کا عاجزی سے جھکا سوا سر اس کے نالوں کی زد پر کانپتا ہو وجود اس کا ذوق و شوق اس کی مجبوریاں سب شیخ کامل کے سامنے تھیں۔ اس کی جان ایک دم اتنی بے تاب ہو گئی۔ مرسل کی طرح پیشانی کو زمین پر رکھے وہ تڑپ رہا تھا۔ وہ معمولی آدمی جو نہ اپنی عبادت میں لو کر تانہ ہی ریاضتیں کرتا تھا جو ہایت عمدہ دنیا دار تھا شیخ کامل کی آواز آئی: ”ابو حسین دیکھو۔“

منصور نے ان کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا جیسے پردے اور حجاب اور راستے اور زمین سب کثیف سحاب اٹھ جائیں۔ آئینے کی طرح ہر شے دکھائی دے۔ اسے اپنے سامنے روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دکھائی دیا۔ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا حجرہ مبارک۔ اور نور اس پر منکشف ہوا۔ جیسے دروا ہو جائیں۔ ساری پشتیوں اور بلند یوں سمیت راستے کشادہ ہو جائیں۔ اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوئیں۔ اس کے قلب کو قرار آیا۔ اس کی روح سیراب ہوئی۔ وہ شام شاد کام ہوا۔ اس کی نظر فراخ ہوئی اور اس کی نگاہ نے جو دیکھا سو دیکھا۔

سواش ابھی سیر کا آصہ سنار ہا تھا جس نے سام کے بیٹے زال کو پالا تھا۔ پہاڑوں کی چوٹیاں اور اس پر ایک پرندے کا گھونسلہ اور اس میں ایک بچے کا پرورش پانا سب فسانے تھے مگر اب اس کے معنی منصور کے لئے بدل چکے تھے۔ ہر شے ممکن تھی۔ کیا ہو سکتا ہے۔ کیا ہوتا ہے یہ تو اس نے دیکھا تھا۔ مگر کیونکر کی اسے اب بھی خبر نہ تھی۔

ایک قافلے کے ساتھ جو بیت اللہ جا رہا تھا حسین بھی طرف روانہ ہوا۔ سیاوش نے تستر کے لوگوں کو قصے سننے کے شوقین بہت ہی مہمان نواز پایا تو وہ وہیں رہ پڑا۔ منصور اپنی نگاہیں جھکائے رکھتا جیسے کسی راز کو چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کسی تقدس کی حفاظت کر رہا ہو۔ کسی راز کے پردوں کو پکڑے کھڑا ہو۔ کسی بارگاہ کے سامنے باریابی کی اجازت چاہتا ہو۔

رخصت کرتے ہوئے شیخ شہل بن عبد اللہ تستری نے کہا تھا:

”ابو حسین۔ زیادہ فکر مند نہ ہوا کرو۔ تمہارا بیٹا اپنی راہیں خود تلاش کر لے گا اس کا دل ولہ شوق تہذیب نفس سے آشنا ہونا چاہئے۔“

اور حسین ک ساتھ ایک بھیڑ تھی۔ وہ اس کے ہاتھ چومتے۔ اس کے پاؤں کی خاک کو اکسیر جانتے۔

اور اس سے دعا کے طالب ہوتے تھے۔ وہ اغماض کی کوشش بھی کرتا مگر لوگ ناقص العقل ضعیف الاعتقاد اس کے وجود کو سعادت اور برکت کا باعث جانتے۔ قافلے میں جب کوئی بیمار ہوتا تو پانی اس سے دم کروایا جاتا۔ ہر تکلیف میں اسے مھونڈا جاتا۔ وہ چھپتا اور

لوگ اسے ڈھونڈتے۔ یہ بالفعل ایک بڑی کامیابی تھی کہ وہ مرجع خلائق بن گیا تھا۔ صرف تمنا سے، صرف تڑپ سے، صرف خدا کی رحمتوں سے، ورنہ وہ کیا ہے؟ یہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ درپے جاننا۔ اس کے لئے جاں رفتن کا مرحلہ تو ابھی بہت دور تھا۔ وہ منزل جاننا کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا مگر اس کا شوق ابھی ادھورا اور ولولہ بحر محیط کی لہروں کی طرح بس چڑھتا چلا آتا تھا اور ہر دم کا ایک جذر ہے اور اس حالت میں اس کے احساسات یا ہوں گے؟ وہ رہ نور و شوق نہیں تھا۔ اسے اس اجلال سے جو ذات رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تھا، اس جمال سے جو خود ان کی ذات تھی آشنا کی نہ تھی۔ وہ تو غلاموں کا غلام تھا اور اسے اپنے جذبوں کی شدت اور اپنی دیوانگی میں بھی صداقت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جذبہ صادق کی آہٹ وہ کبھی اپنی جان میں سنتا اور دوسرے لمحے ایک عجیب بے کیفی کی کیفیت اس کو سمیٹ لیتی۔ وہ تلاش عشق میں جا رہا تھا۔ کاش اس کی جان بے تاب کو اس کو دیتے ہوئے محبتوں اور چاہتوں کے جذبوں تک رسائی حاصل ہو سکے۔ اے کاش! اس کی ہستی کی تکمیل ہو سکے مگر اس کی ہستی کیا تھی؟ اگر وہ فانی ہے تو پھر باقی کیونکر ہے اور اگر باقی ہے، رہے گا تو پھر فنا کس شے کو ہے۔ یہ فنا اور بقا کا فلسفہ کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

سیدھی سادہ تعلیمات جس میں ایک مسلمان روح کا آرام اور دل کا سکون تلاش کرتا ہے۔ نماز اور خوف خدا مختلف حقوق کا تحفظ اور ہر انسان کا دوسرے کے مساوی ح آ رکھنا، کوئی پست نہیں کوئی بلند نہیں مگر اس سے آگے نازک تر مقام ادب جہاں حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور تمنائے خاص اور آرزوئے نظر التفات ہے وہاں پر کیسے گزر ہو؟ وہ جنوں جو آنسوؤں میں ڈھلے تو سارے گناہ دھلیں۔ اس جنون تک، ان آنسوؤں تک رسائی کیسے ہو؟

جنون ان عجیب قافلوں کا تمنہ امتیاز تھا۔ طویل مسافتوں کے یہ راہ گیر، ان کا ذوق و شوق دیدنی ہوتا۔ مجوسی خون اور نصرانی اور یہودی لہو پرستش کا جذبہ شدید جوان کی رگوں میں تھا، اس کو اسلام نے دوا آتشہ کر دیا تھا۔ حب اللہ اور حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ان رگوں میں رواں ہوتی اور ایک آتش عشق درپیش مسلسل ان کی جانوں کو بیقرار رکھتی۔ سوز دروں سے مجاہدہ، ریاضت اور قرأت میں رقت پیدا ہوتی۔

آنسوؤں کی روانی ان کے دلوں کی تڑپ کو کم نہ کر سکتی۔ ایک ایک قدم مجبوراً محبت میں اٹھتا اس سوز کی فزوں کرتا۔ یہ سعادت جوان کو نصیب ہونے والی تھی یہ استطاعت یہ طاقت یہ اشارہ کہ ان کو ان باریابی ملا ہے ان کی سرخوشی اور سرمستی میں کیف و انبساط کا باعث بنتا۔ وہ سب خاص لوگ ہوتے جو سر جھکائے اپنی روحوں کو لبیک کہتے سنتے۔ حاضر حاضر جان و دل حاضر روح و ایمان حاضر اللہ تم تیرے حضور حاضر ہونے والے ہیں۔ تیرے لئے تیری خوشنودی کے لئے تیری راح پر حاضر ہیں جب حضرت

ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ تعمیر کر رہے تھے تو ان کی دعا یہی تھی کہ اس جگہ کو مرکز بنا۔ اے اللہ یہ تیرا گھر ہے۔ اس کو مضبوطی اس کی خوبصورتی صرف تو ہے۔ اے مالک الملک تو ہے۔

حسین اپنی عبادت میں لگا رہتا اور دیکھتا کہ لوگ کس سادگی سے کوئی بڑی آرزو لے کر نہیں، محض اس کی خوشنودی کی خاطر پاک صاف نیتوں سے اپنی کمزور جانوں کو اس کی راہ کی طرف چلاتے تھے اور وہ اپنے اندر دیکھتا کہ وہ بھی اس کی خوشنودی چاہتا تھا مگر اس کا سوال اس سے بہت زیادہ تھا۔ اس کی طلب شدید اور اس کی تمنا شدید تر تھی۔

اے ساربان آہستہ چل کہ میری پسلیوں میں آگ ہے۔

وہ اس سے اسے طلب کرنا چاہتا تھا۔

اس لئے اس کے دل میں آگ نہیں الاؤ تھا۔

اے میرے خدا! میں حاضر ہوں۔ اپنی جان سے جان کی ساری بیتابیوں سے۔ تنہائی کی اذیتوں سے۔ روح کی سار پہنائیوں سے کرب و درد کی اذیتوں سمیت۔

وہ سوالی تھا مگر اس کا سوال دوسرا تھا۔ اس عجز میں اپنے عبد ہونے کا فخر بھی تھا اور یہ امید بھی کہ اسے خالی ہاتھ لوٹا یا نہیں جاسکتا۔

نیا نہیں ناز۔ ہاں جب اس کے راہ میں ایک قدم اٹھایا جاتا تھا کہ اس کو بڑھ کر اس ہاتھ کو تھام لینا چاہئے تھا۔

دیوانگی کی انتہا۔

شوریدہ سری کی حد

سارے مکالمے اس کے نہاں خانہ دل میں ہوتے تھے جہاں دونوں سنا نہیں سکتے تھے۔ اسے حسین کو دھکیل کر باہر پھینک دینا پڑتا تھا مگر باغی آوارہ گرد جلاوطن حسین کہاں جائے؟ گدائے بے نوا۔ گدائے بے نوا۔

جب کارواں رو دکارواں کے ساتھ چلتے ہوئے خرم شہر کی طرف چلا تو شدید سردی کے باعث اور آب و ہوا کی کمی کی وجہ سے دو دن انہیں دارالسلطین میں آیام کرنا پڑا تھا۔ یہ آب جو رودکارواں سے جا کر ملتی تھی اور کہیں پہاڑیوں کے چشموں میں سے مل کر نکلتی تھی، نشیب میں بہتی تھی اور پتھروں کے درمیان ایک سفید شاہراہ کی طرح کبھی چھپ جاتی اور کبھی ظاہر ہوتی مگر اب اس کی تہہ میں ریت اور پتھروں کے سوا کچھ نہ تھا۔

وہ ٹھہر کر ادھر ادھر کھود کر پانی تلاش کر رہے تھے کہ قمر مٹی باغیوں نے ان پر حملہ کر دیا۔ چاروں طرف سے گھیر کر انہیں لوٹ لیا

گیا۔ عورتوں اور بچوں تک کو انہوں نے ذبح کر دیا تھا صرف حسین کو انہوں نے چھوڑ دیا تھا۔ اس کے پاس زادراہ تک تو تھا نہیں۔
 نحیف و لاغر بے چارہ جوان جس کی نکھیں کثرت گریہ سے سرخ تھیں اور جو انہیں روشنی میں کھول نہیں سکتا تھا۔
 ”یہ حاجیوں کا قافلہ..... بھلا اب وہ بیت اللہ میں کیا کرنے جاتے؟“ ان میں سے ایک نے کہا۔

”اسی لئے ہم نے ان کو زحمت انتظار اور سفر کی صعوبتوں سے بچا لیا ہے۔“

”مگر یہ سب.....“ اس نے لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ حجاج اصل حجاج ہیں کشتہ راہ محبت۔“ ایک باریش جوان نے کہا۔
 ”کشتہ راہ محبت۔“ سب نے یک زبان کہا اور قہقہوں کے درمیان ان کی آوازیں ڈوب گئی تھیں۔
 ”وہ سب فنا ہو گئے۔ حاضر ہو گئے۔“ ایک دوسرے شقی القلب نے کہا۔

”سردے کرنی اس راہ میں محبت کا اعلان کیا جاتا ہے۔“ ایک اور نے اپنی خورجین میں چاندی کے سکے بھرتے ہوئے کہا۔
 ”سنو۔“ انہوں نے حسین کو پکارا۔ اپنے پاس بٹھایا اور نہایت تمسخر سے کہا..... ”ان سب کو دیکھتے ہونا۔ انہوں نے راہ
 محبت میں سردے کر جانوں کی قربانی دے کر حج کیا۔“

اس نے حسین کے سر پر مارا۔

”جی۔“

”یہ سب حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں فنا ہوئے ہیں۔ تمہارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں۔ تم جو نمازوں
 اور دعاؤں اور روزوں اور عیدین میں خوشی ڈھونڈتے ہو۔ اگر تم ہمارا دین قبول کر لو تو ہم تمہیں یہاں کی خوبصورت عورتیں اور مال و
 منال دیں گے۔“

تھوڑی دیر اس کے جواب کا انتظار کرتے رہنے کے بعد انہوں نے کہا تھا:

”ہم بے قافلہ و راہلہ تمہیں یہاں اس لئے چھوڑ رہے ہیں تاکہ تم اس بات پر گواہی دے سکو کہ یہ زنجی نہیں ہم تھے اور ہم یہ نیم
 مردہ اونٹ بھی تمہیں دے رہے ہیں تاکہ تم قریب کی کسی آبادی میں پہنچ کر چشم دید حالات سنا سکو۔“
 پھر انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور روڈ کاروں کی طرف لوٹ گئے جہاں سے بڑی شاہراہ قریب تھی۔

”سردے کر راہ محبت طے کرنا ہی تو منزل ہے۔“ اسے دور تک ان کی آوازیں اپنے عقب میں سنائی دیتی رہی تھیں۔

جب وہ مکہ معظمہ پہنچا ہے تو حج کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اسے واپس جاتے ہوئے قافلے بڑے بڑے کارواں اور شاہراہوں میں وادیوں میں مل کر لوٹتے ہوئے لوگ ملے۔ سرشاری کی کیفیت۔ رنگینی کی لہر۔ ہوا میں خوشبو اور سانسوں میں فرحت و تازگی سے فضا معطر ہوتی تھی۔ وہ نوازے گئے، قبول کئے گئے، بلائے گئے، مہمان تھے اور وہ بھٹکتا ہوا، ٹھوکریں کھاتا بس در آیا تھا۔ وہ کیوں سمجھتا تھا کہ اس کا ناز پسند کیا جائے گا؟

آخر اس کے جی میں یہ کیوں آیا تھا کہ وہ دوسروں سے افضل نہ سہی الگ تھا؟ وہ خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے نہیں گیا بلکہ مضافات میں ایک غیر آباد بستی میں ایک پرانی مسجد میں جس کی چھت تقریباً نہیں تھی، ٹھہر گیا۔

”جب تک مجھے بلا یا نہیں جائے گا میں نہیں جاؤں گا۔ قطعاً نہیں جاؤں گا۔“ پتہ نہیں وہ کس سے ضد کر رہا تھا۔ شرط باندھ رہا تھا۔ ناز اٹھوا رہا تھا۔ سرفروشی کی تمنا جی میں لئے مگر سر کی قیمت کا شمار ہونا چاہئے۔ وہ پئے جاناں، دھنکی کا گیت اسے یاد آ رہا تھا۔ درپے جاناں..... درپے جاناں..... اس کے نہاں خانہ دل میں یہ صدا و قنوں سے بار بار ہر لمحہ ہر پل جو بجتی۔ مغنی کے ساز کی طرح اسی آواز سے وہ گونجتا تھا۔ وہ پلکیں اٹھاتا تو درپے جاناں سنائی دیتا۔ وہ انگلی اٹھاتا تو درپے جاناں ہوا میں ستاروں کو چھو کر آتی۔ روشنی میں جنگل میں جب پرندے گیت گاتے۔ ٹڈوں کی چرچر، گھنٹیاں شاہراہوں کی صدا عیں۔ وہ درپے جاناں سے گھرا تھا۔ یہی ایک بول جس نے اسے دھنک کر رکھ دیا تھا۔ اس کے آنسوؤں میں ساس میں بس یہی تھا مگر اس کی جان تھی جان رفتن کی گھڑی دور تھی۔ وہ تھا۔ حسین بن منصور حلاج تھا۔ وہ دیوانہ نہیں تھا۔ یہ بھی ایک شعبہ تھا جتنی نہیں محض شعبہ۔ مئے خودی کے ایک جرے نے اس کی یہ حالت کر دی تھی۔ درپے جاناں..... اس سے مضبوط تو دھنکی تھی جس کے بول گیت میں ڈھل سکتے تھے۔ اس کی جان تو ابھی تھی وہ تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک تانٹ اور لکڑی سے بنی ہوئی معمولی دھنکی بھی نہیں۔ اسے اپنے آپ سے، اپنے آپ کے ہونے سے بہت شرم محسوس ہوئی۔

نواح مکہ میں ان دنوں ایک دیوانہ دیکھا جاتا جو نہ ہنستا تھا نہ بولتا تھا نہ سوتا تھا اور نہ ہی بیٹھتا تھا۔ اس کی بے قرار جان اضطراب میں ڈوبی ہوئی، نگاہیں جھکی ہوئیں۔ وہ حرم کعبہ میں بھی نہیں ہوتا، کبھی غار حرا کے سامنے، کبھی غار ثور کی بلندیوں پر، کبھی جبل رحمت کے نواح میں۔ منیٰ اور عرفات میں۔ دو پہر کو جب دھوپ تیز ہوتی وہ تپتے ہوئے پتھروں پر بیٹھتا اور پسینہ چشمے کی طرح اس کے جسم سے جاری رہتا۔ قطرے پتھروں پر گر کر خشک ہو جاتے۔ اس کا دماغ تمازت سے پکنے لگتا ہوگا مگر وہ پتھروں پر بیٹھا رہتا۔ پتہ نہیں وہ اپنی جان کو عذاب کیوں دے رہا تھا۔ تپش غم سے اسے نیند کیاں آتی ہوگی۔ بے چھت کی مسجد میں جب وہ نماز پڑھتا تو ہی وقت نوال

میں لگا رہتا۔ وہ اس کی آزمائش اور اپنے آپ سے جنگ کے دن تھے۔

لوگ اس سے بات کرنے کی کوشش کرتے مگر ہو کسی سے بات نہ کرتا۔ وہ درپے جانا تھا۔ مہینوں یوں ہی گزر گئے اور لوگ اسے گم سم مگر فرزند دیکھتے۔ ننگے پاؤں ریت پر چل رہا ہے۔ لوگوں کو اس کی تلاش رہنے لگی۔ مجمع اس کے گرد بڑھنے لگا۔ لوگ اس سے دعا کے طالب ہوتے۔ اس سے اپنی حاجتیں کہتے۔ وہ کسی کو کاغذ پر لکیریں سی کھینچ دیتا۔ کبھی سیاہی سے کچھ آڑے ترچھے حروف بنا دیتا۔ لوگوں نے اس کا انتظار کرنا شروع کر دیا تھا۔ لوگ اسے کوئی عظیم بزرگ سمجھتے، اس کی بددعاؤں کی کم گوئی کو بھی ایک انداز دلبرانہ سمجھتے۔ اس کی لاپرواہی و بے نیازی کو بھی ایک شان محبوبی جانتے۔ یہ رحمتوں اور برکتوں والی سرزمین تھی۔ یہ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کا ماں تھی۔ آب زمزم کا سرچشمہ جب حضرت ہاجرہ صفا اور مروی کے درمیان پانی کی تلاش میں رمی کر رہی تھیں اور خدا کو ان کی یہ اداکتبی پسند آئی۔ جب پانی ایز یوں تلے سے پھوٹا تو انہوں نے اسے کہا:

”زم‘زم“ (ٹھہر، ٹھہر) اور وہی اس کا نام ٹھہرا۔

ان بے آب و گیاہ صحراؤں کو اس نے ان کے لئے آباد کیا۔ وہ اس کے پیارے تھے اور اس نے اپنے گھر کے لئے یہی سرزمین پسند کی جو امن کی جگہ ٹھہری۔ پتہ نہیں یہ کیا بات تھی کہ کچھ لوگ زیادہ محبوب نہ تھے اور کسی کی طرف اس کی نظر التفات بھی نہ تھی۔ وہ اس کا پیار نہ سہی مگر اس کا بندہ تو تھا۔ اس کی توجہ کا طالب۔

باب نبی شیبہ کے سامنے ایک شخص خوبصورت لجن میں روز گاتا ہوا گزرتا چلا جاتا۔

”خدا اپنے بندوں کو محبوب رکھتا ہے“

خدا اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے“

جب حسین کے کان میں اس کی آواز پڑ جاتی تو وہ سر تا پا کانپ جاتا۔ وہ محبوب بننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تو اس کی محبت بھی نہیں چاہتا تھا۔ اسے تو خود اس میں فنا ہونے کا شوق تھا۔ اسے تو صرف اس کا شوق تھا۔ اسے اپنی ہستی سے اپنے ہونے سے کوئی محبت نہ تھی۔ محبتیں اس کا مقصود ذات اور مطمح نظر نہ تھیں۔ شدت جذبات سے وہ مٹھیاں بھینچ لیتا۔ کان بند کر لیتا۔ وہ یہ سننا ہی نہیں چاہتا تھا کہ خدا بندوں کو محبوب رکھتا ہے اور ان سے محبت کرتا ہے۔ وہ اپنی رگوں پر اپنی نبضوں پر اس جذبے کو آ ز مانا چاہتا تھا۔ اس کی جرات رندانہ خیال کی بیباکی کہ وہ اپنے جذبہ بے اختیار شوق کی بھی نفی چاہتا تھا اور اپنی بھی۔ وکھویا ہوا سا، بھلایا ہوا سا، اس سرزمین میں پھر رہا تھا جو اس کے پیاروں کی سرزمین تھی۔ اس لئے وہ اس پانی سے اپنی پیاس بھی نہ بجھاتا۔ اور پیاس کی شدت میں اسے پیاس ہی بھول

گئی تھی۔ تسکین اضطراب ہو تو کیسے؟ جب اضطراب ہی نہ رہے۔

اس صحرا میں وہ اکیلا تھا۔ کیا کبھی اس پر ابر کرم برے گا؟

وہ اسے ڈھونڈتا تھا جسے وہ سامنے دیکھنا چاہتا تھا، روبرو۔

حق تعالیٰ خلق پوشیدہ ہے اور وہی ظاہر ہے اور ساری نسبتیں اسی سے تھیں اور جب وہ خلق کو چاہتا تھا تو اپنے آپ کو چاہتا تھا اور حسین کو بھی چاہتا تھا مگر حسین کو اسی خیال سے کوئی تشفی نہیں ہوتی تھی۔ دنیا اور دین اور اس سے بھی پرے ذات حق تعالیٰ الجہاد سے جو اس کی سمجھ سے بالا اترتے اور جو اسے پتہ نہیں یہ قیاس تھے تو ان کی حقیقت کیا تھی؟ اگر وہ حقیقی تھے تو امر تھے تو خدا کی طرف سے تھے۔

اگر وہ خیال تھے اور ان کی اصلیت کچھ نہ تھی تو وہ شیطان کی طرف سے تھے۔

اور ان مہلکوں سے بچانے کے لئے اس کے پاس مرشد کا سہارا بھی نہ تھا۔ وہ سالک تھا کہ نہیں!

وہ جبل رحمت پر بیٹھا رہتا اور سوا لی ہوتا اے نور حق! مجھ پر ظاہر ہو۔

اے نور حق مجھ پر ظاہر ہو۔

اب رب کعبہ مجھ پر منکشف ہو۔

جیسے ایک ذرہ ناچیز آفتاب کو پکارے۔ اپنے آفتاب ہونے پر دلیل دے۔

حسین تم کہیں کے نہ رہے..... ایں ہم رفت و آں ہم رفت۔

اس کی پیاسی جان اسی طرح اپنے ساتھ مکالمے میں لگی تھی۔ کیا وہ صاحب ذوق وجدان بھی نہیں تھا۔

دھوپ بارش کی طرح پہاڑوں اور وادیوں پر برس رہی تھی اور لاوے کی طرح بہتی ہوئی ہر پستی اور بلندی کو بھر رہی تھی۔ حسین

نے یک بیک اپنی پشت میں ٹھنڈک ریگتے محسوس کی۔ جیسے کوئی ہاتھ اس کے سر اُپے کو تھپک اور سلا رہا ہو۔ اکی حفاظت کر رہا ہو۔

مہربانی و محبت کا زمزمہ شیریں اسے سنارہا ہو۔

پتہ نہیں یہ مکاشفہ تھا کہ الہام اس کی آنکھوں نے روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا۔ اس کا بلاوا وہاں کا تھا۔ وہاں جہاں

تاجداران جہاں سر کے بل آتے تھے۔ جہاں کا پیام سارے پیاموں سے افضل تھا۔ اور جہاں پر جانے والے کو نفس گم کر ہونا

چاہئے۔ نفس جس کے متعلق یہ حکم تھا جس نے اسے پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔

کیا آدمی اپنے نفس کو پہچان سکتا ہے؟

اور اگر اپنے نفس کو نہیں پہچانتا تو رب کو کیسے پہچانے گا؟

اس کو پہچانا نہ اس کو ملنا، اس کو ملنا بغیر مرنے کے ممکن نہیں۔ اور اس سے ملنا بھی ضرور تھا۔ پس مرنا بھی ضرور ہے اور موت کا آ کر غمناک کرتا ہے اور نہ ہی پریشان۔ کیونکہ خدا بھی تو اپنے بندوں کا مشتاق تھا۔ جب اللہ نے بندوں میں اپنی روح پھونکی تو وہ اپنے ہی نفس کا مشتاق تھا۔ ہاں وہ سب طرف خود تھا۔ کائنات میں جانے کیا کچھ تھا اور جو بھی تھا وہ آپ تھا۔ اپنی ید کے لئے نفس و آفاق! بطن فر میں ایک قافلہ ٹھہرا ہوا تھا اور ستاروں بھری رات میں سرسبز و شاداب نخلستان خرے کے درختوں سے سجا ہوا ایک عالی شان محل کی صورت تھا جس کے ستونوں پر آسمان کی چادر تھی ہوئی تھی اور چراغوں کی روشنی میں وسیع اور آباد بستیاں خواب میں دیکھی گئی خوشنما سیرگاہوں کی عمارتیں تھیں۔ جلیل القدر لوگوں کی آرام گاہیں۔

حسین کو ان لوگوں نے اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ وہ نظریں جھکائے دل کے گداز سے اپنے اندر اس بلا وے کی کوئی جہت نہیں پاتا تھا۔ وہ ناکارہ بے نوا بے بال و پر بے سہارا بے مال و منال۔ جس کی روح کثیف اور جس کا معاملہ اپنیجند اسے بھی صاف نہیں تھا جس کو حرم کعبہ میں باریابی کی اجازت نہیں ملی تھی کیونکہ صاحب لولاک کے آستانے پر حاضر ہونے کے لئے بلایا جا رہا تھا۔

نرم ہوا کا ظمہ کی پہاڑیوں کی طرف سے آرہی تھی۔ اور ریت ریشمی چادر کی طرح پاؤں تک پھیلی تھی۔ آبار عسغان ایک ویران قلعہ تھا جسے حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بنوایا تھا۔ وہ تیسرے خلیفہ اور صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سب سے زیادہ مال دنیا کے مالک تھے مگر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے جاس ٹاروں میں بھی درجہ ممتاز رکھتے تھے۔ وہ نہایت نرم خوتھے اور اس لئے کنبہ پرور مشہور ہوئے اور اسلام کی فتوحات اور وسیع سلطنت کے بادشاہ ہونے کے باوجود اپنے گھر میں شہید کر دیئے گئے۔ دنیاوی جاہ و عزت نے ان کو شہادت کی موت کی طرف بلایا اور کیا ہی اچھی موت تھی۔ آدمی کو اپنے خدا سے ملنا ضرور ہے۔ وہ خود آدمی سے ملنے کا مشتاق ہوتا ہے۔ کیا دنیا اتنی عظیم اور قابل حصول ہے کہ اس کے لئے کلام اللہ کو خون سے رنگا جائے؟ اگر آدمی کی داستا رنگین ہو تو خدا کا کلام جو اس داستان کر مرکز ہے رنگین تر کیوں نہ ہو۔ دنیا میں محبتوں کی ساری داستا میں مشتاقی اور صبوری کی داستا میں ہیں۔ جان جان آفریں کے حوالے کرنے کی۔

دشوار گزار پہاڑیوں میں سے جن کے پتھر دھوپ میں جلے ہوئے اور سیاہ معلوم ہوتے تھے قافلہ دشت پر وارد ہوا۔ یہ پھیلا ہوا ریگزار بے پناہ آندھیوں اور بگولوں اور صرصروں کی آماجگاہ تھا۔ حد نظر تک پھیلا ہوا ریت جیسے آبادی کے کناروں سے بحر ناپید کنار پر

اترا ہو۔ حسین کو دشت سوس یاد آیا جس کی زرد اور سیاہ سرخ ریت تمازت میں قوس قزح زمین پر اتری ہوئی لگتی تھی۔ رنگین بگو لے ہر شے رنگ میں ڈوبی ہوئی اور زمستان کی شدید راتوں میں برف پر جب شعاعیں منعکس ہوتیں تو یہ الگ الگ لہریے دکھتے اور پھر ہوا کے دنوں میں جب ریت چلتی اور ٹیلے ایک سے دوسری جگہ اٹھائے جاتے تو لہریوں پر گمان ہوتا جیسے کوئی آہستہ خرام محبوب اپنے دامنوں کو گھسیٹتا ابھی ابھی وہاں سے گزرا تھا۔ بھاری تلواروں اور ڈھالوں کی لڑائی میں جو بدر میں لڑی گئی، کوئی مدد کے لئے پکارا تھا اور فرشتے جو بلند یوں پر صرف حمد و ثناء میں مصروف ہیں، مومنوں کے ساتھ صف آرا ہوئے تھے۔ طبل جنگ بجنے کی صدا انھاروں کی صدا جو ان ٹیلوں نے جو اس میدان کو گھرے ہیں۔ محفوظ رکھا تھا اور خرے کے باغوں کے درمیان گنج شہیداں تھا اور جبل رحمت سے فتح مبین کی بشارت آئی تھی اور جبل القبول نے ان آوازوں کی بازگشت کو سمیٹ کر رکھا تھا۔ ان زمانوں کا ہر سانس گنج گرا نمایا تھا۔ اور یہ راستے خوشنما تھے۔ آباد خرے کے باغوں اور پہاڑوں، چشموں اور آبادیوں سے پر یہ اس قافلے کا راستہ تھا جس نے زمین کو عرش بنادیا تھا۔ جس سے عرش کی آبادی تھی اور ساتوں آسمان جس کا روان سالار کی آمد آمد کا سن کر کھلے تھے سجائے گئے تھے اور پھیلائے گئے تھے۔ خدا جو بہت بے نیاز اور لا پرواہ اور پہنچ سے باہر تھا کبھی کبھار کسی کمند افکن کا اسیر ہو جاتا ہے کیونکہ محبت کا طرب اس کی تکمیل اس مشتاقی و دید میں تھا جو وصل کی گھڑی قاب قوسین اور ادنیٰ ہو کر رہ جاتا تھا اور جبریل امین کی رسائی اس تک محال تھی۔ بارگاہیں آباد ہوئی تھیں۔ انبیاء علیہم السلام استقبال کرنے کو جمع ہوئے تھے اور وقت تھم گیا تھا۔

حسین نے نہایت عاجزی سے جبین نیاز زمین پر کھی۔ ”بار الہی! میں بھی تیرا مشتاق ہوں اور اس لئے میں تیرے دوست کی دید کا مشتاق ہوں۔ مجھے بلاوا ہے تو یار یابی کی اجازت دے۔“

وہ مسجد الحلیفہ میں تھا جہاں رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احرام باندھا تھا۔ مسجد قبا اور مقام شہد امیر حمزہ تک مدینہ منورہ کا حرم تھا۔ سفید میناروں اور مسجدوں کے گنبد دکھائی دے رہے تھے۔ وفور شوق سے اس کے آنسو تھم نہیں رہے تھے۔

اے خدا بزرگ و برتر! جب تو اپنے دوست کید کا مشتاق ہوا تو اسے عرش پر بلایا۔ میں تیرے دوست کے در پر حاضر ہونا چاہتا ہوں۔ مجھے طاقت دے۔ اس ادب گاہ میں کہیں مجھے اذن بار یابی مل جائے۔

اس کے جسم میں ایک ٹھنڈک تھی التہاب سے علیحدہ جو اس کی لہو میں تھی۔ حقیقت انسانی کی آتش جو اس کی رگوں میں تھی جو وہ تھا۔ اس کا جی چاہتا وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور ان فضاؤں میں بکھر جائے۔ ان ہواؤں میں مل جائے۔ ان نغمہ سرا پرندوں کی بولیوں میں گھل جائے۔ مدینے کی خوشبوؤں میں۔ خوشبو جو نماز کی طرح خدا کے محبوب کو پسند تھی۔ خوشبو ٹھنڈک تھی۔

”مجھے اس سرزمین میں وہ رطا ہو جس کی مجھے بھی خبر نہیں۔ میرا وہ سوال پور ہو جو میں نہیں جانتا، مگر جو میری روح کو بے قرار رکھتا ہے یہاں سے سب کو بے مانگے ملتا ہے خدا یا۔“

اپنے حواس مجتمع کر کے اپنے آپ کو سنبھال کر فرط ادب سے جھکا ہوا اپنے اندرون کو سنوارے ہوئے شور و غوغا سے مجتنب وہ باب جبریل سے اندر داخل ہوا تھا۔

”یہ داخل ہو گیا ہوں۔ کیا مرا وجود اس قابل ہے کہ اس حرم میں داخل ہو۔“ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔ اور پھر اسے تعجب ہوا کہ وہ ثابت و سالم اپنے وجود اور حواسوں اور دیگر روح اور زخمی قلب بیمار وجود کے ساتھ باب جبریل سے اندر آیا تھا۔ جس کو اپنے پرغرہ تھا، خدا سے اپنے ناز اٹھوانے، ضد سے اپنی بات منوانے کا حوصلہ تھا، وہ کون تھا کہ یہاں آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

وہ کانپنے لگا۔

میں کیا ہوں؟

یہ ارض و سماویہ کائنات جس کے لئے بنائے گئے

وہ سلطان عالم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عربی

اور دشمنوں کی وجہ سے مکہ معظمہ چھوڑ کر مدینہ میں آن بے۔ خداوند تیرا حکم کیا ہے؟ تو جب اپنے دوستوں کو آزماتا ہے وہ تیری راہ میں تکلیفیں برداشت کرتے ہیں۔ کبھی حکم دیا جاتا ہے کہ اپنا فرزند قربان کرو۔ کبھی وہ دریا میں بہائے جائے ہیں۔ کبھی صلیب پر کھینچے جاتے ہیں۔ اور تجھے پکارتے ہیں۔

”کیا تو نے مجھے چھوڑ دیا۔“

”اور میں تیرا بندہ ناچیز، میں تجھ سے عافیت کے ساتھ اذن باریابی چاہتا ہوں۔“

وہ کھڑا تھا اور اس کے قدم آگے نہیں اٹھ رہے تھے۔ پھر موزن نے اذان کہی جو ڈھلتے ہوئے سورج اور بڑھتے ہوئے سایوں میں یوں اٹھی جیسے ریگزاروں کو عبور کرنے والی ناقہ اپنے سوار کو لے کر اپنی گردن کو بڑھا کر پہ خرام آہستہ منزل کی طرف رواں ہو۔ اسے ہوش آیا۔ اس نے خدا سے مدد چاہی اور ریاض جنت میں نوافل پڑھنے کے بعد نماز میں شامل ہو گیا۔

نماز رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت پسند تھی۔

نماز ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھی۔

وہ چاہتا تھا نماز میں تحلیل ہو جائے۔ بس معدوم ہو جائے نہ رہے۔ وہ ان قدموں میں اس خاک میں جذب ہو جائے۔ گزرے ہوئے وقت پر عمر بن عثمان مکی اور کھل بن عبداللہ تستری اور بصرہ در حرقد یہ سارے مرقعے تھے جن میں اس کا رنگ پھیکا اور وہ خدا مکمل تھا۔ بھاگ بھاگ کروہ تھک گیا تھا۔ اس کی برات کیسے ہو؟ ایک بر خود غلط شخص کی شفاعت کون کرے گا؟ اس نے حساب کیا۔ اپنا محاسبہ کیا۔ اس کی لگن بے کیف اور اس کا قلب ٹھہرا ہوا تھا۔ ٹھہرے ہوئے قلب میں رقت کہاں سے پیدا ہو۔ جمود میں حرکت کہاں سے آئے۔ دعا کیسے پرواز کرے اور قبول کیوں کر ہو؟

اسے جو مانگنا تھا اسی در سے طلب کرنا تھا مگر طلب کے لئے جاگتا ہوا دل تو ہو۔ چوک زندہ اور اس کے مرض کہن کا چارہ بھی شاید یہی تھا۔ اسے اپنے اندر طاقت کا سرچشمہ دریافت کرنا تھا۔

وہ روضہ مبارک کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ اس کے جھکے ہوئے کندھے پر کسی نے ہاتھ دھرا۔ جب اس نے سر نہ اٹھایا تو کسی نے پکارا:

”حسین۔ حسین۔“

اس نے سر اٹھائے بنا آواز پہچان لی۔ یہ آقائے رازی تھا۔

”کسی آشنا صورت کو دیکھ کر بڑی تقویت محسوس ہوتی ہے۔ تم کب آئے ہو۔“

آقائے رازی نے پوچھا۔

حسین نے انگلی اٹھا کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ گفتگو کے لئے تو ایک عمر پڑی تھی۔

آقائے رازی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا اور اس نے دعا کے لئے ہاتھ پھیلائے:

”مولائے کل۔ میں کس منہ سے آپ کا شکر یہ ادا کروں۔ آپ نے مجھے اپنے دیدار سے فیض یاب کیا۔ باریابی کی طاقت عطا ہوئی۔ میں حاضر ہوں مولائے بسمل۔ میری جان آپ پر قربان فقیروں بے نواؤں کے آقائے نامداری میری حاضری قبول ہو میری حاضری قبول کیجئے۔ میرا سلقم قبول ہو۔ میری دعا قبول ہو۔ اے شاہ ام۔“ پھر اس کی آواز سسکیوں میں ڈوب گئی۔

حسین حیران تھا۔ جی ہی جی میں اس نے سوچا: ”میں اپنے آپ کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کرنے والا جانتا ہوں اور سمجھتا ہوں مجھ پر انعام و اکرام کی بارش ہونی چاہئے۔ مجھ پر وہ درواہوں جو خاصہ خاصان رسل پر ہوتے ہیں اور یہاں ایک سوداگر

صحراؤں اور شاہراہوں پر گرداں، سود و زیاں کا خیال رکھنے والا نہ اپنے اشواق میں شدید اور نہ ہی اپنی آرزو میں بے پناہ۔ وہ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں گریہ کننا ہے۔ یہ توفیق اسے کہاں سے عطا ہوئی ہے۔ کس کی دعا کا اثر ہے اور میں دیوانہ ہو کر بھی فرزانہ ہوں۔ میرے ہوش و حواس قائم ہیں مگر ایسی حضوری مجھے نصیب نہیں ہوتی۔ کہیں نہ کہیں کسی بات کی کمی ہے۔ سادہ دلوں پر شوق کے جذب غالب کے وقت جو راز منکشف ہوتے ہیں، مجھ پر کیوں نہیں ہوتے۔

مجھے بے منت گریہ اپنا سوال دہرانا چاہئے۔ اپنی جان کی بے تابی کو تہذیب نفس کے دائرے میں لانا چاہئے۔ میں اپنی نمازوں میں شدت اختیار کرتا ہوں۔“

ابھی تک اسے وہ سجدہ شوق عطا نہیں ہوا تھا جس سے اور سجدہ حرام ہو جاتے تھے۔ نوافل کی کثرت کے باوجود شاید اس کی پیشانی میں وہ سجدوں رکھا ہی نہیں گیا تھا۔ اس کا نصیب اس کا مقدر قیام ازل نے اسے جو دیا تھا وہ دیا تھا۔ آقائے رازی اٹھا تو وہ بھی اٹھا۔

”تم سے ملے زمانہ ہو گیا۔ تم بغداد جا رہے تھے۔ کیا اب بھی دربار خلافت میں ہو۔“

”میں دربار رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوں۔“ حسین نے لرز کر کہا۔

جانے اس کی حاضری قبول ہوئی کہ نہیں۔ اسے تو صرف اس تجلی کی طرف سفر کرنا تھا جو اسے اذن سفر دے گئی تھی۔ اس کے تو خواب بھی نہ تھے۔ تپش غم سے مجال خواب محال۔

”کیا اب دربار سے تمہارا تعلق نہیں رہا۔ میں نے اہل کارواں میں سے کسی کی زبانی سنا ہے کہ خلیفہ بس ذرا سے بخارا سے انتقال فرما گئے ہیں۔ افسو آدمی حکومتیں، سلطنتیں، سرحدیں بناتا ہے، محل سراخیں اور سیرگا ہیں اور انجام اول آخرفنا ہے۔ ہے نا۔“ اس نے حسین کو مخاطب کیا۔

حسین اپنے خیالوں میں گم اپنی بے وقعتی، کم مائیگی پر نازاں، مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں صرف آخری جگہوں کی تلاش میں تھا۔ اگر اس کا شمار ان صفوں میں ہو سکے تو خلیفہ کے نام پر اس نے چونک کر دیکھا۔

”اچھا۔“ اس نے گھبرا کر کہا۔

”پیاک اور نذر آدمی جو مت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جرات رکھتا تھا۔ اسے متعزز یاد آیا۔ اور پھر بغداد اور کنار و جلہ کی سیر گا ہیں، رندی و ہوشیاری کے جلے، بکھری ہوئی دنیا داری جو رونقوں میں نمود کرتی تھی۔ اور پھر موت اور ویرانی اور برد

باری میں جا کر ختم ہوتی تھی۔ روشنی زندگی ہے تو تاریکی موت ہے اور موت سے ایک قدم ہمیشہ کی زندگی اور اسی لئے اسے فنا سے پیار تھا۔ وہ وہ موت کا طلب گار تھا۔ ایک آدمی جو پل صراط پر چلتا رہا، آخر کار پارا تر ہی جاتا ہے مگر کیا موت فنا ہے؟

”کیا سوچنے لگے ہو حسین؟“ آقا رازی نے اس کے کندھے کو چھو کر کہا۔

”آقائے رازی! موت فنا تو نہیں ہو سکتی۔“ اس نے جیسے اپنے آپ سے سوال کیا۔

”میں سیدھا آدمی ہوں۔ مجھ سے تم موسموں کا پوچھ سکتے ہو دنیا کی اقلیموں کا موسم جن میں میں نے سفر کیا ہے مگر بخدا میں مر کر دوبارہ جی نہیں اٹھا ہوں کہ بتا سکوں کہ موت فنا ہو سکتی ہے کہ نہیں۔“ پھر کچھ دیر سوچ کر اس نے کہا: ”حسین فنا کا مطلب تو مٹ جانا ہے اور ہم جو رسول عربی کا دیدار قیامت میں کریں گے۔ ہم جو قیامت میں جنت اور دوزخ کی طلب اور بچاؤ کی خاطر زندگی گزارتے ہیں ہم مٹ نہیں سکتے حسین۔ ہم فنا نہیں ہوں گے۔ دوبارہ جی اٹھنے کا مطلب فنا ہونا نہیں۔ موت فنا نہیں ہرگز نہیں۔ بالکل نہیں۔“ اس نے حسین کے کندھے کو جھنجھوڑ کر کہا۔

حسین اس کے چہرے کو تکتا رہا۔ جیسے پہلی بار اسے دیکھ رہا ہو۔ بھلا آقائے رازی اس کے سوال کو کیسے سمجھ سکتا تھا۔ وہ کنیزوں اور ریشم کے کپڑوں کی تجارت ایک ہی جذبے سے کرتا تھا مگر اس سر زمین کی محبت جس میں سوائے محبت کے کسی سوال کو دخل نہیں تھا، اس میں کوئی غرض پنہاں نہ تھی وہ یہاں اس لئے آیا تھا کہ اس کی خوشبو سے اپنی جان کے آرام کا سامان کرے۔ اپنے دل کو اس سیر سے شاد کام کرے۔ اس در پر حاضری دے اور اس کو اعتماد تھا کہ اس کی حاضری قبول ہوگی، اس کا طلب صادق تھی اور لامحدود نہ تھی اور اس لئے شرف باریابی اسے مل گیا تھا۔

دونوں روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب ان قدموں میں بیٹھے رہے۔ ایک خلقت اپنی محبت میں مکمل شوق دیدار سے پروانہ دار اس آستان پر حاضر تھی۔ پوری زندگیاں اسی خیال میں غلطاں ایک لگن کہ آخربلاوا آئے گا۔ اپنے بخت رسا پر نازاں جانوں کی تپش سے دلوں کے ارادوں سے قربان ہونے والے۔ خدا نے آسمانوں اور زمینوں میں اس نام کو بلند کیا تھا۔ جہانوں کے رجمتیں بحر و بر پر خشک و تر پر رحمت بن کر آنے والے۔

راتوں کو مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحن شمعوں سے بقیعہ نور بن جاتا۔ لوگ کلام اللہ پڑھتے۔ خوش الحان جوان مدح محمد ثنائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسی رقت سے پڑھتے تھے کہ سینوں میں دل پانی ہوئے جاتے تھے۔ ریت پر حلقہ باندھ کر بیٹھے لوگوں میں آقائے رازی بھی شامل تھا۔ اور صدقہ و خیرات کے لئے الگ رکھے روپے کو خدا حرم میں تقسیم کر کے وہ بھی سننے کی تازگی

ایمان کی حرارت کا باعث تھیں یہ زائر کی جنت نگاہ اور وہ لجن داؤدی فردوس گوش۔

زیارت مقدسہ کے لئے حسین اور آقائے رازی ساتھ چلے تھے۔

”میراجی چاہتا ہے کہ میں ایک ایک ذرے کو آنکھوں میں سرمہ بنا کر لگاؤں۔ میری جان ان راستوں پر قربان میرادل ان جگہوں پر فدا جہاں میرے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قدم دھرے۔“ آقائے رازی نے چلتے ہوئے کہا تھا۔

حسین نے اس کی بات کا کچھ جواب نہیں دیا تھا۔

جبل شیطان پر پہنچ کر آقائے رازی نے کہا: ”یہ وہ جگہ ہے جہاں جنگ احد کی گھڑی شیطان نے چلا کر کہا تھا تمہارے نبی شہید ہو گئے۔“

”شیطان نبیہ نہیں کہا ہوگا وہ تو شہادت میں یقین ہی نہیں رکھتا۔“ حسین نے کہا۔

”مگر میں کیسے کہوں اپنے منہ سے جو بات شیطان نے کہی تھی۔ شیطان جو انسانوں کو گمراہ کرنے والا اور غلط راہوں پر ان کی رہنمائی کرنے والا تھا۔“ آقائے رازی نے کہا۔

”وقت کے کسی گوشے میں شیطان بھی فرشتہ تھا۔ سب سے زیادہ عبادت گزار۔ قریب تر۔“ حسین نے مسجد فتح میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”دنیا میں کتنا امن ہوتا اگر شیطان نہ ہوتا۔“ آقائے رازی نے کہا۔

”آقائے رازی یہ ساری رونق اس کے دم سے ہے۔ اگر گناہ کا تصور نہ ہو تو آدمی کس شے سے بچے۔ شیطان نہ ہو تو ابن آدم فتنوں سے محفوظ کیسے رہے۔“ حسین نے حیرت زدہ آقائے رازی کو بتایا۔

”یہ جب بخشی ہے ابن منصور۔ یہ گمراہی ہے۔ اس سے بچو۔ تمہارے خیالوں سے مجھے سخت حیرت ہوئی ہے۔“

”بھدا آقائے رازی آپ کسی سے پوچھ لیجئے۔ میں نے غلط نہیں کہا۔“ حسین خوش دلی سے ہنسا۔

”ابن منصور۔ میں کسی بات کی وضاحت نہیں چاہتا۔ کسی سے پوچھنا نہیں چاہتا مگر تم کیونکر یہ بات کہتے ہو؟ تم نے نہایت عالموں اور شیوخ کی صحبت اٹھائی ہے۔“ رازی کے ماتھے پر لکیریں گہری ہو گئیں۔

حسین پھر ہنسا۔ ”آقا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ کلام پاک میں جو لکھا ہے وہ اس بات کے سوا نہیں جو میں نے کہی ہے۔ خدا نے آدم کو

بنایا اور ابلیس کو بھیج دیا۔“

”ٹھیک“

”آدم کی پیشانی میں اپنا نور رکھا۔“

”رکھا۔“

”فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے سجدہ کرو۔ سب نے کیا مگر ابلیس نے نہیں کیا۔ وہ راندہ درگاہ ہوا۔ عرش سے نکالا گیا۔ خوار ہوا۔ انسانوں کو گمراہی میں مبتلا کرنے کے لئے وہ بھی دنیا میں وارد ہوا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو کوئی گمراہی میں مبتلا کیونکر ہوتا۔ اور یہ سوز و ساز حیات ہی نہ ہو۔ وہ نہ ہو تو جنت نہ ہو۔ اس کی تڑپ نہ ہو۔ اس کے حصول کے لئے کدو کاوش نہ ہو۔ ایک طرح سے تو وہ محسن ہے۔“

وہ بات ختم کر کے ہنسنا تو رازی کو جیسے ہوش آیا۔

”بغدا۔ حسین بن منصور تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو۔“

”شاید۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شاید۔“

ایک بحر بیکراں اور ایک جوہ بھی ناقابل ذکر۔ رازی نے ٹھیک کہا تھا وہ حواسوں میں نہیں تھا۔ مگر وہ آب جو اس بحر متلاطم میں مل جانا چاہتا تھا۔ مشکل ناممکن۔ اس کا شمار کہاں تھا۔ مایوسی اور بے چارگی نے اسے اپنے لپیٹ میں لے لیا۔

خلقت خالق تک کیسے پہنچے۔

خالق سے خلق کی ہوئی چیزوں کے خیالوں اور خوابوں کا کیا رشتہ۔

جودل میں دخیل ہوتا ہے وہ موج در موج خیال ہیں۔

موجیں اپنی حدوں میں اسیر۔

اصل کو کہاں جاناں جاسکتا ہے۔

جو حقیقت ہے وہ اصل ہے جدا ہے۔

پروانہ شمع کے گرد پھرتا ہے۔ شب گزاری کے بعد۔

وہ اپنی گردش کا فسانہ کہتا ہے۔

اس فسانے میں سرخوشی ہے

یہ سرخوشی کہ کبھی وہ تکمیل کو پہنچے گا

شعلے کی روشنی حقیقت کا علم ہے

اور گرمی شعلہ وہ اصل ہے

گرمی میں داخل ہونے اور روشنی کو جاننے کے لئے

اصلت کو سمجھنے کے لئے

پروانہ آپنے آپ کو شعلوں میں جھونک دیتا ہے

اور پھر سرخرو ہو کر پلٹ کر وہ اپنی واردات سناتا ہے

پروانہ دید کو شنید پر ترجیح دیتا ہے

اور خبر دیتا ہے کہ شعلوں کے درمیان اس نے کیسے گزارا

جو دید کی منزل پر پہنچا وہ شنید سے بے پروا ہو گیا

عشق میں تبدیل ہوا

اور دید کی منزل سے مشاہدے کی طرف گیا

مگر وہ جو جلیوں کے اسیر ہیں

اور گناہ میں ملبوس ہیں

میری طرح کبھی خوش بختی تک نہیں پہنچیں گے!

”تم صبح و مساں قدموں میں ناصیہ فرسا ہو کیا چاہتے ہو۔“ آقائے رازی نے اس سے پوچھا۔ ”تم نوافل میں لگے رہتے۔ کیا

شمار تمہاری ان عبادات کا۔“

”ایک ہزار یا اس سے زیادہ نوافل۔“ حسین نے کہا۔

”ایک قصہ سنو گے۔“ آقائے رازی نے اس کو گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ ایک واقعہ ہے جو مجھے شاہراہ خطا پر

پیش آیا۔“

حسین نے سر جھکا دیا۔

”دشت لوط سے پرلی طرف پہاڑوں کے سلسلے دور تک چلے گئے ہیں۔ وہاں آزاد قبائل آباد ہیں۔ انہوں نے اسلام قبول تو کر لیا

ہے مگر اپنے شعائر اور طرز زندگی اور طرز احساس میں وہی ہیں۔ وہ لوگ عورتوں کی آزاد روی کے قائل ہیں۔ درحقیقت وہاں خواتین کی حکومت ہے۔ وہ بڑے بڑے فیصلے کرتی ہیں اور زندگی کے نازک ترین مسائل بھی ان کے فیصلہ پر ہوتے ہیں۔ میں ان علاقوں میں اعلیٰ درجے کی اون اور موتیوں کے لئے جاتا ہوں۔ سردی شدید نہیں ہوتی مگر اچانک برف پڑنے لگتی ہے اور آمد و رفت کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔ یہاں آنے سے ایک سال پہلے میں ان چراگا ہوں کی جنت میں گیا تھا۔ دور تک، حد نظر تک گھاس کا بیکراں سمندر اور جب ہوا چلتی تو ہبزے کی لہریں ایک دوسرے کے عقب میں موج بحر کی طرح چڑھتیں۔ ہمارا پڑاؤ کچھ دن وہاں رہا۔ پاس کی بستیوں سے دوزیاں کم ضرورت کی چیزیں فروخت کرنے آتیں تھیں۔

ایک دن میں چشمے پر وضو کر رہا تھا کہ دولڑکیاں وہاں آ کر بیٹھ گئیں۔ میں اوٹ میں تھا اور وہ روشنی میں تھیں۔ بیلوں اور درختوں اور پھولوں کی جھاڑیوں سے میرے بیٹھے کی جگہ ان سے پوشیدہ رہی ہوگی۔

”یہ قافلہ دو ایک دن میں یہاں سے کوچ کر جائے گا۔“ وہ بہت اداس تھی۔

”سلطان آغا! تم نے تو خوب سکے جمع کر لئے ہوں گے۔ اس کیوں ہو۔“ ایک سنے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ چھوٹے چھوٹے پتھر کنارے سے اٹھا کر چشمے میں پھینک رہی تھی۔ پتھر ”گم“ کی نہایت مختصر آواز سے پانی کہ تہہ میں بیٹھ جاتا۔

”نہیں ترخان آغا! یہ بات نہیں۔ رقم تو جمع نہیں ہو سکی۔ اس میں سے نصف میں نے رستم کو دے دی ہے۔ اس نے کارواں والوں سے ایک ریشمی چادر خریدی ہے۔“ اس نے سر جھکا لیا۔

”اس لئے اداس ہو کہ اب گھر والے حساب کریں گے۔“ ترخان آنے نے کہا۔

”سنو۔ دوست پر خرچ کیا ہے تو خوف کیسا۔ اور نصف تو تم نے بچا لیا ہے۔ میں یوں نہ سوچتی سلطانہ آغا۔ دوست پر سب کچھ لگا کر کے بھی کوئی گھائے میں نہیں رہتا اور حساب کرنے والا کبھی دوست کو خوش نہیں کر پاتا۔ اب خوش ہو جاؤ کہ چاہے تم اس کو کچھ بتا سکو گی مگر جی میں سمجھتی ہوں نا۔ تم نے وہ سب کھو نہیں دیا۔“

دونوں کھلکھلا کر ہنسیں اور چشمے میں انہوں نے جھک کر اپنے سراپے دیکھے۔ بالوں کو سنوارا۔ پانی سے انہیں برابر کیا۔ دودھ والے مشکیزے اٹھائے اور پھر اچانک ترخان آغا کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس نے زور سے چیخ ماری اور بھاگ گئی۔

”آقائے رازی میرے پاس دوست پر لٹانے کے لئے کوئی شے نہیں۔“ حسین نے نہایت درد سے کہا۔

رازی بہت پر اسرار ہنسی ہنسا۔ ”کچھ نہیں۔ اتنے تہی دست بھی نہیں ہو اور نوافل کا شمار رکھتے ہو۔“

حسین نے خراباکی کی طرح خروش کیا۔ درودھنا اور کہا: ”واللہ تم صحیح کہتے ہو۔ بخدا تم ٹھیک کہتے ہو۔“

اسے وہ فہم کیوں نصیب نہ تھا۔ وہ نظر جو سلطان آغا کو ملی تھی اسے کیوں نہ مل سکتی تھی۔ دوست کے لئے نوافل کا شمار کیسا۔ وہ ایک دائرے میں اس وقت تک بھاگتا رہا تھا جس کے اندر تو داخل ہوا جاسکتا تھا مگر باہر نکلنے کی راہیں بند تھیں، مسدود۔ اس کی شرویدہ جان یہ ذرا اسے اسرار سمجھ نہ سکی تھی۔ اسے آج تک اپنے آپ پر ناز رہا تھا۔ وہ اپنے راستے خود چننا اور خود ان پر چلتا تھا۔ واپس مقدور خود بنانا آیا تھا۔ وہ اپنا آپ اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا تھا۔

یہ گزاری ہوئی ساری زندگی کی تھکن تھی جس نے اچانک اس گھڑی اسے آلیا تھا۔ بھلا وہ کیا کرتا رہا تھا۔ اس کے پاؤ زخمی تھے اور روح زخمی تھی۔ اس کو اپنی ہمت پر جو ناز تھا بھتی ہوئی دھوپ کے دھارے تلے گزرے مدہوشی کے دن سب اذیتیں جو اس نے نادانی میں اپنی جان پر روا رکھی تھیں اسے پابجولاں قیدی کی طرح اپنے عقب میں گھسیٹے پھرا تھا۔

یہاں ہر طرف امان تھا، نور تھا اور لوگ حلقہ بنا کر مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحن میں بیٹھ کر تلاوت کرتے تھے۔ پلٹرت جلائی گئی۔ شمعوں کی روشنی میں خروش میں وغوغا کے بناؤ کرو فکر کی محفلیں سجاتے تھے۔ وہ اتنا کم فہم تھا کہ یہاں آ کر بھی اپنے نعروں سے الامان الحذر میں مصروف تھا۔ ایک چھوٹی سی بے بضاعت چڑیا کی طرح جو شام کی خاموشی اور تاروں بھری نیلا ہٹ تلے لوگوں کے آرام میں خلل انداز ہوتی ہے اور اپنے ہونے کا احساس دلانے کے لئے چیختی ہوئی آسمان کی پہنائیوں کے بوجھ سے دبی گنبدوں اور میناروں پر سے پرواز کرتی رہتی تھی۔

ان کے قدموں میں بیٹھ کر ان دیواروں کو چھو کر اس فضا میں سانس لے کر اس نے بے پناہ دولت کی حامل زمین پر اگر امن نہ پایا سکون حاصل نہ ہوا تو کہیں نہیں ملے گا۔ ہو سکتا ہے وہ مدعا کہے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا سنیں اور اس دنیا میں اس کی شفاعت کریں۔ وہ اپنی مراد کو پہنچے۔

ریاض الجنہ اور منبر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عربی کے درمیان لوگ اسے دیکھتے۔ وہ بنا ہلے بنا پلکیں جھپکائے بنا کوئی سوال کئے وہاں حاضر تھا۔ احمد مرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوں۔ رسول خدا میں حاضر ہوں۔ آپ پر ان گنت درود و سلام ہوں میں حاضر ہوں۔ میں حاضر ہوں۔ میری جان آپ پر قربان میں حاضر ہوں۔

اس کی عجیب شان تھی کہ کسی کو اسے وہاں سے ہٹانے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ اسے کھانا لا کر دیا جاتا تو وہ ایک ٹکیہ چاروں کونوں سے تھوڑا تھوڑا اتر لیتا اور دو گھونٹ پانی پی کر باقی لوٹا دیتا۔

ایک روشن چراغ نادیدہ روشنی سے روشن ہوا۔ اس کی روشنی سارے چراغوں سے بڑھ کر تھی۔ ماہ منور اپنے اپنے گرد ہالہ کئے باقی روشنیوں میں نازک تر اور روشن تر۔ خدا نے اسے امی کہا۔ عرش پر وہ اس کا مشتاق تھا اور باقی سب ان ایوانوں سے باہر تھے۔ وہ محبوب تھا بے سارے علوم اور سارے سراں ایک ہستی میں تھے جو آئینہ تھا اور اس کے روبرو تھا اور مشتاق دید اپنا جلوہ دکھا تھا۔ وہ اس سے ہم کلام ہوا تو اپن سے ہم کلام ہوا۔ اس کا سوال عین کے عین کا تھا!

اپنی دیوانگی میں وہ بھی ان کے در پر گدا تھا سوالی تھا۔ مگر اس کے سوال بڑے تھے۔ وہ اس رخ روشن کا دیدار کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح مشتاق تھا۔ اس کو اپنی حدود میں لوٹنا چاہئے۔ حدود کیا تھیں۔

اے نور دیدہ دل جلوہ فگن ہو

اے ماہ منور اپنی ضیا سے میری تاریک زندگی کو منور کر دے

مجھے اس ماہ تمام کی تمنا ہے دوستو

تمہارے سامنے یہ روضہ مبارک ہے جس کی خوشبو مہک رہی ہے

ان پر درود اور سلام پڑھو۔

لوگ روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد پروانہ بن رہے تھے۔ خوف اور رقت سے دل بھرے ہوئے دماغ سے ہوش و حواس اڑے ہوئے برہنہ سرور و کردعائیں مانگتے تھے۔ خشوع و خضوع سے الحاح و زاری سے اپنا درد دل کہتے تھے۔

حسین بن منصور کا سوال دوسرا تھا۔

کبھی عالم رویا میں اس فقیر درخوبی و محبوبی کو دیدار نصیب نہ ہوا تھا۔

رونے والوں کو دیکھتا کہ جیسے کثافت دھل گئی ہو پر سکون ہو جاتے۔ اس کی بے چین جان کو قرار کیونکر ہو؟ یہ جگہ جہاں سید الاولین و الاخرین، امام مرسلین، رسول رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف رکھتے ہوں وہاں مایوسی اور پریشانی کو سکینہ القلب میں بدل جانا چاہئے بارگاہیں جہاں ملائکہ محمد و ثنائے عرش جہاں جبریل امیں کا آنا جانا تھا اور عرش پر تخت پر جلوہ فگن وہ۔ روشنیوں کی روشنی حسین الجھ جاتا۔

تیز آتشیں ہواؤں میں اس کا وجود جلنے لگتا جیسے زیر میں میں آگ اگلے ہوئے ذخائر پھٹ گئے ہوں اور حسین اسے بال و پر ہی عطا نہیں ہوئے تھے۔ ایک ہی وجود کو قائم رہنا چاہئے۔ وہ اپنے آپ کا کیا کرے۔ اس کی رسائی نہیں۔ اسے طاقت

گویائی نہں۔ اسے یارائے تکلم نہں۔

اے انس و آفاق کے خدائے لم یزل!

اسے دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ ان وادیوں نے، ان پہاڑوں نے، اس سرزمین نے وہ عالی مرتبہ بار اٹھائے تھے کہ وہ عرش سے بھی بڑھ گئی تھی۔ وہ لرزاں ترساں گریہ کنناں شہنشاہ جن کے لئے کلام اللہ نے احترام کیا۔ وہ دونوں اب حضور کے قدموں میں محو استراحت تھے جن کی صداقت پر خدا نے خود گواہی دی تھی۔

حسین روتا مگر اس کا قلب قبض کی حالت میں رہتا۔

وہ اپنے تن کی قید سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ وہ اسے گھلارہا تھا کہ شاید وہ معدوم ہو تو عدم قائم ہو۔

یہ شور و غوغا کرنے کا مقام نہ تھا آہستہ خرام! ارواح ملائے اعلیٰ سے زیارت کے لئے آتیں۔ ایک تانا بندھا رہتا تھا، مگر خروش کی مجال نہ تھی۔

اہل صفہ اس کی طرف دیکھتے اور مسکراتے۔ گویا اس حیرت خانہ امروز و فردا میں اس کی جدت طرازی سے محفوظ ہو رہے ہوں۔

اس کی جرات رندانہ پراس کی عقل ناداں پر اور اس کی بے باکی پر خندہ زن ہوں۔

اہل مدینہ اس خرقہ پوش کو ہاں دیکھنے کے عادی ہو گئے۔ جانے اس کا سوال کیا تھا؟



یہ شعبان کی آخری تاریخیں تھیں۔ بیشتر لوگ عبادت میں مصروف اور رمضان المبارک کی آمد آمد کی وجہ سے نوافل میں لگے ہوئے تھے۔ صحن مسجد تلاوت کرنے والوں اور قرأت کے جلسوں میں مصروف خوش الحان قاریوں اور مختلف النوع دور دراز کے علاقوں سے آئے معلموں اور حفاظ سے پڑھتی۔ کبوتر دانے پر چونچ نہیں مارتے تھے جیسے افطار کے وقت کے منتظر ہوں۔

بڑھیاں نے حسین کے قریب آ کر پانی کا خمرہ رکھا: ”یہ افطار کے لئے شربت ہے۔“

جواب نہ پر کر آگے بڑھنے کے بجائے وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ ”کیا تم بھی روزے سے ہو..... کیا تم نے نہولنے کی قسم

اٹھا رکھی ہے۔ کیا تم قائم اللیل وصائم الدہر ہو۔“

جب اس نے پھر بھی جواب نہ دیا تو بڑھیا نے کہا: ضد نے اور اپنے ناز نے اسے محروم رکھا۔ تم اس کی راہ پر کیوں چل رہے ہو۔“

حسین نے سرخ انگارہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ استغراق نہیں شرک ہے۔ تم کو ادب سیکھنا لازم ہے۔ جہاں تم ہو جس آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور ہو کیا ان سے آگے جانے کی خواہش کرتے ہو۔ یہ کفر ہے کفر۔“

حسین کو ہوش آ گیا ہو جیسے اس کی قوت گویائی اور شنوائی واپس آ رہی ہو۔ تیز آنندھیاں اس کے خون میں چلنے لگیں۔ وہ تنکے کی طرح ان ہواؤں کے دوش پر اڑا جا رہا تھا۔ گولے اسے اٹھا رہے تھے۔ اپنے دائروں میں گھمار رہے تھے۔ اپنے مرغلوں میں اسے بلند یوں کی طرف لئے لئے جاتے تھے اور نقارے پر چوٹ پڑ رہی تھی۔ عناصر اس سے آمادہ پیکار ہونے والے تھے۔ وہ اسے معوم کر دیں گے۔ گم کر دیں گے۔ وہ جھک گیا کہو ہاپنے آپ کو پکڑ کر رکھ سکے۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو اذن کی صدا کائنات میں نغمہ نورک طرح گونج رہی تھی اور وہ اکیلا تھا۔

بڑھیا کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اس نے شربت کا ایک گھونٹ افطار کی نیت سے پیا۔ ساتوں عرش اس کی نگاہ کے سامنے پرت پرت۔

اور اس کی نگاہ اس سے لے لی گئی تھی اس کو دھویا اور پاک کیا جا رہا تھا تاکہ اسے لوٹائی جاسکے۔

ایوان سجائے جا رہے تھے کسی سپید دل کے استقبال کے لئے۔

جانے وہ کون ہوگا جس کی خاطر دریاں اسے منظور تھیں۔

جنت اور جہنم اور برزخ وہ پھیل کر ہر مقام پر پہنچ رہا تھا اور آستان سے پرے حجابوں کے پار سے سرپردہ اسرار سے صدا آ رہی

تھی:

”بیابا مابہ میخانہ۔“

پھر اس نے اپنی چشم بینا سے دیکھا اور بخدا وہ خواب نہیں تھا کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی طرف محبت سے دیکھ رہے

ہیں۔

اس کی نگاہیں جھکی ہیں مگر اس کی جان کی ساری بے تائیاں اور آتش زدگی اور بے چارگی ایک دم رخصت ہو گئی۔ اسے حکم دیا گیا

نہیں اسے سمجھایا گیا کہ وہ خانہ خدا پر حاضر ہو کر فریضہ حج ادا کرے۔

وہ بادلوں والی شمات میں بدل گئی اور گھٹاؤں نے اپنے مشکیزے سارے شیب و فراز پر کھول دیئے۔ وادیاں اور پہاڑ دھوئے

گئے۔ باغوں پر بار رحمت برسا۔ مدینہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چاروں دروازوں سے پانی ندیوں کی صورت بہہ نکلا۔ حسین کی

جان دھل گئی اور اس کا پیسا سا جسم سیراب ہوا۔ اس کا رواں رواں سجدہ شوق میں مشغول ہوا۔ وہ مسکراہٹ وہ نظر کرم وہ کب اس کا

سزاوار تھا۔

شعبان کی میکدہ بدوش راتیں سفر کے لئے نہایت موزوں تھیں۔ وہ پھر قافلہ شوق میں ایک مسافر تھا جس کے پاس زادراہ کے نام پر تقریباً کچھ نہیں اور سواری کے لئے ایک عربی گھوڑا تھا۔ ایسا ہی جسے دو حرقہ سے واپسی پر بغداد جاتے ہوئے خلیفہ کے دربار میں حاضری کے لئے اس کے باپ نے اسے خرید کر دیا تھا۔ دنیاوی جاہ کے نام پر اس کی تہی دستی قابل گرفت تھی کیونکہ جس قافلے میں اسے شامل ہونا تھا وہ متمول لوگوں پر مشتمل تھا۔ کثرت سے سامان تجارت اونٹوں پر لدا تھا۔ خوبصورت محملوں میں جوان عورتیں تھیں جن کے محملوں پر وہ چاندی سے مزین کپڑوں کے قے بنے ہوئے تھے۔ دو اونٹوں پر مضبوطی سے ایک ہی چبوترہ سا بنادیا جاتا اور تیز گام نا قائیں اپنے حسین بوجھ سنبھالے ہوئے گام زن ہوتیں۔ پانی کا بوجھ اٹھائے ہوئے کنیزوں اور غلاموں کی سواریوں خورو نوش کا سامان، غرضیکہ ایک متحرک جہان تھا جو بارگاہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خانہ خدا کی طرف رواں ہوا تھا۔ شمعیں جلائی جاتیں اور مصروف عبادت لوگ کلام پاک کی تلاوت کرتے ہوئے قاری دل و جان کی ساری مستانہ آرزوؤں سے زیارت کے لئے جانے والوں کی دعائیں، درود و سلام پڑھنے کی آوازیں، سجدہ ریز پیشانیاں گریہ کنناں دیدہ بے خواب معاصی پر منغلل روحمیں معاف کر دیئے جانے کی امیدیں نفس بے تاب اور شرمندہ شرمندہ قلب نیم پارہ سوز و ساز سے پر نغمہ شوق جاری و ساری۔

شعلہ مستعل کی سی حسین کی جوانی کو عبادات نے ایک عجیب ضیاء بخش دی تھی۔ پیشانی پر اس کے نصیب کی روشنی اور آنکھوں میں سکون اور ٹھنڈک کی کیفیت نے اسے لگوپ کیلئے باعث برکت وجود بنا دیا تھا۔ اس کی مقناطیسیات کچھ یوں تھی کہ لوگ اس کی طرف کھینچے چلے آتے۔ ایں ہم آں ہم کا سرور اس کے رگ وریشے میں آرام جاں بن گیا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے تیغ کی ساری تیزی اور چمک اس کی دھار میں ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ بھی تیغ تیز ہے۔

کیا اس پر پھر دیوانگی کا دورہ پڑنے والا تھا۔ اس جان کنی کی حالت میں اترنے سے پہلے اس نے چاندنی میں ضربشاں ذروں میں ہوا میں اپنے آپ کو ملتے پایا اور اپنے آپ کو بکھرنے سے بچانے کے لئے اس نے مدینہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف چہرہ کیا اور اپنی مناجاتوں میں انہیں پکارا۔

اور اس کا تنفس اس کے مالک کا تنفس ہے اور خود مالک ہے اور اپنی زیارت کو جا رہا ہے وہ تو نہیں ہے سب طرف اسی کا جلوہ ہے۔ ہو ہو ہو وہ ہو ہے ہو وہ ہے۔

جب کارواں مکہ معظمہ پہنچا تو قافلہ نجوم اپنا آدھا سفر طے کر چکا تھا اور دب اکبر کے ساتوں تارے جن کی سیدھ میں قطب آسمان

ہے بھٹکے ہوئے تھے جیسے ناقہ شب اپنا گھٹنا ٹیک کر گردن کو جھکولے دے کر پشت کو خم کر کے پاؤں پھیلا کر بیٹھنا چاہتی ہو اور انہیں گلیوں میں وہ دیوانہ وار اپنے غرور سے زخمی پھرا کرتا تھا۔ یہیں وہ اذن باریابی چاہتا تھا اور لوٹا یا گیا تھا۔

اور وہ حرم کعبہ میں داخل ہوا۔ امن کے شہر سلامتی کے قریے میں جہاں خلیل اللہ نے دعا مانگی تھی اور ان کی دعا کو شرف باریابی بخشا گیا تھا۔ جہاں ہبل ولات و منات نے آباد ہونے کی کوشش کی تھی اور نکالے گئے تھے۔ اونچے اور خشک پہاڑوں سے گھرا یہ خدا کا گھر نشیب میں پیالہ نما وادی کی تہہ میں جس کے گرد پروانہ وار شمار ہونے والوں کا حلقہ ہر دم گنگینے کے گرد خاتم کی طرح ہوتا۔ اس کی جاں نے بھی احرام باندھا اور مصروف طواف ہوئی۔

پہلے اس نے داخلی طواف کیا پھر مقام کریم نماز پڑھی اور پھر ملتزم کے پاس خانہ کعبہ کا پردہ پکڑ کر دعا کی اور یہ دعا کیا تھی۔ اب جبکہ وہ حاضر کیا گیا تھا۔ اجازت دیا گیا تھا وہ کیا دعا کرے؟

اس کو باریابی اجازت ملی تھی مگر اس کا سوال وہی تھا۔

اسے سوال کو دہرانے کی جرات نہ تھی۔

وہ کھڑا رہا۔ کھڑا پردہ پکڑے سے اسے پردوں کو اٹھانے کی اجازت طلب کرنا تھی۔ وہ اسی جگہ تھا جہاں کہ وہ تھا۔

اے میرے خدا کوئی اشارہ کوئی نشانی۔ ایک حرف محرمانہ۔

خلقت جو اس سے دریا کی موجوں کی طرح آ کر ٹکراتی اور طواف میں مصروف حجر اسود کو بوسہ دینے میں سبقت لے جانے کے لئے بھاگتی تھی ایک ریلے نے اس کے قدم بھی اکھاڑ دیئے۔ وہ اس موج کے ساتھ بہتا ہوا قبۂ زمزم کے پاس کھڑا تھا۔

اس آب حیات آب رحمت آب زمزم کے صدقے میں مجھے وہ دے جو میری طلب ہے۔

لوگوں کو اس نے دیکھا خوش تھے۔ سیراب ہو کر صفا اور مروہ کے درمیان بھاگ رہے تھے۔ سعی کے بعد سر کے بال ترشوار ہے

تھے۔ پھر احرام کھول کر خدا کا شکر ادا کر رہے تھے جس نے انہیں اس دعوت ابراہیمی سننے والوں میں داخل فرمایا تھا۔

ہوش آیا تو وہ باب سدہ کے باہر کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کعبہ بیت الحرام عروس و لقریب ہے۔ اس کا لباس عنبرین دماغ کو معطر

کر رہا تھا اور پر تو جمال نے چشم یقین کو منور کر دیا تھا۔ کیا بال آخرا اس کے اندر کوئی تنویر حیا م در آئی ہے۔

رقصاں درویشوں کے حل آے سے قریب وہ ستون سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور خلقت کا اثر دھام اس سے دعا کا طالب ہو رہا

تھا۔ چھوٹی چھوٹی آرزوئیں ذرا ذرا سی الجھنیں بگڑے ہوئے مقدروں کے لئے کوئی صراط مستقیم، تولید نصیب کو سنورنے کے لئے شانہ

اسم اعظم۔ دنیا میں سب کچھ پانے کے لئے حرف راز، دولت اور جاہ و چشم کو جای راہوں پر چلنے کے لئے کوئی آسرا۔ عشق مجازی میں کامیابی کے لئے تعویذ، دور جانے والے مسافروں کو واپسی کیلئے کوئی زود اثر مناجات۔ وہ دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ لوگ دیوانے ہیں کیا چند روزہ زندگی کے لئے کتنے پریشان ہیں۔ اگر انہیں معلوم ہو سکے کہ یہ سب جس کی طلب انہیں بے قرار رکھتی ہے کچھ نہیں تو وہ ناکامی اور دہشت سے مر جائیں۔ اگر انہیں یہ خبر ہو کہ طلب صادق کیا ہے تو وہ ان بے راہوں کے جنگل میں جو آرزوؤں کی آبیاری سے جوان ہوتا ہے کبھی بھی دلچسپی نہ لیں۔ رویزیہ کی جھلک کے لئے اپنی جانوں کو گھٹائیں۔ وہ بھلا کیوں کمتر امیدوں سے دل کو بے سکون کریں۔

کنیزوں کے ایک گروہ نے اسے گھیر لیا۔ ان کے دل اپنے وطنوں کی جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ وہ چاہتی تھیں دعا کی جائے انہیں رہائی نصیب ہو۔ وہ خوابوں میں دیکھی گئی ان سرزمینوں کو واپس جاسکیں جہاں ان کے لئے اور کچھ نہ ہو تو خوشبو تو ہوگی اس خاک کی جس نے انہیں جنم دیا تھا۔

وہ سر جھکائے نقش لکھ رہا تھا۔ اس کا مرید خاص جو تستر کا زر گر تھا باری باری اس کے کان میں نام بتا دیتا۔ عجیب بوجھل سی فضا تھی۔ حرم کعبہ سے درود و سلام کی آوازیں آرہی تھیں مگر اس کی جان ہلکان ہوئی جاتی تھی۔ ناامیدی اور مایوسی، قلب میں وہی ٹھہراؤ، وہی کیفیت جو مدہوشی اور بد مستی کے وقت سے پہلے اس پر طاری ہوتی تھی۔ سینے میں خالی پن جس میں تیز گولے اٹھ رہے تھے۔ طوفان کی زد پر آیا ہوا اس کا وجود۔ جب اغول کا نام لیا گیا تو اس کے ہاتھ سے قلم گر گیا۔ وہ ساری جان سے کانپا، جیسے سخت سردی سے بخار چڑھنے کی کیفیت ہو اور پھر ایک دم موت کی زردی اس کے چہرے پر کھنڈ گئی۔ اسے لگا ایک زمانہ اسے یہاں ٹھہرے ہوئے ہو گیا ہے اور پلکیں ایک دوسری سے چپک گئی ہیں۔ وہ کبھی آنکھیں کھول نہیں سکے گا۔ اغول کی طرف دیکھنے کی ساری کوشش کے باوجود وہ نگاہ نہیں اٹھا سکا۔

”شیخ بزرگ!“ مرید نے بات جاری رکھی۔ ”خاتون اغول کا سوال دوسرا ہے۔ وہ نصیحتیں جانا چاہتی ہے جہاں وہ اپنی زندگی عبادت و ریاضت میں بسر کرنا چاہتی ہے۔“

پھر جواب نہ پا کر اس نے جھک کر شیخ کو دیکھا اور کیف کی اس حالت کو سمجھ کر اس نے اغول سے کہا کہ پھر کسی وقت آئے۔

”بھیڑ میں گم ہونے سے پہلے وہ لوٹ آئی اور زرگر سے پوچھا:

”کیا ان کا نام حسین ہے۔“

”ہاں۔ کیا تم انہیں جانتی ہو۔ پہلے انہیں دیکھا ہے۔“ زرگر نے پوچھا۔

وہ حسین کی صورت کو کتنی رہی پھر مڑ کر اس نے نقاب اپنے چہرے پر گرا لیا اور زرگر سے کہا۔

”انہیں کہنا اغول کے لئے دعا ضرور کریں۔“

”اچھا۔“ زرگر مرید نے حسین بن منصور حلاج کے تلوے ملنے شروع کی شاید انہیں ہوش آ جائے۔

اس عورت کی محبت نے جس کا نام اغول تھا، حسین کو پھر اپنے میں مشغول کر لیا۔ اس جاگی ہوئی روح، تشنہ جان، سوختہ قلب، درد آزو سے بے تاب دل کے ساتھ اسے صرف اغول کی آرزو تھی۔ یہ عجیب بازگشت تھی۔ اس کی عبادتیں اس کے مجاہدے خدا کے لئے اس کی بے چینی اس کا صبر و قرار اس کی دیوانگی سب ایک دم رخصت ہو گئے تھے۔ ساری فضا میں اغول کی خوشبو پھیلی تھی۔ اس کے گرد ایک دائرہ تھا جس میں ایک ہی ہوا بار بار چلتی اور ٹھہر جاتی تھی اور اغول کو پکارا کرتی تھی۔ اس کا جسم اپنی مدتوں کو ترسی ہوئی سوکھی رگوں میں ایک سیال کو تیز چلتا محسوس کرتا تھا۔ اغول کے نام پر یہ روانی بڑھ جاتی۔ کہیں اندر آتش فشاں پھٹ رہے تھے۔ لاوانس نس میں بہتا جاتا تھا اور سنسناہٹ جو فتنہ انگیز لگتی تھی اس کے آس پاس گنگناہٹ کا وجود ندی کے تیز دھارے میں بہتا ہوا وہ خود..... وہ اتنا شدید کیوں تھا..... اور یہی دن تھے جب اسے اپنے آپ میں سے اغول کی خوشبو آنے لگی تھی۔ دل میں گھنٹیاں سی بج اٹھتیں اور ایک نام سنائی دیتا۔

میرے دل کے لئے غم..... اے غم اے خوشی اے سرخوشی

میرے دل میں عشق کی آگ فروزاں ہے

میرے جگر میں سیاہ راتوں کا پورا چاند ڈوب گیا ہے

اے مشک، اے ماہ تمام

اے ریت کے ٹیلوں کی جھاڑیو

جھاڑیاں کتنی سرسبز ہیں۔ ماہ تمام کتنا روشن ہے۔ خوشبو کتنی میٹھی ہے

وہ دہن شیریں جس کی مجھے آرزو ہے

اس کا اٹھا ہوا نقاب میرے دل کے ٹکڑے کر دیتا

اس لئے اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا

وہ افق پر طلوع ہوتا ہوا آفتاب صبح ہے

وہ ریتلے ٹیلوں کی جھاڑی ہے جس کو مرغزاروں میں لگایا گیا ہو

اگر بلیس نے آدم کے چہرے میں اس کی ضیاء دیکھ لی ہوتی تو وہ کبھی سجدے سے انکار نہ کرتا

مجھ پر تعجب نہ کرو دوستو کہ میں ان غزالیں آنکھوں کا اسیر ہوں

جب قمریوں کو کراہتے سنتا ہوں

تو اس محبوبہ جانفز کی یاد میں میری زندگی تلخ ہو جاتی ہے

اور میں موت کو گلے لگا لیتا ہوں

حسین کے ذہن میں ایک نام گونجتا۔ وہ دیوانہ وار مکہ معظمہ کی گلیوں کی بھیڑ میں جھانکتا۔ ایک ایک حسین چہرے کو تکتا اسے کہیں

قرار نہ تھا۔ وہ نام اس کے خون میں گھل گیا تھا۔ اب اسے پہلی بار اغول ملنا یاد آتا۔ چاندنی رات اور حوض کا کنارہ اور اس کا اپنے کتے

کے بالوں میں منہ دے کر ہولے ہولے رونا بے یقینی کی وہ زندگی مستقبل کے اندھیرے میں کود جانے کی سی کیفیت اور معلوم انجام۔

اس کا مطالبہ ایک ہی تھا کہ ”مجھے بھلا نہ سکو۔ مجھے یاد رکھو۔ میرے لئے دعا کرو۔“ ان دنوں اسے شدت آرزو کا معلوم نہ تھا۔ یہ محبت کا

قلعہ جس میں اب وہ قید تھا اتنے برسوں میں تعمیر ہوا تھا۔ کیا ہوتا اگر وہ اغول سے کہہ سکتا کہ وہ اسے چاہتا ہے! اس نے پکار پکار کر

ہواؤں سے کہا تھا کہ اسے اغول سے عشق تھا۔ اس نے رات کے اندھیروں میں سجدوں میں نماز میں عبادات میں ہر جگہ ہر گھڑی

اسے بھلایا نہیں تھا۔ وہ اسے ملھانے پر قادر نہیں تھا۔ اسے اپنی عبادات نے کوئی قدرت اپنے پر عطا نہ کی تھی۔ اسے اپنے پر کوئی

تصرف نہ تھا۔ وہ ت ایک ناکارہ نوجوان تھا جس کی زندگی نے ایک مسلسل خواب دیکھا تھا مگر اس خواب کی تعبیر اس کی حرماں نصیبی تھی۔

اس کا جاگا ہوا وجود اس کی اذیت کا باعث تھا۔

زرگر مرید جس کا نام توفیق تھا پریشان ہو گیا۔ اب حسین بن منصور حلاج میں کوئی روح درآئی تھی۔ کوئی سایہ اس کے سر پر تھا۔ وہ

اپنے طور پر تعین کرنے کی کوشش کرتا اور الجھ جاتا۔ کنیزوں کے جانے کے بعد اس مرد بزرگ کی اس شیخ صائم کی یہ حالت ہوئی تھی وہ

کس سے اظہار کرے۔ اپنے خدشات کا اپنے خوف کا۔ بھلا وہ اغول کون تھی۔ وہ شیخ کو کیونکر جانتی تھی۔ اس نے کیوں کہا تھا کہ اس

کے لئے دعا کی جائے اور پھر وہ بعد میں کبھی نہیں آئی۔ اسے دعا کی ضرورت تو تھی۔

شیخ پر ستر میں بھی ایسی قبض کی حالتیں ہوتیں مگر وہ ستر تھا اور سہل بن عبد اللہ کا ہیبت و جلال ہر درد کی دوا تھا۔ وہ کس سے کہے کہ

حسین بن منصور کے لئے دعا کرے اور اس نے سوچا بہتر یہی ہے کہ وہ خود حسین سے اس سلسلے میں گفتگو کرے۔ درد کا مداوا بولنے اور کہنے اور اندر کا غبار نکالنے سے ہی ہو سکتا ہو شاید۔ کوئی راز داں۔

حسین کے چہرے پر التهاب ذات کا پرتو ہوتا اور جسم پر تشج کی کیفیت۔ عناصر سے بنے ہوئے اس کے وجود پر آتش شوق کی لپٹیں نکلکھیں مگر توفیق کس سے بات کرتا۔ حسین جو پہلے ہی کم گو تھا اب بالکل خاموش رہتا۔ اندر کے خروش کی کیفیتیں ان آنکھوں سے عیاں ہوتیں جو بیٹھڑ میں ہر چہرے کو تکتیں اور کبھی کبھار کنیزوں کے جھرمٹ کے عقب میں حسین چلتا رہتا کیا وہ سچ مچ دیوانہ ہو گیا تھا۔

پتہ نہیں وہ کسے ڈھونڈتا تھا۔

بابرکت رمضان المبارک کی راتوں میں جب حرم کا صحن ذکر و فکر کی محفلوں سے آباد ہوتا اور ہر ہر امام اپنے مقلدوں کے ساتھ عبادت میں مصروف ہوتا تو حسین نواجی پہاڑوں اور وادیوں کی طرف نکل جاتا۔ پھر اس کے دل کا درد اس کے نالوں میں ڈھلتا اور اس کی آواز آتش تو مغنی کی سی دلنوازی سے کون و مکاں کی حدود کو پار کرتی اور اس حریم ناز کے باہری ایوانوں میں دستک دینی لگتی تھی۔ زرگر توفیق پر بھی عجیب بے خودی طاری ہوئی جاتی۔ وہ سائے کی طرح اس مجذوب کا اس سالک کا اس نداف کا پیچھا کرتا جو ہجوم سے بیزار تھا اور چہروں کے میلے میں کسی کی تلاش میں تھا۔ جو پہاڑوں سے کہتا تھا:

”تم مجھ پر اسے آشکار کرو۔ وہ کہاں گئی۔“

کہکشاں ایک تندوری کے دھارے کی طرح اس رات آسمان کی پہنائیوں میں ستاروں کے غبار کو لینے زمین پر آ بشار بن کر گر رہی تھی اور حسین کے عقب میں ایک سائے کی طرح توفیق زرگر اس پہاڑ کے دامن میں کھڑا تھا جہاں رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا عبادت گزار اور شب بیداری کے لئے اکثر تشریف لاتے تھے اور غار میں متمکن ہوتے تھے۔ جب ایک بیک حسین نے مڑ کر توفیق سے کہا:

”میں اپنی عروس کی تلاش میں جا رہا ہوں۔ تم یہیں میرا انتظار کرو۔“

اور توفیق ابھی اپنے حواس جمع کر کے ان لفظوں کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا جب اس نے حسین کو ہوا میں تحلیل ہوتے دیکھا اور پھر گھوڑے کی ٹاپوں کی صدا وادیوں میں گونجنے لگی۔ ہولے ہولے وہ گونج بھی دور ہوتی گئی اور توفیق کے آئینے میں اغول کا سراپا ابھرا جیسے ہوا پر کوئی اپنے ہاتھ سے مرقعے بنا رہا ہو۔ صورتیں ہی صورتیں۔ قافلہ اور پانی کے حوض اور چاندنی کے بحر مہیب میں زرد

بالوں والی اغول اور حملہ کرتے ہوئے سیاہ صورتوں والے وجود اور ایک حملہ آور کے گھوڑے پر لدی بے ہوش اغول۔ توفیق کو لگا اس کا سر رنگا صورتوں اور واقعات سے بھرا ہوا ایک پٹارا ہے اور یکے بعد دیگرے حالات اور واقعات اس میں سے نکل رہے ہیں۔ وہ صورتوں سے گھرا تھا۔

اس نے دیکھا بازار پر رونق اور معصوم ہیں اور سوداگر کنیزوں کو فروخت کرنے کے لئے لارہے ہیں۔ اغول کو بھی لایا گیا۔ وہ زرد چہرے اور دراز زلفوں والی کنیز شرم سے سر جھکائے پاؤں کے انگوٹھے سے اپنے سامنے کی زمین کرید رہی ہے۔ وہ نظر اوپر اٹھا کر دیکھتی ہی نہیں تھی۔ کون اسے خریدتا ہے۔ اس واقعہ سے اسے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بغداد کے امراء ایک ٹولی کنیزوں کی خریداری کے لئے آئی تھی اور ایک زنگی سردار نے اس کے مایوس سراپے میں اس کے بے آس شہرے میں اس کے مکمل حسن کو جو چمکتے لباس کو بھی ماند کر رہا تھا دیکھا۔ وہ رکا رہا کہ وہ کنیز اوپر دیکھے مگر اغول اسی طرح زمین کی طرف تکتی رہی یہاں تک سوداگر دوسرے لوگوں کے ساتھ ادھر آیا۔ اس گستاخ کنیز کو ڈانٹا اور زنگی سردار سے اس کی قیمت کے متعلق بات کرنے لگا۔

وہ بغداد میں تھی جو اس کا مقدر تھا۔ وہ کتنے الجھے راستوں سے اپنے مقدر تک پہنچی تھی۔

زنگی سردار کی منظور نظر لونڈیوں میں سے اغول بھی تھی جس کے خواب التائی کی ان سرزمینوں کے تھے جہاں نسطوری پادریوں نے چراگا ہوں اور گھاس کے میدانوں، جھیلوں اور خوبصورت وادیوں میں ان کی تربیت کی تھی۔ وہ جذبہ شہادت سے سرشار تھیں اور بکنا ان کے لئے دل آزاری کا باعث نہ تھا۔ اغول حسین کو بھول نہ سکتی تھی۔ وہ عجیب سا نوجوان جس کی نگاہوں نے حسن کو نہیں دیکھا تھا خوبصورتی اور تکمیل پر غور نہیں کیا تھا۔ وہ دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا تھا مگر وہ بے پناہ آنکھیں رکھتا تھا۔

زنگی سردار جب حج کا فریضہ ادا کرنے حرم کعبہ کی طرف آیا تو وہ بھی ہمراہ تھی۔ اپنا دین بھول چکی تھی کیونکہ اس کا مالک اسے لونڈی نہیں سمجھتا تھا۔ وہ سب سے بہت التفات سے پیش آتا۔ اس کے خدشات دور ہو گئے تو پہلی بار اس کے جی کی گرہیں کھلیں..... کیا ہو کبھی حسین سے ملاقات ہو جائے! ناممکن کا ممکن بھی تھا۔

ان بانگوں اور رونقوں کے درمیان اسے وہ یاد آتا۔ رقص کی محفلوں میں دعوتوں اور گہما گہمی میں وہ اسے بھلا نہ سکتی تھی۔ پتہ نہیں کئی صورتیں ایسی کیوں ہوتی ہیں کہ تم ان سے اپنا دامن چھڑا نہ سکو۔ وہ پہلا نوجوان نہیں تھا جس کو اس نے دیکھا تھا۔ اس کے قبیلے کے نوجوان سچیلے، گھڑسوار، جنگجو سپاہی، بلند وبالا چیتے کی پھرتی سے گھات سے نکل کر دشمن پر حملہ کرنے اور ہر وقت مسلح رہنے والے ہوتے۔

دو شیرائیں ان کے دل میں محبت کے نغمے گانے کا شوق تو پیدا کریں مگر زندگی میں وہی سب کچھ نہ ہو سکتیں۔ دودھ دوہتے، کوس بناتے، ریوڑوں کی رکھوالی کرتے ہوئے اناج کاٹتے بولتے، دودھ کے ذخیروں کی حفاظت خشک گوشت کو محفوظ کرنے کے طریقوں کو آزما تے ہوئے وہ اپنی مصروفیت میں خیمہ گاہوں کے باہر انہیں دیکھتیں کہ تیار ہیں اور گرداڑا تے ہوئے شعلہ کی سی تیزی سے دشمن کے تعاقب میں جا رہے ہیں۔ ہنستے گاتے ہوئے شکار کی تلاش میں جاتے وہ سنجیدگی سے محبتوں کے لئے کبھی پریشان نہ ہوتے۔ قبیلے کی لڑکیاں ان کی جائیداد تھیں اور ان کا مسئلہ نہ تھیں۔

پھر ننگے پاؤں سردیوں اور گرمیوں میں وہ کوہ صحرا پر سفر کرنے والے پادریوں نے نسطوری طریق عبادت سکھایا اور شہادتوں اور کڑی آزمائشوں کے پر اسرار پیمانے، مسلمان لوگوں کا مقابلہ کرنے کے لئے طریقے اور قربانیاں دینے کا بے پناہ حوصلہ ان میں پیدا کیا۔ بغداد اور مغرب کے تمام ممالک میں سلطنتوں کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کے لئے انہوں نے سازشوں کے جال پھیلا دیئے۔ یہ نصرانی راہبات جن کے لئے زندگی محض خدا کی عبادت اور اس کی راہ میں قربان ہو جانے تک محدود ہوتی..... اور عشق کے نغموں کو صرف اس کے لئے گاتیں جو قربانی دے کر صلیب پر آویزاں ہو کر خدا کا بے بدل پیغمبر اور بعد میں اپنی قربانی کی مناسبت سے ان کا خدا بن گیا تھا۔ وہ تین خداؤں کی پرستش کرتے تھے۔ خدا کا بیٹا روح القدس اور خدا کا باپ۔

پتہ نہیں اغول کو راہ چلتے چلتے ٹھوکر کیسے لگی تھی۔ وہ حسین میں کیا دیکھ کر اس کی محبت میں گرفتار ہوئی۔ ایک لمحے نے انہیں جدا بھی کر دیا۔ فراق کے التہاب نے اسے رنج اور سرخوشی دونوں جذبے دیئے تھے۔ محبت کی اعلیٰ وارفع منزل کے لئے پیدا ہوئی تھی۔ اس وجود کا وہ کیا کرے جو قربانی کے جذبے اور منزل کے درمیان کہیں سے آ موجود ہوا تھا۔

اس کے سراپے میں آتشیں شعلوں کی لپٹیں ساگئی تھیں۔ وقت نے اس زخم کو مندمل نہ ہونے کے قابل بنادیا تھا۔ اس کے دل میں ایک ہی نام بار بار لپکتا۔ پھر وہ بغداد کے بازار میں نیلام ہوئی اور نصیبین پہنچنے کی جگہ ایک عمائد سلطنت کی کنیز بن کر سرفراز ہوئی۔ اس نے اپنے بڑے بچے کا نام اپنے جی میں حسین رکھا تھا کیونکہ پکارے تو وہ اسی نام سے جاتے تھے جس نام کو مالک پسند فرماتا۔ ہوا اور فضا اور ستاروں تلے رات کا آسمان ہر شے اسے اس کی یاد دلاتے۔ وہ کبھی مکمل طور پر اسے بھلا نہ سکی۔ اپنے دل سے اس کا خیال علیحدہ نہ کر سکی۔ وہ چھوٹا سا نام گونج کی طرح اس کے اندر بند ہو گیا تھا اور خالی مکان میں ایک بار دہرائے جانے والے لفظ کو جس طرح ہوا میں اور دیواریں اور چھتیں بار بار واپس لاتی ہیں اس کا نام بھی اغول کے اندر سنائی دیتا رہتا۔

گھٹن اور بے چارگی سے گھبرا کر اس نے اپنے ساتھ کی ایک کنیز و شاد سے جو جھیل بیکال کے علاقے سے جتہ مغلوں کے قبیلے اور

معمولی سی جھڑپ میں گم ہوئی تھی اور یہاں آن پہنچی تھی اپنا حال دل کہا۔

”اغول۔ تمہارے لئے ایک ہی راستہ ہے، اسے بھلا دو۔ تم اسے یاد کہاں ہوگی۔ ایک لمحے کے لئے تو تم ملے تھے۔“

”اگر میں اسے بھلا سکتی۔“ اغول نے کہا۔ ”دیکو۔ کسی قسمت کا حال بتانے والے سے دریافت کریں گے۔ کسی بزرگ سے دعا کروائیں گے۔“ دلشاد نے کہا۔

بغداد میں اس کے باوجود کہ عورتوں کو آزادی تھی اغول نے کبھی محل سرا سے باہر قدم نہیں دھرا۔ ناامید ہو کر وہ اس کی یاد کو بھلانا چاہتی تھی۔

دلشاد نے کہا: ”یہ بیماری ہے اغول ورنہ عشق تو دیکھنے بھالنے کی کیفیت ہے۔“

اغول بہت دیر خاموش رہی پھر نہایت رازداری سے اس نے کہا: ”وہ عمیق ترین خلوتوں میں ہوتا ہے بحر محیط کی طرح اس کا وجود میرا احاطہ کئے ہوئے۔“

”یہ تو گناہ ہے اغول۔“ دلشاد نے نہایت دل سوزی سے کہا۔ ”یہ تو آقا سے بے وفائی ہے۔ تم اس کی مرتکب کی طرح سے ہوتی ہو۔“

اغول نے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔

”دلشاد! تم میری دوست ہو۔ بتاؤ میں کیا کروں۔“ وہ بہت پریشان تھی۔

اسی لئے جب ان کا آقا مکہ معظمہ کی طرف بغرض حج روانہ ہوا تو وہ دونوں دوسرے خدوم و حشم کے ہمراہ تھیں۔

حسین کو پہچان کر اغول کو انتہائی صدمہ ہوا۔ نوجوان جو اس کی یاد میں زندہ تھا اور تھا بالکل دوسرا اور یہ جلال و ہیبت سے ستون کے ساتھ ٹیک لگائے آدمی بالکل دوسرا تھا۔ اسے اپنے پر حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا وہ شاید غلطی پر ہو مگر حسین ک بے ہوشی کے بعد وہ گم صم واپس خیمے میں پہنچ کر بالکل تباہ شدہ کشتی کی طرح جس کے بادبان پھٹ گئے ہوں، مستول ٹوٹ گئے ہوں اور چرچراتے تختوں کے سوراخوں میں سے پانی اندر آ گیا ہو۔ وہ بس ڈوب گئی پانی کی لیروں اور موجیں اس پر سے گزر گئیں۔ گزرتی چلی گئیں۔

دلشاد نے کہا: ”اغول ہو سکتا ہے تم غلطی پر ہو اور وہ بزرگ حسین نہ ہو۔“

”نہیں۔“ اغول نے سر کو دائیں بائیں پھیرتے ہوئے نہایت مایوسی سے کہا۔ ”میں ان بے پناہ آنکھوں کو کبھی نہیں بھول سکتی۔

دیئے کی لو کی طرح جلتی ہوئی اس کی پیشانی۔ یہ وہی تھا، وہی تھا یقیناً۔

دلشاد نے اس کی مایوسی کو محسوس کرتے ہوئے کہا: ”اغول کبھی کبھار عورت کا دل عجیب و غریب دیوانگی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ تم تو اس حسین کا سوچا کرو جس کو تم نے چاہا تھا۔“

قطعی ناامیدی سے جو بے حوصلگی پیدا ہوتی ہے، اغول کا دل اس کے شکنجے میں تھا خونیں ہنگام۔ وہ سخت بیمار ہو گئی۔ ایک حدت سے تپتا ہوا اس کا وجود روشنی چادروں اور ایرانی قالینوں اور شاندار خیموں کے بوجھ کو برداشت نہیں کر پاتا تھا۔ وہ بند آنکھوں پر ہاتھ دھرے موت کی راہ دیکھتی۔ اسے اپنے بچے پر باندیوں پر اور کنیزوں پر سخت غصہ آتا۔ کاش وہ نصیبین جاسکے۔ اکیلی ہو۔ اس کے لئے یہ دنیا کا اختتام تھا۔

دلشاد نے خیمے کے پردے کو اٹھایا تو اندھیرے میں اسے روشنی کا ایک ہالہ سا نظر آیا۔
اغول بستر پر ہی سجدے میں پڑی تھی۔

دلشاد نے اس کا کندھا چھوا تو وہ بخار کی حدت کہیں نہیں تھی۔ خوف سے اس نے اسے تقریباً ہلا ڈالا۔

اغول نے سراٹھایا تو اس کا چہرہ چمک رہا تھا جیسے وہ سکون اور طمانیت سے ہوا اور بیماری نے کبھی اسے گھیرا ہی نہ ہو۔

”مجھے مبارک باد کہو دلشاد۔ میں نے وہ پایا ہے جو کسی نے نہیں پایا۔“ وہ کھڑی ہو گئی اور سرمستی میں ناچنے لگی۔

”اغول تم ایک گھڑی پہنچ تک تو بیمار تھیں۔ اب کیا ہوا ہے۔ میں کس شے کی مبارک کہوں۔“ دلشاد حیران تھی اور اس کا خیال تھا گرمی نے اس کے ذہن پر اثر کیا ہے۔

جیسے بہت راز کی بات ہو۔ اغول نے کہا: ”تمہیں پتہ ہے نا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ پیدا ہوں گے اور وہ دنیا پر حکومت کریں گے۔“

”مگر ان سے تمہاری سرمستی کا کیا تعلق۔ مبارک کا کیا تعلق؟“ میں نے انہیں دیکھا ہے۔ خدا پاک مجھ پر کتنا مہربان ہے۔
دلشاد میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میں نے کیا دیکھا ہے۔“ اغول سر جھکائے جھوم رہی تھی۔

”جب دماغ میں حدت ہو اور خیالوں کا جھوم ہو تو خیال اور تمہارا حد سے بڑھا ہوا احساس محبت صورتوں کو تمہارے سامنے لاکھڑا کرتا ہے۔ تمہیں ہر طرف حسین نظر آنے لگا ہے۔ کوئی خاکی وجود جو عناصر سے بنا ہے خیموں کے حصار میں نہیں آ سکتا۔ پہرے دار سپاہی اور غلاموں کی ایک فوج آقا کے ساتھ ہے۔ اغول تم نے جو دیکھا ہے اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ لوگ تمہاری بات پر یقین نہیں کریں گے۔ ہمارے قبیلے میں جب کوئی عورت بہت بیمار ہو تو ہوا میں صورتیں دیکھتی ہے تو اس پر دعائیں پڑھی جاتی ہیں۔ تمہارے لئے بھی

آقا سے کہہ کر کسی حافظ قرآن کو بلایا جانا چاہئے۔“

”مگر تم کیوں ایسا کرو گی دلشاد میں نے جو دیکھا ہے اس کھلی آنکھ سے دیکھا ہے البتہ ابن مریم کی شکل حسین میں ملتی ہوئی تھی۔“
اغول نے بات ختم کی۔

دلشاد نے کہا: ”مت بولو اغول دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور یہ بالکل تمہارے خیالوں کے ہیولے ہیں۔“

اس نے اغول کے لمبے زرد اور سنہری مائل بالوں پر ہاتھ پھیرا اور انہیں تھپکا۔ یہ عجیب رنگ کے بال تھے کہ ان دراز زلفوں کی کہیں مثال نہ تھی اور خود اس چپ چاپ رہنے والی تقریباً اداس اور خاموش کنیز کو اس نے بہت کم ہنسنے دیکھا تھا۔ ان سب کو اپنے اپنے عقائد کے مطابق عبادت کرنے کی آزادی تھی۔ صرف بچوں کی تربیت آقا کے اپنے مذہب پر کی جاتی تھی اور انہیں ماؤں سے دور رکھا جاتا تھا۔ اغول کو اپنے بچے سے جس کا نام وہ حسین پکارتی تھی نہایت شدید لگاؤ تھا۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں اور بہت چھ جانتی ہوئی نگاہ۔ وہ کھلکھلا کر ہنستا تو اغول کے چہرے سے سائے ایک لمحے کے لئے دور ہو جاتے مگر پھر وہ سوچتی ہوئی اپنے خیمے میں پہروں فضا میں دیکھتی رہتی۔ زندگی کی سب راہوں پر اندھیرا تھا اور ان سر زمینوں کے صرف خواب دیکھے جاسکتے تھے۔ یہ فراق تھا مکمل، یہ جدائی تھی ابدی، یہ خواب تھے بیکراں، یہ زندگیاں تھیں بے کنار اں اور حیات محرمی کی طرح ان پر رواں تھی مگر آواز کی مرکز کی محبت اور یاد دل کے کسی گوشے میں موجود رہتی نکالے نہ نکلتی، پر چھائیں اور سائے ہیولے اور صورتیں اور خیال پورش کرنے والے انیم کے جاسوسوں کی طرح موجود رہتے اور موقع بہ موقع خدشات اور خواب بن کر ظاہر ہوتے۔ دلشاد نے باہر جھانکا۔ خیموں کے اس شہر سے پرے اذان کی آواز بر رحمت کی طرح پرواز میں تھی۔

”رب کعبہ خدا قدوس۔ اغول کو اپنی پناہ میں رکھنا۔ اسے دیوانہ ہونے سے بچائے رکھنا۔“

مگر جو میری آنکھوں نے دیکھا کیا وہ دھوکا تھا۔

جو روشنی کا ہالہ میں نے دیکھا کیا وہ دیوانگی نہ تھی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے چالیس ہزار فرشتوں کے ساتھ اترے ہیں تو وہ صرف اغول کے لئے آئے ہیں۔

اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کی ہتھیلیوں سے ملا۔ میں تو دیوانہ نہیں ہوں۔ یقیناً نہیں بالکل نہیں۔

وہ خانہ خدا کی زیارت کرتے طواف کرتے حجر اسود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اغول اور حسین کے خیال سے رہائی نہ پاسکتی۔
رمی کرتے ہوئے وہ لوگوں کو قرآن کریم پڑھتے اور قادر یوں کو تلاوت سنتی۔ لوگ حلقہ بنا کر ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر طواف کر رہے

تھے۔ درد مند اشعار سے جانیں سینوں میں تڑپتیں۔ آنسو جاری ہو جاتے۔ پردوں کو پکڑ کر حطیم میں سجدہ ریز ہو کر مقام ابراہیم پر ناصیہ فرسائی کر کے ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہوئے دل میں گز گزاتے ہوئے اسے محسوس ہوتا کہ خدا کا گھر پھیل گیا ہے دیواریں پھیل گئی ہیں اور سب لوگ حلقے میں ہیں۔ ساری کائنات عرش اور ستارے اور زمین اور اس کے خزانے وہ خود اس گھر کے مرکز میں ہے۔ نکتے کی طرح۔ یہ تجربہ جس کو نام نہیں دیا جاسکتا، بیان نہیں کیا جاسکتا، لفظوں سے ماورا، رمضان المبارک شب بیداریاں، زندہ دارِ جہوم عاشقاں اور وہ کیا تھی جس کو یہ تجربے کرائے جارہے تھے یہ خواب دیئے گئے تھے وہ اغول سے نہیں کہہ سکتی کیونکہ وہ اسے سمجھ نہیں پائے گی۔ یہ اس کے خون میں نہیں تھا۔ حب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہیں۔ کیا وہ دیوانہ ہوئے جارہی تھی۔ اس رحمتوں اور محبتوں کے مرکز میں اس کی رسوائی نہ ہو۔

قبرِ زمزم کی دیوار کے پاس چبوترے پر جو حجرِ اسود کے سامنے ہے، حسین کے ہمراہ ایک جماعت تھی اور وہ اشعار پڑھتے اور وجد میں آ کر رقص کر رہے تھے۔ ان کی عبا عین اور حرکت کی وجہ سے پھیل رہی تھیں۔

عشق ایک مزرعِ گلاب ہے

اس کی پگڈنڈیاں ان کے لئے ہیں

جو عاشقوں کے قہے سے تعلق رکھتے ہیں

ذرا پرے ایک عجیبی بڑے ذوق و شوق سے اشعار پڑھ رہا تھا اور اس کی آواز کبھی بلند اور کبھی پست کبھی نہایت سوز میں ڈوبی اور آہ کرب ناک سے بے قار کرنے والی تھی، کبھی وہ بالکل خاموش ہو جاتا، جیسے سینے میں دل کو سنبھال رہا ہو۔ کبھی وہ دلوں کو تڑپانے والے لحن سے شعر پڑھتا اور تکرار سے ایک ہی بیت کے کلمے کو دہراتا یہاں تک کہ آنسوؤں سے اس کا گلہ بند ہو جاتا تھا۔ حسن کلام اور سوز و گداز نے رقصاں درویشوں کے وجد میں اضافہ کیا۔

اگرچہ میرے افعال بدلنے دور کر دیا ہے۔

مگر تمہارے ساتھ میرا حسن ظنِ قرب کا باعث ہے۔

اس کی تکرار کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ رقصاں درویشوں نے تھم ک چبوترے کے اس حصے کی طرف دیکھا جہاں وہ تھا، مگر اب

اس کا پتہ نہ تھا۔ شاید نیچے گر گیا تھا اور بے حس و حرکت پڑا تھا۔

لوگ حیران کھڑے تھے کہ ایک عجیبی عورت آئی۔ اس نے زمزم اس کے منہ پر چھڑکا۔ تب درویشوں میں سے ایک دو نے آگے

بڑھ کر اسے اٹھایا۔ اس نے ہوش میں آتے ہی اپنا منہ چھپا لیا اور اٹھ کر باب بنی شیبہ کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد حسین کو جیسے ہوش آیا وہ اپنے حلقہ مریداں کو چھوڑ کر اس کے پیچھے بھاگا۔

یہ مجاہدات و ریاضات میں عجیب منہمک آدمی استقامت اور کرامت کے لحاظ سے بے نظیر جس کی آواز سوائے دلوں کو جگا سکتی تھی جس کی تڑپ بارگاہ خداوندی کے نگرے ہلا کر رکھ دیتی تھی۔ حسین کے مرید حیران تھے اور خود حسین کا کہیں پتہ نہ تھا۔

ولشاد کو اس کے بعد حرم کعبہ میں ستون سے ٹیک لگائے ہوئے شہر مکہ میں دروازوں کے باہر اور اندر اس بھیڑ میں حسین دکھائی نہیں

دیا۔

جبل قنیس پر لوگ ہلال کو دیکھ کر آپس میں مبارک باد دیتے معاف کرتے تھے۔ چراغ جلائے جاتے کثرت سے روشنی کی جاتی اور مخلوق کی زبان پر صدائے لبیک کہتی ہیبت خداوندی سے دل گھٹکتے تھے اور آنکھ سے آنسو بہتے تھے۔ مقام کریم اور ملتزم اور حطیم کی پر شور روئیں غلاف کعبہ کو پکڑ کر گریہ و زاری کرتے ہوئے لوگ 'خانہ کعبہ کو طواف کے وقت شوق سے لپٹتے ہوئے جیسے بچے ماں کو لپیٹتے ہیں' پردوں کو گرم جوشی سے کھینچتے ہوئے 'نماز پڑھنے میں سرخوشی سے سجدوں میں الحاح و زاری کرتے ہوئے اخلاص سے دعائیں یوں ادا کرتے کہ سننے والوں کے دل سینے میں پانی ہوئے جاتے۔

وہ اس مجمعے میں کھویا ہوا کھڑا تھا اور بے لفظوں کی دعا کر رہا تھا۔ "ان دلوں کا درد مجھے نصیب ہو۔ یہ گریہ و زاری مجھے عطا ہو۔"

رفیق زرگر اس کے برابر میں کھڑا تھا اور اسے یاد آ رہا تھا کہ صحرا میں تستر سے روانہ ہونے کے بعد جب بھیڑ کو پانی کی کمی نے جاں بلب کر دیا تھا تو حسین نے ہاتھ زمین پر مار کر پانی کا چشمہ جاری کر دیا تھا۔ وہ سب سیراب ہوئے تھے۔ ان کے اونٹ اور گھوڑے اور بار برادری کے جانور انہوں نے مشکیزوں میں پانی بھر لیا تھا اور کپڑے دھوئے تھے۔ یہی شیخ کامل پھر نظر سے گم ہو گیا تھا۔ وہ تلاش عروس میں اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا اغول ہاں اس کنیز کا نام اغول تھا مگر یہ گدڑی پوش جس کو اب اپنی خبر نہ تھی جس کے بال بڑھے ہوئے تھے اور خرقہ میں کی وجہ سے دیکھنے والے کو بوجھل معلوم ہوتا تھا جانے کہاں سے وارد ہوئے تھا۔ یہ وقت اس نے کہاں گزارا تھا۔ رمضان المعظم خوشیوں کا مہینہ۔ شوال اور ذی قعد پھر رحمتوں اور برکتوں کا ماہ حج جیسے کرنیں غلیظ بادلوں میں سے کہیں کہیں سے جھانکتی ہیں۔ ان مہینوں کی یاد حسین بن منصور حلاج کے ذہن میں بھی یادوں کو جلا بخشتی۔ وہ مکہ کی گلیوں میں مارا مارا پھرا تھا۔ اس نے سراپردوں سے پوشیدہ خیموں اور درپجوں کے اندر جھانکا تھا۔ محفلوں میں گستاخانہ گھسا تھا اور دھتکارا گیا تھا۔ کئی جگہ وہ جھگڑے کا سبب بنا تھا۔ اس نے لمبی مسافتیں طے کی تھیں لوگ اسے بے نوا سمجھ کر خیرات دیتے تھے۔ اسے دیوانہ سمجھ کر اس سے

ہمدردی کرتے رہے تھے۔ اس کے بے خواب سراپے کو دیکھ کر ابلی ہوئی پچکی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر اسے اپنے سے دور کرتے رہے تھے۔

کبھی اغول کا سراپا ہوا میں اس پر اترتا۔ خاموش اداس کتے کے بالوں میں منہ دے کر اپنے نالوں کو بند کرتی ہوئی نسطوری راہبہ اور وہ اس کی آتش شوق کو بڑھانے کی خاطر اس کی طرف بڑھتا مگر قرب شعلہ بن کر اسے جلا دیتا تو وہ راہبہ بن کر ہوا میں اڑا جاتا۔ پھر جمع کیا جاتا پھر جلا یا اور اڑا یا جاتا۔ اغول غمناک مسکراہٹ اس کے تعاقب میں رہتی۔ ان دنوں وہ بتا بگڑتا، پھیلتا سمٹا ایک آتشیں ہیولا تھا۔ مگر اس نے تو سجدے سے انکار نہیں کیا تھا؟ وہ تو سراپا سجدہ شوق تھا۔ پھر وہ راندہ درگاہ کیوں تھا؟

عزازیل کے متعلق کئی خیال ہیں

وہ عرش پر انسان کو حادثے کی اطلاع دینے والا ہے

اور زمین اور آسمانوں میں

اس نے فرشتوں کو اچھے اور برے پر آگاہ کیا

اور زمین میں انسان کو گناہ پر اطلاع دی

خیر کا مقابل شر ہے اور شر کاٹنے والا خیر ہے

حاکم اعلیٰ خیر و شر کا خالق ہے

خیر پر ٹھہرنے والے خیر ہوتے ہیں

اور جو شر پر خیر نہیں رکھتے اور جو شر کو جاننے سے انکار کرتے ہیں

خیر کو کیسے پہچان سکیں گے

وہ غار ثور کے سامنے جبل ثور کھڑا تھا اور ہوا میں آندھیوں اور کبوتروں اور تار عنکبوت کی آویزش سے ایک شہد آگیں سرور تھا۔ لوگ دعا اور نوافل کے لئے اندر جا کر اپنی بار کے منتظر تھے۔

عجی نے اس کے پاس آ کر کہا: ”جو گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں جو نااہل ہیں وہ اندر داخل نہیں ہو سکتے۔“

”میرے لئے دعا تو کی جاسکتی ہے۔“ حسین نے کہا۔ ”تمہیں تو خدا نے لُحْنِ دَاوُدِی عطا کیا ہے۔ تمہاری آواز نے مجھے دیوانہ کر

دیا تھا۔“

”لحن داؤدی۔“ عجی ہنسا ”یہ تو دل پر شوق تھا۔“

”دل پر شوق۔“ حسین نے حیرت سے کہا۔ ”کیا دل پر شوق پرواز اور حد ادراک سے پرے لے جاتا ہے۔“

”سفر شرط ہے کبھی منزل بہ منزل کبھی منزلوں سے ماورا حد ادراک سے پرے پلک جھپکتے میں جذب صادق ہو تو۔“ پھر کچھ دیر چپ رہ کر اس نے کہا: ”شعبہ بازیات تمہاری راہ میں حائل ہیں۔ اغول پر مثل بن کر اترنے میں تمہارا کیا مقصد تھا۔ وہ تمہاری منزل نہیں تھی۔

اور نہ ہو سکتی تھی۔“

حسین عجی کی طرف دیکھتا رہا، دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہاں نہ جبل ثور تھا نہ باری کا انتظار کرتے سق سے دیوانے لوگ تھے۔ صرف طلب کے صحرا میں وہ اکیلا تھا۔ خجالت سے اس کے حلق میں کانٹے چھ رہے تھے اور اس کی پیاسی روح کو آب زمزم کی طرف پلٹنا تھا جس کی تعریف میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا:

”اللہ تعالیٰ اس کے تشنہ کاموں کو اس سے سیراب کرے۔ اس کے پینے سے رنج و تعب زائل ہو جاتا ہے۔ فرحت پیدا ہوتی ہے۔“

”ہاں۔“ اس نے اپنے آپ سے وعدہ کیا۔ وہ منیٰ عرفات، مزدلفہ اور میقات میں پرسکون رہے گا۔ اس کے سفر جج کو اگر شرف قبولیت عطا ہو۔ اس راہ میں وہ ابھی طفل مکتب تھا۔ اسے مرشد کی تلاش تھی جو اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ان پر خطر راہوں سے پار اتروا سکے۔ اس کی کشتی ٹوٹی ہوئی تھی اور ساحل مراد دور تھا۔ پتہ نہیں وہ گھڑی گھڑی بھٹک کیوں جاتا تھا۔ یہ کس بددعا کا اثر تھا۔ گنج نامہ کے مطالب اس پر واضح تھے بھی اور نہیں بھی مگر اسے زمانے چاہئیں کہ وہ ان پر عمل پیرا ہو۔ اب اس کا نالہ بے موسم تھا۔ تلاش بسیار کے باوجود اسے یہی پتہ چل سکا تھا کہ وہ ابھی تک کہیں بھی نہیں تھا۔

یہ شہر خوبی و محبوبی یہ شہر قریش شرم ابراہیم خلیل اللہ کا قریہ امان مکہ۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا۔ ان پہاڑوں سے جن پر تجلیاں قربان ہیں۔ ان پناہ گاہوں کو اپنی آغوش میں چھپائے جن پر ساری آزادیاں شمار ہوں۔

محملوں، عماریوں، قبوں سے رنگین زائرین سے معمور دعاؤں سے عبادت فضا میں پکاریں اور گونج۔ پروانوں کو شمع سے جو نسبت ہے وہی لوگوں کو خدا کے گھر سے اپنی جانوں کو دیدار کعبہ کے لئے ہلاکت میں ڈال کر خوشی ہوتے لوگ، اس کی حرمت پر جانیں فدا کرنے کو سعادت سمجھنے والے، حسرتوں اور ارمانوں کو اس کے دیدار سے سیراب کرتے ہوئے عشاق۔ مسافر ان کوئے خواہاں اپنی

تڑپ کے لئے قرار ڈھونڈتے۔ احرام باندھ کر قوموں اور ملکوں اور وطنوں کی شناختوں کو گم کرتے ہوئے ایک ہی جذبے سے سرشار ستاروں سے عرش کی طرح مزین زمین دعا اور ثنا اور خوش الحانی سے قرأت کرتے لوگوں سے گونجتا یہ شہر اور اس میں سنائے میں گم ایک دل حسین بن منصور حلاج کا دل۔ ہاں اسے در کعبہ وا ہواے رب کعبہ مجھ پر آشکار ہو۔ اے تجلی مجھے اپنے میں گم کر۔ ہر میدان میں ہر منزل پر ہر مقام میں لوگ اسے دیکھتے اور محسوس کرتے کہ وہ صرف زائر ہی نہیں سوالی ہے اور پلٹ کر نہیں تڑپ کر نہیں مگر جانے کیسے سوال کرتا ہے کہ لگتا ہے دیواریں شق ہو جائیں گی۔ زلزلے سے زمین ہل جائے گی پلٹ جائے گی اس آتش سوزاں سے جو اس کی آہ نیم کش میں ہے۔ بت کدہ صفات میں غلغلہ الامان کا شور اٹھے گا۔

”کیا تم روضہ رسول کی زیارت سے شاد کام نہیں ہوئے۔“ اس کے برابر کھڑے ہوئے کسی نے اس سے سوال کیا۔
”یہ سعادت مجھے نصیب ہوئی ہے۔“ حسین نے ہولے سے کہا۔

”اس شدت کو جو تمہارے اندر ہے کیا تم نے تہذیب کے دائرے میں لانا نہیں سیکھا۔ اس آقائے سبل ختم المرسل مولائے کل سے تم نے کچھ نہیں سیکھا۔“ آواز سرزنش کرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی افسوس زدہ۔
حسین نے مڑ کر دیکھنا چاہا مگر اس کی گردن اس طرف پھیری نہ جاسکی۔

”نرمی اور عاجزی سیکھو۔ ہوا کی طرح جو ہر مقام پر بار پا سکتی ہے مگر جس کا اپنا کوئی وجود نہیں کوئی تقاضا نہیں۔“
”میں کس سے مخاطب ہوں۔“ حسین نے حرم کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”کوئی بھی کوئی بھی..... اس سے غرض نہ رکھو۔“
”مجھے معلوم ہونا چاہئے۔“ حسین نے ضد سے سوال کیا۔

”سب کیوں جان لینا چاہتے ہو۔ یہ امانت ہے بہت بڑا بوجھ اس کو اٹھانہ سکو گے۔“
”میری طاقت آزمادیکھو۔“ حسین کے اندر پھر کسی غرور نے زہریلے ناگ کی طرح پھنکار کر کہا۔
ہنی کی آواز سنائی دی۔ دبی دبی تمسخر اڑتی ہوئی رگوں میں تلخی بن کر اترتی ہوئی جان کو نہایت مضطرب کرتی ہوئی۔
”اغول کے عشق سے رہا ہو گئے ہو کیا۔“ سوال کیا گیا۔
”اغول کون اغول۔“ اس نے حیران ہو کر پوچھا۔

”بڑھو آگے بڑھو مگر احتیاط شرط ہے یہ مت سوچو کہ صرف تم ہی طلب صادق کے داعی ہو۔ بساط سے بڑھ کر مت مانگو۔ توفیق سے زیادہ مت چاہو۔ اپنی حدوں میں رہو۔“ آواز سنائے میں گم ہو گئی۔

حسین کے گرد خلقت کا اثر دھام تھا جو اس سے ٹکراتا اور پلٹتا تھا۔

وہ بارگاہ سے باہر ٹھہرا رہا۔ بلاوے کا منتظر طلب کے جانے کے لئے جاں فرش راہ کئے دل کو سجدہ ریز کئے اجتماع دعاؤں میں اس نے شرکت کی۔ یہ خیر و برکت کا مجمع تھا جو اپنی طب کے لئے حاضر تھا۔ لیک کہتا ہوا اتنے انکسار سے عاجزی سے انسان اپنی عبودیت کا اقرار کر رہے تھے اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتباع کر رہے تھے جو سب سے مکمل عہد تھے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کے لئے یہ ساری بساط بچھائی گئی تھی وہ جو وجہ کائنات تھے۔ حیات انسانی کے کاروان سالار۔

چاہنے والے ماننے والوں عقیدت مندوں سوال کرنے والوں دعا کے طالبوں کی ایک بڑی بھیڑ حسین کے جلو میں تھی۔ جب وہ حج کے بعد وارد بغداد ہوا تھا۔ وہ دیکھی بھالی جگہوں زایوں مدرسوں اور خانقاہوں کی اقامت گاہوں میں پھیل گئے۔ انہوں نے اپنا رخت سفر کھولا کچھ دنوں کے لئے متمکن ہو کر وہ اپنا آپ ان مدرسوں اور صوفیاء کی جماعتوں کے درمیان آزمانا چاہتا تھا۔ اس کا حاصل حیات سفر اور حاصل سفر اور حاصل جانکا ہی جو تھا اس نے مدرسہ نظامیہ کی مجلس میں حضرت جنید بغدادی کے سامنے رکھنے کا فیصلہ اپنے جی میں سوچ لیا تھا وہ خدا کا نہایت عاجز کمتر بندہ جب یوں نوازا گیا ہے تو پھر حضرت جنید کو جو شیخ کامل اور استاد زمانہ تھے۔ اس نوازش کی آگاہی ہونا ہی چاہئے اس میں خود نمائی خود فریبی کا کوئی شائبہ نہ تھا۔

اتنے عرصے کے بعد اس کا بغداد میں آنا خود اسے بھی حیران کر گیا۔ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو کسن تھا آتش شوق سے پگھلتا ہوا دل سوختہ جان جس کو بہت سی درگاہوں سے نکال پھینکا گیا تھا جسے عمر بن عثمان مکی نے نہایت خفگی سے بددعا دی تھی۔ اس کے جاننے کے شوق نے اس کی را میں خار پاشی کی تھی۔ وہ صرف جاننا ہی تو چاہتا تھا۔ محرم اسرار ہونا چاہتا تھا اور محرم راز ہونے کی تمنا سے اس کو انہوں نے راندہ درگاہ قرار دیا تھا۔ خانقاہوں اور مدرسوں کی عیب دنیا تھی جہاں جہالت کو نہیں آگاہی کو نشانہ ملامت بنایا گیا تھا۔

اور یہ بھیڑ راہ میں اس کے ساتھ جمع ہو گئی تھی کیونکہ حجاج کے اس قافلے پر قمر مطیوں کا حملہ بہت منظم اور سخت تھا۔ معتمد کے مرنے کے ساتھ ہی قرامطہ نے مختلف نواح میں زور پکڑ لیا۔ ان کے داعی ایسے قافلوں کے ساتھ مل جاتے اور نہایت ہوشیار رہنماؤں کی طرح انہیں نزدیکی راستوں سے منزل کی طرف لے جانے کا دعویٰ کرتے۔ ایسے راستے جو باغوں اور مرغزاروں میں سے ہر کر نکلتے تھے نخلستان سے گزرتے تھے اور چشموں سے آباد ہوتے۔ پھر گھات میں سے نکل کر قمر مطی ان پر حملہ کر دیتے۔ لوٹ لیتے عورتوں اور بچوں تک کو تہ تیغ کر دیتے کیونکہ غلام بنا کر پابہ زنجیر کر کے وہ خود پابند ہو جاتے تھے۔

جب قافلہ پر حسین کی موجودگی میں حملہ ہوا تو رات کا پہلا پہر گزر چکا تھا۔ قافلہ میں سے جو لوگ نوافل پڑھتے اور تہجد گزار تھے وہ نماز میں مشغول ہو گئے باقی کارواں آرام کی غرض سے کمریں کھول کر لیٹ ہی رہا تھا کی عقب سے نہایت خاموشی سے قمر مٹلی نکلے اور لوٹ چلے گئے۔

”کھہرو۔“ حسین بن منصور نے انہیں حکم دیا۔

جس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا اور انہیں ہاتھ ہلانے سے نیچے یا اوپر کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

”یہ افسوس اور ساحری نہیں ہے۔ اگر تم لوگ اب بھی اپنے ارادوں سے باز آ جاؤ تو تمہارے ہاتھوں کی حرکت جو سب کر لی گئی ہے واپس مل سکتی ہے لوٹ آئے گی مگر توبہ صدق دل سے کرو اپنے باطل مذہب سے توبہ کرو تمہارے بازو خود بخود حرکت میں آ جائیں گے۔“

وہ رونے اور زور زور سے توبہ استغفار کرنے لگے۔ یہاں تک کہ ان کی حرکتیں لوٹ آئیں۔ انہوں نے تلواریں نیام میں کیں اور حلاج کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے مذہب سے تائب ہونے کا اعلان کیا اور حجاج میں مل کر بیٹھنے لگے۔ وہ متعجب تھے کہ یوں بھی ہو سکتا ہے۔

پھر انہوں نے اس مرد بزرگ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور توبہ کر کے اس کے عقب میں بغداد آ گئے۔

بازاروں میں شاہراہوں پر خانقاہوں اور مسجدوں میں اس کی کرامت کا چرچا ہو رہا تھا اور وہ نہایت عاجزی سے سر جھکائے مدرسہ نظامیہ کے دالان در سالان صحنوں میں شاندار درس گاہوں کے باہر حضرت جنید کے حضور حاضری کے لئے نہایت انکسار سے بیٹھا رہتا تھا۔ منتظر..... اسے یہ جرات نہیں ہو سکتی تھی کہ اپنی آمد کی اطلاع کروائے اذن باریابی چاہئے۔

میلوں میں پھیلا ہوا یہ مدرسہ مشرق اور مغرب کے علوم کا چشمہ جاری تھا۔ فلسفہ یونانی اور تعلیمات اسلامی دونوں کے شعبے تھے فقیہ فقیر یہاں درس دیتے تھے۔ اس آئینہ خانے میں خام طبعیتوں کے مس کو کندن بنایا جاتا تھا۔ خدا اور انسان کے بارے میں بحث و استفسار کے دروازے کھلتے تھے۔ ذاتی تجربے کے ساتھ اسلامی روایات کو ایک نئی زندگی اور نیا آہنگ عطا ہوا تھا۔

حضرت جنید کے لئے چراغ کی لواؤں کی کئی غلام نے دلیز کے باہر نظر کی توجھ کے وجود کو نہایت پرسکون اور منتظر پایا۔

”حضرت کوئی دلیز کے باہر سوال کرنا چاہتا ہے کیا اسے اذن باریابی دیا جائے۔“

”آؤ حسین آؤ۔“ انہوں نے اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

غلام نے چراغ طاق میں رکھ دیا اور سہارا دے کر اسے اندر لایا۔

”میں کئی دن سے تمہارا منتظر تھا۔ حجاج کے قافلے کو یہاں آئے بہت دن ہو گئے ہیں۔“ حضرت نے استفسار کیا۔

”میں شرمندگی کی وجہ سے حاضر ہونے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔“ حسین نے رک رک کر کہا۔

”یہ بشری کمزوریاں ہیں مگر کاروبار حیات یوں بھی چلتا ہے خیر.....“ انہوں نے بات ختم کی۔

”حضور میں کاروبار حیات چلانا نہیں چاہتا، میرے لئے دعا کیجئے، میرے لئے ”عطا“ ہو۔“ حسین نے نہایت آزر دگی سے کہا۔

تم عام زندگی بسر کیوں نہیں کرتے۔ یہ سب اس کی عطا ہے۔ یہ روشنی اور آتش اور حدت شوق کیا ہے؟“ انہوں نے اس سے

سوال کیا۔

”میرا سوال دوسرا ہے۔ بالکل دوسرا، مختلف سوالوں سے ماورا۔“ حسین نے ہولے ہولے کہا۔

حضرت جنید دیر تک خاموش رہے۔ چراغ کی لو بھڑکی۔ ہوا کے جھونکے نے اسے بچھا دیا۔ ستاروں کی ضیا اس سردرات میں کہیں

سے در آئی۔ کمرے میں دو نفوس تھے ار خدائے بزرگ و برتر انہیں دیکھ رہا تھا۔

”حسین ازلی اور قدیم حادث سے جدا ہے۔ اپنے مانوس بیسروں کو ترک کر دو۔ بھائی بندوں کو چھوڑ دو۔ نامعلوم کو بھلا دو اور ان

سب کی جگہ صرف ذات خداوندی کو یاد رکھو۔ یہ اس کی توحید ہے۔“ حضرت جنید نے بہت محبت سے حلاج کو مخاطب کر کے کہا۔

”کسی مقام پر ازلی اور حادث کا اتصال ممکن نہیں۔“ حسین نے بہت پست آواز میں کہا۔

”ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔“ حضرت جنید نے تیزی سے کہا۔ ”وہ حد ادراک سے ماورا ہے۔ کوئی شے اسے احاطہ نہیں کر سکتی۔ کوئی

صفت اس کے لئے کافی نہیں۔ جب تم اس کی تعریف کرنے پر قادر نہیں ہو تو کس اتصال کی بات کرتے ہو۔“

حسین خلا میں تکتا رہا۔

”تمہیں معلوم ہے خدا ہر جگہ موجود ہے۔ ہر آن ہر ساعت تمہارے ساتھ موجود ہے۔ تمہاری پکار سننا اور پکار کا جواب دیتا ہے۔“

وہ بہت ہی آہستہ بات کر رہے تھے ”تمہیں پکارنا بھی ہے۔“

حسین کے وجود میں یوں حرکت ہوئی جیسے کسی در ماندہ مردہ وجود میں یک لخت زندگی کی رودور جائے۔

”وہ پکارتا ہے۔ میرے لئے یہی کافی ہے۔“

”تو تم پھر بھی موجود رہو گے۔ تم اسے پکارو گے۔ وہ تمہیں پکارے گا۔ اس کی ذات کا کامل ادراک تمہیں اس وقت تک حاصل

نہیں ہو سکتا جب تک تم اپنے آپ کو بالکل غم نہ کر دو۔ اس کے جمال کا مشاہدہ تمہارے اندر حس اور حرکت کر ختم کر دے گا۔“
جنید اسے یوں سمجھا رہے تھے جیسے بچے کو مشکل سوال سمجھاتے ہیں۔

”کیا یہ ممکن نہیں۔“ بہت دیر کے بعد حسین نے جواب دیا ”کہ وہ اور میں ایک ہو جائیں۔ حضرت ایسا ممکن ہو گا خدا اور بندے کی ہستی مل جائیں ایک ہو جائیں۔ کامل اور اک سے بھی آگے بندے اور خدا میں کوئی فرق نہ رہے۔ کوئی فاصلہ نہ رہے۔ ذرا سا بھی۔“

جنید سوچتے رہے اور حسین کی طرف دیکھتے رہے اور جی ہی جی میں کہتے رہے خدا اور انسان کبھی مدغم نہیں ہو سکتا۔ پھر انہوں نے اس کی بے پناہ آنکھوں میں دیکھا..... دیکھتے رہے..... اور آخر کہا:
”دوست سے جو بھی پہنچے اس کا انعام ہو گا۔“ حسین نے متانت سے کہا۔
”تم اپنے ہوش و حواس کو قائم رکھو۔ تمہیں معلوم نہیں اسلام میں حواس کھونے والے کا کوئی مقام نہیں۔ رسول خدا اپنی عبدیت میں خوش تھے۔ تمہارے خیال میں کیا وہ اس مقام سے آگے نہ جاسکتے تھے۔“
جنید اب اس کی شکل کو دیکھ کر خفا ہو رہے تھے۔

”انہوں نے یہ چاہا نہیں ہو گا حضرت شیخ۔ انہوں نے یہ کیوں نہیں چاہا۔ ان کے لئے تو یہ ممکن تھا۔“ حسین نے جوش میں کہا۔
”کوئی مقام رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے مقام سے آگے نہیں ہے۔ کسی کو اس کی تمنا بھی نہیں کرنا چاہئے۔ یہ کفر ہو گا صریحاً۔ حسین تم اپنے حواس میں نہیں ہو بخدا تمہیں شعبدوں نے جو اتفاقاً تمہیں مل گئے ہیں دیوانہ کر دیا ہے۔ کیا قریطیوں کے بازوؤں کی طاقت سب کر لینا اتنا بڑا کارنامہ ہے۔ آغاز اسلام میں لوگ جنگجو میں بشری قوتوں کے ساتھ لڑتے رہے شہید ہوتے رہے۔ کیا ان کو یہ سب قوتیں نہ تھیں۔ کائنات کے نظام کو درہم برہم کر کے اپنا وجود قائم کرنا اپنی ذات کا منوانا کوئی بڑی بات نہیں۔ یہ تماشے ہں۔ تم کہاں بھٹک گئے ہو یہ نا سمجھی کی باتیں ہیں۔“
جنید اب بہت خفا تھے۔

”تمہارے اندر بے پناہ ممکنات ہیں مگر تم آسان راستوں سے سفر کرنا چاہتے ہو۔ کیا تم قریطی ہو۔“
حسین بیٹھے سے اٹھ گیا اور جھک کر اس نے شیخ کبیر کے پاؤں چھوئے اور اٹھے قدموں دہلیز کے باہر آیا جہاں اس کے مریدوں کے ہمراہ ابو یعقوب قطع اس کا انتظار کر رہے تھے۔

اب حجاج کے قافلے کے ساتھ حسین کے آنے کی امید میں منصور بغداد آیا۔ شاید اسے بچے کی یاد کھینچ لائے۔ اس نے سب سے پہلے خانقاہ میں حاضری دی۔ حضرت شیخ الشماخ کے حضور مگر اس کے ساتھ مریدوں کی ایک بھیڑ تھی اور ان کی نرالی شان کو دیکھ کر منصور کے دل پر عجیب ہیبت طاری ہوئی۔ وہ ہرگز خوش نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا سوائے سہل بن عبد اللہ تستری کے حسین نے کہیں بھی دلجمعی سے زانوئے تلمذ طے نہیں کئے تھے۔ اس نے زمیں کی ساری مشقتیں نہیں اٹھائیں۔ بھلا وہ رازدار عرشیاں کیسے بن گیا۔ گر اپنی عادت کے مطابق اس نے سوال نہیں کیا۔ صرف سفر کے حالات ان مریدوں کی زبانی سنتا رہا جو اب بغداد میں یہاں وہاں مقیم تھے اور حسین کے جلو میں نہایت تمکنت اور وقار سے چلتے تھے اور ان کرامات کا ذکر کرتے تھے جو اکثر اس سے سرزد ہوتی تھیں۔ وہ حاجتوں کا روا کرنے والا دعا کرنے والا رازوں کا جاننے والا کہلایا جائے لگا تھا۔ وہ جس طرح کی طرف دیکھتا لیتا اس کا مقدر مل جاتا تھا۔ عورتوں اور کنیزوں اور خواتین کا ہجوم اس کے گرد رہنے لگا تھا۔ محملوں اور عمارتوں میں پیدل اور سوار یوں پر عمر رسیدہ اور جوان دو شیزائیں اور ازدواج، بیمار اور تندرست، مغموم اور خوش شہزادیاں اور گداگر اس کی شہرت دور دور پھیل گئی۔ وہ دلوں کا بھید جان لیتا۔ پوشیدہ چیزوں کے ٹھکانے بتا دیتا۔ لوگ اس کی پرستش کرنے لگے تھے۔

بغداد کی بیشتر آبادی اس کے اتباع کے لئے تیار تھی۔ اس کا اتباع کرتی تھی۔ وہ کبھی اکیلا ہوتا تھا جیسے دنیا سوائی، بھٹکی ہوئی اور بچ کی جو یا ہے کم از کم اپنی ذات تک تو لوگ کسی نہ کسی تلاش میں رہتے تھے۔ لوگ اس سے مستقبل کی خبریں مانگتے جو ان کے مقدر میں تھا اس کی خبر چاہتے تھے۔ انسان کتنا بے چین اور بدحواس اور گم گشتہ ہے۔ اس کا ایمان کتنا کمزور اور اس کی حاجتیں کتنی بے پناہ ہیں۔ خدا نے یہ تماشا گاہ بنائی تو ہے مگر اس کی آبادی کا کوئی سہارا نہیں لگتا۔ بدحواس جاندار ایک دوسرے پر گرے پڑتے ہیں اور طوفان کے بعد کی حالت میں مبتلا ہیں۔

منصور نے اپنے بیٹے کے پر جوش چہرے پر متمناہٹ دیکھی اور اس میں ناامیدی کی لہریں جو بار بار آ کر اس کی پیشانی سے ٹکراتی تھیں۔

”تمہاری حاضری قبول ہوئی کہ نہیں۔“ اس نے حسین سے پوچھا۔

”مجھے قمر مطی کا خطاب مل گیا ہے اور دار کی خوش خبری ملی ہے۔“ اس کی مسکراہٹ میں عجیب مایوسی اور سرخوشی تھی۔

”کیوں آخر کیوں۔“ منصور نے نہایت بے تابی سے پوچھا۔

”یہ روشن ستارے اتنے چمپیدہ ہیں یا بتا دیئے گئے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا۔ جو سوال کرتا ہے راندہ درگاہ قرار پا جاتا ہے۔“

”صبر کرو حسین اور اس دہلیز سے چپے رہو۔“ منصور نے دلاسہ دینے والے باپ کی طرح کہا۔

”عشق ابن اسبیل ہے۔ اس کے ہزاروں مقام ہیں۔ کیا میں اس مقام سے گزر نہیں سکتا جو ایک دہلیز سے لپٹا رہوں گا۔“ حسین نے نہایت بے چارگی سے کہا۔

منصور نے کہا: ”مجھے تمہاری باتیں سمجھ نہیں آتیں مگر عاجزی اور صبر تو کل کے علاوہ اور کیا کر سکو گے۔“

”کچھ بھی۔ کچھ بھی۔ اپنی آزمائش ہی سہی۔“ حسین نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ مریدوں کی مودب بھیڑ اور اشاروں پر چلنے والے رفیقوں نے اسے گھیر لیا اور ان کے جلو میں وہ ستاروں کے جھرمٹ میں مابتاب کی طرح گدڑی میں روشن چہرہ لئے اس شاہرہ پر چل رہا تھا جو مدرسہ نظامیہ سے بازاروں اور رونقوں کو سمیٹتی کنارہ جملہ جانتی تھی۔ منصور کو عتابیں محلہ جانا تھا کیونکہ یہاں ریشم بنتا تھا جو مختلف الالوان اور سوت سے تیار ہوتا تھا۔ ابویعقوب قطع حسین کے ساتھ محلہ کی طرف چلے گئے جہاں خلیفہ منصور کی عالی شان جامع مسجد تھی اور معمور آبادی کی وجہ سے بہت پر رونق تھی۔

منصور کو عتابیہ کی ایک چوڑی گلی میں کارخانے کے باہر وہ ہندی سودا گر مل گیا جو مچی کے وقتوں میں بیضا میں ان کی سرائے میں آ کر ٹھہرا کرتا تھا اور ریشم خریدنے کی بڑی سوجھ بوجھ رکھتا تھا۔ ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے بعد دونوں دجلہ کے کنارے ایک مطبخ میں جہاں مچھلی اور دوسری نعمتیں عمدہ اور ارزاں ملتی تھیں؛ چلے گئے۔ ہندی راستوں اور مشکلوں اور عام بے چینی کا جو سلطنت میں پھیلی تھی ذکر کرتا رہا تھا۔ یہ امن و امان کی حکومت تھی مگر اب اس کے حصے بخرے ہو گئے ہیں؛ اس لے سودا گروں کو جو سہولتیں میسر تھیں وہ نہیں رہیں۔

”یہ دنیا کا دستور ہے ہندی بھائی۔“ منصور نے کہا۔ ”وسیع و عریض سلطنتوں میں ایسے فتنے اٹھائی کرتے ہیں جیسے یہاں وہاں کوئی آگ روشن کرنے کی کوشش کرے۔ گورشا اعظم سے لے کر دیوار پوش تک یہی ہوا ہے۔ تمہارے ہاں حالات مختلف ہوں گے۔“

”ہم سودا گر لوگ سلطنت کے کاموں کو برہمنوں اور اونچی ذات کے حکمرانوں پر چھوڑ دیتے ہیں۔ پھر ہمارے ملک میں یہ نئے نئے مذاہب اور فرقے اور فتنے نہیں ہیں۔ ہم نے اپنے آپ کو اتنی مضطرب دیواروں میں محفوظ کر رکھا ہے کہ کوئی حملہ کوئی عقیدہ ان کو ہلا نہیں سکتا۔“ ہندی نے فخر سے سر بلند کر کے باہر دیکھا جہاں ایک نوجوان کے جلو میں بھیڑ کی بھیڑ چلی آ رہی تھی۔ عقب میں چلتے ہوئے مودب لوگ ایک قدم پیچھے گردنیں جھکائے ہوئے اور درویش اپنی سرشاری میں ہوشیار باخبر بھی اور بے خبر بھی؛ ہجوم کا حصہ بھی

اور اس سے الگ بھی، نا آشنا بھی اور آگاہ بھی۔ عاجزانہ فخر سے زمین پر نہایت انکسار سے قدم رکھتا اور اپنے گرد مجھے کے کیف میں مست بھی اور بے پروا بھی کلمہ طیبہ کا ورد کرتے لوگوں کا ساتھ دیتا بھی اور رکتا بھی جیسے وہ ان لوگوں کو فنا کا درس دے بھی رہا ہو اور حیات و موت کے درمیان کا فاصلے کو انہیں سمجھا بھی رہا ہو اور اسے مٹا بھی رہا ہو۔ ارد گرد کے رنگارنگ نظاروں سے آنکھیں بند کئے بھی اور رونقوں سے جھٹب بھی، ان کی محبت کی گرفتاری سے بیزار بھی اور ان کے لئے کوشاں بھی۔ ہندی اسے دیکھتا رہ گیا۔

”کیا جلال ہے۔“ اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

منصور نے سر جھکا لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ دعا کر رہا تھا کہ حسین کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ خود اس کی نظر سے بھی وہ بچا رہے۔ عجیب بے چین طمانیت نے اس کے جی کو بھر دیا جیسے کوئی آگ ڈھونڈنے جائے اور اسے بادشاہت مل جائے۔

”یہ کون ہو سکتا ہے۔“ ہندی نے منصور کی طرف دیکھا جس کی آنکھوں میں آنسو رواں تھے اور جو لرز رہا تھا۔

ہندی نے اس کا شانہ بلایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

”طبیعت تو اچھی ہے۔“ اس نے منصور سے پوچھا۔ ”تم پر لرزہ کیوں طاری ہے۔ یک بیک بیمار ہو رہے ہو کیا؟“

منصور نے سر کے اشارے سے اسے تسلی دی گر اس کی زبان گنگ ہو رہی تھی۔ تسری خانکاہ اور زاویے اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم رہے تھے۔ بصرہ اور اس کا نواح اور خود وہ سارا ماضی جسے بھلانے اور فراموش کرنے، ذہن سے محو کرنے کے اس نے سر توڑ کوشش کی تھی آج تک کے گزرے بزرگوں کے تقریباً بھولے ہوئے نام پر دے پر تصویروں کی طرح اس کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ حسین کا یہ جلال اس آتش روشن کا حصہ لگتا تھا۔ یہ بڑھی ہوئی تابش و پتیش اور اب اس کی سمجھ میں یہ بات ذرا ذرا سی واضح ہونا ہی چاہئے۔ اس کا طرز عمل کیونکر ایسا ہے جیسا کہ ہے اور اسے کیوں ایسا ہونے کا حق ہے!

”کیا اس نوجوان کو دیکھنے سے تمہارے دل کو تکلیف ہوئی۔“ ہندی نے اس کے قریب جھک کر پوچھا۔

”اولاد کو دیکھ کر کسی باپ کو تکلیف ہوتی ہے کیا؟“ منصور نے پست آواز میں کہا۔

ہندی کھڑے سے بیٹھ گیا اور حیرت سے کھلی آنکھیں لگتا حلقوں سے نکلنے کے قریب ہیں۔

”منصور کا بیٹا حسین۔ جناب سہل بن عبداللہ تسری کے پاؤں کی خاک۔“

”اپنے والد کے اس دنیا سے کوچ کرنے سے پہلے میں دین اسلام پر تھا۔“ اس نے ہندی کو بتایا۔ ”میں انہیں بتا ہی دیتا مگر وقت نے مہلت نہیں دی۔“ پھر اس نے محمی کی موت کا واقعہ ہندی کو سنایا۔

”میں ایک ذاتی سوال کرنا چاہتا ہوں جو ہو سکتا ہے گستاخانہ بھی ہو مگر گزرے دنوں نے مجھے یہ حق دیا ہے۔“ پھر ذرا رک کر اس نے کہا ”مجھی بہت عمدہ انسان تھا، صاف گو اور سیدھا۔ کیا تم اس سے مختلف محسوس کرتے ہو۔ میرا مطلب ہے اس سے اچھے ہو گئے ہو۔ یقیناً تم نے ایسا محسوس کیا ہوگا۔“

”ایک بہتر نظام حیات جس میں حسن ترتیب کے ساتھ آدمی کے اندر اندھیروں کو روشنی نصیب ہو، انسان کی ممکنات، حد ادراک اور خود بار ہوں تک اس ذرہ خاک کی رسائی یقیناً ایسی منزلیں ہیں جن کا اس سے پہلے زندگی میں مجھے تجربہ نہ تھا۔ یہ تکمیل اس سے پہلے میں نے کہیں نہیں دیکھی۔“ منصور نے بات ختم کی۔

ہندی سوچتا رہا اور پھر اس نے کہا: ”انتشار جو پھیلا ہوا ہے کیا وہ اس کی تکمیل سے ناامیدی ہے۔“

”سلطنتوں کے معاملات اس نہج پر ہوتے ہیں۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچتا ہے تو ڈھلتا ہے۔ جانے دنیا کب سے ہے اور زمانے لوگ بادشاہتیں، ہر شے فنا کی زد میں ہے مگر اس نے مذاہب کی صداقت پر نہیں ان کے ماننے والوں پر حرف آتا ہے۔ سنی مذہب کی خانقاہیں بھی آباد ہی رہی ہوں گی۔ زرتشت کے معبدناہید کی روشنیاں کبھی اقصائے عالم کو روشن کرتی تھیں۔ بودھ کے مجسمے اور وہ مکمل مسکراہٹ لئے ہوئے مورتیاں اب بھی دور دراز پہاڑوں کے دامنوں کے موجود ہیں مگر ان سب کو سمیٹ کر جو پیغام اب رقم ہوا ہے اس کو جھٹلانے کی کوشش کر نیوالے خود مٹ جائیں گے یہ سچائی دائم قائم رہے گی۔“

ہندے نے منصور کی بات ختم ہونے سے پہلے کہا: ”کیا ایسی مورتیوں اور عبادت گاہوں تک پہنچنے کی کوئی صورت ہوگی۔ میں ریشم سے زیادہ ایسے نواردات کی تلاش میں ہوں۔“

”ہمارے مدارس میں مذاہب کے تقابلی مطالعہ کرنے والے بہت کچھ جانتے ہیں اور روز روشن کی طرح ان پر سب واضح ہوتا ہے۔ کہاں، کیا ہے، وہ بہتر طور پر بتا سکتے ہیں۔“ منصور نے فخر سے کہا۔

”مگر ان تک رسائی ممکن نہیں ہوتی۔“ ہندی نے افسوس سے کہا۔

”کیا تم نے کوشش کی ہے۔ یہاں پر تو ہر رنگ و نسل کے لوگ موجود ہیں۔ دربار کے اندر اور باہر مدارس میں اور دوسری جگہوں پر عوام کے مجموعوں میں مباحث کی محفلوں میں ہر شخص بار پا سکتا ہے۔ پہلی حکومتوں میں ذرا سی سختی روارکھی گئی تھی کہ مسلم اور غیر مسلم میں فرق کرنا ممکن نہیں رہا تھا مگر اب حالات پھر وہی ہیں۔ یہ خلفائے عباسیہ کی رواداری ہے جس نے فرقوں اور خیالوں اور مذہبوں کو رواج دیا ہے۔“

”یہ بات تو ہے۔“ ہندی نے تسلیم کیا۔ پھر اس نے بہت دیر سوچتے رہنے کے بعد کہا ”تم نے اپنے بیٹے کا نام تو مجھے بتایا ہی نہیں۔“

”حسین۔ حسین بن منصور حلاج۔“

دونوں دیر تک ہنستے رہے۔

ہندی نے پوچھا: ”تمہارا حسین شروع سے اس وضع پر ہے۔“

”تقریباً۔ مگر اس کی طبیعت میں بے قراری بہت ہے۔ کبھی نہایت دنیا دار اور کبھی یہ درویشی۔ بیوی بچوں سے ذرا سی بھی رغبت نہیں۔ کبھی عبادتوں اور ریاضتوں میں الجھا ہوا علوم کے مطالعے کے شائق دربار سے منسلک اور پھر سب کچھ یک قلم موقوف دنیا داری میں مصروف۔ میں خود اس کی افتاد طبع سے عاجز ہوں مگر الجھنا میری عادت نہیں۔“

ہر انسان اپنے مستقبل کا معمار اپنے دنوں کا مالک ہوتا ہے۔“ ہندی نے کہا۔ ”حسین کو جس رنگ میں میں نے آج یہ دیکھا یہ رنگ اب شاید ہمیشہ اس پر جم جائے۔“

”زندگی سے اس کے مطالبے بے شمار اور اس کے سوال بے حساب ہیں۔ خدا کا اس کا رشتہ بھی ناز کا ہے۔ وہ اس سے اتنا کچھ چاہتا ہے کہ میں حیران ہوں آخر کیوں۔ مگر میں اس کے معاملات میں شروع سے کبھی دخل نہیں رہا۔ صرف دعا کرتا ہوں اور دوسروں کی طرح تماشا کی بھی۔“

”میں تمہارے بیٹے سے اور مجھی اپنے دوست کے پوتے سے ملنا چاہتا ہوں۔“ ہندی پر شوق تھا۔

”ضرور ضرور۔“ منصور نے اٹھتے ہوئے کہا۔ آپ اپنی کارواں سرائے میں ہوں گے۔ میں آج شام یا کل صبح کسی وقت اس

ملاقات کا بندوبست کروں گا۔“

پھر دونوں باہر آئے اور کنار درجہ چہل قدمی کرتے رہے۔ ہوا نہایت خوشگوار تھی اور سیر کرنے والوں کا ہجوم کشتیوں پر سوار یوں پر اور پیدل رواں تھا۔ گھنے باغوں میں پھول کھلے تھے اور گھر سے سایوں میں لوگ بچوں کے ساتھ پانی کے تالابوں میں فواروں کے پاس خوش گفتگو میں لگے تھے۔ پھر ہندی اپنے مستقر کی طرف مڑ گیا اور منصور بہت فکر مند سا ابو یعقوب قطع کیا ہاں اپنے پوتے حسن کی طرف پلٹا۔

بظاہر حسین کی زندگی چمکدار قابل رشک اشاروں پر چلنے والی بھیڑ اور اتباع کرنے والوں کی زیادہ ترقی کی وجہ سے بہت خوب

تھی۔ یہ حاصل اس کشت مراد سے اسے ملا تھا مگر بغداد کے مدرسہ نظامیہ کے فقیہ اور مشائخ اس سے کیوں گریزاں تھے۔ عمر بن عثمان مکی کیوں اس کیورانہ درگاہ سمجھتے تھے حالانکہ اس کے نوافل کی کثرت اور عبادت کی شدت نے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنادیا تھا۔ دعا کے طالبوں کا ہجوم اس کا منتظر رہتا اور وہ خدا کے خوف سے لرزاں ترساں گریہ وزاری میں مصروف ہوتا۔

اس کے گرد شہباز تھے اور وہ مولے کی طرح سینے پر سر جھکائے آنکھیں بند کیے طلب اور مزید طلب میں لگا ہوتا۔ جنید اس کا سوال سمجھتے کیوں نہیں۔ وہ آخر کہاں سے جواب مانگے۔

ابو یعقوب قطع نے کہا ”تم حضرت جنید کو کسی طرح اپنی طرف مائل کرو۔ بہر حال وہی تمہارے مرشد کامل ہو سکتے ہیں۔ مرشد کے بنا سفر میں ٹھوکر لگتی ہے۔“

”وہ مرشد میں خود ہوں۔ میں اپنے اندر اور باہر سفر کرنے کی سمتیں جانتا ہوں۔“ اس نے اپنے بابا کے روبرو اپنے سرسرو جواب دیا۔

”یہ تعالیٰ ہے غرور۔ اس سے بدو حسین۔ ہادی کے بغیر کوئی کسی منزل پر نہیں پہنچ سکتا۔“ منصور نے اسے سرزنش کی۔

”منزلیں خود میری طرف سفر کریں گی پدر محترم! خدا کا ملک تنگ نہیں ہے۔“ حسین نے سر جھکا کر کہا۔

منصور نے مباحثہ بیکار سمجھ کر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ صرف ہندی کا بتایا جو اس کے دادا کا دوست تھا اور اس سے ملنے کا آرزو مند تھا۔

برادر ہندی کی سرائے شہر کی ان کارواں سراؤں سے ذرا ہٹ کر نخلستان کی طرف جانے والے راہ پر آخری تھی اور اس لئے اس میں شور کم تھا اور اس پر ایک مدرسے کا گمان ہوتا تھا۔ منصور کو اسے دیکھ کر بیضا یاد آ گیا۔ محمی کی سرائے اور درختوں سے پٹا ہوا صحن اور اپنا پن وقت کیسے گزر جاتا ہے۔ اس بڑے دروازے سے اندر جا کر اس نے مالک سے برادر ہندی کا پوچھا۔

اطاق کے نیم روشن اندھیرے میں مجسمہ منصور کو دکھائی دیا۔

”آؤ۔ آؤ۔ میزبان نے ہاتھ ملتے ہوئے اٹھ کر کہا۔ ”میری خوش قسمتی ہے کہ آپ نے یہاں قدم نہ فرمایا۔ میں نے یہ مجسمہ آج بلکہ ابھی خریدا ہے۔ ایک قبطنی افغان اسے قدھار سے لایا تھا مگر اس چہرے پر وسطی ایشیائی بلکہ منگولیاں چھاپ ہے۔ دبی ہوئی آنکھیں ابھری ہوئی رخساروں کی ہڈیاں۔“ اس نے مجسمہ منصور کے سامنے رکھ دیا۔ ”ناک ذرا ستواں ہے۔“ پھر ہنس کر اس نے کہا: ”دنیا کے کسی حصے میں بھی وہ بدستوا کے مجسمے اس ناک کے بغیر نہیں بنا سکتے اور اس مکرراہٹ کے بنا بھی نہیں جو مخفی نور کے خزانے کی

طرح جانے کہاں سے ظاہر ہوتی ہے۔“ ہندی کا چہرہ جوش سے متمایا ہوا تھا جیسے نایاب خزانے کے ملنے سے یا اچانک کسی نہایت اچھی خبر سننے سے ہو۔

منصور اپنے سامنے پڑے پتھر کے اس ٹکڑے کو دیکھتا رہا اور پھر پتھر کی ممکنات پر غور کرتا رہا تو یہ خیال پتھر کے اندر مستور ہوگا۔ مصورتو بہر حال وہی تھا جس نے صورتیں بنائی تھیں، تصویر گیری کی تھی مٹی میں کیا کیا ممکنات تھیں۔

برادر ہندی نے پھر کہا: ”یہ ایک نہایت نادر مجسمہ ہے۔“ اس نے اسے پھر چھوا۔ ”سنگ یشب کی یہ مورقی ایک خزانے سے کم نہیں۔“

منصور اس سارے عرصے میں چپ چاپ صرف سوچتا ہوا کھڑا رہا۔

”میں نے بیٹھنے تک کو نہیں کہا منصور برادر۔ اصل میں آدمی کی بساط کیا ہے اور اس میں پوشیدہ طاقتیں کیا ہیں۔ انسان کا ہاتھ جب خالق کا ہاتھ بنتا ہے۔“

”ارے بیٹھو نا“ اس نے ایک خالی نست کی طرف رہنمائی کی۔ ”میں بس دیوانہ ہو جاتا ہوں تخلیق کے یہ نمونے تکمیل مجھے بے چین کر دیتے ہیں۔ ہر حسین شے مجھے مضطرب کرتی ہے، میرے اندر ہلچل مچا دیتی ہے اور مجھے اداس بھی کر دیتی ہے کہ یہ میرا ہاتھ کیوں نہیں جس کو یہ طاقت عطا ہوتی۔ میں نہایت حاسد آدمی ہوں۔“ وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔ پھر مڑ کر اس نے منصور کی طرف دیکھا ”مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ اشکوک چکر والا پاؤں اپنے آسن کو بھول کر ابھی قدم دھرے گا۔ یہ بہت کچھ جانتی ہوئی آنکھیں کھلیں گی اور وہ نظر جانے وہ نگاہ کیا ہوگی۔ میں اس کی تاب ہرگز نہیں لاسکوں گا۔ بس میں راکھ ہو جاؤں گا۔“ اس نے جوش کے عالم میں پھر اپنے ہاتھ ملے۔

منصور مبہوت سا اسے دیکھتا رہا اور اس کی نگاہوں میں مرتعے گھوم گئے جو اس نے دیکھتے ہوئے گھی نہ دیکھتے تھے۔ آدمی کی اپنی دیوانگی اور اس کا اپنا شوق ہے نا!

ہندی نے مجسمے کے سراپے کو پھر شوق سے گھورا۔ ”کس قدر مکمل“ پھر اس نے منصور کی طرف دیکھ کر کہا: ”سنگ یشب میں اس سے بڑی دولت کبھی بھی میرا مقدر نہیں ہوئی۔ پھر یہ یاکشتی اورنٹ راج سے بھی کہیں آگے ہے۔ آپ کو پتہ ہے برادر منصور کہ آپ کے والد کا اور میرا شوق اس سلسلے میں برابر تھا۔ وہ فارس میں میرے لئے ان نوادرات کی خبر رکھتے تھے، بخدا ان کی طرح کا دوست پھر مل نہیں سکتا۔

مجسمے کی ادھ کھلی آنکھیں درپے میں سے آنے والی ایک کرن سے یوں روشن ہوئیں جیسے نگاہیں اٹھا کر ابھی نظر اطاق کے اندرون پھیلے گی۔ اقصائے عالم میں کیسے کیسے مذاہب اور عقائد پھیلے اور سمٹتے رہے تھے۔ دنیا والوں پر عرش کی نعمتیں قطرہ قطرہ جرہ جرہ بعید بعید بوند ساعت سات پہنچتی رہی تھیں۔ آدمی نے اپنی عقل سے ادراک تک سفر کتنی صدیوں میں طے کیا تھا۔ معلوم سے حدود سے قدیم تک سمجھ اور نا سمجھی کے رشتے الجھے ہوئے دراز اور فہم سے ماورا تھے۔ آدمی نے ہر اس شے کی پرستش کی تھی جو اسے طاقت اور بالاتر دکھائی دی تھی۔ آدمی نے کائنات کے بھید جاننے کے لئے کہاں تک سفر کیا تھا مگر کائنات کے راز اسی طرح سر بہتہ رہے تھے۔ اس نے ستاروں سے لے کر آتش پرستی تک زقندیں لگائیں مگر وہ جو مقصود تھا اور محل نظر تھا ماورا ہی رہا۔ حسن کی تکمیل سے عشق کی تکمیل تک داستان رنگین تر ہوتی گئی مگر داستان ہی رہی۔

”جب کپل دستو کے راج کمار کی طبیعت دنیا داری سے اوب گئی تو اس نے جنگلوں کا رخ کیا۔“ ہندی نے اس کی طرف منہ کر کے کہا۔ ”آپ کو یہ کہانی تو معلوم ہی ہے نا۔“

”دنیا نہایت دلفریب جگہ ہے۔“ منصور نے کہا۔

”کالیسا کے مندر میں قطار اندر قطار اندھیروں میں ڈوبی لمبی راہداریاں بدھ کے مجسموں سے سجی ہیں جو زمین پر ہوتے ہوئے بھی اس سے اوپر اور بہت پرے ہے۔ وہ جسامت صرف حیران ہی نہیں حیرت زدہ بلکہ خوفزدہ کر دیتی ہے۔ عظمت کا کپکپانہ دینے والا تصور اور آدمی کی اپنی بے بضاعتی فن کی معراج اور پھر فن کار کے اندر کے ممکنات اس کے تخیل کی پرواز میں کیا بتاؤں منصور برادر۔“

”وہ سب ایک نسل کا کام تو نہیں ہو سکتا۔“ منصور نے پوچھا۔

”ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ وہ آدمیوں کا نہیں آدمی کا کام ہے۔ آدمی جس نے سوچا کہ وہ اپنے مذہب کی خدمت کر رہا ہے۔ اپنے بدھ کو اپنے تخیل سے دوبارہ بنا سنوار کر رکھ رہا ہے اور اس لئے یفن پارے زمانے کی اس دست برے سے محفوظ رہے۔“

”اور خدا مجسمہ سازوں کی دست بردے سے محفوظ رہا۔“ منصور نے ہنس کر کہا۔

ہندی نے ہولے ہولے اپنے پاؤں پر گھوم کر گہری نظروں سے منصور کو دیکھا اور دیکھتا رہا۔

”میں نے کوئی بات قابل گرفت اور دل آزاری کہی ہے۔“ منصور نے پوچھا۔

”اگر آپ کی بات کو سچ مان لیا جائے تو لازوال فن کی اہمیت محض نقش گری کی رہ جاتی ہے۔“ ہندی ایک نشست پر ٹک گیا۔

”میں جاہل آدمی ہوں برادر ہندی اور فن کی باتیں بالکل نہیں سمجھتا۔ اس کی معراج کیا ہے اور اس کی ممکنات کیا ہیں؟ یہ نہیں جانتا مگر مجسمہ حسین ہے اور یہ سارا حسن خدا نے اس پتھر کے سینے میں رکھ دیا تھا۔ صنعت گری تو آدمی کی نہیں اس کی ہے۔ مصور تو پھر بھی وہی ہوا۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا۔“

ہندی نے سر ہلایا مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔

کالیسا کے مندر میں پہاڑوں کے اندر بنی راہدار یوں میں ورطہ حیرت میں جس کو آدمی پتھر سے کھوجتا ہے تو پھر بھی نہ ملا کیونکہ وہ مل نہیں سکتا۔ جس نے کئی کائنات تخلیق کئے ہوں وہ اپنی ہی تخلیق کردہ ایک مخلوق کے ہاتھ آ سکتا ہے۔ اسے ملنے کا اسے دیکھنے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اسے فانی چیزوں میں تلاش کرنا دیوانگی ہے۔“

”برادر منصور یہ دیوانگی آدمی کو خوشی دیتی ہے۔“ ہندی نے مجسمے کو اٹھایا اور سر پر سجے مکٹ کو ہاتھ سے چھوا۔ ان پتھوں کو انگلی سے محسوس کیا۔ انتہائے حسن کی تمتماہٹ میں سکون لئے اس چہرے کو دیکھتا رہا۔ اشوک چکر پر ہاتھ پھیرا وہ دنیاؤں اور آکاش اور دھرتی، سمندروں اور اندھیروں اجالوں سے آشنا مکسر اہٹ لیئے ہوئے سراپا۔ کیا آدمی کی رسائی ماورا تک ہے۔

پھر اس نے نہایت حفاظت سے اپنے لپیٹا اور صندوق کے زیریں حصے میں رکھ کر ڈھکنے کو مضبوط بند کیا۔ لکڑی کا جوتا ایک کونے میں اتارا اور یمنی طلیساں کو کندھے پر درست کر کے وہ منصور کے ساتھ ابو یعقوب قطع کے گھر کے لئے روانہ ہوئے۔

راہ کے دوسری طرف بادلوں کی وجہ سے جو سورج کے سامنے آ کر کبھی روشنی کو کوروک لیتے تھے درختوں کے جھنڈ میں سے جھانکتے ہوئے کھنڈرات کی ایک جھلک دکھائی دے جاتی۔

”میں اکثر ویرانوں میں گھومنے نکلتا ہوں جب بھی میرا گزر بادشاہت بغداد میں کہیں ہوتا ہے۔“ ہندی نے اس طرف اشارہ کیا۔

”ان میں کیا ہے۔“ منصور نے پوچھا۔ ”یہ کھنڈرات کیا ہیں؟“

”گزرے زمانوں کی کہانیاں ہیں جن کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ جو وقت کے دھارے کے سامنے کھڑی ہیں۔ وقت ان کے آس پاس ادھر ادھر سے بچ کر نکل جاتا ہے آنکھ بچا کر۔“ ہندی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

عافیت اسی میں ہے کہ ازلی ادبی وقت کے سامنے شکست تسلیم کر لی جائے۔“ منصور نے جواب دیا۔

”برادر منصور کئی چیزیں آدمی کی بنائی ہوئی ہوتی ہیں مگر اس سے آگے نکل کر بس اس کے راہ میں جم جاتی ہیں۔ اسی طرح کئی خیال

کئی خواب مجسم ہو کر ٹھہرے رہتے ہیں۔“

”کیا ان کھنڈرات میں تمہیں نوادرات ملے ہیں مجسمے جن کی تلاش میں تم رہتے ہو۔“ منصور نے کہا۔ ”یوں خصوصیت سے تمہیں یہی جگہ پسند ہے ورنہ دشت سوس کے وسط میں اور پرانی معدوم شاہراہوں کے ساتھ ساتھ آبادیوں کے نشان ہیں جن پر ریت نے پہاڑیاں تعمیر کر دی ہیں۔ چرواہے جب شاموں لوٹتے ہیں تو ان ٹیلوں پر سے کئی عجیب و غریب چیزیں لاتے ہیں۔“

”ہاں برادر! ذہن کے سب گوشے کسی ن کسی وقت آباد رہتے ہیں اور ایک خدا کے تصور سے پہلے لوگوں نے کس کس شے کو پوجا ہوگا۔ دنیا بہت قدیم ہے اور مجسموں کی میری تلاش بھی سمجھ لو میری دیوانگی ہے۔“ پھر ٹھہر کر اس نے کہا: ”گزرے ہوئے خداؤں کی تلاش۔“ وہ بڑی خوشدلی سے ہنسا۔ ”تخت سے اترے ہوئے بھولے اور بھلائے ہوئے دیوتا اور پیغمبر اور اتار..... سنی مذہب ان علاقوں میں تو اب تقریباً معدوم ہو چکا ہے مگر ان خانقاہوں کے تہ خانوں میں اب بھی بدھ کی مورتیاں ہیں۔“

”تلاش جاری رکھو اور تم پر ہی کیا منحصر ہے ہر آدمی کچھ نہ کچھ تلاش کرتا رہتا ہے جس دن یہ تلاش نہ رہی آدمی کے اندر بے چینی نہ رہی آدمی نہیں رہے گا۔“ منصور خوش تھا۔

”آدمی تو بھگوان کو ڈھونڈتا اور پاکر بھی کچھ اور کھوجتا ہے برادر منصور۔“ ہندی بہت سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

ابو یعقوب قطع کے گھر کے دروازے پر ایک بھیڑ جمع تھی جس میں سے راستہ بناتے ہوئے گویا سروں پر پاؤں دھرتے ہوئے وہ پہلے دروازے کی طرف بڑھے۔ بھیڑ اندر بھی تھی۔ عورتیں اور بچے اور بے چینی سے مضطرب لوگ اور سکون سے وقت اور فرصت انتظار کرتے لوگ بارش جوان اور شرطے اور فوج کے افسران اور ہر طبقے کے نمائندہ لوگ۔ بڑے بڑے نقابوں کے پیچھے کنیزیں اور لونڈیاں۔ لگتا تھا کسی بہت بڑے طبیب کا دواخانہ ہے۔

منصور معافی مانگتا اور راستہ بناتا آخرا اندر جانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ اس کے پیچھے ہندی نے بھی کسی نہ کسی صورت اپنا وجود لٹھکا لیا۔ روشنی سے ایک دم وہ نیم تاریک کمرے میں داخل ہوئے تو انہیں آنکھوں کی سرگوشیوں میں بتیں کرتے بہت سے لوگ دکھائی دیئے۔ پھر چند لمحوں کے بعد منصور نے مڑ کر دیکھا تو ہندی ہاتھ جوڑے سر کو ان پر دھرے ہمہ نیاز بنا ہوا اپنے وجود کو سجدہ ریز کرنے کے لئے لوگوں کے سروں پر گویا گر رہا تھا۔

”برادر ہندی۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آپ آگے کی طرف نکل آئیے۔“ مگر ہندی اپنے بندھے ہوئے ہاتھوں پر سر جھکائے کھڑا تھا بالکل ساکت جیسے کسی مندر میں دیوتا کے سامے ہو یا برزوا کے سامنے معبدناہید میں کوئی موبد استاد پڑھتا ہوا اور تجلی آتش کو

اپنے دل میں ابھرتا محسوس کر رہا ہو۔

ہولے ہولے یا جانے کس جذبے سے حسین نے اوپر دیکھا۔

ہندی کے بندھے ہوئے ہاتھ کھل گئے بازو نیچے گر گئے اور وہ جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ اس کے منہ سے جو نکل رہا تھا اسے سوائے اس کے کوئی سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ کم روشنی میں جو لوگوں کے سانسوں سے دھکتی لگتی تھی منصور نے ہندی کو پسینے میں تر ہوتے دیکھا۔ بال اس کے سر پر کھڑے تھے جیسے خوف کی وجہ سے نس نس تن گئی ہو اور ٹوٹنے کو تیار ہو۔ پھر اس نے حسین کی طرف مڑ کر دیکھا اور مجھے کو بھی۔ اس کے بیٹے کی آنکھیں خون رنگ ہو رہی تھیں اور حلقوں سے باہر نکلی لگتی تھیں۔ فضا میں کچھ رکاوٹ اور گھٹن تھی جیسے طوفان سے پہلے سناٹا ہو۔

”میں کوئی اوتار نہیں ہوں، بالکل نہیں، تم غلط سوچتے ہو۔“ حسین کی آواز گرجدار گونج اور بجلی کے کوندے کی طرح لہرائی جیسے طوفان ایک دم برس پڑے۔ شدت جذبات سے ہندی جھکا جاتا تھا اور لرز رہا تھا۔ اس کی پیشانی تقریباً زمین کو چھو رہی تھی اور حسین کی خفگی درے کی طرح اسے تڑپا رہی تھی۔

”نہیں نہیں۔ ایسا نہیں۔ میں نے جھوٹ نہیں دیکھا۔ تم ہی بھگووان کے اوتار ہو۔“ برادر ہندی کی بے تابی دیدنی تھی۔ لوگ اس مکالمے کو سن رہے تھے اور دم بخود زدہ تھے۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ منصور بھی ان میں سے ایک تھا۔ وہ اپنے دوست کو اس کی درخواست پر اپنے بیٹے سے ملاقات کے لئے لایا تھا مگر وہ خود ایک اجنبی تھا اور مکالمے کی نوعیت و غایت ماہیت اور فہم سے قطعاً بے خبر تھا۔

”مجھے غلط مت سمجھو۔ میں خود تلاش میں ہوں۔ بے خبر ہوں اور راہوں کے الٹ پھیر میں الجھا ہوا ہوں۔“ حسین اٹھ کر ہندی کے قریب آ گیا۔

ہندی نے سر اٹھایا۔

”یہ آنکھیں، یہ پیشانی، یہ ماتھے پر تڑپتی لوجو، بھتی نہیں جلتی ہے۔ تمہارا سارا وجود جس سچ اور جس تہج سے بول رہا ہے تم اسے کیوں جھٹلا رہے ہو۔ میرے مذہب کی کتابوں میں آنے والے زمانوں کی پیش گوئیوں میں یہ سب لکھا ہے، ایک ایک حرف۔ یہ نشانیاں ہیں۔ میں ملک ملک میں انہیں ڈھونڈتا پھرا ہوں اور میں نے انہیں پالیا ہے۔“ اس نے جھک کر حسین کے پاؤں چھو لئے۔

حسین تڑپ کر پیچھے ہٹا۔

”میں محی تمہارے دادا کا دوست ہوں اور میں غلط کہنے والا نہیں ہوں۔ دنیا کے کناروں تک گھوما ہوں اور میری تلاش بس تم تک پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے۔“ ہندی نے حسین کے سامنے کی زمین کو بوسہ دیا۔

”اٹھو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہاری تلاش نے تمہیں گمراہ کیا ہے۔“ حسین نے گرج کر کہا۔

منصور نے آگے بڑھ کر حسین کے کندھے پر ہاتھ رکھا: ”یہ تمہارے دادا کے دوست ہیں بیٹے۔“

حسین نے باپ کا ہاتھ کندھے سے جھٹک کر الگ کیا۔ ”میں راہ حق کی تلاش میں خود پریشان ہوں اور یہ مجھے قابلِ سجدہ سمجھتا ہے۔ اپنے دیوتاؤں کی بدلی ہوئی شکل کسی مجسمے کی شبابہت میں ڈھونڈتا ہے۔ اسے کیسے ابھی یہاں سے چلا جائے۔“

منصور نے کہا: ”حسین ہوش میں تو ہو۔ انہیں میں لایا ہوں۔ وہ تو تمہاری دید کے متمنی تھے بس۔“

”ہاں یہ محض اتفاق ہے کہ میری منزل یہاں ہے۔“ ہندی نے پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

”تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ میں پھر کبھی نہ تمہاری شکل دیکھنا چاہوں گا اور نہ تم سے ملنا۔“ حسین نے باپ کی بات کا جواب

دینے کی جگہ ہندی سے کہا۔

”یہ مکمل شکل ایک اوتار کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ میرے دل کا حال سوائے اس کے کوئی جان نہیں سکتا۔ میرے ملک میں لوگ

تمہارے منتظر ہیں۔ ہماری زمین کو تمہاری ضرورت ہے۔ تم ہمارے ہو بالکل قطعاً ہمارے۔“ ہندی نے عاجزانہ فخر سے کہا۔

یہ عجیب تماشا تھا جیسے محبوب اور محب کے درمیان ہو جیسے دو دشمنوں کے درمیان ہو۔ ایک ہمہ ناز اور دوسرا ہمہ نیاز۔ ایک وفور شوق

سے بے تاب اور دوسرا پہچان سے بھی منکر۔ زمانوں پہلے کی دور وحشیں دو ذرے اچانک ایک دوسرے سے ملائی ملائی ہوئے ہوں اور

دامن چھڑا رہے ہوں۔

منصور نے ہندی کو اشارہ کیا۔ وہ خود بھی سخت دل برداشتہ ہو رہا تھا۔ ایک بھرے مجمعے میں حسین نے اس کی بات سنی تک نہ تھی۔

جانے اسے کیا تھا۔ وہ اسے نہایت فرمانبردار تو نہیں کہہ سکتا تھا مگر آج تک اس نے سعادت مندی سے اس کے دل کو دکھانے کی کوشش

نہیں کی تھی۔ وہ خود شرمندہ تھا۔

ہندی پھر حسین کے قدموں کی طرف جھکا تو اس نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

”دیکھو تمہاری دیوانگی میری دیوانگی سے ٹکرا کر پاش پاش ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ اپنے کو بچاؤ اور یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

سمجھے۔“ اس نے اسے تقریباً دروازے کی طرف دھکیل دیا۔ جاؤ۔ جاؤ!“

منصور اور ہندی چپ چاپ ابویعقوب اقطع کے گھر سے نکلے اور سرائے کی طرف چلے۔

”برادر منصور۔ میں خود سرائے تک چلا جاؤں گا۔“ ہندی نے کہا۔

”میں تم سے بہت شرمندہ ہوں برادر ہندی۔ مجھے حسین سے یہ امید نہ تھی۔ مگر تمہاری بات کی بھی مجھے سمجھ نہیں آئی۔ تم اسے کیا

کہہ رہے تھے۔“

ہندی ہنسا..... ”یہ میرے اور اس کے درمیان ایک راز تھا۔ مگر یہ جان لو کہ تمہارا حسین ہرگز معمولی آدمی نہیں ہے۔ ایسے

انسان صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اسے پیدا تو ہمارے یہاں ہونا چاہئے تھا مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی اس راز کی کون ٹوہ

لگائے گا کہ وہ محی کا پوتا ہو کر تمہارا بیٹا ہو کر ہمارے لئے کیسے ہوگا۔“

پھر اس نے مڑ کر منصور کا بازو زور سے تھام لیا۔ ”اسے آخروہیں آنا ہوگا۔ ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ دنیا کے کسی حصے میں بھی

ہو وہ اوتار آخر بھارت ورش کا ہو کر رہے گا۔ تمہارے بیٹے کو وہاں آنا ہوگا۔“

منصور نے کہا: ”برادر ہندی‘ مشیت کونہ کوئی جان سکتا ہے اور نہ اس سے لڑ سکتا ہے کہ میں محی کا بیٹا ہو کر کیوں ایسا ہوا اور وہ خود میرا

بیٹا ہو کر حسین کیونکر ہوا۔ وہ جو ہو جیسا ہے کیوں ایسا ہے۔ قدرت کے کارخانے کی کوئی بات آدمی سمجھ نہیں سکتا۔ اس کا مقدر کیا ہے

آنے والے زمانے میں کیا ہوگا‘ مجھے نہ تو معلوم ہے نہ ہی معلوم کرنے کی جلدی ہے۔ ایک باپ ہونے کی حیثیت سے میں اس کے

لئے دعا کر سکتا ہوں۔“

ہندی نے کہا: ”آج رات کے پہلے پہر میرا قافلہ خوزستان کی طرف روانہ ہو جائے گا اور مجھے کچھ خریداریاں بھی کرنی ہیں اس

لئے میں رخصت چاہوں گا۔ ہو سکتا ہے حالات ہمیں پھر ملائیں۔ ستارے پھر ایک دوسرے کی مخالف سمتوں کی بجائے مطابق سفر

کریں یا ہو سکتا ہے پھر کبھی ملاقات نہ ہو مگر ایک بات ضرور دھیان میں رکھو کہ محی کا پوتا اگر معبدناہید کا بڑا کاہن نہیں ہے مگر اتنا ضرور ہو

گا کہ زمانہ اسے بھلا نہ سکے۔“

”شکریہ۔“ کہہ کر منصور نے اسے گلے لگا لیا۔ ہندی نے اپنی یسینی طیلماں اس کے کندھوں پر ڈال کر کہا:

”یہ میرا تحفہ ہے۔ امید ہے ایک بھائی دوسرے بھائی کا ذرا سا نذرانہ قبول کر لے گا۔“

”اب اس کو واپس کرنے کی گنجائش ہی کہاں رہی ہے۔“ منصور نے اپنے کندھوں کو تھپتھپایا۔

پھر بہن کی تیز سرد ہوانے دونوں کو کپکپا دیا اور دونوں پھر ایک تازہ گرم جوشی اور محبت سے گلے ملے۔ ہندی اتر کر اپنی راہ ہو لیا اور

منصور اپنے خیالوں میں گم بہت کچھ سوچتا ہوا مدرسہ نظامیہ کی طرف چلا۔ وہ حضرت جنید سے ملنا اور حسین کے متعلق کچھ دریافت کرنا چاہتا تھا۔

فیروز دین کے آخری دن تھے۔ برف پگھل کر زمین کی جھولی کو رنگ رنگ پھولوں سے بھر گئی تھی۔ وجہ میں پانی شفاف اور تیز تھا۔ اور بغداد کی عمارتوں کا بہتا ہوا عکس کشتیوں کی روانی کے ساتھ ہلتا تو زیر آب ایک جنت کا گماں ہوتا۔ معمور اور آباد شہر کی رونقیں مختلف النوع لباس پہنے لوگوں کے مجموعوں سے بڑھ گئی تھیں۔ یہ درو دراز ملکوں سے آئے ہوئے اپنے نمائندہ سفارتوں کے ساتھ منسلک لوگ تھے جو آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے شہر کا مقابلہ کرتے اور حیران ہوتے تھے۔ سواری کے جانوروں کی بھیڑ بھاڑ سودا گروں کے عجیب لباس جو وسطی ملکوں سے آئے تھے اور عجوبوں سے کم نہ تھے۔ پھر زمانوں سے یہاں پر مقیم ایسے لوگ جو خلیفہ کی نگاہ کرم کے منتظر تھے اور دربار تک رسائی نہ پاسکے تھے۔ بڑی بڑی عیسائی سلطنتوں کے پیغامبر جو جاسوس اور ریشہ دوانیاں کرنے والوں سے کسی طور کم نہ تھے۔ پراسرار ترک جو درانہ ہر جگہ گھسے اور بغداد کو اپنی مملکت گردانتے تھے۔ موسم کے بدلنے کے لئے بہار کی ہواؤں نے دلوں میں نئی امنگیں پیدا کر دی تھیں اور اس سارے ہنگامے سے دور حسین بن منصور اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ تستر کی طرف رواں ہو ہو رہا تھا۔ اس نے مال تجارت کے کچھ اونٹ ٹھیک کئے تھے اور اپنے بزرگوں سے تقریباً قطع تعلق کر لیا تھا۔

حضرت جنید بغدادی نے منصور سے کہا تھا: ”تمہارا بیٹا جھٹک گیا ہے۔ اس نے تو ابھی ابتدائی مرحلے طے نہیں کئے۔ سلوک اور طریقت کی راہوں سے نا آشنا عجیب و غریب انسانوں کا مرجع اور اپنی بساط سے بڑھ کر مدعی۔ منصور سر جھکائے آنسو بہاتا رہا۔

حضرت نے کہا: ”میرا منشا تمہاری دل آزاری نہ تھا مگر صورت حال یہی ہے۔ وہ اپنے کوشش کامل تصور کرتا ہے۔ لوگوں کو اپنے گرد جمع رکھتا ہے۔ یہ غرور ہے جیسا ابلیس نے کیا تھا اور راندہ درگاہ ہو گیا تھا۔“ منصور نے کانپ کر کہا: ”حضور اس کے لئے ہدایت کی دعا کیجئے۔“

حضرت جنید اپنے کسی رسالے کی تدوین کر رہے تھے اور انہوں نے اس کی بات سنی ہی نہ تھی۔ وہ قلم ہاتھ میں لئے کسی گہری سوچ میں ڈوبے تھے اور باہر اسفند کی کی بارش چپ چاپ عورت کے آنسوؤں کی طرح برس رہی تھی۔ منصور نے پہلو بدلاتو گویا انہیں اس کے وجود سے آگاہی ہوئی۔ وہ اس کی طرف دیکھتے رہے۔

”لوگوں میں حسین کے لئے سرگوشیاں پھیلی ہیں۔ اس کی دعا مستجاب اس کی نظر دور رسو اور اس کی طاقتیں بے اندازہ ہیں مگر یہ

افواہیں اس کے لئے خود نیک قال نہیں ہیں۔ ابھی تو اس نے اپنی منزل کی طرف سفر شروع نہیں کیا۔ وہ تقدیروں کا بدلے والا کب سے ہو گیا ہے۔“

منصور نے جھک کر کہا: ”حضور اس کے لئے دعا کیجئے۔ وہ میری کل متاع ہے۔“

حضرت جنید نے کہا: اسے اس شعبہ بازی اور مجمع سازی سے روک سکو تو یہی میری دعا ہوگی۔“ وہ پھر اپنے قلم کو نسہری روشنائی میں ڈبو کر کچھ لکھنے لگے اور منصور اپنے قدموں چلتا ہوا ان دالانوں میں سے ہوتا ہوا باہر نکلا جہاں جگہ جگہ طالب علموں کی ٹولیاں علمی مباحث میں لگی تھیں اور خوشگوار ہوا میں مدرستہ نظامیہ کے پھولوں اور صحنوں میں لگے شجر سایہ دار خوشبو مشام جان کو معطر کرنے والے ناموں میں گھل رہی تھی۔

رف رف۔ رفتن کی صدا تتر کے اس گلیارے میں پھر لوگوں کو متوجہ کرنے لگی تھی جہاں دعا کے منتظر ٹولیاں اب لوٹ جاتی تھیں کہ حسین نے کسی کے لئے بھی دعا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

حضرت جنید کو مل کر جب منصور لوٹا تو اس نے بیٹے کو اپنی ملاقات کا حال بتا کر کہا تھا۔ ”وہ شیخ کامل ہیں اور غلط نہیں کہہ سکتے۔“

”میں بھی غلط نہیں کہتا گو میں شیخ کامل ہونے کا دعویٰ نہیں کرتا۔“ حسین نے نہایت نرمی سے جواب دیا تھا۔

”مگر جو خواب تمہارے دل میں منعکس ہوتے اور جو طاقتیں تمہیں قابو کئے ہوئے ہیں ان سے اپنا دامن چھڑاؤ۔ سلوک کی جن منزلوں سے تمہیں گزرے ریاضت کی جن مشقتوں کو تم نے نہیں آزمایا، انہیں آزماؤ بیٹے۔“ منصور نے آخر وہ بات کہہ ہی دی۔

حسین بہت دیر چپ رہا۔ اس سے دعا کی طالب بھیڑ خود اس کا تصرف جو خدا کا عطا کردہ ہی تو تھا، پر چھائیں اور سایوں کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے سے وہ جلسے وہ محفلیں وہ اسباق گزر گئے اور وہ سب اسی کی دین تھی۔ حضرت جنید یہ سب جانتے تھے اور اس کے باوجود انہوں نے اس کے ذکر و فکر کو شعبہ بازی سے تعبیر کیا تھا۔ اس کی مشقت و ریاضت کو دیوانگی کہا تھا۔ جھنجھلاہٹ اس کی روح میں اترتی چلی گئی اور مایوسی بھی۔ بغداد اسے کبھی بھی پسند نہیں کرے گا۔ اسے اپنی سند کہاں سے حاصل کرنا تھی؟ اگر اس کے نصیب میں کسی اعلیٰ روحانی درجے پر فائز ہونا نہیں تھا تو وہ کیونکر مشیت سے لڑ سکتا تھا۔ اس نے سوچا یہی بہتر ہوگا کہ وہ عام سادہ زندگی گزارے جو ہر وہ شخص جو اس روئے زمین پر پیدا کیا گیا، گزارتا ہے۔ اپنے دنوں کو یونہی تمام کرے۔ اگر حضرت جنید جو استاد عصر اور پیر طریقت تھے یہ کہتے تھے تو صحیح کہتے ہوں گے۔ آخر وہ سوالوں کے پردے میں مدعی کیونکر تھا۔ کاش اسے ایسی آنکھیں عطا ہوں کہ وہ ماضی میں اور آنے والے زمانے میں دور تک دیکھ سکے۔ اس سے اپنا مشاہدہ کیوں سلب کر لیا گیا تھا؟ ایک لمحے کو اسے محسوس ہوا

جیسے سوائے اندھیرے کے کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ دیکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتا۔ وایک دیوار ہے جس کی نہ پینائی ہے اور نہ ہی کوئی حیثیت جیسے ساری طاقتیں اس سے واپس لے لی گئی ہو۔ روشنیاں اور نور اور آئینے کی طرح صیقل کیا ہوا اس کا دل اس کے حوصلے سب کچھ!

رف رف رفتن۔

رقص کے لئے تیار وجود تن کر اس کی نسیم ڈھیلی ہوتیں اور ڈھیلی ہو کر تن جاتیں۔ گویا وہ ایک لے ہو جس میں پوشیدہ نغمے بے تاب ہو رہے ہوں۔ گویا وہ ایک باجا ہو جس میں بند راگ تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہے ہوں۔ وہ ایک قید خانہ ہی نہیں تاریک زندان ہو جس میں بے بسی اور ناامیدی کے ماریا پھنکار رہے ہوں اور پھر وہ ایک طنبور ہو اور کی اپنی انگلیوں سے مضرب چھین لیا گیا ہو۔ پچھلے پہر جب رات نرم رو قاصد ستاروں اور نیم قوس کہکشاں کی موجودگی میں پرندوں کے خوش الحان گیتوں میں ڈھلتی اور خوشبو کے معطر جھونکے کائنات کی شہنائی کے صدا بابل اس پر انڈیل دیئے جاتے تو وہ کراہتا اور بے چین ہوتا، سراپردہ اسرار سے پرے کیا ہے؟

وہ کون ہے؟

وہ اپنا اور اس کا رشتہ کبھی سمجھ سکے گا کہ نہیں؟

پھر وہ سر جھٹک کر سب سے چھوٹے بچے کو اپنے ساتھ بھینچ لیتا۔ وہ بھی اس کی طرح بے بس تھا اور ہر لمحہ محتاج اور نا سمجھ۔ اس کی حفاظت کون کرے گا۔

زینب نہایت آہستگی سے بچے کو اس کی گرفت سے لے لیتی ہے۔ وہ اپنی ساری سادگی کے باوصف یہ جانتی تھی کہ حسین یہ سب اولاد کی محبت میں نہیں کرتا۔ اپنے آپ کو بچا رہا تھا، پکڑ رہا تھا، سمیٹ رہا تھا، بکھرنے سے بچا رہا تھا، پناہ گاہ کی تلاش میں تھا، آسرا چاہتا تھا۔

وہ اپنی ساری آرزوؤں کے ساتھ اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ جانتی نہ تھی، سوائے اس کے کہ وہ اپنے آپ سے انکار کر رہا تھا۔ اپنے آپ سے بھاگ رہا تھا۔

کرب کی ان کیفیتوں کو جنہیں وہ چھپانا چاہتا تھا، وہ جانتی تھی۔

زینب کو اس پر رحم آتا۔ اس کے کھوئے ہوئے وجود پر اس کی بے چینی پر۔ کاش وہ ایک عام معمولی انسان ہوتا۔ اصل میں دھنیا جیسے تانت اور لکڑی کے بنے ہوئے روٹی دھکنے کے اس آلے سے دلچسپی ہوتی، خود زینب کی زندگی میں ایک بے صبر سا سکون تھا جس

کی عادت اسے ہو چلی تھی۔ بیضا کی سرائے میں منصور اور حسین اور بچوں کے ساتھ رہنا، اپنے باپ کے گھر میں محفلوں اور جلسوں باحثوں اور مراقبوں کی گونج سننا جو خانقاہ کے قرب کی وجہ سے تھی اور اب وہ اور حسین نہر کے کنارے باغ کے سرے پر تستر کی خانقاہ کے عین نیچے اس چھوٹے سے گھر میں جس کا راستہ نہر سے پار کشتی کے ذریعے جاتا تھا۔ جیسے حبابوں کا قالہ جولہروں پر آگے ہی آگے بہتے تھے۔ اسے معلوم تھا حسین ایک مسافر کی طرح یہاں رکا تھا اور آخر اپنے سفر پر روانہ ہوگا مگر اس سفر میں زینب کو اس کا ساتھ نہیں دینا تھا۔ وہ منتظر تھی اور وہ گن رہی تھی۔ یہ خوشبو جو اس کے گرد تھی آخر پرواز کرے گی۔ ٹھہرے گی نہیں۔ نہر میں پانی لوٹ کر تو نہیں آتا تھا۔ لہریں آگے ہی آگے حبابوں سے بے پرواہ ایک دوسرے سے آنکھ میچولی کھیلتی اس کنارے سے اس کنارے بھاگ کر آگے ہی جاتی تھیں۔ آدمی بھی اپنی کشتی کھیتا پانی کے رخ بہتا تھا۔ اسے بہتا تھا۔

یہ فاقہ مست خاندان تھا جس کی ضرورتیں محدود اور آمدنی محدود تر تھی۔ نداف کی دکان جہاں دن رات رف رف کے باوجود اکثر بھوکا سونا پڑتا۔ کبھی رات کو دیئے میں تیل نہ ہوتا اور بیمار بچے کے لئے دوا لانے کو پیسے نہ ہوتے۔ اندھیرے میں بخار کی ہڈیانی کیفیت میں جب بیمار ڈر کر چیختا تو زینب خدا سے پناہ مانگتی، دل ہی دل میں نا جاتیں پڑھتی، دم کر کے پھونکتی، قرآنی آیات کا ورد کرتی۔ حسین گھبرا کر باہر نکل جاتا۔ کانوں کو بند کر کے ہاتھ ان پر دھر لیتا۔ برفباری کے دنوں میں حسن پھٹے جوتے پہنے جن میں سے اس کی سرخ ایڑیاں جھانک رہی ہوتیں۔ مکتب کی طرف جاتا دکھائی دیتا۔ اس کا گول چہرہ چمکدار آنکھیں سر دھوا میں ٹھٹھرتیں سکڑتیں اور لمبی پلکوں سے سچے رخسار اور بھی سرخ ہو جاتے۔

ان دنوں جب حسین گھر لوٹا اور مٹی خانہ ساز رنگین طلیساں کا دامن الٹ کر کھانے کی کوئی چیز کوئی پھل نکالتا تو خوشی کی لہر سب چہروں کو بدل سادیتی جیسے چاند کی کا دھاوا بادلوں کو چکا دیتا ہے۔ وہ بے موسم کے پھل ہاتھ اشارے سے حاضر کرنے اور ایسی ہی ارکرامات رکھنے والا شخص کسی گزرے زمانے کی کہانیوں کا کردار لگتا تھا۔ یہ حسین اپنی طاقوتوں کو بھول کر اپنے گھر میں ایک عام آدمی کی طرح مطمئن اور متمکن لگتا تھا اور زینب بھی کبھی زیادہ کا مطالبہ نہ کرتی۔ صبر و شکر سے وہ حسین کا اس کے اور بچوں کے قریب ہونا سب سے بڑی آسائش تصور کرتی تھی۔

حسین نے لوگوں کے لئے دعا کرنا چھوڑ دیا تھا اور جیسا کہ لوگوں کا حافظہ جلد بھلا دینے والا ہوتا ہے تستر میں لوگ تقریباً بھول گئے تھے کہ حسین بن منصور حلاج ان کے درمیان ہے۔ جیسے دریا کے دھارے تلے چھپا موتی ہو۔ یہاں تک کہ ایک کارواں سرائے میں آک رکا۔ ان لوگوں کے ساتھ ایک جاں بلب بیمار تھا۔ وہ بہت دور سے آئے تھے اطراف بغداد اور شاہتے تھے کہ حسن اس بچے

کا علاج کرے۔ اس کے لئے دعا کرے۔ انہوں نے سنا تھا وہ مردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔

جب وہ اس کا ٹھکانا ڈھونڈتے ہوئے نہر کے دوسرے کنارے پر پہنچے تو رات آدھی سے زیادہ ڈھل چکی تھی۔ پچھلی راتوں کا چاند نیلا ہٹ میں غوطے لگاتے تاروں کے ساتھ بادلوں کے اکا دکا ٹکڑاؤں کی اوٹ میں آنکھ چھوٹی کھیل رہا تھا۔

”حسین علاج کا گھر یہی ہے کیا؟“ دوسرے کنارے سے کسی نے پکارا۔

زینب جاگ گئی اور پریشان ہو گئی۔ اس نے حسن کو بیدار کیا اور دریافت حال کے لئے باہر بھیجا۔

”کیا کام ہے۔“ حسن کی چھوٹی سی آواز بھتے پانی کے اوپر سے درختوں کی شاخوں میں سے سنائی دی۔

”ہم ایک بیمار کو لائے ہیں اور بغداد کے محلہ رصافہ سے آئے ہیں۔“ انہوں نے دوسرے کنارے سے جواب دیا۔

حسن نے ماں سے آکر سب حال کہہ دیا۔ حسین نوافل میں مشغول تھا۔ اب کیا کیا جائے؟ تستر میں آکر تو اس نے اپنا ماضی بھلا دیا تھا۔ اب کون اسے اس بات پر مجبور کرے گا؟

”پھر میں ان سے کیا کہوں؟“ حسن کی نیند سے بوجھل آواز زینب کو سنائی دی۔

”تم کشتی میں جا کر انہیں یہاں لے آؤ۔ معلوم کریں گے۔ جو لوگ رصافہ سے آئے ہیں وہ لمبا سفر طے کر کے بہت امید لگا کر آئے ہوں گے۔ انہیں ناامید کرنا کفر ہوگا۔“ وہ حسین سے زیادہ اپنے آپ سے بات کر رہی تھی۔

پھر چپوؤں کے پانی سے ٹکرانے اور کشتی کے رواں ہونے کی صدا آئی۔

”کیا وہ بیمار کو لے آئیں۔“ حسن نے باہر سے ہی ماں سے پوچھا۔

”میرا تو یہی خیال ہے۔ اگر حسین خفا ہوئے تو بھی ہمیں ان کے پاؤں پکڑ کر دعا کروانا ہی ہوگی۔“ زینب نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

وہ ایک عمر زرد و لڑکا تھا جس کی سانس رک رک کر آ رہی تھی اور جو نقاہت کی وجہ سے آنکھیں تک نہیں کھول سکتا تھا۔ وہ سائے کی طرح لکڑیوں کو باندھ کر بنائے ہوئے جھولا نما بستر پر لیٹا تھا اور چادر کا ایک حصہ لگتا تھا۔ زینب نے دیکھا کہ بس وہ کوئی دم کا مہمان تھا۔ پتہ نہیں وہ اسے محلہ رصافہ سے یہاں کیوں لائے تھے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے دجلہ اور رونقیں اور طرب انگیز ہوائیں اور دارلخلا فے کی چہل پہل گھوم گئی۔

ہاں وہ آئے تھے اور بغداد کی ہواؤں اور خوشبوؤں اور یادوں کو ساتھ لائے تھے۔ اس کا دل بے چین ہوا تھا۔ اسے اس سرزمین

کے ذرے ذرے سے پیار تھا اور پھر وہ ماں تھی۔ جانے کیوں اس کا دل اس بچے کی طرف کھنچ رہا تھا اور پہلی بار اسے غصہ آ رہا تھا۔ بے چینی سی کہ حسین اپنے طویل نوافل کو مختصر کیوں نہیں کر سکتا۔

بچے کے ساتھی خاموش تھے اور اداس۔

”کیا بغداد کے نواح میں اس کا علاج نہیں ہو سکتا تھا جو اس حالت میں تم لوگوں نے اسے یہاں لانے کی زحمت اٹھائی۔“ زینب نے ان سے پوچھا۔

بغداد میں حسین بن حلاج کی شہرت سن کر اس کی والدہ محترمہ نے بامنت یہاں بھجوانے کی درخواست کی۔ ان کا کہنا ہے کہ ”صرف ایک شخص ہے جو اپنی طاقت میں مسیحا صفت اور جو اس کو حیات نو بخش سکتا ہے۔ جس کی دعا کی تاثیر تقدیروں کو بدل دیتی ہے۔“

زینب دکھ کے باوجود مسکرائی۔

”یہ دعا کرو کہ وہ اس کے لئے دعا کرنے کو تیار ہو جائے کیونکہ وہ تو اب ہاتھ اٹھا کر کسی کے لئے ایک کلمہ نہیں کہتے۔“

”مگر حسین کی والدہ محترمہ نے کہا تھا کہ وہ اس بچے کے لئے ضرور دعا فرمائیں گے۔ یہی ایک بچہ ان کی زندگی اور متاع حیات ہے۔“ انہوں نے بہت پر امید ہو کر کہا۔

”انہوں نے کبھی اپنے لئے کروائی ہوگی۔“ زینب نے پوچھا۔ ”کیا اسم مبارک ہے ان کا۔“

”اغول۔ وہ امیر حامد بن عباس کے گھر میں ہیں۔ مگر ابھی تک اپنے مذہب پر ہیں جیسے بغداد کے امراء کے گھروں میں کنیزی ہیں۔“ انہوں نے نہایت ادب سے جواب دیا۔

زینب نے جا کر دیکھا حسین سجدہ میں گرا تھا۔

”امیر حامد بن عباس اور اغول کا بیٹا دعا کا طالب ہو کر بغداد سے یہاں آیا ہے۔ اس کے لئے بھی دعا کرو۔ وہ اپنی ماں کا لخت جگر ہے اور بہت امیدیں لے کر وہ لوگ آئے ہیں۔“

زینب نے سوچا حسین اپنے مراقبہ اور دعاؤں میں ہمیشہ کی طرح اس کی آواز کب سنی ہوگی۔ مگر پھر یوں ہوا کہ سجدے میں اس کے جسم کو ایک جھٹکا لگا جیسے خود اس کی جان نکل رہی ہو۔ تڑپ اور بے کلی سے جیسے روح سجدہ ریز وجود کو چھوڑ رہی ہو۔ اس حال میں زینب نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں خون کبوتر کی طرح، گوشت کے دو ٹکڑوں کی طرح سرخ ہو گئیں۔ زینب خوفزدہ ہو

کر باہر آئی۔

”حسن! تم دیکھو تمہارے باپ کو جانے کیا ہو گیا ہے۔“

لحلوں کی یہ کیفیت ختم ہو چکی تھی اور ایک بدلا ہوا حسین اپنے جلال و جمال میں بے مثال اپنی سطوت و شوکت میں بادشاہوں کی طرح بے نیاز اور پراعتماد نہایت پرسکون مسکراہٹ چہرے پر لئے، جیسے خود اسے ایک نئی زندگی کی بشارت ملی ہو۔

”اغول اور حامد کا بیٹا سلامت رہے گا۔“ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ منصور جب ایک سال کے بعد ستر پہنچا تو حسین بھیڑ میں تقریباً دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا نگاہ نیچی اور ایک لمبی ہزار دنوں کی عقیق کی تسح کا ایک سرخ ڈھیر اس کے سامنے تھا۔ منصور نے دیکھا بیماروں اور دعا کروانے والوں کی ایک بھیڑ ان کے دروازے سے دور تک پھیلی تھی۔ لوگ کئی دنوں سے اپنی باری کے منتظر تھے اور نہایت مطمئن تھے۔ یہاں کی ہوا میں ایسی تاثیر تھی کہ شفا یاب ہونا ضروری تھا۔

باپ کو دیکھ کر حسین کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا۔ وہ اٹھا اور بھیڑ سے راستہ بنا تا باپ کے پاؤں چھو کر باہر نکل گیا۔ شام رات میں ڈھلی رات کے دامن صبح کی سرخی سے رنگین ہوئے، دوپہر ہوئی، بہار کی ہوائ نے سایوں کو جھلایا اور طویل کر دیا۔ خوشبودار گل رنگ پودوں پر کلیوں نے اپنے منہ نقابوں سے باہر جھانکنے کے لئے آدھ کے منتظر رہے اور پھر انہیں معلوم ہو گیا کہ اب شاید وہ لوٹ کر نہ آئے۔

”کیا ہی بھلا تھا تم لوگوں کے لئے بہتر اگر میں نہ آتا۔“ منصور نے زینب سے کہا۔

مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مسافر کو آخر سفر پر نکلنا ہی تھا۔“ زینب نے جواب دیا۔

”میں نے سوچا تھا تم لوگ اب زندگی کے دل میں آباد ہو گئے ہو۔ بچوں کی محبت اور ٹھکانہ آدمی کو یہ چیزیں گھیرنے کو کافی ہیں۔“

”وہ آبادیوں میں متوحش صحراؤں کا غزال ہے پدر محترم۔“ زینب نے بہت حوصلے سے کہا۔

منصور چپ ہو گیا۔ یہ مقدر تھا اور اسے کون روک سکتا تھا۔ پھر انہوں نے رخت سفر باندھا۔ حسن کو خانقاہ میں چھوڑا اور خورداد کے آخری دنوں میں جب کم کم ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی وہ بیضا کے لئے روانہ ہو گئے۔

ابوالعباس حسین قرمطی چبوترے کے قریب بیڑیاں پہنے کھڑا تھا اور اسے اپنے انجام کا انتظار تھا۔ سفید داغ پر جو اس کے ماتھے پر تھا، حریر کی لمبی ٹوپی ڈھکی تھی اور عبا کا حریر میلا تھا۔ چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ اس میں وہ استقامت نہ تھی جو عذابوں کو گوارا بناتی ہے۔ وہ ڈرا ہوا اور جھکا ہوا تھا۔ مرجھایا ہوا شجر جس کی جڑیں کسی تیز آندھی کے زور میں زمین سے باہر آ پڑی ہوں۔ المدثر اور الملق

بھی اس کے ساتھ تھے۔ وہ سب ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے اور بغداد کی پولیس کے افسر اعلیٰ کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ یہ نئی شریعتوں کو لانے والے لوگ تھے جن کے خیالوں میں ان کے اندازوں کے مطابق وحی نازل ہوئی تھی اور بشارتیں دی جاتی تھیں۔ پتہ نہیں انہیں اس انجام پر مطلع کیوں نہ کیا گیا تھا۔ اس کے مقلدوں کی ایک بھیڑ بھی اپنے انجام کو پہنچنے والی تھی اور وہ اس میں تنہا تھا۔

پہلے اس کو بے حس کیا گیا۔ پھر ہاتھ پاؤں کاٹے گئے۔ لکڑی کو آگ لگا کر اس کے کولہوں اور پیٹ کے درمیان رکھا گیا۔ پھر جب اس کی آنکھیں کھلنے اور بند ہونے لگیں تو اس کی گردن مار دی گئی تھی۔ اس کے سر کو لکڑی پر بلند کیا گیا اور اس کا جسد خاکی بغداد کے جسر الاعلیٰ پر لٹکا دیا گیا تاکہ لوگ اس سے عبرت پکڑیں۔ لوگوں نے مہدی ہونے کے رسول ہونے کے امام ہونے کے اور خدا ہونے کے دعوے کئے تھے اور اپنے انجام کو پہنچے تھے مگر لوگ ایک دوسرے کو انجام سے عبرت نہیں پکڑتے۔ کیا یہ آدمی کی سرشت میں تھا؟

یہ ایک بڑی فوج تھی جس نے دیا مصر میں تباہی مچا رکھی تھی۔ ابن جبیک مفتی باللہ جو معتضد کے بعد تخت خلافت پر متمکن ہوا تھا اور دین کی حفاظت کے لئے مدینۃ السلام سے رقد آیا تھا۔ پھر قرمطی فتنے کو نیست و نابود کر کے وہ قیدیوں کے ہمراہ فتح یاب واپس ہوا۔ وہ نرم روشیں گفتار اور مہربان تھا مگر اسلام کی حفاظت کچھ لئے عبادی خلفاء اب تک سینہ سپر ہوتے تھے۔ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اور زندگی کے بعد جنت میں مقام حاصل کرنے کی خواہش میں جنت تقریباً ناقابل حصول انسان کی گرفت سے دور اور ہر مسلمان کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ بشارتیں، خواب، الہامات، خوشخبریاں، ریاضتیں سب اس کے لئے تھیں۔ مگر ایک ایسا گروہ تھا جو ان سب سہولتوں کے خیال سے ماورا تھا۔ جس کے ارادے عظیم تھے جو کسی بھی دنیا کے طالب نہ تھے۔ جن کا مطلوب مقصود صرف وہ تھا۔ وہی وہی..... ہو ہو۔“

بظاہر اس سے بڑی جسارت اور کیا ہو سکتی تھی کہ آدمی ممکنات کی حدود سے نکل کر خالق کائنات کی تلاش میں نکلے۔ اس کی نظر ایک ذرہ ناچیز کی نگاہ گستاخ سے سراپردہ اسرار سے پرے جانا چاہئے۔ اس دنیا کی محبت میں لوگوں نے اس دنیا کو ٹھکرایا تھا۔ شہادت کے ملٹاشی رہے تھے اور جو دیوانے خالق کل کی تلاش میں تھے ان کا انجام بھلا کیا ہونا تھا۔ وہ جو ناممکنات سے بھر سجدوں کو جبین میں لئے گھومتے تھے جانے کس آستان پر جبین سائی کرنا چاہتے تھے۔ ایسا ہونا بھلا کیا ممکن تھا۔ جیسے پروانے شمع کو پکڑنا چاہیں اور اس کے شعلے کی اصل کو جاننا چاہیں۔ بھلا جل کر کوئی بتا پاتا تھا کہ جلنے میں کیا لذت تھی۔

حسین نے ستورز کے جنوب میں لوہار کی بھٹی دہکاتے ہوئے سنا ایک اندھا فقیر کشلول تھاے گاتا ہوا گلی میں سے گزرتا تھا۔ مگر اس کا آقا سخت گیر تھا اور بھٹی کو دہکانے کے کام میں زیادہ انہماک اور توجہ چاہتا تھا۔ ہتھی کو چپھرتے ہوئے جب چمڑے کی مشک میں ہوا بھرتی اور ہوا کو نکلوں کو دہکاتی تو چنگاریاں اڑ کر ادھر ادھر پھیلتیں؛ بھٹی میں رکھا ہوا لوہا تپ جاتا، سرخ ہو جاتا، اتنا سرخ کہ وہ کو نکلوں کا حصہ لگنے لگتا۔ آگ بن جاتا۔ آگ میں اور اس میں فرق کرنا ممکن نہ رہتا۔ یہاں تک کہ حداد کی آواز سنائی دیتی۔

”ابن منصر اب اسے باہر نکالو۔“

اور دوسرے ملازم سے کہتا ”اس پر تیزی سے ضرب لگاؤ۔ اس انگارے پر ہتھوڑے سے کوٹو تاکہ جس شکل میں ڈھانا ہو ڈھالا جاسکے۔“

حسین بھٹی کے قریب دھونکی میں ہوا بھرتا رہتا۔ جب اس کا ہاتھ ذرا ڈھیلا پڑا تو ابو سلمان کہتا:

”لوہے کی شناخت بدلنے والے سویا نہیں کرتے۔“

یا پھر کبھی زیادہ خفا ہوتا تو کہتا ”تم کبھی اچھے استاد نہیں بن سکو گے ابن منصور۔ تم کام ہوئے خواب دیکھتے ہو۔ یہ رزق حلال کھانے والے کی عادت نہیں ہونا چاہئے۔“

کبھی بہت موج پوتا اور حشیش کا دم لگا کر بیٹھا ہوتا تو کہتا:

”حسین! مجھے بتا سکتے ہو تم کیا خواب دیکھتے ہو۔ تمہاری آنکھیں پتہ نہیں چیزوں کے پرے دیکھتی ہوئی لگتی ہیں۔ تمہاری نگاہیں کہیں اور بھٹک رہی ہوتی ہیں۔“

پھر دوسرے آدمی سے کہتا: ”صدام! لوہے کو تلواری بنانے کے لئے اس کی ضیافت ضروری ہے۔“

پھر حسین کا دھیان باہر کی طرف گیا جہاں پانی کی نالی سے پاؤں باہر نکالتا وہ گارہا تھا اور ٹھوکر لگنے سے اس کا کشلول الٹ گیا تھا۔

مجھے الزام نہ دو۔ مجھے عاقبت سے نہ ڈراؤ۔

مجھے انعام دو! ملک میں اکیلا ہوں۔

مجھے الزام نہ دو۔ مجھے قیامت سے نہ ڈراؤ۔

حز حداد زور زور سے ہنس رہا تھا ”برادر! تم کو الزام کون دیتا ہے مگر تمہارا انعام یہ ہوا کہ تم سے کشلول کی متاع چھن گئی، الٹ گئی، مشیت نے اسے تم سے لے لیا۔“ صدام! اگر تم ہتھوڑا رکھ کر بیٹھے ہو تو اس کی مدد کرو۔ اس کا کشلول سیدھا کر دو۔ اسے کھانے کے لئے

روٹی لا دو۔“

اس کی بیوی نے جوڈیوڑھی کے دروازے کے قریب اپنے سوت کی انٹی سلجھا رہی تھی، بڑی درشتی سے کہا ”حداد ہو کر تم کو سخاوت زیب نہیں دیتی۔ دکان میں دو دو منہ کھانے والے ہیں اور تمہارا دوزخی پیٹ ہے اور اب تم اس ناپینا پر اپنی نیک دلی کا سکہ بٹھا رہے ہو۔ صدام! کوئی ضرورت نہیں روٹی لانے کے لئے اندر آنے کی۔ سنا تم نے۔ اگر کوئی بھی اندر کی طرف بڑھا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“

صدام نے دونوں ہاتھ اپنے سر پر ڈھیک کر کہا ”کشفول ولاے کو کہیں نہ کہیں سے کوئی شے مل ہی جائے گی۔ خدا اس پر مہربان ہے۔“ اور اس نے لمبے دست پناہ سے باہر کھینچ کر تھوڑے سے لوہے پر ضربیں لگائیں۔
فقیر آگے نکل گیا۔ گلی میں کتے بھونکے۔ بچے چیخے اور پھر خاموشی ہو گئی۔
حسین نے جنگل میں اپنی عبادت گاہ کے ایک کونے میں سجدہ ریز ہو کر کہا۔

”میرے پروردگار! میں اکیلا ہوں۔ اے میرے مالک میں اکیلا ہوں۔ مجھے وہ عطا ہو جس سے وحشت تنہائی دور ہو۔ مجھے اپنی محبت کی آتش سوزاں میں پکھلنے کا حوصلہ تو دے۔ ہاں میرے خالق! مجھے انعام دے کہ میں اکیلا ہوں۔“
اور پھر اس خاموشی میں جس پتوں کی سرسراہٹ ہوا کی چلت پھرت اور شاخوں کا ٹوٹنا، چٹخنا، پرندوں کی بولیاں، خوشبو اور سایہ تھا۔ اس نے محسوس کیا اس سے ذرا پرے کوئی جنگلی بیلوں اور روئیدگی میں سے اپنی تھوٹنی نکال کر ارد گرد سونگھا اور اس کی عبادت گاہ کی طرف آیا۔ باہر کھڑا رہا۔ جیسے منتظر ہو۔ پھر اس کے اکیلے پن کو دور کرنے اور اس کی اس تعلق کے جواب میں کہ مالک میں اکیلا ہوں، جنگل کے چرند پرند اور زمین کے نہاں خانوں کی مخلوق وہاں جمع ہونا شروع ہو گئی۔

حسین نے سجدے سے سر اٹھایا تو وہ ہنسا۔ اس کی وحشت تنہائی کو دور کرنے کے لئے یہ عطا تھی۔ اور وہ اکیلا نہیں تھا۔
اسے مانگنے، سوال کرنے کا سلیقہ بھی نہیں تھا۔

حضرت عمر بن عثمان مکی کے دروس میں جب وہ شریک ہوتا تھا تو وہ ہدایت کرتے تھے۔
حق تعالیٰ کی طرف کامل توجہ کرو۔

سچ کی طرف رغبت کرو۔ عالم روحانی کی طرف نفس لگاؤ۔

نفس کو بری صفات سے پاک رکھو۔

اس کو بدنی صفات سے روکو۔

اس کو عمدہ صفات سے متصف کرو کیونکہ یہ سب باتیں اس کو روشن کرتی ہیں۔ نفس جس قدر قوی ہوگا، ظلمت و تاریکی دور کرنے پر اسے قدرت حاصل ہوگی = نفس پر ان ارواح سے فیضان ہوگا اور مشاہدہ کامل حاصل ہوگا۔ پھر جب فیض کا حکم اس سے منقطع ہوگا تو نفس عالم شہادت کی طرف اپنے سارے علم کے ساتھ پلٹتا ہے۔

اور پتہ نہیں اس نے خلاف شرع کیا کام کیے تھے کہ اس کے حجاب بڑھ رہے تھے۔ ظلمت اس کے چاروں طرف تھی اور خواب میں اسے قبیح صورتیں دکھائی دیتی تھیں۔ پریشانی خواب جن میں اغول کا سراپا اور روتی ہوئی زینب کی صورتیں دکھائی دیتیں۔ یہ خوفناک امور تھے اور وہ سارے امور اس کے احوال ظاہری کا نتیجہ تھے۔ شیطان نے یہ سچی اور جھوٹی باتیں ملا کر اس کے گرد ایک جال پھیلا دیا تھا۔ وہ کس طرف جائے کیا کرے۔ اس کے فیضان کے راستوں پر یہ سب بیٹھے تھے۔ ان مہلکوں سے بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ قرآن وحدیث جو رسول خدا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کشف تام کی خبر دیتے تھے۔ کیا اس کے نصیب میں ہر گام پر روز اول تھا کہ وہ قرآن وحدیث کی روشنی سے بھی فیضان حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

فہم وادراک بھی مل کر کبھی اس اصل تک نہیں پہنچ سکتے۔

اعیان ثابتہ کا ادراک بھی اصل نہیں ہوتا۔ اصل تک پہنچ نہیں پاتا۔

اصل کا ادراک مشکل ہے اس لئے اصل کے اصل تک رسائی کیسے ہو۔

اللہ اصل سے ماورا ہے اور اس اصل میں خدا شامل نہیں ہے۔

کیونکہ وہ ہر اصل کے اصل سے ماورا ہے۔

کلی معظفہ میں وہ ایک کھوئے ہوئے انسان کی طرح گھومتا تھا۔ ابن عطاء نے اس سے کہا:

”تمہاری جسارت پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔ تم کیوں اتنی شدید ظلمت کرتے ہو۔ ماورا کا بھی ماورا اور اس سے آگے۔ اپنے آپ و

سنجھا لو ورنہ کفر کے الزام سے بچ نہ سکو گے۔“

”بچنا کون چاہتا ہے۔ میں تو اس سر کو جو بار دوش ہے بے وجہ سنجھا لے پھرتا ہوں۔“ حسین نے کہا۔

لبریز اور معمور اور مدہوش و خوابناک آواز نے ابن عطا کو ہلا کر رکھ دیا۔ لرز کر انہوں نے کہا تھا:

”اگر تمہیں یہ سعادت نصیب ہوئی ہے تو سجدہ شوق میں تمہارا وجود گھل جانا چاہئے تھا۔ تم ابھی نامکمل ہو۔ سائل ہو کر بھی جانے

کیوں شان استغنا سے یوں بات کرتے ہو جیسے احسان کرتے ہو۔ تمہارا سوال کون پورا کرے گا۔“

”اگر اس کون کو پاسکوں تو سوال بھی کہوں۔“ حسین نے اپنی گدڑی کو لپیٹتے ہوئے کہا جس میں سے ایک بڑی جوں گری تھی، ہڈیوں پر کسی ہوئی تقریباً بے آب کھال اور بے پناہ تابناک آنکھیں جو ابن عطا کے اندر تک دیکھ رہی تھیں۔

”میں حالت تنزل میں ہوں۔ یہ نفس مجھے معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔ میں نفس کو مارنے، تفرقہ اور بعد کو رفع کرنے اور رجوع الی اللہ میں لگنا چاہتا ہوں مگر میرا نفس عود کرتا ہے اور میں ان افعال و اخلاق پر تبرا کرتا ہوں۔ ملامت کرتا ہوں۔“ ابن عطا نے ہنس کر حسین کی طرف دیکھا۔

”یہ حالت پہلی حالت سے عمدہ ہے اور فرشتوں کی صفات تم میں پیدا ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ تم محو ہو جاؤ اور الامات کا سلسلہ تمہارے نفس کو مطمئن کر دے اور تمہارا قلب سلیم ہو جائے اور پھر قلب سلیم نفس حق ہو۔“ ابن عطا نے ہولے ہولے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”ہاں۔ یہ مبادیات مجھے سمجھاؤ کہ میں بار بار اسی مقام پر رہوں جہاں سے چلا تھا۔ قدم قدم نہ جلی نہ اشارہ۔ یہ تو صحرا میں پیدل چلنے ریت میں دھنسنے اپنے آپ کو دلدل سے نکالنے اور پھر دب جانے دفن ہو جانے کے برابر ہے۔ کوئی سواری نہیں۔ کوئی ناقہ تیز گام نہیں کہ کہہ سکوں۔“

”اے ساربان آہستہ چل کہ میری پسلیوں میں آگ ہے“

اجیال اکبر میں یمن کی سرہا قوم کے قافلے اترے تھے۔ اونٹوں پر عیاریاں اور قبے، میلی چادریں، لمبی ٹوپیاں پہنے ہوئے اور گھائی سے ادھر ادھر ساری جگہیں ان سے پر تھیں۔ اناج اور خرمے، انگور بادام کے لدے ہوئے اونٹ مکہ کے بازاروں میں ان کے آنے سے ہر شے ارزاں ہو گئی تھی اور خوشی کی ایک لہری دوڑ گئی تھی۔ جبل ابوقیس سے ملے ہوئے راستے پر بھی ان کے شور و غوغا کی گونج پہنچتی تھی اور حسین کو اپنے مراقبوں میں اکثراً ہوا کے ساتھ یہ گونج سنائی دیتی۔ جب کی یہ حرمت والی راتیں عمرہ کرنے والوں کے جوش و خروش سے یوں لبریز تھیں جیسے شیریں دودھ سے پیالہ، تقدیس و تکریم اور ذکر و سوز سے معمور سننے والوں کے رنگٹے کھڑے کرنے والی آوازیں، یہ لوگ دعا پڑھتے تھے۔ ان کی بے تابانی شوق اور بیت المکرم کے لئے ان کی محبت رنگین داستان کی طرف خواب آگئیں اور کھلے زخم کی طرح تڑپا دینے والی تھی۔ عام زندگی میں وہ لوگ نماز پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ سجدہ سے سراٹھا کر ادھر ادھر لیتے۔ باتیں کرتے ہوئے نماز پڑھنے لگتے مگر دعا میں ان کی جانیں پگھل کر ان کی آنکھوں سے آنسو بن کر بہنے لگتیں۔ ان کا

نیا زان کی عاجزی، ان کی خاکساری، وہ الحاح و زاری ہر کسی کو نصیب نہ تھی۔ جب وہ دعا کرتے تو لوگ ہاتھ اٹھا کر ان کے ساتھ آمین کہتے۔ رب کعبہ نے ان کی دعاؤں کو تاثیر بخشی تھی۔ ایک طرف یہ عجیب تھے کہ ہنٹے کھیلنے اس وادی شوق میں اترے تھے اور پتھروں کو پگھلانے کی طاقت ان کی زبان میں تھی۔ اور ایک یہ عجیب تھا حسین جو اپنے آپ کو گھلانا چاہتا تھا مگر اس کا وجود سب سے بڑا پتھر تھا۔

”اے پروردگار! ان سب کی جانوں کا سوز مجھے عطا کر۔ اب رب کعبہ! مجھے ان کی زبانوں کی تاثیر عطا کر۔“

اور اس گھائی میں چاند کی تیز روزنی میں جو نور بن کر اتر رہی تھی، ان کے اونٹوں کے درمیان چلتے ہوئے حسین نے اپنے سائے کو دیکھا۔

”میں ہی وہ ظلمت ہوں، کثافت، جو کسی پر تو سے روشن نہیں ہو سکتی۔“

وہ زور زور سے ہنسنے لگا جیسے دیوانہ ہو گیا ہو اور اب حضرت جنید بغدادی کی بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ وہ آج تک شعبدوں میں لگا رہا تھا۔ یہ تصرفات جو تھوڑی سی کوشش سے لوگوں کو نصیب ہو جاتے تھے، دیواروں کے پار دیکھ لیا، ہوا میں سے چیزوں کو حاضر کر دینا، دوسروں کے دلوں کی بات بتا دینا، پرتا شیر دعائیں، بیماریوں سے شفا کے لئے ہاتھ اٹھانا اور بیماری دور کر دینا۔ آدمی کے اندر بھے پناہ پوشیدہ طاقتیں تھیں اور تصرفات تو کچھ بھی نہ تھے..... گورحمت خداوندی شامل حال تھی مگر وہ ان رمتوں کی فکر میں نہ تھا۔ اسے وہ نگاہ چاہئے تھی۔ وہ تو کچھ بھی نہیں چاہتا تھا۔ کسی شے کا بھی طالب نہ تھا، سوائے اس نگاہ کے۔

حسین بھی نگاہ کی تلاش میں تھا۔ اس کے دنوں کی تپش بس اس ایک نگاہ کے لئے تھی مگر خدا کی مرضی کیا تھی، پتہ نہیں وہ اس کی طرف کب دیکھے گا۔ دیکھے گا بھی کہ نہیں۔

باب المعلى سے اتر کر لوگ عمرہ کے لئے جا رہے تھے۔ خوش اور پر شوق اور دلوں میں دعائیں لئے، لبوں پر دعائیں لے دست بدعا، امیر مکہ اپنی فوج کے ہمراہ نگلی تلواروں کے پہرے میں کربوں اور کھیلوں اور نقاروں کے ساتھ۔ آس پاس پہاڑ تماشا دیکھنے والوں سے بھرے تھے۔ مسجد عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تک سرد کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ لوگ دیوانہ وار طواف کر رہے تھے۔ سرد ہوا میں تیزی تھی اور بادلوں سے بھرے آسمان پر سورج کی روشنی سفیدی بن کر ان پردوں سے منعکس ہو رہی تھی۔

پردوں اور غلافوں سے ڈھکایہ خانہ خدا کیا صرف اینٹوں اور پتھر کا گھر تھا؟ جس کے گرد لوگ یوں پھرتے تھے جیسے شمع کے گرد پروانے۔ جاں نثار کرنے والے، فدا ہونے والے، اس کی ایک جھلک کھ لئے دروازے سے سفر کر کے آتے تھے۔ راہ کے مصائب اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے تھے۔ اس سرزمین کی مٹی میں بھی شفا تھی۔ بیمار جانیں، گھری ہوئی روئیں، صحت و انبساط سے ہم

کنار ہوتی تھیں۔ یہ گھر جو حجر اسود کی طرف سے ظاہر ہے۔ یہ پر اسرار سطون قطب ہے اور روح القدس اس مکان کی جان روح محمدی اور ساری جانیں جو اس کے گرد چکر کاٹتی ہیں؛ دراصل والا و شیدا ہیں کہ اسے کے سائے تلے اپنے ازلی وجود سے ملائی ہوں۔ تمام اعیان اور مظاہر خدا کے اس گھر کے سائے تلے آشکار ہوں۔ یہ روحانی تجربہ جس میں آدمی اپنی بے تابیوں کو بھول کر تسکین و قلب سلیم کے ساتھ اس بیعت معمور میں داخل ہوتا ہے۔ سارے علم کے ساتھ جواول و آخر ہے ظاہر و باطن ہے جو خدا ہے۔ کائنات کا دل ہے۔ کعبہ دل اور کعبہ کے گرد طواف ہوتا ہے۔ آدمی تلاش کرتا ہے اور یہو اف تلاش ہے حرف راز کی تلاش مگر تلاش کرنے والا اکیلا نہیں ہوتا۔

جبل البقیس کی اس گھاٹی میں اتر کر جب حسین نے ناقاؤں کی قطاروں کو دیکھا، خیموں کے سامنے الاؤ جلتے دیکھے آگ کے شعلے دیکھے روشنی دیکھی اور اس کا جی چاہا اس آگ کی اصل اپنے دل میں پوشیدہ آتش سوزاں پر بھی اطلاع پائے۔ زندگی کے دل میں رہتے بہتے یہ سادہ دل لوگ جو کسی پریشانی میں مبتلا نہ تھے اور آسمان کی کھلی آنکھوں تلے شاید عین مین اپنے خدا کی نظر میں تھے محبوب حقیقی کی نگاہ میں۔

بیت کعبہ روشنیوں سے منور تھا۔ لوگ طواف کرتے حجر اسود کو بوسہ دیتے، غلاف کعبہ کو پکڑ کر آہ و زاری اور دعاؤں میں لگے تھے۔ حسین قبۃ زمزم کے پاس کھڑا تھا اور منتظر تھا کہ کب اس کی باری آئے اور شعبان کی اس مبارک رات میں جب زمزم کے کنویں کا پانی بڑھ جاتا ہے وہ بھی سیراب ہو کہ کسی نے عقب سے اس کا دامن کھینچا۔

حسین نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ ایک کنیز تھی۔ منہ کو چادر سے چھپائے، خوشبو سے معطر اور اس کے لباس کو جو حصہ ظاہر تھا وہ بہت عمدہ تھا۔ ایسے ریشم سے بنا جو بغداد کے محلہ عتابیہ میں ہی بنتا تھا۔ اسے اپنا باپ منصور یاد آیا۔ زینب، حسن اور محمٰی، پورا ماضی ایک کوندے کی طرح لپکا۔

”ابن منصر۔ ایک بیمار کے لئے دعا کی حاجت ہے۔ میں پہرہ دن رہے سے تمہاری تلاش میں ہوں۔“
حسین نے مڑ کر دیکھا۔ چونکہ صورت ظاہر نہ تھی وہ اسے پہچان نہیں سکا۔ اس نے جواب بھی نہیں دیا۔
کنیز نے پھر کہا ”بیمار جاں بلب ہے۔“

”یہ خانہ خدا ہے اسے زمزم پلاؤ۔“ حسین نے جواب دیا۔

”وہ کچھ بھی نکل نہیں سکتا اس کا منہ بند ہے۔ ایک قطرہ پلا نا ممکن نہیں۔“ کنیز نے کہا۔

لوگوں کے جمع میں سے جو اس بخ بستہ رات کو قبہ زمزم کے گرد جمع تھے وہ دونوں باہر نکلے۔

”میں طیب نہیں ہوں خود بیمار ہوں۔ تم کسی اور سے دعا کے لئے کہو۔“ حسین نے پھر رک کر کہا۔

”آپ میرے ساتھ چلے تو کسی۔“ کنیز نے اب تیز چلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ لمبے لمبے قدم اٹھا رہی تھی اور معالج سر جھکائے اس کے پیچھے تھا۔ باب السفل کی طرف جو مکہ معظمہ کا جنوبی دروازہ ہے وہ ایک گلیارے میں داخل ہوئے۔

”چلے آئیے۔“ مڑ کر دیکھے بنا کنیز نے کہا اور ایک اونچا دروازہ کھول کر اندھیرے میں داخل ہو گئی۔ حسین تذبذب کی حالت میں باہر کھڑا رہا۔ یہاں تک کہ خاصی دیر ہو گئی۔ اس نے سوچا یہ کسی گمراہ کن خواب کا ایک حصہ ہے اور وہ حالت خواب میں ہے۔ یہاں تک کہ ایک کمزوری روشنی اور ایک نہایت شیریں آواز نے اس کی راہ نمائی کی۔ اوپر دیکھے بنا وہ اس کرن کے تعاقب میں دروازے کو پار کر گیا۔

”بیٹھ جاؤ حسین۔“ شمع کی لوکی طرح آواز کی لپک نے ماضی کی یاد کے کوندے نے اسے اچک لیا۔

مخملیں نشست پر وہ اکڑوں ٹک گیا۔

”بیمار کہاں ہے۔“ حسین نے سوال کیا۔

”میں ہوں۔“

طیب نے آواز کی سیدھ میں دیکھا۔ سنہری زلفیں کرنوں کی طرح اس چہرے کو ہالہ کئے تھیں۔ صرف گود میں کتا نہیں تھا اور وہ جھکی ہوئی نہیں تھی۔ آنکھیں خشک تھیں۔

حسین تڑپ کر کھڑا ہو گیا اور پھر دروازے کی طرف لپکا۔

”تم ہی دین دار اور نیک نہیں ہو۔ تمہیں اپنی کن قوتوں پر اتنا ناز ہے۔ بیٹھ جاؤ۔“

سحر زدہ سا وہ پھر اور نشست پر تقریباً ڈھس گیا۔

”کیا میں تمہیں یاد ہوں حسین۔“

سر کے اشارے سے حسین نے جواب دیا۔

”ابن منصور! حیرت ہے نا۔ ہم کبھی نہیں ملے۔ تقریباً نہیں۔ اس کے باوجود تمہاری زندگی ایک مسلسل اور بدلتی ہوئی تصویر کی طرح ہر لحظہ گھڑی میری نگاہوں کے سامنے رہی تھی۔ جیسے ہوا پر کوئی مصور رنگوں سے نقوش اجاگر کرتا جائے اور یہ طاقت مجھے تمہارے

نام نے دی تھی۔ تمہاری شخصیت نے تمہارے خیالوں نے یہ جلا تمہارے اس وعدے نے بخشی تھی۔ جب اس حوض کے کنارے رات کے پچھلے پہر چاندنی میں تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ نہیں میں بھول رہی ہوں۔ میں نے تم سے وعدہ لیا تھا التجا کی تھی کہ تم مجھے بھلاؤ گے نہیں۔ میں جو کچھ بھی ہوں تمہاری وجہ سے ہوں۔ تم میرے مسیحا ہو اور تمہارا دم عیسیٰ ہے۔“

وہ حیران سا اس کی باتیں سنتا رہا۔ وہ ہنوز خواب میں تھا۔

”کیا تم میری باتیں سن رہے ہو۔ زمانوں سے تم مجھ سے نہیں ملے۔ ہماری ملاقات تقریباً کبھی نہیں ہوئی اور اب کہ میرا وقت آخر ہے۔ میں یہ سب تمہیں بتانا چاہتی ہوں تاکہ تم سمجھ سکو کہ جب تک یہ سب مشیت نہ ہو کوئی ریاضت کہیں نہیں لے جاسکتی، مشقتیں کچھ کام نہیں آتیں۔ خدا سے توفیق مانگو حسین اور اس کی نگاہ کرم۔ جن پردوں کے پار آدمی دیکھنا چاہتا ہے وہ ہٹ بھی جائیں تو بھی نگاہ حجاب بن کر درمیان میں آ جاتی ہے۔ میں ایک کمزور عورت ہوں اور تمہارے دین پر بھی نہیں ہوں۔ میری باتیں اہم نہیں ہیں مگر ان میں غور کرنا زندگی اور موت میں کوئی ایسا فاصلہ نہیں ہوتا۔“

وہ دم لینے کو رکی تو حسین نے ارد گرد دیکھا۔ وہاں ان دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔ باریک ریشمی پردے سا کن تھے، ہوا چپ تھی اور دنیا آوازوں سے خالی تھی جیسے وہی دونوں باقی رہے ہوں۔

”حسین! تم اس بات پر بھی گواہ رہنا میں ابن مریم کو خدا کا بیٹا نہیں سمجھتی۔ وہ حضرت جبریل کے نفخ سے پیدا ہوئے تھے اور چونکہ وہ حضرت مریم بشری صورت میں ظاہر ہوئے تھے اس لئے حضرت عیسیٰ میں زندہ اور اچھا کرنے کی جو قوت تھی وہ حضرت جبریل کی جہت سے تھی۔ ان مردوں کو زندہ کرنے کا فعل اللہ کی طرف سے تھا کیونکہ یہ صفت صرف اور محض خدا کی صفت ہے اور جو لوگ یہ سوچتے ہیں کہ خدا ان میں حلول کر گیا تھا وہ گمراہ ہیں۔“

”اغول۔“ حسین نے گھبرا کر کہا اور کھڑا ہو گیا۔

”حسین! یہ میری آخری گھڑیاں ہیں۔ ایمانا میں ایک نسطوری عورت ہوں مگر میرا عقیدہ سب سے مختلف ہے۔ اب اس گھڑی جب زندگی کی روشنیاں ختم ہو رہی ہیں میں نے ہمیشہ تمہاری قوتوں کو بھی خدا کا دین جانا ہے اور تمہارے نفس کو نفس مسیحا، حالانکہ وہ روح اللہ تھے اور یہ بھی یاد رکھو کہ میں نے جس گھڑی سے تمہیں دیکھا تھا تم سے محبت کی ہے۔ اتنی ہی جتنی مجھے اپنے آپ سے ہے۔ محبت بڑی مہربان ہوتی ہے، مگر ان فرشتے کی طرح۔ اس نے ہم دونوں کی حفاظت کی ہے۔ ہمیں بھٹکنے سے بچایا ہے۔ محبت کائنات کا دل ہے حسین۔ خدا کی رحمت اور میں آخری گھڑی میں نہایت طمانیت محسوس کر رہی ہوں اور میری آرزو ہے کہ تم خدا کی محبت میں

مشقت نہ کرو۔ اس کو مجبور نہ کرو۔ مشیت میں جو ہے وہی ہوگا۔ بس نگاہ کے لئے دل کو پاک رکھو اور امید وار رہو۔“

پھر وہ لیٹ گئی، جیسے تھک گئی ہو۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کینز نے اندر جھانکا نہایت سرد ہوا کا جھونکا پردوں میں سے سر سراتا اندر آیا۔

چراغ لوکا نپی اور پھر بجھ گئی۔

حسین نے اس اندھیرے میں سوچا۔

”اغول کے لئے سب کچھ اتنا آسان کیوں تھا۔ محبت کرنا، دل کی بات کہنا، برداشت کرنا، زندہ رہنا، ابھی ہوئی باتوں کو سمجھنا۔

پتہ نہیں اس نے یہ طاقت کہاں سے حاصل کر لی تھی کہ اسے اس کی پوری زندگی کی ایک ایک ساعت کا علم تھا۔ یہ علم اس نے کہاں سے سیکھا تھا۔ وہ کیوں ایسی بنائی گئی تھی اور اس کی راہوں سے کیوں گزری تھی۔ انہوں نے وہ ذروں کی طرح ایک لمحے کے قیام سے کیا پایا تھا۔

اور آخر میں اس نے اسے کیوں بلایا تھا۔ کیوں اس سے ملنے کی متنی تھی حالانکہ جب وہ بغداد میں تھا تو وہ یقیناً یہ جانتی تھی اس نے اس سے ملنے کی کبھی کوئی کوشش کیوں نہیں کی۔ پھر وہ باب السفل میں اس گلیارے میں اس نہایت خوشنما گھر میں کیوں تھی۔ حسین کو یوں محسوس ہوا جیسے عرش اور فرش اس کے خلاف ہو گئے ہیں۔ کائنات بکھر گئی ہے۔ چند ستارے ٹوٹ گئے ہیں اور اس مرد واحد کی اس کی کائنات برباد ہو گئی ہے۔

جبل ابوقیس پر وہ نہایت کھویا حوا حیران دھوپ اور سائے تمازت وحدت سردی اور گرمی سے بے پرواہ رات اور دن کے فرق سے بھی بے نیاز بیٹھا تھا۔ لوگ اسے ایک دیوانہ سمجھتے، جذب حال سے مغلوب، جب شام رات میں ڈھلنے لگتی اور نیلی ہوا ان آبریز پہاڑوں سے نیچے وادی میں چراغوں کی لوؤں کو جھلاتی تو اس دیوانے کا سایہ معدوم ہو جاتا۔ شعبان گزر کر رمضان المبارک کی ذکر و فکر سے آباد راتیں گھاٹیوں اور وادیوں، آبادیوں اور ویرانوں پر اتری تھیں اور پیالہ نما نشیب میں رب کعبہ کے دیوانے طواف میں پردانوں کی طرح گھومتے تھے حجر اسود کو بوسہ دینے کے لئے اور اسرار کعبہ کو جاننے کے لئے سرگرداں ہوتے تھے اور در کعبہ ہر روز دا ہوتا تھا۔

سمنون محب نے حسین کو پکارا تو اس کو اپنے جسم سے مس کرتی ہوا میں ایک عجیب سنسناہٹ سی محسوس ہوئی۔ یہ پکار گویا ایک تازیانہ تھا جو اسے بھگا رہا تھا۔ ایک کوڑا تھا جو ان دیکھی طاقتیں اس کے گرد لہرا رہی تھیں۔

”ابن منصور! کیا جبل البقیس کا حصہ بننے کا ارادہ ہے۔“ انہوں نے کہا۔

حسین نے سر کو جھٹکا، آنکھیں ملیں اور حیرت سے ان کو دیکھا۔

”کیا مجھے نہیں پہچانتے ہو، دیکھو۔“ انہوں نے پھر آہستہ سے کہا۔ ”یہ صریحاً گستاخی ہے، بے ادبی کہ تم حرم کعبہ کے سامنے محض اس

لئے متمکن رہو کہ ایک نسطوری عورت کی محبت تم سے بازی لے گئی۔“

حسین نے سر جھکا لیا۔ کیا وہ رسوا ہو گیا تھا۔

”تم محبت کی طاقت ہے واقف نہیں ہو حسین۔ تم ہر جذبے کو صرف اپنا ہی سمجھتے ہو، نا۔“ انہوں نے شفقت سے اسے دیکھا۔

حسین نے ایک آہ کھینچی اور خاموش رہا۔

”یہ سب عطیہ خداوندی ہے اور راہیں کسی پر بند نہیں ہیں۔ تمہارے خیال میں صرف گدڑی پوش ہی خدا سے محبت کر سکتے ہیں۔

صرف اپنے آپ کو رسوا کرنا ہی محبت کرنے کا طریقہ ہے۔ ہاؤ ہو اور سینہ کو بی ہی سے یہ جذبہ تسکین پاتا ہے۔ تم اپنے آپ میں الجھے

ہوئے۔ سمجھتے کیوں نہیں ہو۔“

حسین نے محسوس کیا کہ اس درس محبت کو اس کے گرد پہاڑ اور ان پر کی روئیدگی اور وادیوں میں سائے اور گھاٹیوں میں گھاس

چھوٹے بڑے درخت، پانی کے چشمے اور جھکا ہوا پیالے کی طرح سروں پر ڈھکا ہوا عرش سب سن رہے ہیں۔ ہو ا وجد کرتی ہوئی جھومتی

ہوئی، نیلگوں آسمان بے ستونوں کی دنیا پر سایہ کئے ہوئے دھواں دھواں سا گوش بر آواز ہے۔ فرشتگان اور مقربین بارگاہ الہی ہمہ تن

گوش ہیں۔ حرم کعبہ اور مکہ کی گلیاں، دروازے اور راستے لوگوں کا جم غفیر اور سواری کے جانور سے چپ چاپ سامع ہیں۔ سمنون محب

کے اس درس محبت کو جو نہایت شیریں لہجہ اور نرم آواز میں صرف حسین کو دے رہے ہیں۔

”حسین یہ راز عرشیاں ہے اور راز زندگی ہے۔ کیا اس کے بوجھ کو برداشت کر سکتے ہو۔“

جب وہ چپ رہا تو انہوں نے پھر کہا:

”یہ نفس حیات ہے جس شے پر بھی پھونکو گے جاگ اٹھے گی۔ یہ نفس جبریل ہے۔ سامری نے ایک مشت خاک سے اپنے

بچھڑے کو پوجنے کے قابل بنا لیا تھا اور تم ابھی تک سرگرداں ہو کہ اس نسطوری عورت نے کیوں اور کیسے اس راز کو پالیا حسین یہ سعادت

صرف خدا کی عطا ہے۔ عطا اور وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔“

”سب چیزیں فروزاں ہیں صرف میرا دل بجھا ہوا ہے۔“ حسین نے کہا۔

”اپنے آپ کو جلاؤ روشن کرو۔“ سمنون محب نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”آتش سوزاں سے بچنے کے لئے میں نے یہ راہیں اختیار کیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ آگ میں ہی رہوں۔ میں مجوسیت سے الگ اور بلند ہوں۔“ حسین نے ٹٹول ٹٹول کر لفظ ڈھونڈ کر ایک ایک حرف کر کے اپنا مطلب ادا کیا۔

ایک مقام پر جدائی اور محبت کا مطلب کیا ہو جاتا ہے۔ سوزا اور محبت کا مطلب ایک ہوتا ہے۔ فنا اور بقا کا راستہ ایک ہے۔ خود فنا اور بقا ایک ہی ہیں۔“

حسین اور سمنون محب طواف کرنے والوں میں شامل ہو گئے۔ خطیم اور ملتزم مقام ابراہیم پر روشنیاں ہی روشنیاں تھیں اور خانہ خدا کے گرد لوگوں کا جھوم تھا۔ گریہ وزاری کرتے مغرت کی دعا کرتے لوگ غلاف کعبہ کو لپیٹے جیسے ان کو جان اسی گھڑی جان آفریں کے حوالہ کرنا ہو۔

حسین کا دل کہتا تھا۔

یہ دروازہ اس مقام کی طرف لے جاتا ہے جہاں سچ ہے۔

مگر تم ایک دم اس سچائی تک نہیں پہنچ پاؤ گے کیونکہ اب تم خود ایک بندر ہو۔ تیسرا بندر دروازہ تلاش کرنے والا جو بھٹک گیا ہے سچائی کے صحرا میں سچ کی اصل تک اور جو سچائی کے دائرے سے باہر کون جاسکتا ہے۔

دائرے میں نشانات اس کی تمنائیں ہیں اس کی تڑپ کے نشان اس سے پرے دوسرا نشان جو اس کے قدموں میں ہے نیچے اس کی روانگی کا مقام ہے۔

اور درمیان میں اس کی سراپیمگی اس کی حیرت ہے

دائرہ میں گھومتے ہوئے اندرونی دائرے میں داخل ہونے کا کوئی دروازہ نہیں

اور سچ اس دائرے کا نقطہ ہے

سچ کا مطلب ہے کہ اندرون اور بیرون اس سے باہر نہیں ہے

اور یہاں کوئی صورت گری ممکن نہیں

یہ اس کی غیرت ہے جس نے ہمیں حقیقت تک پہنچنے نہ دیا۔

اور خوف جس نے ہمیں جدا رکھا

اور حیرت

یہ سچ کے مطلب ہیں

یہ پہلے دائرے کا ابتدا کا نشان ہے

اور مدارج کی تدوین

اور عقل کی نارسائیاں

جو فہم و تخیل سے ماورا ہیں

کیونکہ مشاہدہ کرنے والا صرف دائرے کا نظارہ باہر سے کرتا ہے اندر سے نہیں

اور سچ کے علم کے لئے جو علم چاہئے وہ اس سے نابلد ہے

علم مقام کا متلاشی ہے اور دائرے میں کوئی مقام نہیں یہ حرم ہے۔

اور رسول خدا کر حرم کہا گیا

کیونکہ صرف وہی اس دائرہ سے باہر آئے

وہ حیرت اور خف سے بھرے تھے

سچ کی پوشاک پہن کر وہ دائرے سے باہر آئے اور ساری مخلوق کو آہ کہہ کر مخاطب کیا۔

سمنون محب نے کہا ”حسین یہ تمہاری کم فہمی ہے کہ تم سچ کی تلاش میں نکلنا چاہتے ہو۔ کیا حرم پاک اور وجود حرم تمہارے لئے کافی

نہیں ہیں۔ آدمی کی رسائی وہاں تک نہیں ہو سکتی جہاں تک تمہارا گمان ہے۔“

حسین اور سمنون محب طواف کرنے کے بعد دعائیں پڑھتے صفا اور مروہ کی طرف جا رہے تھے۔ اس نے نہایت حیران ہو کر

اپنے ساتھی کی طرف دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

سمنون نے پھر کہا ”سچ کا پیرا بہن زیب تن کر کے صرف وہی باہر آ سکے تھے بے دروازوں کے اس دائرے سے۔“

”آپ میرے خیالات پڑھ لینے پر قادر ہیں۔“ حسین نے کہا۔

”نہیں۔ صرف اپنی شدیت محبت کی وجہ سے تمہاری کیفیت جان پایا تھا اور لفظوں میں پناہ لیتی تمہاری تلاش حق اور حیرت اور علم

ک تڑپ اور تخیل کی پرواز۔“

حسین چپ چاپ صفا اور مروہ میں دوڑتا رہا۔

”وہ جب پسند کرتا ہے تو بس پسند کر لیتا ہے اور وہ بے نیاز ہے۔ اس وادی غیر ذی زرع میں اس نے ایک عورت اور ایک بچے کو روک لیا تاکہ زندگی کی رونقیں یہاں پر اپنا دامن پھیلائیں اور یہ گھرا من وعافیت کا گھر ہے۔“

سعی کے بعد وہ بال ترشوار ہے تھے جب سمنون محب نے حسین کی طرف بہت گہری نظروں سے دیکھا اور حطیم کی طرف چلنے لگا۔ طواف کرنے والوں سے حطیم کیوں خالی تھا۔ اس کی سمجھ حسین کو نہیں آئی۔

باہر لوگوں کا مجمع زور زور سے لبیک کہتا روشنیوں میں دیوانہ وار خانہ خدا کے گرد نثار ہو رہا تھا۔ نہایت مسکرا کر سمنون بہت عاجزی اور سبکداری سے حطیم پر داخل ہوئے اور انہوں نے حسین کو بھی اشارہ کیا کہ پیچھے آئے۔ طواف کرنے والے بہت دور رہے گئے اور حد نظر تک حطیم ہی طیم تھا اور وہاں کا ہجوم تسبیح کناں سجدہ ریز دعا گو نہایت چمکتے ہوئے آئین رو لوگوں کا تھا۔ سمنون نے حسین کا ہاتھ پکڑ لیا اور قطاروں کے درمیان سے راستہ بناتے ہوئے ادھر ادھر دیکھتے جیسے کسی کی تلاش میں ہوں۔

وہ چلتے رہے یہاں تک کہ حسین تھک گیا۔

”خواجہ حسن بصری سے ملو حسین۔“ اس نے سنا۔ وہ بیٹھ گیا اور سمنون بھی بیٹھ گئے اور منتظر رہے یہاں تک کہ دعا کے لئے اٹھے ہوئے خواجہ کے ہاٹھ کھلے اور انہوں نے نہایت شفقت سے اس کی طرف دیکھا۔

”حسین ادراک پانے کے لئے عاجزی کرنا ہی ادراک ہے۔“ ان کی آواز شیریں نرم اور چاندی کی نہایت سریلی گھنٹیوں کی طرح اس کی طرف آرہی تھی اور اس کی جاں اس شیرینی کو جذب کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اس کی نفسی کو دیکھ سکتی تھیں۔ محبت کی روشنی سب طرف پھیلی تھی۔

”جب تمہارا سوال تمہارے وقت کے برابر ہوگا تو دعا قبول ہوگی مگر اس میں عجلت ہرگز نہیں ہونی چاہئے حسین۔“

حسین ایک تجلی میں نہا رہا تھا۔ سکون اس کے چاروں طرف بحرِ خار کی لہروں کی طرح پھیل رہا تھا۔ ایک کشتی جو تھکنے کی طرح موجوں پر بہتی جائے اور وہ بہا جاتا تھا۔ پھر موجیں ایسے آئینے تھیں جن میں حسین ہی حسین تھا۔ اس کوشش جہت سے جو آئینہ مقابل تھا اس میں بھلا وہ کہاں سے آن پکا تھا؟ ہر آئینے میں وہ آپ نظر اہ بھی تھا اور نگاری بھی وہ پھر حائل تھا اس کا وجود۔

نہایت بے چارگی سے اس نے خواجہ کے پاؤں چھوئے۔

سمنون محب نے کہا: ”ہاں بس یہی ہے۔ یہی ہے۔ تم جرم آئینہ کو دیکھنا چاہو گے مگر کبھی دیکھ نہ سکو گے۔“ وہ ہنسے۔

خواجہ نے محبت کرنے والے کی طرح سمون کی طرف دیکھا۔ حسین نے محسوس کیا گویا وہ سرزنش کرنا چاہتے ہوں۔
”اپنے نفس کو اس سے اعلیٰ درجے کی ترقی میں حیران و پریشان نہ کرو۔“

حسین کا نفس روشنی کی طرف بڑھا۔ چاندِ حطیم کے ان چہروں کے سامنے ایک کمزور اور بجھنے والی شمع لگ رہا تھا اور اسے سفید کناروں والے سیاہ بادل گھیرے میں لے رہے تھے۔
اس نے سیاہ زلفیں کھول کر اپنے گرد پھیلا لیں۔
کہہ دیکھنے والے ان کو مار سیاہ سمجھیں اور قریب نہ آئیں۔
بخدا مجھے ان سیاہ زلفوں کا خوف نہیں۔
مجھے ڈر ہے کہ شاید میں اس چہرے کو دیکھنے کے لئے
کل تک زندہ نہ رہوں۔

حیرت انگیز طور پر اسے بصرہ میں لکھے ہوئے اپن شعار یاد آئے تو وہ ماضی اور حال میں یوں چل پھر رہا تھا جیسے ہوا پردوں کو ہلاتی جھلاتی انگیلیاں کرتی چل پھر رہی ہو۔ انمول اور تنہائی اور وحدت سے لبریز راتیں اور ہر جہت سے وہ خود جلوہ افروز وہ خود منعکس۔
آپ ہی آپ محبت اور محبوب اور محبت اور سوا محبت۔

خواجہ اٹھتے تو عبادت گزار ارواحِ حطیم سے گزر کر طواف میں شریک ہوئیں۔ وہ اور سمون محب بھی باہر آئے اور قطبِ کعبہ حجرِ اسود کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے لبیک کہتے ہوئے ان سب کے ساتھ گھومنے لگے۔ ہزاروں لاکھوں ان گنت فدا ہون والوں جاں نثار کرنے والوں جل رنے والوں حاضر کہہ کر فدا ہونے والوں کے ساتھ اور ان کے ساتھ جو فدا ہو چکے تھے جو نوازے گئے تھے۔ وہ سب جو اول آدم سے اس بھیڑ میں شریک تھے اور جو ان راہوں پر چلائے گئے تھے اور جو خود اس کے مطلوب تھے

ترکی کنیزیں اپنے روایتی لباس میں ملبوس تھیں اور کچھ کے تاروں کو چھیڑنے والے ہم وطن موسیقار سے ہنس کر باتیں کر رہی تھیں کیونکہ حامد بن عباس امیر الامرا کا انتظار کیا جا رہا تھا۔ عربی دھنوں پر ترکی گیتوں کو گانے کی کوشش ہو رہی تھی۔ رات دور تھی اور خوشگوار دنوں میں ہوا کسی محبوب کے آنچل کی خوشبو سے بھر اور دلنواز تھی۔ جسم سے مس ہتی تو فرحت بخش نیند لاتی۔ دجلہ میں پانی شفاف تھا اور پہاڑوں پر برف پگھلنے کی وجہ سے نہایت ہی بخ بستہ اور شیریں صحن چمن میں پھل اور درختوں پر چھوٹی چھوٹی چڑیاں ڈال ڈال شور مچا رہی تھیں اور شاخیں جھکی ہوئی پانی کے آئینے میں اپنا عکس دیکھتی تھیں۔ مغرب کی اذان افق پر بادلوں کی طرح اٹھی اور سفید

کناروں ولای گھٹا بن کر محلوں اور ایوانوں پر چھا گئی۔ خادم چراغوں کی روشنی کے کم و بیش ہونے کے درجے سے جگہ بہ جگہ رکھنے لگے تھے اور حریری پردوں کی طویل سلوٹوں میں رنگ اور چمک کے تناسب سے تاریکی اور سائے کھل مل رہے تھے۔ فانوس اور قندیلیں صحنوں میں دیواروں اور اشجار کے سایوں کو تصویروں کی سی خوبصورتی عطا کر رہی تھیں۔ صراحیاں اور جام سجائے گئے تھے۔ مسندوں پر بڑے چھوٹے نکلے مرتبے کے لحاظ سے پڑے تھے۔ تازہ نبیذ کی مہک دریا کی طرف کھلنے والے لمبے درپچوں سے باہر کھڑے محافظوں کے لئے لذیذ اور اہبتا انگیز تھی اور ہر وقت بہاؤ کی طرف نظر کئے ہوئے تھے جہاں کشتیوں میں تفریح کرنیوالوں کا ہجوم ہوتا اور گانے والے اپنے ساز سنبھالے دھارے سے پر غم ہوا میں لمبی تانوں والے غم انگیز اشعار گاتے ہوئے گزر جاتے۔ بہت سے لوگ جن کے دل میرے دل سے ہم آہنگ نہیں ہیں میرے دل سے عہدہ کی محبت کم کرنے کی کوشش کرتا ہیں۔

لیکن میں ان سے کہتا ہوں تم میرے دل کو اس کی مرضی اور اختیار میں آزاد چھوڑ دو اس لئے کہ عاشقوں کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، سر کی آنکھوں سے نہیں دیکھتا

یا

کون ہے جو میرے لئے اس دل کو نرم کر دے جو پتھر کی چٹان سے تراش کر بنایا گیا ہے۔

میں اپنی نگاہ سے اس کے رخساروں کو زخمی کر دیا تو فوراً ہی اس نے میرے دل سے اس کا قصاص لے لیا۔

کشتیوں میں جلتے چراغوں کی لومیں لہروں میں یوں ڈولتیں جیسے کسی سپاہی کی زرہ پر رات کے پچھلے پہر دم رخصت اس کی محبوبہ ہاتھ میں روشنی لئے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی اور زرہ کی کڑیاں یہاں وہاں چمک رہی ہوں۔ لگتا تھا اس زمانے کو کبھی نیند نہیں آئے گی اور آسمان اپنے چاند ستاروں سمیت یونہی ان بارگاہوں کے درپچوں کے سامنے منتظر رہے گا۔

نہر الخطیب کی طرف سے ایک تیز رفتار زورق سیڑھیوں کے ساتھ آگئی۔ سوار کو دروازہ اور بھاگتا ہوا بڑے دروازے کی طرف بڑھا۔

”امیر کہاں ہیں۔ میں ایک نہایت ضروری نہایت المناک پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں۔“

پہرہ داروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ”آقا اس وقت اپنے دوستوں کے ساتھ انتہائی راز کی محفل میں ہیں۔“ ان میں سے ایک نے جواب دیا۔ ”مگر تم کہاں سے وارد ہوئے ہو۔“

”ارض پاک سے اور یہ ایک موت کی اندوہ ناک خبر ہے۔“ اس نے ذرا تاخیر سے کہا۔

حسین لمبی راہداری سے جو درپچے کی طرف سے گزر کر گھومتی ہوئی پھر عقبی حصے سے جا ملتی تھی ادھر آیا۔ وہ نماز مغرب کے لئے جا رہا تھا اور جلدی میں تھا۔ موت لفظ سن کر ٹھہر گیا مگر اس نے پوچھنے کی ہمت نہ کی۔

وہ رک رک کر سا اکھڑا اکھڑا چپ چاپ لڑکا تھا جس کی شکل پر دسوزی اور یتیمی تھی حالانکہ حامد اسے بہت چاہتا تھا کیونکہ وہ اس کی اولاد میں سب سے زیادہ ذہین اور نازک تھا۔ مگر حسین نے اس محبت کو قبول نہیں کیا تھا۔ اسے اپنی ماں کی چاہت شدید تھی اور اس کی شکل ہر گھڑی اس کی آنکھوں کے سامنے ٹھہری رہتی۔ دھندلی اور بھولی ہوئی خواب میں دیکھی پر چھائیں جس کے سراپا میں سے ایک عجیب روشنی نکلتی تھی۔ ان آنکھوں کی زخمی نگاہ بے بس اور محبت سے بھیگی ردا کی طرح اس کے گرد لپیٹی ہوئی۔ اس کی ملاقات تقریباً اس سے نہیں ہوتی تھی کیونکہ اتالیق اور تربیت تعلیم اور سپاہیانہ مشقتیں جو ان لڑکوں کو اتنا وقت نہیں دیتی تھیں کہ وہ ماؤں کی دعاؤں کو طلب کرنے محلات میں جائیں۔ درس و تدریس دین و دنیا کے مختلف علوم آداب دربار اور سیاست وقت ان کو مصروف رکھتے تھے اور اس کے باوجود اس کی ماں کا سراپا تمکنت و جلال پر جمال اور دنوازا مسکراہٹ جس میں زخمی ہونے کا احساس ابھرتا ہوا لگتا اور زردی جو دنیا سے الگ اور زندگی سے بھی علیحدہ کوئی مافوق الفطرت مخلوق بنا دیتی تھی۔ اس کی آواز اتنی دل نشیں تھی کہ جب وہ بات کرتی تو حسین چاہتا کہ وہ سننا رہے۔ اپنے لمبے گھیر دار لباس پر نیمہ پنے جو سر پر پہنے لمبے کلاہ کی لمبی موتیوں کیلویوں سے مزین لگتا اور سنہری بالوں کی کا کلیں بل کھا کر پھولوں کی طرح کانوں پر بجی ہوئیں اور ہیروں کی دمک سے رخسار صرف چمک پکڑتے رنگ نہیں۔ ہو سکتا ہے اسے رنگوں کی شناخت نہ ہو۔ اس کی طویل بیماریوں نے اسے ملول اور اداس کر دیا تھا جیسے بجلی گھنا میں شاخ در شاخ تر پے اور زمین کی ظلمتوں کو روشن کرے۔ حسین کا دل گھبرا یا۔

پھر پہرہ داروں نے حسین کو وہاں ٹھہرا ہوا پایا اور وہ اس کی طرف آئے۔

”ارض پاک سے کسی کی موت کی خبر آئی ہے۔“ انہوں نے سلام کرنے کے بعد کہا ”مگر وہ صرف امیر سے ملنے کا متمنی ہے اور امیر اس وقت نہایت خلوت میں ہیں۔ کیا آپ وہ اطلاع وصول کر لیں گے۔“

یہ اصول کے منافی ہے۔“ حسین نے قدم آگے بڑھائے۔ اس کا دل بے چین ہو رہا تھا۔ جانے کیا خبر ہو؟

کشتی پانی پر روشنی اور تاریکی کے دھارے پر بے خبری اور خبر کے درمیان ہچکولے لیتی رہی۔ پھر ملاح نے زور سے کہا:

”مجھے اجازت رخصت ہے۔“

آنے والے نے جھک کر نیچے دیکھا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔

مسجد میں جماعت کب کی کھڑی ہو چکی تھی۔ حسین تقریباً بھاگتا ہوا راہداری کی طرف سے نکلا۔ پہرہ دار مستعد ٹہلنے لگے۔ دریا پر کی ہوا اونچے میناروں اور خلیفہ منکفی باللہ کے محل اور باغوں کی سیاہی کی طرف چلنے لگی۔ کوئی پرندہ نہایت غم ناک آواز میں بولنے لگا جیسے سسکیاں لے رہا ہو اور ماریاہ کی سی گھٹائیں پھنکارتی ہوئی بڑھنے لگیں۔ آندھی درپچوں کو پر شور پھٹکانے اور توڑنے میں لگی تھی۔ جب تک لوگ سنبھلیں ایک مہیب طوفان ان کے سروپ پر وارد ہو گیا تھا جو برفبار تھا اور اونچے ایوانوں اور بارگاہوں محلوں اور گنبدوں درختوں اور دریاؤں پر برف ہی برف تھی جو عشا کے وقت تک سارے بغداد کو کفن میں لپیٹ چکی تھی۔ پانی جم رہا تھا اور اصطبلوں میں گھوڑے کانپ رہے تھے۔ کارواں کسی اوٹ کی تلاش میں درختوں کی پناہ ڈھونڈ رہے تھے جو بہت ناکافی تھی۔ آسمان نا مہربان کیوں ہو گیا تھا۔ یک بیک!

ارض پاک سے نہایت تیزی میں آنے والے سوار پر یک بیک تھکن نے حملہ کر دیا تھا۔ اتنی طویل مسافت کے بعد وہ مزید انتظار کی وجہ سے نہایت مضحل تھا، گویا کسی نے شعلوں پر برف ڈال دی ہو۔ اس کی رد امیلی اور سر بند ڈھیلا تھا۔ گرد سفر اس کے سر کے بالوں میں تھی مگر اسے کسی سے بات کرنے اور کسی کو کچھ کہنے کی جرات نہ تھی۔

جب وزیر قاسم اس دعوت نبیز سے باہر آیا تو برف بای جاری تھی۔ وہ کانپا، پلٹا اور حامد بن عباس کے ساتھ پھر ایوانوں کی طرف چلا گیا۔ رات بوجھل پروں والے پرندے کی طرح اڑنے کی کوشش کرتی اور گرتی تھی۔ کوئی من چلانے میں دھت گاتا ہوا اپنے آپ کو گھسیٹتا ہوا گزر رہا تھا۔

اور یہ ایسے گروہ ہیں کہ جب میں ان کے درمیان رہا تو زمین تنگ ہو کر میرے لئے انگوٹھی کے گلینے کے حلقہ کی مانند ہو گئی۔

ابلیس اس کے وجود پر خندہ زن ہے

اس لئے کہ یہ آدم کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔“

اپنی مصیبت کے باوجود پہرہ دار بنے۔

”شاید یہ شراب کی محفل سے دھکیل کر پھینکا گیا ہے۔“

”ہو سکتا ہے یہ کوئی یہودی یا نصرانی جس پر دینا تنگ ہو گئی ہو۔“

”نہیں یہ کوئی قرمطی ہے جو تائب ہو گیا ہے۔“

اپنی سچ ہوتی ہوئی ٹانگوں کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے اور دریا کی طرف دیکھ کر سپاہی نے کہا:

”اتنے فتنوں کے درمیان تائب ہونے سے بھی کیا ہوتا ہے۔“

”کیوں کیوں۔“ باقیوں نے یک زبان اس سے سوال کیا۔

”اس لئے کہ نئی نئی امارتیں قائم ہو رہی ہیں۔ بلاد مغرب میں فاطمین نے اپنی ریاست بنالی ہے۔ مہدی کا ظہور ہوا ہے۔“

”تم نے کیونکر جانا کب سنا؟“ وہ پوچھنے لگے۔ آباد شہر اذانوں کی آوازوں سے جو ہر گلی اور ہر شاہراہ سے بلند تھیں، بھرا تھا۔

”سارا بغداد جانتا ہے جو ہوا ہے۔ کیا ایسا موساس سے پہلے تم نے کبھی ملاحظہ نہیں کیا تھا۔“

وہ سب ہر بلانے لگے جیسے اس کی بات کو سمجھ رہے تھے، متفق تھے۔

”مہدی کا ظہور قرب قیامت کی نشانی تھی اور یہاں وہاں جنگ بھڑکنے کے واقعے بھی تو قرب قیامت ہی ہیں۔“ ان میں سے

ایک نے کہا۔

مدینہ السلام سے خلیفہ ان کی بیخ کنی کرنے اور ان کی پیش قدمی روکنے کے لئے باب الشماسہ سے روانہ تھا۔ لشکر اور خزانہ خیمے

اور سراگا ہیں اس کے ہمراہ تھیں۔

”کبھی عباسی خلفا کا نام سن کر مصر تک لوگ کانپ جاتے تھے۔ بلاد مغرب میں کسی کو سراٹھانے کی جرات نہ تھی۔“ دوسرے نے

نہایت افسوس سے کہا۔

اور اب خلیفہ کی روائی کی خبر نے بھی کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ قمر مطی حسین صاحب الشامہ کے قتل کر دیئے جانے، اذیب میں مارے

جانے کے باوجود قمر مطی پورے مغرب میں فساد برپا کر رہے تھے۔ وہ تبلیغ ہی سے مطمئن نہیں ہو سکتے تھے، جہان بانی اور جہاں رانی انکا

مقصد تھا۔“

”جہاں رانی۔“ ان میں سے کسی نے طنزیہ سیٹی بجائی اور ہوا کے تھپڑوں سے بچنے کے لئے دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔

مگر ہوا دیوانی بنی شائیں شائیں کی مہیب آواز سے لرزہ پیدا کرتی ان عمارتوں پر وارد ہوتی رہی اور مکینوں کو ڈرانے کے لئے اس

نے مکانوں کو ہلایا۔

”کسی نہایت عظیم روح کو قبض کرنے کے لئے عزرائیل اپنے سارے لشکر و جاہ و جلال سمیت زمین پر نازل ہوا تھا۔“

سپاہیوں کی ایک ٹولی پناہ پناہ پکارتی گشت کرتی ہوئی دوسری طرف سے گزری۔ ان کے قدموں کی چاپ سنسان شاہراہوں پر

گوئجی رہی اور برف کے بگولے اس گونج کو دور دور لے جاتے رہے۔ دریا پر حرکت میں رہنے والی اور خلیفہ کے محل کی حفاظت کرنے والی کشتیاں تیزی سے گزر رہی تھیں اور ان کی مدھم روشنیاں برف میں دھندلا کر صرف کنارے کے درختوں کی سفیدی کو واضح کر رہی تھیں۔

حامد بن عباس کی بارگاہ سے جب وزیر قاسم بن حسین جبوں اور داؤں میں لپٹا اپنے محل کے لئے روانہ ہوتا تو اس کا حفاظتی دستہ جو ترکوں پر مشتمل تھا بہت خوش تھا کیونکہ اپنے وطن سے دور ہونے کے باوجود ترکی کے موسموں کو یاد کرتے رہتے تھے اور سارے عیش بھی انہیں اس سر زمین کے خوابوں سے علیحدہ نہ کر سکتے تھے۔ اب زمین کی روئیدگی کا رنگ بدلے گا اور وہ نئے پھولوں سے مزین ہو گی۔ برف نئے نئے نادر روزگار گل بوٹے لایا کرتی ہے۔

حامد بن عباس کو وہ دن یاد آتے تھے جب اس نے کنیزوں کے سوداگر سے اسے خریدا تھا۔ یوں اسے کنیزیں خریدنے کی ایسی عادت نہ تھی۔ اس کی تربیت سختی سے کی گئی تھی اور چونکہ اس کی زندگی کی منزل وزارت عظمیٰ تھی اس لئے دن رات محنت کرنا پڑتی تھی۔ خانقاہ اور مدرسوں سے جب وہ فارغ ہوا تو چونکہ اس کا باپ زیر عتاب رہا تھا اس لئے اسی معمولی عہدے کے لئے بھی اسے بہت دنوں انتظار کرنا پڑا تھا اور بالآخر وہ محمد بن جراح کا تب کے دفتر میں خراج کے حساب کی کتابوں کا متوی بنا دیا گیا تھا جس طرح آگ سے خوفزدہ آدمی مجبوراً اس میں کود جاتا ہے اسی طرح حامد بھی ان معمولی آدمیوں میں اٹھنے بیٹھنے اور کام کرنے لگا۔ وہ بہت محتاط کم گو اور ظلم کی حد تک اپنے کام میں منہمک رہتا تھا۔ اس کے دوست بہم کم تھے اور وہ دانت بھیج کر نہایت سختی اور صبر سے آنے والے دنوں کی طرف دیکھتا تھا۔ اپنی ساری ایمانداری کے باوجود اس کے باپ نے دنیا سے شکست کھائی تھی اس لئے وہ دوسری دفعہ ایک شکست خوردہ ٹوٹا ہوا ہار ہوا انسان بن کر جینا نہیں چاہتا تھا۔ ہو لے ہو لے اس کا کاغذوں پر جھکے جھکے اپنے باپ کی ضبط شدہ امارت تک اپنے راستے صاف کر لئے۔ معافی کا طلب گار ہوئے بنا اس نے وہ سب کی سب تو نہیں مگر اس میں سے کچھ چیزیں حاصل کر لیں۔ دجلہ کے مشرقی کنارے جہاں عباس بن حسین کے ذاتی محلات تھے اس کے لئے واگزار کئے گئے اور وہ ایک دیوانے کی طرح ایلکلا ہی ان راہدار یوں میں گھومتا اور ان بارگاہوں سے درپچوں سے باغوں کا نظارہ کرتا۔ پھر ہنستا۔ یہاں تک کہ آنسو اس کی آنکھوں سے رواں ہو جاتے۔ اس کے اجداد نے عباسیوں کی خدمات کی تھی اور ذرا سی لغزش سے وہ ساری خدمت خاک میں مل گئی تھی۔ کیا آدمی غلطی نہیں کرتا؟ اور جبکہ زمانہ اتنا نا پائیدار تھا۔ خلافت روٹی کے ٹکڑے کی طرح آج ایک ہاتھ میں تھی اور کل دوسرے کے لئے اس سے چھینی جاتی تھی۔

افسوس اور بے بسی نے اسے نہایت منتقم بنادیا تھا اور وہ باریک بین بال کی کھال اتارنے والا سخت سوال کرنے والا تھا۔ وہ بڑے محل کے ایک کمرے میں اکیلا کتابوں پر جھکا رہتا اور جب فراغت ہوتی تو ٹھہلتا اور آنے والے دنوں کی سوچتا۔ جب وہ دولت مند ہو گا، صاحب ثروت ہو گا اور ان بڑے خالی کمروں میں روئیں ہوں گی جیسی اس نے اپنے بچپن میں دیکھی تھیں۔ اس کا اپنے ساتھ کام کرنے والوں میں سے کسی کے ساتھ بھی کوئی رابطہ نہ تھا جیسے وہ ہوا میں اسے اس اطاق میں داخل ہوتا ہوا اور پھر تحلیل ہو جاتا ہو۔ خدا کہاں تھا؟ وہ اکثر سوچتا۔

اسے نئی سوچوں، ہنستے چہروں اور خوبصورتی سے سخت نفرت تھی۔ اسے قہقہے، روئیں اور نبیذ کی محفلیں ناپسند تھیں۔ دجلہ کے کنارے یہ پرشباب قہوہ خانے اور تماشے اس کے خون کو غصے سے کھولا دیتے۔ اسے بولنے والے پر اعتماد لوگوں سے چڑھتی۔ اور اس لئے جب وہ اپنے محکمے میں ترقی کرتا ہوا بڑھتا گیا تو بھی وہ بخیل ہی رہا۔ ایک ایک دینار درہم کو دانتوں سے پکڑتا ہوا وہ اپنی منزل کی طرف رواں تھا۔

اس نے جن لوگوں کو اپنے گرد جمع کیا وہ اس سے ہر لحاظ سے کمتر تھے اور اسے آقا سمجھتے تھے۔ وہ برابر کے ساتھیوں سے خدمت کی حد تک روابط نہ رکھنے کا عادی تھا۔

جب قافلہ ارض پاک سے واپس ہوا تو اغول اس میں نہیں تھی۔ وہ اسے بیابان ساویہ کے کنارے ایک بستی میں دفن کرائے تھے کیونکہ اس سے قریب جگہ کہیں نہ تھی۔ اسے اغول کے نہ ہونے کا ملال تھا یا نہیں اس کی خبر نہ ہو سکی تھی کیونکہ ان دنوں خلیفہ قرامطہ کی دست درازیوں سے سخت پریشان تھا اور چھوٹی دور دراز سرحدوں کی طرف جنگوں کے اخراجات کے حسابات بہت بڑھ گئے جس کے لئے حامد کو تقریباً اپنے محکمے کی درستی سب سے زیادہ ضروری تھی اور کام بہت بڑھ گیا تھا۔ وصیف بن صوار تکمین زکرویہ کے شکار کے لئے نکلا تھا کیونکہ کوفہ بصرہ کا راستہ تقریباً بند ہو گیا تھا اور حجاج کے قافلے لوٹ گئے تھے۔ شور قیامت تھا جس نے مکئی جیسے امن پسند خلیفہ کو بھی بغداد سے نکالا تھا۔ محاصل میں حیرت انگیز طور پر کمی ہو گئی تھی اور حامد کو ایک ایک درہم کا حساب نہایت ہی جانفشانی سے رکھنا پڑتا تھا اور اسے اپنی زندگی میں ایک کنیز کے کم ہونے سے کوئی کمی محسوس ہوئی تھی؟ قاسم بن حسین سے اس کی دوستی نہایت گہری تھی مگر سلطنت میں دوستی کا کیا اعتبار؟

اس کے ہاں نبیذ کی نہایت پر تکلف محفلیں ہوتیں۔ ناچنے والی ترکی کنیزوں کا اس کے ہاں ایک جھوم تھا اور وہ جب کسی کو بطور خاص مدعو کرتا تو ترکی سازوں پر عربی دھنیں بجائی جاتیں اور عرب شاعروں کا کلام ترکی دھنوں پر ترتیب دیا جاتا۔ وہ سخت گیر آقا تھا

اس لئے نامیں ذرا ذرا جزئیات کا خیال رکھا جاتا اور ترک موسیقار رقص و سرود کی ترتیب میں کئی دن پہلے سے لگ جاتے۔ وہ ہر کام کو انجام تک صحیح دیکھنے کا جنون کی حد تک اُتق تھا اور غلطی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دشمنوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا ہی تھا۔ اس میں معاف کرنے کی صفت نہ تھی۔ اور اس کے باوجود کہ وہ غلاموں کا ہر طرح سے خیال رکھتا تھا اور انہیں پتھر اور جانور نہیں سمجھتا تھا۔ کوئی بھی اس سے خوش نہیں تھا۔ لوگ ان سہولتوں کے بجائے آزادی اور دوری کے خواہش مند رہتے تھے۔ انمول ہر طرح آزاد تھی۔ ایک نکاحی بیوی کی طرح جو وہ چاہتی کرتی اور جہاں جی چاہے جاتی مگر پھر جب مرنے کی خبر محل میں پہنچی تو لوگوں نے کہا:

”خوش قسمت آزاد ہو گئی۔“

سوداگروں نے نئی کنیزوں کے پرے اس کے سامنے سجادے۔ ان کی نرم خوئی اور حسن کی تعریف میں زبانیں سوکھ سوکھ گئیں مگر حامد نے کہا:

”اب زمانہ بدل گیا ہے اور مجھے کنیزوں کی ضرورت نہیں رہی۔“

”خوشبو اور نماز اور عورت۔“ کسی نے دہرایا۔ ”ہمارے کریم انفس رسول خدا کو بھی پسند تھیں۔“

اس نے بولنے والے کی طرف نہایت خفگی سے دیکھا۔ ”کیا ہم اس زمانے میں ہیں۔ ہم کون ہیں۔ مجھے مذہب کی یہ تاویلات ہر گز پسند نہیں ہیں۔ جو کچھ ہو رہا ہے قرب قیامت میں کیا ایسی باتوں کی گنجائش ہے۔“

لوگوں نے اس کو بھی اس کی طبیعت کی ایک نئی جہت جانا۔ سوداگر کنیزوں کو واپس لے گئے اور حامد بن عباس اپنے محاصل اور خراج کا تب اعلیٰ کی حیثیت میں لگ گیا۔

بڑے بڑے قافلے حجاج کرام کو لے کر ارض مقدس کی طرف روانہ ہو رہے تھے اور راتیں روشن تھیں۔ موسم خوشگوار اور سفر کے لئے نہایت موزوں تھا۔ جب حامد بن عباس کی طرف سے اس کنیز کی طلبی ہوئی جو انمول کی نظر منظور تھی اور اب حسین کا خیال رکھتی تھی۔ قہرمانہ جو اس کے محلات کے انصرام اور بندوبست پر ملازم تھی موقع بموقع اس سے بات کہتی تھی کہ گل رنگ حسین کا بہت خیال رکھتی ہے جیسے وہ اس کی کنیز اور خدمت گار نہیں۔

حامد اپنی اولاد کی تربیت پر بہت محنت کرتا تھا اور جزئیات پر اس کی نظر رہتی تھی۔ اس لئے اس کے باوجود کہ وہ وقت کی کمی کا اسیر تھا وہ حسین کی ہر حرکت پر نگاہ رکھتا تھا۔ علم و ادب کے استادوں سے اکثر خلوت میں ملتا اور اس کی ترقی اور ذہانت پر مطلع ہونا چاہتا۔ اسے حسین پر بجا ناز تھا مگر خود حسین اپنی ماں کے بعد بچھ سا گیا تھا۔ اس سے پہلے بھی وہ بغداد کی شانہ زندگی اور محفلوں میں کم ہی کم

دکھائی دیتا۔ فن سپہ گری میں طاق ہوتے ہوئے بھی اس نے کبھی اس پر فخر نہیں کیا تھا۔ حامد اسے مکمل دیکھنا چاہتا تھا۔ ہر لحاظ سے ایک عمدہ دنیا دار ایک منجھا ہوا دربار دار خلیفہ وقت کی ہم نشینی کے قابل وہ کبھی کبھار اسے نبیذ کی اس نجی محفلوں میں آنے کی اجازت دیتا جہاں سوائے چند مصاحبین اور راز دار دوستوں کے اور کوئی نہ ہوتا اور حسین دیکھتا کہ کس طرح جھکنا اور خوشامد سے اپنی بات کہنا ایسی جگہوں پر آسان ہو جاتا تھا۔

مگر خود اس کی طبع ان سب باتوں سے مجتنب تھی۔ اسے خانقاہی مزاج جانے کس پشت سے ورثے میں ملا تھا کہ دربار اور ریشہ دوانیوں سے نفرت تھی۔ وہ کسی فقیہ کے دروس میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ وہ نماز اور مسجد کی خدمت میں دل سے یقین رکھتا تھا۔ ایک دفعہ حامد نے ہنستے ہوئے اسے سرزنش کی اور سنجیدگی سے کہا تھا۔

”دنیا اتنی ناکارہ جگہ نہیں ہے کہ تم اس سے احتراز کرو۔“

”میں دنیا میں ہوں اور اس میں دلچسپی لیتا ہوں مگر میری خواہش دوسری اور میری تمنائیں لامتناہی ہیں۔“ حسین نے نہایت مضبوطی سے جواب دیا تھا۔

”تمہیں دربار میں میری جگہ لینا ہوگی۔“ حامد نے ذرا نرمی سے کہا۔

”اگلے سانس کی خبر تو کسی کو ہوتی نہیں جگہیں تو دور کی بات ہے۔“ حسین نے مودب جواب دیا تھا۔ ”اور پھر مذاب کے ظاہر و باطن یہ سارے جھگڑے فلسفہ اور اس کی الجھنیں مجھے گھبرا دیتی ہیں۔“

”تم سے یہ باتیں کون کہتا ہے۔“ وہ اب بالکل خفا ہو رہا تھا۔

”کیا آپ نہیں جانتے کہ کتنی دعوت پورے عالم اسلام کا احاطہ کئے ہیں۔ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔ کیا سیدھا ہے اور کیا ٹیڑھا۔ کہاں ظلمت ہے اور کہاں روشنی۔ کون یہ سب جان سکتا ہے۔“

”طاہمین کا مصر پر قبضہ اور مہدی کا ظہور کیا کوئی پوشیدہ سانحہ ہے۔“ اس نے باپ سے پوچھا۔

باپ کے اضطراب کو محسوس کر کے اس نے کہا ”آدمی ایک نظام حیات کا حصہ ہے اور اس کی زندگی صرف اور میض اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ اپنے مفاد کے لئے ہی کوشاں رہے۔ میں اپنے طور پر ان سب دعوات کا مطالعہ کرنا اور ان لوگوں سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں تا کہ روشنی میں دیکھ سکوں۔“

”خاموش رہو حسین۔“ اس کے باپ نے کہا۔ ”تم کسی نہایت زہر آلود صحبت میں یہ سیکھ رہے ہو اور میں یہاں ان سب باتوں کی

اجازت نہیں دے سکتا۔ مذہب کی اصل یہی ہے، سیدھی اور سادہ نماز جس میں تم دل لگا سکو۔ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مکمل اعتماد رکھو اور بس اطاعت کرو۔“

مسکرا کر حسین نے کہا: ”والد محترم! ایک مطلب وہ ہے جو آپ اور میں اس سے سمجھتے ہیں اور دوسرا مطلب لفظوں کے اندر پوشیدہ ہے جو اس کی تاویلات ہیں باطنی معانی۔“

حامد اس کی طرف آیا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھے اور دیر تک اس کی صورت دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا اور اسے معلوم ہو گیا کہ یہ باتیں جو حسین کو بے چین کر رہی ہیں اس کے رگ وریشے میں پیوست ہیں، وہ محض سوال سمجھ کر انہیں اس کے سامنے نہیں دہرا رہا۔ وہ ان پر اعتقاد رکھتا ہے مکمل اور مکمل تر۔ وہ لمبی رات میں سے رخصت کرنے کے بعد بھی اپنی خلوت میں بے چین رہا۔ روشنی اس کی آنکھوں میں چمکن بن گئی تھی اور حریری بستر کا ہر تار اسے خارزار لگتا تھا۔ اس نے ایک عمارت تعمیر کرنا چاہی تھی اور اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اب تک اس نے ریت پر اسے اٹھایا تھا۔ وہ کیا کرے۔

اس کے بیٹے اس کے حسین کو یہ بے چین کر دیتے اور برباد کرنے والی سوچ کہاں سے ملی تھی۔

رات کے پچھلے پہر کی ہوا چلنا شروع ہو گئی تھی۔ دجلہ پر کشتیوں میں نئے پہرہ دار اپنی تان آوازوں کے ساتھ اور مضبوط ہاتھوں سے کشتیاں کھے رہے تھے۔ شاہراہوں پر گھوڑوں کی ٹاپیں تیز ہو گئی تھیں اور دور کسی مینار پر نصب ساعت نما سے گھنٹہ بجا تھا اور یکا یک اسے یاد آیا کہ قہرمانہ نے کہا تھا کہ گل رنگ اس پر بہت توجہ دیتی ہے۔

بے چینی میں جیسے قرار آ جائے۔ اس نے گل رنگ کو بلا کر اس سے بات کرنے کا ارادہ کیا اور صبح سے پہلے وہ لرزتی کانپتی اس کے حضور حاضر کر دی گئی۔

”بیٹھ جاؤ گل رنگ۔“ اس نے رات کا اضطراب چھپائے ہوئے کہا۔ ”میرے پاس فرصت کا یہی وقت ہے۔ تمہیں واپس آئے تقریباً دس ماہ ہو گئے ہیں۔“

”جی آقا۔“ اس نے نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا جس کی طرف حامد نے اشارہ کیا تھا۔

”میں تمہارا نہایت شکر گزار ہوں کہ تم حسین پر خصوصی توجہ دیتی ہو۔“

حیرت کے مارے وہ نشست سے تقریباً گرتے گرتے بچی۔

”تمہیں حسین کی والدہ نے اس کی دلداری کا ذمہ سونپا ہوگا۔“ حامد کی شدید خواہش تھی کہ وہ مطلب کی بات تک جلد از جلد پہنچے۔

”جی آقا۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا ”آخری وقت میں کوئی بات نہیں ہو سکی تھی۔ انہوں نے کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ تو ایسے ختم ہو گئے اس جہاں سے ایسے گزر گئیں جیسے ہوا کا جھونکا یوانوں کے پردوں کو ہلائے گزر جائے۔“

”تو آخری گھڑی میں تم اس کے پاس نہ تھیں۔ وہ بیمار تھیں۔؟“ حامد کو اپنی کوتاہی پر غصہ آ رہا تھا کیونکہ ان سب باتوں کا علم اسے بہت پہلے ہو جانا چاہئے تھا۔

”نہیں آقا۔ وہ باتیں کرتے کرتے ایک دم خاموش ہو گئیں جسے چراغ ایک دم بجھ جائے۔“ گل رنگ کو اب اپنے دم میں کچھ دم آتا جان پڑا۔ آقا صرف انمول کی موت کی آخری گھڑیا جاننا چاہتے تھے۔

”تم نے ابھی کہا وہ تم سے باتیں کر رہی تھیں۔ وہ کیا باتیں تھیں۔ کیا تم اس گفتگو کو دہرا سکتی ہو۔ اگر تمہیں یاد ہو تو میرا خیال ہے تمہارا حافظہ کمزور نہیں ہے۔“ اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔ وہ مجھ سے مجو گفتگو نہ تھیں۔“ گل رنگ کو لگا وہ گہرے اور نامعلوم پانیوں کی طرف لائی جا رہی ہے۔ وہ کیا کرے۔

”تو پھر کون تھا۔ اسے بلایا جائے۔ اس سے پوچھا جائے۔ میں نہایت ضروری جاننا چاہوں گا۔“ حامد نے ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ اس کا سایہ مدھم چراغ کی روشنی میں بہت مہیب لگ رہا تھا جیسے وہ سارے کمرے میں بھرا ہو۔ گل رنگ کانپنے لگی۔

”ہاں گل رنگ وہ کون تھا۔“ اس نے پھر پوچھا۔

”مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں قبہ زمزم کی طرف جاؤں اور جو شخص سب سے الگ اور سکون سے کھڑا ہو اور جس کی گدڑی سب سے میلی ہو اسے بلا کر لاؤں۔“

حامد بن عباس نے ہمت پکڑنے کے لئے نبیذ کا ایک جام خود ہی صراحی میں سے بھرا اور پی گیا۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔ مسند پر دونوں ہاتھوں کا سہارا لے کر اس نے کہا۔

”ہاں تو گل رنگ۔ اس کا نام بھی تم نے پکارا ہوگا۔ اسے کچھ تو کہا ہوگا۔“

آنسو گل رنگ کی آنکھوں سے رواں تھے اور اس کا سانس رک رہا تھا۔

”ابن منصور۔ شاید یہی نام تھا۔“ اس نے یاد کرتے ہوئے کہا ”میں نے کہا تھا ابن منصور آپ ایک جاں بلب مریض کے بستر مرگ پر بلائے جا رہے ہیں۔“

”کیا تمہاری آقا بیا تھی۔“

”نہیں آقا۔ میری نگاہوں میں وہ بہت ٹھیک تھیں۔ اس سے پہلے دن بھی اور سب دنوں میں جب ہم یہاں سے روانہ ہوئے ہیں انہیں ذرا سی شکایت نہیں تھی۔“

”تو پھر تم نے اس گدڑی پوش سے کیوں کہا کہ وہ ایک جاں بلب مریض کو دیکھنے کے لئے طلب کیا جاتا ہے۔“ حامد نے نہایت خفگی سے کہا۔

”آقاے مہربان۔ آقا خاتون نے کہا تھا کہ میں ایسا ہی کہوں۔“

”انہیں کیسے معلوم تھا کہ وہ قہ زمزم کے پاس کھڑا ہوگا۔“

”میں دلوں کا حال نہیں جانتی جو حکم دیا جاتا بجالاتی تھی۔“ گل رنگ نے کانپتے ہوئے جواب دیا۔

”تم نے ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی تھی وہ سنی تھی؟ میری طرف دیکھو اور جواب دو۔“ اس نے سختی سے کنیز کا چہرہ اوپر اٹھا دیا۔

”سبکیوں کے درمیان اس نے کہا: ”میں دوسرے کمرے میں تھی اور مجھے ان کی باتیں سننے کا کوئی حق نہیں تھا۔“

”مگر تم نے ضرور کچھ سنا ہوگا۔“ پھر اس نے دانت پیستے ہوئے کہا ”گل رنگ تمہاری زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے۔ تلوار

کی اس نوک سے میں تمہاری آنکھیں نکال سکتا ہوں اور تم سے جواب چاہوں گا۔ تم جانتی ہو سناؤ۔“

”آقا۔“ اس نے تقریباً بے ہوش ہوتے ہوئے پکارا۔ ”مرنے والوں سے دفا کیسے کروں۔“

”دیکھو لڑکی۔“ حامد نے پھر اس کے آنسوؤں سے بھیگے چہرے کو اٹھایا۔ ”خدا کی نگاہ میں وہ صرف میری زر خرید کنیز ہی نہیں

میرے بیٹے حسین کی ماں ہے اور مجھے ہر حق پہنچتا ہے کہ میں اس کے آخری لفظوں کو سنوں جو تم جانتی ہو وہ مجھ سے کہو۔ کہہ دو تا کہ میری

روح سکون پکڑے۔“

بہت دیر دونوں کے درمیان خاموشی رہی گویا آوازوں کو نیند آگئی تھی اور سانس رک گئے تھے۔ پھر گل رنگ جیسے موت اور

حیات کی حقیقت کو اپنے نصیب کو سمجھ لیا ہوا اپنے لئے کوئی راستہ منتخب کر لیا ہو۔ اس نے کہا:

”آقا۔ انہوں نے ابن منصور کے سامنے اپنی لازوال محبت کا اقرار کیا تھا۔ اپنی نگران آنکھوں کا جو اس محبت کی وجہ سے ہر جگہ

اسے دیکھتی تھیں اور جو موت کے بعد بھی اس پر نگراہیں رہیں گی۔“

حامد بن عباس نے تھوک نلگتے ہوئے گل رنگ کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم نے جو سنا تھا وہ کیا ہے۔“

موت کے لئے تیار ہونے والوں کی طرح کنیز نشست سے اٹھ کر زمین پر بیٹھ گئی اور اس نے آقا کے قدموں کو چھو کر کہا:

”میں نے غلط نہیں سنا تھا آقاؐ محترم اور اس آخری گھڑی میں جب زندگی میرے لئے چند سانسوں سے سوا باقی نہیں ہے میں خدا کو گواہ بنا کر صاحب الزماں کی قام اٹھا کر کہتی ہوں کہ سچ یہی تھا۔ ایک ایک حرف۔“

حامد پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

دور کسی گھر کے کونے میں مرغ نے اڑاں دی۔ پھر باغ میں پرندے بولے جیسے سوتے سے جاگ گئے ہوں، جگا دیئے گئے ہوں۔ حامد نے درپچے سے دیکھا۔ اندھیرا ابھی اسی طرح گہرا تھا۔ درپچوں سے ٹکرا کر واپس جاتی آواز ہوا میں ٹلی نمی کی وجہ سے بوجھل اور ٹھہری ہوئی لگ رہی تھی جیسے موت کی تاریکی میں کودنے سے پہلے پیچھے رہ جانے والے راہ پر نظریں دوڑا رہی ہو۔ وہ سوچ رہا تھا۔ نہیں وہ محبتوں سے انکار کیا گیا انسان خالی ہاتھ سے پیٹ کو کھولے کھڑا تھا۔ انمول نے اس کی زندگی کی عمارت میں ایک دم آگ لگا دی تھی جیسے جمع شدہ گھاس کے محفوظ ڈھیروں میں کوئی چنگاری پھینک دے۔

حسین کی ماں جسے اس نے چاہا تھا۔

اس کی روح ایک ویرانہ تھی۔ شدت جذبات سے اس نے چاہا کہ وہ یہاں سے دریا میں کود جائے۔ شاید اس سوز نہاں کو کوئی آرام نصیب ہو۔

آخر وہ ابن منصور کون تھا۔

وہ پلٹا اور اس نے گل رنگ کو ایک جھٹکے سے اٹھا کر اپنے سامنے کھا کر لیا۔

”کیا تم جانتی ہو وہ کون تھا۔ وہ ابن منصور۔ وہ گدڑی پوش غلیظ آدمی۔ وہ کون تھا آخر۔ تمہاری مالکہ اسے کب سے جانتی تھی۔“

گ رنگ نے حامد بن عباس کے چہرے کو دیکھا جو دھواں دھواں تھا۔ آنکھیں اندر کودھنس گئی تھیں جیسے اس پر سے قیامت گزر گئی ہو۔ اس کا جلا ہوا وجود سوز دروں سے مہکتے شعلے کی سی ہوا دے رہا تھا۔

”آقا۔ مجھے ظہور مہدی کی قسم۔ میں اس کے سوا جو آپ کو بتا چکی ہوں کچھ نہیں جانتی۔“

”اگر وہ اب کبھی تمہیں نظر آئے تو تم اسے پہچان سکو گی۔“ حامد کی آواز نہایت مدہم تھی اور شک آلود بے یقین اور گری ہوئی۔

”مجھے مہدی موعود کی قسم میں اسے پہچان لوں گی۔ ہاں وہ بے پناہ آنکھیں کوئی ہرگز نہیں بھول سکتا۔ ایسی آنکھیں بس اسی کی ہی ہو سکتی ہیں۔ بھید جانتی ہوئی نگاہیں۔“

حامد اپنے پاؤں پر ہولے ہولے گھوما۔ ماتھے پر ہاتھ دھر کر وہ وہیں بیٹھ گیا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ حریری پردوں کو صبح صادق کے جھونکنے ہلایا۔ مسجدوں میں اذانیں بلند ہوئیں۔ پھر اونچے میناروں سے اٹھنے والی اس صدا سے خلائیں اور فضا میں بھر گئیں۔ ہواؤں نے رقصِ ناتمام کے چکروں میں جھومنا شروع کیا اور عرش بھی اسے سن کر سجدہ ریز ہوتے گئے۔

”کیا حسین کو معلوم ہے کہ اس کی ماں ایک گدڑی پوش سے عشق کرتی تھی۔“

گل رنگ کو لگا وہ قیامت سے گزر کر اور زندگی میں داخل ہو رہی تھی اور کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ صرف اسے حامد کی اذیت کو کم کرنے کے لئے اسے سچ بتادینا چاہئے۔

”آقائے محترم! یہ عشق نہیں تھا۔ یہ ایک طرح کا معاہدہ تھا۔ ایک مذہبی عقیدہ تھا۔ وہ گلیم پوش ”روح اللہ“ تھا۔ آقا زادی نے اسے یہی کہا تھا۔ مسیح موعود جس کے فس سے مردہ زندگی کی رگوں میں خون حیات دوڑنے لگے۔“

حامد ہنسا۔ مذہب کے یہ الجھاوے اسے ہمیشہ ناپسند تھے۔ ”کوئی روح اللہ ہے“ کوئی روح حیات ہے۔ مہدی موعود ہے آخر کیوں؟“

گل رنگ نے اپنی پیچانی سے پسینے کے قطرے صاف کئے۔ ”دنیا فسق و فجور سے بھر گئی تھی۔ اور اسے کسی مسیحا نفس کی ضرورت تھی۔ قائم القامہ کی امام مستور اب ظاہر ہوئے ہیں۔ ظہور مہدی ہو چکا۔“

حامد نے تیزی سے اٹھ کر اس کے کندے پکڑ لئے۔ ”تم قرمطی ہو زندیق ہو یا اہل بیت کی داعی ہو۔ کون ہو تم۔ تم کب سے دعوت میں شریک ہو اور تمہارے ساتھی کون ہیں۔“

”آل فاطمہ کی اذیتوں اور مصیبتوں کو کرم کرنے کے لئے کسی نئی دعوت میں شرکت کی ضرورت نہیں۔ یہ ہر دور کا تحفہ ہے جو آل رسول کے لئے آل حسین کے لئے بھیجا جاتا ہے۔ آل علی آل فاطمہ کیا منتظر نہیں ہیں کہ اس سیاہ رات سے دن کی روشنی میں آئیں۔“

”خاموش۔“ حامد نے زور سے پاؤں زمین پر مارا۔

پھر اس نے تالی بجائی۔ ایک رہ پوش حبشی اپنی نے اپنی تھو تھنی اندر کی۔ ”حکم آقا۔“

”اس کنیز کو لے جاؤ اور اس سے وہ راز دریافت کرو جو ظہور مہدی سے متعلق ہیں۔ عمار سے کہو ساری تفصیل مرتب کر کے مجھے بھیجے۔ صبح میں امیر المومنین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

تہ خانے کی طرف اترتی نم سڑھیوں پر کائی کی وجہ سے ان دنوں کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ دور نقارے پر چوٹ پڑی تھی۔

فوفیں صبح کی مشقوں کے لئے مستعد تھیں اور سوئے ہوئے بغداد میں حامد کے دل پر قیامت گزر چکی تھی۔
حسین ابن منصور نے سوچا۔

سچ کیا ہے؟

ظاہر اور باطن اور تخلیق

جو ہر لحظہ تغیر پذیر ہے سرگرداں، حرکت میں، جوشِ نمو میں بیتاب، مربوط اور غیر منقسم، گم کردہ راہ، ژولیدہ، بکھری ہوئی اور ٹکڑے ٹکڑے۔

اور اپنے اپنے دائروں میں گردش کرتی ہوئی، ضمیر انسانی کے جھپٹے، حیران و پریشان

تغیر پذیر بدلتی ہوئی اپنے الیے سے آشنا

ایک دوسری وادی میں محور قص

یہ تخلیق کا شعار ہے اسے بے قرار رکھے ہوئے

لمح بہ لمح

حقیقت اس کا احاطہ کئے ہوئے ہے اور اس سے ماورا ہے

اور ذہن انسانی کی نارسائی کا ثبوت ہے

سچ کیا ہے؟

اس ہندی سوداگر یاد آ یا جس نے اسے کالی کا اوتار کہا تھا۔ اسے ”روح اللہ“ کہا تھا۔ میجا نفس۔ مگر وہ خود کون ہے؟ اسے خود سے

بہت خوف آیا۔ وہ کیا تھا؟ پہلے اسے اس کی تلاش تھی اور اب وہ اپنی ہی تلاش میں تھا۔ اگر میں وہ ہوں۔ کیا۔ کیا؟ سفاک سوالوں سے

بچنے کے لئے وہ نوافل میں مشغول ہو گیا تھا۔ اے راز کائنات مجھ پر عیاں ہو۔ اے حقیقت مجھ پر آشکار ہو۔ سچ کیا ہے ظاہر اور

باطن؟ حسین نے اپنے نفس سے کہا۔ ابھی ٹھہر، عجلت کی اجازت نہیں۔ سوال اور وقت کا انتظار کھینچ۔

وہ منتظر رہا کیونکہ سوال کرتے رہنے اور اسے دہراتے رہنے کی لذت اس سے اٹھالی گئی تھی۔ سرعوشِ منور سے در سدرۃ المنتہی حطیم

میں جو تھے وہ سب کیا سوالی تھے منظر تھے۔

نفس نے ہنس کر کہا: ”میں بارگاہوں سے باہر ٹھہروں گا مگر میری منزل سدرۃ المنتہی نہیں ہے۔“

حسین نے کانپ کر کہا: ”تم کہاں جانا چاہتے ہو۔ اتنے گستاخ کیوں ہو۔ نماز عشق کے سجدہ شوق کی تو تمہیں توفیق نہیں۔“
نفس نے کہا: ”میں خود عشق ہوں اور نماز بھی۔“

حسین اس تعلیٰ کو سن کر خوف زدہ ہوا اور زمین پر ناصیہ فرسائی کر کے توبہ کرنے لگا۔ سنون محب کا کہیں پتہ نہ تھا اور بغداد میں اس کی عبادات کا چرچا تھا۔ اس کی ریاضتوں کے فسانے بننے لگے تھے۔ غلام سمری جو اس کی خدمت میں رہتا تھا ان قصوں کو ہوا دیتا تھا۔ امراء کے گھروں سے کنیزیں دعاؤں کے لئے حاضر ہونے کی اجازت چاہتیں۔ سواریاں اس خانقاہ کے دروازے سے لگی رہتیں جہاں پردہ مقیم تھا۔ ابو یعقوب قطع اس سے بیزار تھے اور وہ گویا زیر عتاب تھا۔

اس نے سوچا وہ سفر کرے گا اور کوہ صحرا کی تخصیص کے بنا چلتا رہے گا۔ یہاں تک کہ ان ساری بستیوں سے دور ہو جائے۔ خلقت جو اس کے گرد جمع ہوتی تھی اس کی محویت میں مغل ہوتی تھی۔ لوگ اس کی دعاؤں کی اجابت پر یقین بھی رکھتے تھے اور حیران بھی ہوتے تھے۔ اس کی خاموشی سے متاثر بھی سوال کرنے سے پہلے جواب پالینے کی حیرت کیسے کم ہو سکتی تھی۔ وہ دلوں کے بھید جاننے والا تھا۔ رازوں پر خبر دینے والا تھا۔

اونچے میناروں والے ایوانوں میں دالان اور در دالان محلوں میں بغداد کے گلی کوچوں میں اس کا شہرہ پھیل رہا تھا۔ وہ آنکھ اٹھا کر بات نہیں کرتا۔ کثرت نوافل سے اسے کوئی وقت نہیں ملتا تھا۔ وہ ہمہ وقت روزے سے ہوتا تھا۔
پھر کچھ ایسی خبریں پھیلنے لگی تھیں۔

اس کے نفس میں شفا ہے۔ وہ اگر سوکھی ہوئی شاخوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ لے تو وہ ہری ہو جاتی ہیں اور ان پر پھول کھلتے آتے ہیں۔

وہ جس بیمار کے لئے کہہ دے کہ تندرست ہو جا تو ہو جاتا ہے۔

پھر اور مبالغہ آمیز باتیں کہ وہ پانی پر چلتا ہے۔ دجلہ کو چل کر پار کرتے ہوئے اسے کئی دفعہ دیکھا گیا ہے۔

دیواریں اس کے سامنے سے ہٹ کر خود بخود اسے راستہ دیتی ہیں۔ اس کی دعا سے ناممکن باتیں ممکن ہو جاتی ہیں۔ وقت رک جاتا ہے۔ ہوا میں پرندے ٹھہرے رہتے ہیں۔ اس سے کچھ چھپا ہوا نہیں اور وہ مہدی آخر الزماں ہے۔

حامد کی ایک محبوب جا رہی کسی نامعلوم عارضے میں مبتلا تھی اور طبیبوں کی ان تھک کوششوں نے بھی اسے تندرستی کی طرف راغب نہیں کیا تھا۔ وہ خاموشی سے لیٹی رہتی۔ نہ کوئی شکایت نہ کوئی آواز نہ بیمار داروں کی بھیڑ کی طالب۔ بس اپنے سامنے بکتی رہتی، کبھی ہنس

دیتی اور پھر وہی المناک خاموشی دیکھنے والے کہتے اسے صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ ہوا میں آباد مخلوق اس پر سائی قلن ہے۔ کوئی اس پر قابو پا چکا ہے۔ کوئی کہتا اسے عشق تھا۔ مگر یہ سرگوشیاں سب دبی زبان میں ہوتیں۔ اغول کی موت کے بعد سے حامد بہت زرس رنج ہو گیا تھا۔ وہ بات بات پر قہر مانہ سے بھی الجھ پڑتا اور محلات میں کم ہی آتا تھا۔ پھر گل رنگ کے یکا یک غائب ہو جانے سے بھی سب طرف ایک ہر اس پھیلا ہوا تھا۔ لونڈیوں پر نگرانی سخت کر دی گئی تھی اور انہیں آزادی سے بازاروں میں گھومنے اور سامان خانہ لانے کی بھی اجازت نہ تھی۔ مگر اس رومی نژاد لونڈی پر حامد ہزار جان سے عاشق تھا اس لئے جب قہر مانہ نے دبی زبان سے کہا کہ طیبیوں کے ہاتھوں میں اگر شفا نہیں رہی کیوں نہ کسی مرد خدا سے دعا کا طالب ہو جائے تو حامد نے سر کے اشارے سے اجازت دے دی اور نبیذ کا پیالہ ساقی کنیز سے لے کر موسیقی کی ان دلنواز تانوں میں اپنے آپ کو مکمر نے لگا جو پس پردہ سازوں آوازوں کے تانے بانے سے بنی جا رہی تھیں۔ رقص کرنے والے نو خیز لڑکے جب گردن کو خم دے کر نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھتے تو نبیذ کا نشہ سہ ہو جاتا۔ لمبے سیاہ بالوں والی ساقی کنیز کی موہوم سی کمر پر نظر ثار ہونے لگتی اور ساری عمر اس آغوش میں گزار دینا حیات ہوتا۔ اے کاش!

گانے والے نے طنز پر اپنی انگلیاں پھیریں اور گایا۔

جب ہمارے دل میں تمہارا خیال آتا ہے

تو غم فراق سے دل دم نکلنے لگتا ہے

اگر ہم ضبط نہ کریں تو واقعی ہم مرجائیں

آہ کیا زمانہ تھا

وصال کا

جب ہم سرور شادماں تھے

خدا اس کی یادوں میں سدا سربزر کھے

وہ زمانہ جب تم ہماری روحوں کے لئے مہکتے ہوئے پھول تھے

بخدا ہمارے دل نے تمہارے سوانہ کسی کو اپنے اندر جگہ دی اور نہ ہی ہماری آرزوؤں نے تمہارے سوا کسی اور کی خواہش کی

وہ کچھ ہفتے پہلے بلاد مغرب کی ایک نہایت سخت ترین جنگ سے لوٹا تھا جہاں متغنی نے اس کو حالات کا جائزہ لینے کے لئے بھیجا تھا۔

حالات اتنے لرزہ خیز اور دگرگوں تھے کہ اسے سلطنت کے پائے ثبات میں لغزش ہی نہیں محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا اب کوئی دن میں

انہدام شروع ہو جائے گا۔ ظہور مہدی کی اس گھڑی نہایت جانقشانی سے پھیلائی ہوئی دعوات کی وجہ سے سارے علاقے اپنے مال و منال سمیت مہدی کے حلقہ بگوش ہو جاتے تھے۔ ابو عبد اللہ نہایت نیاز مندی سے مہدی کے گرد دولت کے انبار لگا چکا تھا۔ اور ایک ادنیٰ غلام کی طرح صرف خدمت گزاری میں خوش تھا۔ فوجیں اس جوش شہادت سے معمور تھیں جو آغا اسلام میں غزوات کے لے پایا جاتا تھا اور اس لئے بغداد کی فوجوں کا ان پر فتح یاب ہونا تقریباً ممکن ہو جاتا تھا۔ خوزیر خوفناک جنگ میں خلافت کی فتح ہوئی اور عبد اللہ شیعہ مغرب کی طرف دھکیل دیا گیا جہاں جاہل بربر عربوں سے بیزار ہونے کی وجہ سے اس کی اطاعت اور اس کے مذہب کو قبول کر رہے تھے۔

ابو عبد اللہ نہایت سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور اس نے جبل السیجان کو مضبوط قلعہ بنا لیا تھا۔ زیادہ اللہ کی غفلت کی وجہ سے اس نے بہت طاقت پکڑ لی تھی اور اپنے بھائی احوں کو جو ایک جنگجو اور باتدبیر سپہ سالار تھا، قتل کروا دیا تھا۔ اس کی عیش کی محفلوں میں جب بڑھتے ہوئے خطرے کا ذکر آتا تو وہ شراب کا جام اٹھا کر دیوار کے ساتھ دے مارتا۔

”جبل السیجان کیا جبل الطارق ہے کہ ہمیں اپنے پیچھے کشتیاں جلانی پڑیں گی۔“

سردارانِ قومن نے اپنی بقا اور عافیت کے لئے ابو عبد اللہ کی طاقت قبول کر لی تھی اور ظہور مہدی کی تیاریوں میں لگ گئے تھے۔ بھلا ہونے والے واقعہ کو کون روک سکتا تھا؟ اور یہ تو قاحم القامیامتہ کے ظہور کے گھڑی تھی جس کے لئے لوگ جانے کب سے منتظر تھے؟ قرامطہ اور اسماعیلی اور داعی جنہوں نے صرف خوشخبریاں پھیلائی تھیں اور تاجروں کے بھیس میں ملکوں ملکوں گھومے تھے۔ آل فاطمہ کے دن پھرے تھے۔

آل عباس کی بساط مغرب میں سمیٹی جا رہی تھی۔

اور کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ بھلا کوئی کیا کر سکتا تھا؟ یہ خدا کی مرضی تھی کہ بساطیں لپیٹی اور بچھائی جائیں۔ حامد بن عباس نے اخراجات کی تفصیل پیش کی اور دوسرے وزرا دور کے ملکوں میں لڑی جانے والی جنگوں میں محاصل کو لگانا یوں بھی ضیاع سمجھتے تھے اور مصر تو تقریباً دوسری دنیا تھا۔ ہاں اور دور۔ اور ان کا مسئلہ نہ تھا۔

علیحد حامد کی رومی نژاد محبوب جا رہے کے لئے جب قہرمانہ ابن منصور کے پاس پہنچی تو وہ مراقبہ میں تھا۔ اس کے غلام سری نے کہا: ”اگر آپ توقف فرمائیں بھی تو لا حاصل ہے وہ اب اگلی صبح کو ہی مل سکیں گے۔“

”یہ کثرت عبادات انہیں تھکا نہیں دیتی۔“ قہرمانہ نے پوچھا۔

”تھکا؟ وہ عبادت کے بعد مثل تازہ پھول کے ہوتا ہے۔ نہایت پیچیدہ ریاضتوں میں خدا سے ہمکلام۔“ سری نے فخر سے کہا۔
 قہرمانہ نے حیرت سے آنکھیں کھول کر کہا ”لوگ کہتے ہیں اس پر فرشتے اترتے ہیں۔“
 ”فرشتے؟ وہ تو بلا واسطہ خدا سے روز و نیاز میں مشغول ہوتا ہے۔“ سری نے سرگوشی کی۔
 قہرمانہ نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پیغمبر بھی وحی الہی کے منتظر رہتے تھے۔“

”جو صورت حال ہے میں نے اس کی آپ کو اطلاع دی ہے۔“ سری نے کہا۔

”تم نے کبھی سنا ہے کچھ دیکھا ہے کہ محض فسانہ بنا رہی ہو۔“ وہ بہت الجھ گئی تھی۔

”بغداد خاتون محترم! میں افسانے بنانے والوں میں سے نہیں ہوں مگر میں نے اسے ہوا سے گفتگو کرتے اور ہاتھ پھیلا کر چیزیں لیتے دیکھا ہے۔ وہ بھوک اور پیاس سے نا آشنا ہے۔ نیند سے اس کی آنکھیں کبھی بند نہیں ہوتیں۔ آرام اور اونگھ اس کے لئے نہیں۔“
 ”یہ صفات۔“ قہرمانہ نے سرکودائیں بائیں حرکت دی۔ ”انسان میں نہیں ہو سکتیں۔ تم نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“
 ”پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ خود دیکھ سکتی ہیں کہ جب مراقبے میں ہو تو اسے کوئی خبر نہیں رہتی۔ وہ مافق الفطرت ہے۔“ سری نے جواب دیا۔

”عام آدمیوں سے بڑھ کر پیغمبروں سے بڑھ کر یہ خدائی صفات ہیں۔“ قہرمانہ کھڑے سے بیٹھ گئی۔

”میں کیا عرض کروں۔ اس دور غلامی میں اتنی عجیب باتیں دیکھی ہیں میں نے کہ ان کے بوجھ سے میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔ ذہن کام نہیں کرتا۔ میں دروازے پر حاضر ضرور رہتا ہوں مگر میری ضروریات بھی دست غیب سے خود بخود پوری ہو جاتی ہیں۔ حاجت مند یہاں آتے ہیں اور ان کی حاجتیں پوری ہو جاتی ہیں۔ کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔“

قہرمانہ نے ہولے سے کہا ”ارے غلام دروغ گو۔ اگر یہ سب باتیں نہ ہوئیں تو یاد رکھ تاریک ترین خانہ تیرا منتظر ہوگا..... میں اب چلوں گی۔“

سری اسے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ فخر نہایت عمدہ اور زرد رنگ کا تھا اور آگے پیچھے راستہ صاف کرنے والا اچھی وردیوں میں ملبوس غلام تھے۔ وہ ہاتھ ملنے لگا۔ اس نے اپنے کلوں پر زور زور سے طمانچے مارے۔ وہ تو اس خاتون کو مرعوب کرنا چاہتا تھا صرف مرعوب۔ پتہ نہیں اب کون سا تاریک خانہ اس کا مستنفر ہو؟ کیا ہو؟

مگر ابن منصور کے کثرتِ نوافل اور طویل مراقبوں کا نتیجہ یہی ہونا چاہئے۔ سری نے سوچا۔ وہ اور لوگوں کی طرح کیوں نہیں؟ شب و روز کا شمار اس کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ بھوک پیاس، کسی شے سے اسے تکلیف نہیں ہوتی اور پھر بھی کثرتِ گریہ سے اس کی جان بے تاب کیوں رہتی ہے؟ اس کی آنکھیں مشعلوں کی طرح کیوں ہیں؟

جب قہرمانہ واپس پہنچی تو بیمار کنیز درتپے سے باہر دیکھ رہی تھی اور نشست پر نیم دراز تھی۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ اس نے سوچا بیک اس پر خواب کی کیفیت چھا گئی تھی اور نیند، تھکن اور گرمی نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔

”ناممکن۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ابھی صبح کے پہلے پہر میں اس مرد خدا سے ملنے گئی تو یہ اپنا ہاتھ بھی نہیں ہلا سکتی تھی۔ آنکھیں کھولنا اس کے لئے مشکل تھا۔ مجھے اس کی حیات سے مایوسی تھی اور اب؟ اس نے پلٹ کر دیکھا اور اٹھ کر اس سے پلٹ گئی۔

”دیکھا آپ نے مجھے ایک دم شفا بخش دی گئی ہے۔ میں چل سکتی ہوں۔ مجھے سخت بھوک محسوس ہو رہی ہے۔“

”قہرمانہ اسی جگہ بیٹھ گئی۔“ بخدا یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔“

”ایک آواز میرے کان میں کہہ رہی تھی۔“ بیدار ہو جاؤ۔ تم بالکل تندرست ہو۔“ اور پھر میں نے اپنے آپ کو ایسا پایا جیسا آپ مجھے دیکھ رہی ہیں۔“

”وہ روح اللہ ہے، مسیحائے حق ہے یا ان سے بھی عظیم۔ غائب دان اور خدا کی طرح شفا بخشنے والا۔“

قہرمانہ بالکل حیران ہو رہی تھی۔ ”مگر لوگ اس کے درپے ہو جائیں گے۔ خلقت اس کے ہلاکت بن جائے گی۔ میری نگاہوں نے بڑے پر غرور سروں کو خاک میں ملاتے اور خیالوں سے بھرے ہوئے ذہنوں کو قطع ہوتے دیکھا تھا۔“ وہ سوچ رہی تھی۔ پھر اس نے اٹھتے ہوئے کہا ”میں آقا کو اطلاع دوں کہ تم بخیریت ہو۔“

رومی نژاد لونڈی نے اپنے لمبے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیرا اور شرما کر آنکھیں جھکا لیں۔

وہ آخر اتنی طاقتوں کا مالک کیسے ہو گیا تھا۔

اس پر فرشتے اترتے تھے۔

قہرمانہ نے اگلے دن غلاموں سے آنکھیں بچا کر پیدل اس خانقاہ تک راستہ طے کیا جہاں وہ مقیم تھا۔ وہ سراپا نیاز تھی اور منتظر مگر اسے باریابی کی اجازت نہیں ملی اس لئے کہ ابن منصور نے غلام سری سے کہا تھا کہ وہ کسی خاتون سے ملنا نہیں چاہتا۔

”کیا تم میرے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔ میں صرف ایک نظر نہیں دیکھنا چاہتی ہوں۔“

”میں دروغ گو غلام نہیں ہوں اس لئے جھوٹے وعدے کیسے کر لوں۔“ سری نے جواب دیا۔

قہرمانہ خاموشی اور نیاز مندی سے سر جھکائے اس کی باتیں سنتی رہی۔

”مجھے ایک بار صرف ایک بار شرف ملاقات بخشو۔“ قہرمانہ نے کہا۔

”نہیں۔ جب تک مجھے اذن ملاقات نہ ہو میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ سری نے نہایت رعونت سے کہا۔

”شاہی دربار میں بھی بارل جایا کرتا ہے۔ بڑے بڑے شہنشاہ بھی خلعت کے محتاج ہوتے ہیں۔“

”صرف سائل کو اجازت ہوتی ہے، محض ملاقات کرنے والاوں کو نہیں۔“ سری اندر چلا گیا۔

وہ بھیڑ میں جو باہر جمع تھی مل کر بیٹھ گئی۔ جہاں چہرہ چھپائے ہوئے اپنے آپ کو رداؤں میں لپیٹے بیمار اور تندرست سب طرح کی عورتیں جمع تھیں۔ مرد اور جوان بچے اور بوڑھے سب تھے مگر کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ کوئی عجلت میں نہیں تھا۔ کوہ اذن باریابی نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ عجیب بھیڑ تھی۔ قہرمانہ نے ہمیشہ خلافت کے ایوانوں میں لوگوں کو جمع دیکھا تھا۔ سرگوشیاں کرتے بے تاب پریشان منتظر تیزی میں الجھے ہوئے پیشانیوں پر لکیریں گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے پسینے میں شرابور بیزار کنپٹیوں کی رگیں پھڑکتی ہوئی آنکھوں میں سوال لئے دیوانوں کی طرح ان کے چہرے سوال ہی سوال ہوتے تھے۔ مگر یہاں جو لوگ تھے وہ کہاں سے آئے تھے۔ کیوں ایسے تھے؟ نرم گفتار خاموش کسی اور دنیا کے مخلوق اور یہ بادشاہت کوئی اور بادشاہت۔

میں اب تک کیوں بھٹکتی رہی ہوں۔ کہاں بھٹکتی رہی ہوں؟

جب دن ڈھل گیا تو لوگوں کی واپسی شروع ہوئی۔ کسی کو اندر نہیں بلایا گیا۔ کسی کو اذن باریابی نہ دیا گیا۔ کسی کو کچھ نہیں کہا گیا۔ سری لوگوں کو پانی پلا رہا تھا اور ان سے کبھی ویسی ہی باتیں کرتا تھا جیسی اس نے اس سے کی تھیں۔ سب سے آخر میں اس کی باری آئی۔

”تم واپس جاؤ اور منتظر رہو۔“ سری نے نقاب کی طرف اچھتی ہوئی نگاہ بھی نہیں ڈالی۔

جب قہرمانہ قصر میں واپس آئی تو اس نے ایک غلام کو منتظر پایا۔ پھر اس نے اپنی چادر اتاری اور وہ حوامد بن عباس کے اس کمرے کی طرف چلی گئی جہاں باریابی کے لئے بلائے جانے والے کو اجازت تھی۔ وہ داخل ہوئی تو حامد کھڑا تھا۔ بغیر پلٹے اس نے کہا۔

”قہرمانہ! میں قبیحہ کو دیکھ کر حیران ہوں۔ یہ تو ایک معجزے سے کم نہیں۔“

”جی آقا۔ یہ معجزہ ہی ہے کیونکہ میں ابن منصور کو دیکھ نہیں سکی۔“

”کیا مطلب۔“ اس نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ کہ وہاں کسی کو باریابی کی اجازت نہیں۔ سب لوگ باہر منتظر رہتے ہیں اور پھر گھروں کو چل دیتے ہیں اور ان کے دکھ درد خود

بخود ختم ہو جاتے ہیں۔“

”دلچسپ۔“ حامد نے کہا ”تم نے اسے دیکھا ہے جس کے در پر سوالی بیٹھے رہتے ہیں۔“

”جی نہیں آقا۔“

”تو اسے دیکھو اور پھر مجھے اطلاع دو۔“ وہ نہایت تلخی سے مڑا۔ اس نے تالی بجا کر حبشی غلام کو بلایا اور اسے نیند کے وقت سے

بہت پہلے صراحی لانے کو کہا کیونکہ اس کی طبیعت اتنی بڑی خوشی کے باوجود اندر سے بہت مکدر تھی جیسے قہر مانہ نے ابن منصور سے نمل کر

کوئی بہت بڑی کوتاہی کی ہو۔ پتہ نہیں یہ کونسا ابن منصور تھا اور اس کے ذہن پر گزرے واقعات جیسے پردے کے سامنے سے تصویریں

گزریں، گزرنے لگے.....

نبیذ ہر کا پیالہ تھی.....

ساقی کی صورت میلی میلی اور صراحی پکڑنے کا انداز نہایت کریہہ تھا۔

رقص بیکارا چھل کودھی

موسیقی نوحہ تھی

سازوں میں آہنگ نہیں تھا

اس نے نبیذ کا پیالہ وہیں الٹ دیا۔ سازندوں کو خاموش کر دیا گیا۔ رقص کرنے والی کنیزیں واپس لوٹادی گئی تھیں۔ پردے برابر

کر دیئے گئے تھے۔ رومی نژاد جاریہ کہیں اندر کے ایوانوں میں ٹھہری رہی اور حامد بن عباس کے منہ میں ریت کا مزہ تھا۔ اس کے

دانتوں تلے کچکا پھاٹ تھی۔ بغداد اسے اتنا ویران کبھی لگا تھا۔ زندگی نہایت بے کیف تھی۔ پھر یکا یک اسے کچھ یاد آیا اس نے تالی

بجائی تو زرہ پوش حبشی نے اپنی تھوٹھی اندر کی۔

”آقا۔“

”اس کنیز کو لاؤ، گل رنگ کو۔“ اس نے کہا

وہ تھوٹھنی پردوں کے عقب میں غائب ہو گئی تھی مگر وہ منتظر اور بے تاب رہا۔ ایک ایک لمحہ اس پر ہزاروں سال کا ہو کر گزر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا وہ کائنات کا آخری فرد ہے اور سب کچھ تباہ ہو گیا ہے۔ اس کے گرد سوائے راکھ کے اور کچھ نہیں۔ وہ ایک ویرانے میں ہے اور مرنے نہیں سکتا۔ اس کے ذہن میں آنندھیاں چل رہی تھیں۔ وہ تنہا تھا اور عذابِ جنم سے گزر رہا تھا۔ چاروں طرف ایک عجیب تپش تھی۔ اس نے کتنے نامعلوم پرخطر راستوں سے اس طاقت تک سفر کیا تھا۔ اپنے ماضی کو جو ایک بار اجڑ چکا تھا پھر سے سرسبز کیا تھا۔ اس نے خیابوں کو پھر آباد کیا تھا۔ ایک بے نام طالب علم سے اس نے ایک وزیر کے عہدے تک اپنی محنت و ریاضت سے رسائی حاصل کی تھی اور اب جب وہ اپنے حرم میں اقصائے عالم سے لائی ہوئی طرحدار کنیزوں اور بے پناہ حاجت مندوں کے جھوم میں غلطیاں تھا۔ یکا یک اسے معلوم ہوا کہ کسی شے کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ ایک گدڑی پوش نے اس کی زندگی کے چمن کو پھر سے ویران کر دیا تھا اور وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ جو خلیفہ کے مزاج میں دخیل اور وزیرِ بادشاہ تھا۔ کیا تھا؟

گل رنگ کو لے کر ان ہزار سیزھیوں کی پھسلن کو پار کر کے جب حبشی غلام نے جھک کر حاضر ہونے کی اجازت چاہی تو اس کی تلوار نے زرہ کو چھو کر ایک خفیف سا شور کیا۔ حامد مڑا اور اس نے گل رنگ کو دیکھا جو اسی طرح تازہ دم نو بہار تھی اور جس کے چہرے پر چمک تھی اور آنکھوں میں ایک سکون تھا۔ سردی جس کے جھونکے نے اس پر کپکپی طاری کر دی۔ پتہ نہیں یہ بخ جھونکا کہاں سے آیا تھا کون اسے ساتھ لایا تھا۔ اس نے کیونکر ایسا محسوس کیا تھا حالانکہ پردے گرے ہوئے تھے۔ درتے بچے بند تھے اور دریا کی طرف کھلنے والے دروازوں پر بھی خاموشی تھی۔

”ادھر آؤ۔ قریب آؤ۔“ اس نے کنیز کو حکم دیا۔

گل رنگ کے چہرے پر تحیر اور تسخردیدنی تھا۔ اس کے گرد کوئی خوف و ہراس نہ تھا مگر وہ ایک ایک قدم یوں اٹھا رہی تھی جیسے موت کی طرف مراجعت کر رہی ہو۔

حامد نے کہا:

”گل رنگ تمام بن منصور کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ شہر میں وارد دو ہی ہے جسے تمہاری آقا خاتون نے روح اللہ کہا تھا جو اس کو زندہ دیکھنے والا آخری انسان تھا۔“

گل رنگ نے سر جھکا لیا۔ حامد کے منہ سے لفظ کنکریاں بن کر چبھے۔ اس کے دل میں بحریہ کی سی موجیں اٹھ رہی تھیں۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم کو آزاد کر دیا جائے گا مگر مجھے ابن منصور پر اچھی طرح سب معلومات چاہئیں۔ وقت اور ذرائع

تمہارے لئے لامتناہی ہوں گے مگر مجھے اصل خبر چاہیے۔“

گل رنگ نے آداب کر کے کہا: آقاؑ محترم! اگر ابن منصور وہ شخص نہ ہوا تو پھر۔“

”پھر بھی تم آزاد کردی جاؤ گی۔ تمہیں حدود مصر کی طرف جانے کی اجازت ہوگی۔“ حامد نے خوش دلی سے کہا۔

حبشی غلام واپس جا چکا تھا اور گل رنگ ابھی تک وہاں تھی۔

”اپنے قید و بندے سے متعلق ایک لفظ نہیں۔“ حامد نے یوں کہا جیسے اسے کچھ یاد آ گیا تھا۔

”بہتر آقا۔“ اس نے آہستہ سے کہا۔

”قہر مانہ کو کیا جواب دیا جائے گا آقا۔“ گل رنگ نے پوچھا۔

”تم اس میرے پاس بھیج دو۔ تم حرم میں جا سکتی ہو۔“ حامد نے کہا۔

پھر اس نے بڑے دروازے میں سے اندر کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا اور ایک ٹھنڈی آہ بھر کر اس نے ان دنوں کو یاد کیا جب اغول تھی اور پھر حسین کی ولادت اور چھوٹے چھوٹے واقعات بارش کے قطروں کی طرح ٹپ ٹپ اس کے گرد برسنے لگے۔ یادیں اور مسرتیں اور اس کی مسکراہٹ اور خاموشی اور سنہری بالوں کا خیال اور اس کا استغناء کم آ میزی جو بے رخی ہرگز نہ تھی۔ اس کی عبادات اور سنجیدگی دوسری کنیزوں سے اس کا ایک دم الگ تھلگ ہونا وہ اس کی زندگی میں بس ضرور گئی تھی مگر پتہ نہیں کیوں وہ ہرگز خوش نہ تھی۔ اسے وہ زمانہ یاد آتا تھا جب حسین پیدا ہوا تھا۔ پھر تربیت کے لئے اس کا حرم سے باہر رکھا جانا اور اغول کا تنہائی کی طرف لوٹ جانا۔ اپنے خدا کی عبادت میں منہمک ہو کر خدم و حشم کے ساتھ طویل سفر کرتے رہنا۔

حامد کو دربار کی مصروفیات اور ذمہ داریوں نے لپیٹ لیا تھا۔ آخری بات جب وہ اس سے رخصت ہو رہی تھی تو طمانیت کا نور اس کے چہرے پر تھا۔ اس کی طویل غیر حاضری میں حامد کو یاد آتا تھا کہ اس نے کہا تھا:

”آقا! اب ہو سکتا ہے ملاقات میں کچھ زمانہ لگے۔“

وہ اس کے لئے اپنے جی میں عجیب سی بے چینی پاتا تھا۔ اس جملے کی توجیہات اس نے اپنے طور پر کی تھیں اور پھر اس کی موت کی خبر اور ملاقات کے لئے زمانوں کی دوری۔ پتہ نہیں حشر کے میدان میں روز حساب انکی ملاقات ہو کہ نہ ہو۔ بہر حال سینے میں دل کی جگہ ایک خلا تھا جو بعد کی مصروفیتوں نے کبھی پر نہیں کیا تھا۔

وہ یقیناً اسے نہیں مل سکے گی اس لئے کہ وہ ابن منصور کی محبت میں گرفتار تھی۔ اس کے آگے اور پیچھے اندھیرا تھا۔ یہ سب کنیزیں

جن سے اس کا حرم رشک حنان تھا اس سے محبت کرتی تھیں۔ ان کی ادا میں ان کی محبت ان کا بالکل بن گیا مجبوری نہ تھی؟ اور وہ روئی نژاد لونڈی جس کے سنہرے بالوں کے جال میں وہ گرفتار تھا کیا وہ اس کو چاہتی تھی؟ چاہ سکتی تھی۔ محبت اس کے لئے کہاں تھی۔ صرف زندگی کا بے سایہ ویرانہ تھا جس میں اسے اکیلے ہی بھاگتے رہنا تھا اور جس کی منزل ناپید تھی۔ طلسم حیات کے بند دروازے اس کے لئے بند رہیں گے۔ وہ کبھی اس شہزادی تک نہ پہنچ سکے گا جس کو ہزار وقتوں اور جان جو کھوں سے حاصل کیا جاتا اور پھر حاصل حیات بن جایا کرتی تھی۔

لوگ کن لوگوں سے محبت کرتے ہیں۔

محبت کیا شے ہے۔

وہ تنگ تاز حیات میں کبھی سمجھ ہی نہیں پایا تھا کہ محبت کیا شے ہے۔ اس نے آج تک کسی کو کچھ دیا نہیں تھا ان سے لیا تھا۔ ان کی وفا کا طالب رہا تھا۔ ان کی نگاہ کا طالب رہا تھا۔ اپنے آپ کو نقطہ پر کار محبت سمجھتا رہا تھا۔ اس نے کیا سمجھا تھا۔ راز حیات کیا ہے۔

اگر محبت ہے تو پھر خدا کی محبت کرنا بھی ممکن ہی ہوگا۔ کیا وہ مقصود حیات تھا۔ بکنے والے غلاموں کی طرح جو بازاروں میں خریدے جانے کے منتظر ہوتے ہیں۔ اس کے سوال بھی جوابوں کے انتظار میں تھے۔

دلہی دل میں وہ یہ دعا بھی کر رہا تھا کہ ابن منصور وہی نہ ہو مگر اس میں ابن منصور کا کیا قصور تھا۔ وہ طلب کئے جانے پر غلط اطلاع پر گیا تھا۔ وہ اغول سے کب ملا تھا۔ کیونکر ملا تھا۔ کبھی نہ حل ہونے والے معمول کی طرح گدڑی پوش مرد حق اور اغول کی تصویر اس کی نگاہ میں گھوم گئی۔ اغول نہیں تھی اور کوئی بتا نہ سکتا تھا کہ وہ ابن منصور کو چاہتی رہی تھی۔ کیوں؟

بظاہر دنیا کی سب نعمتیں اسے میسر تھیں۔ اس نے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی اسے زرخیز لونڈی نہ سمجھا تھا۔ اس نے شادی کی تھی تا کہ صالح اولاد کا باپ کہلا سکے۔ اسے حسین سے بے پناہ لگاؤ تھا۔ اس کا کھویا کھویا سہا ہوا انداز کونوں میں چھپ چھپ کر رونے کا طریقہ ہمیشہ اس کے دل کو ہلاتا تھا۔ آزاد فضا میں تربیت دیا گیا یہ بچہ ایسا کیوں تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔

حسین کہا تھا؟ گل رنگ سے اس تفصیل کے معلوم ہونے کے بعد اس کی زندگی ایک بھس بھسے کھلونے کی سی ہو گئی تھی جو حرکت کرتا ہے کہ اس کی ڈوری کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ تماشا دکھانے والے کی صوابدید پر اس کا انحصار ہوتا ہے۔ وہ بھول گیا تھا کہ وہ کیا تھا۔ کنیزیں اور شبانہ زندگی دربار کی مصروفیات سفر سب سائے میں دیکھی صورتوں کی طرح اس کے گرد اس تماشے میں شامل

ضرورت تھی مگر اس کے احساس شکست میں شریک نہ تھے۔ وہ بکھرا ہوا انسان تھا جو نامعلوم سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا تھا اور خون آلود وجود کو یونہی گھیسے پھرتا تھا۔ ابن منصور ایک سائے کی طرح اس کے تعاقب میں تھا۔ ہر موڑ پر حملہ آور ہونے کو کو تیار تھا اور حیرت تو یہ تھی کہ اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کا دشمن کون ہے۔

ابن منصور ایک عام آدمی تھا اور اس کے نزدیک کسی عہدے پر فائز نہ ہونے کی وجہ قابل اعتنا نہیں تھا۔ وہ شاعر نہیں تھا، موسیقار نہیں تھا اور حامد بن عباس اس سے آگے کچھ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آدمی عظیم ہوتا تھا تو دربار میں اس کی کرسی ناقابل حصول ہوتی تھی جس کو حاصل کر کے اس نے اپنے آپ کو نہایت قابل تسلیم کروالیا ہوتا تھا۔ وہ اس سائے سے کس طرح عہدہ برآ ہوا۔ اسے گل رنگ کے لوٹ کر آنے اور ابن منصور کے متعلق صحت شخصیت پر گواہ ہونا تھا۔

گل رنگ اس سے دغا نہیں کر سکتی تھی۔ اسے بغداد میں رہنا تھا اور وہ اس سے فریب نہیں کر سکتی تھی۔ بہتر ہوتا وہ قہرمانہ کو بھی گل رنگ کے ہمراہ بھیج دیتا۔

اس نے تالی بجائی۔ قہرمانہ کو بلانے کے لئے حرم کی حبشی کنیز کو حکم دیا۔ قہرمانہ نہیں تھی۔ حبشی کنیز نے اپنے موٹے ہونٹ لٹکا کر جواب دیا تھا۔ مگر وہ کہاں تھی؟ حامد بن عباس کو لگا دیواریں اس کے گرد گر رہی تھیں۔ چھت اس کے سر پر آ رہی تھی۔

”تقریباً ایک ہفتے سے وہ یہاں نہیں ہے۔ شاید رخصت طلب کر کے کہیں گئی ہو۔“ حبشی کنیز کانپ رہی تھی۔

”قہرمانہ..... کہاں ہے قہرمانہ اسے بلایا جائے۔“ اس نے پاس لگی ریشمی ڈوری کو کھینچا جس کا مطلب اس کے محافظ دستے کی فوراً طلبی تھی۔

ایک ساتھ پاؤں اٹھنے کی آواز نے عجیب سنسنی پیدا کر دی تھی اور اب کہ وہ سب ایوان کے باہر باادب منتظر کھڑے تھے اور ان کی بے نیام تلواروں کی چمک آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ وہ جی ہی جی میں شرمندہ ہو رہا تھا۔ کیا قہرمانہ کے لئے اس نے انہیں بلایا تھا۔ موہوم سے خوف کی بنا پر اور خوف بھی کیا تھا؟ اسے کیا خوف تھا۔ ایک نے نام نامی معلوم سا خوف کہ قہرمانہ نے بھی اس کا ساتھ نہ چھوڑ دیا ہو۔ کوئی کسی کو وفادار رہنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔

وہ باہر منتظر رہے اور ان کے سالار نے اندر آ کر ”حکم آقا“ کہ کر سر جھکا دیا۔ وہ ایسے جاں نثاروں کا دستہ تھا جس کو حامد نے زر کثیر کے خرچ سے اور بہت داد دہش سے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ سلطنت میں آگے بڑھنے اور اپنے پاؤں اپنی جگہ مضبوط جمانے کے لئے ایسے اقدامات ضروری تھے۔ پھر حامد کے دل میں آرزوؤں کی جو بھٹی جلتی تھی اور گزرے وقار کو حاصل کرنے کی جدوجہد اس نے

کی تھی اس کے لئے بھی اور ترکوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو مضبوط بنانے کی خاطر بھی وہ دولت لگانے میں بخیل نہ تھا۔

”تمہاری طلبی محض امتحان تھا اور کچھ نہیں۔“ حامد نے محبت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ حکم کا منتظر وہاں کھڑا رہا۔

حامد نے کہا ”نئے ترک سواروں کا ایک دستہ وصیف نے ابھی متعین کیا ہے وہ لوگ کیسے ہیں۔“

”شوریدہ سرا اور مغرور بغداد کے بازاروں کی رونق ان لوگوں کی آنکھوں کو چند ہیادیتی ہے۔ وحشی قبائلی لوگ ج یہاں پہنچتے ہیں تو

دنوں میں اپنا ماضی بھول جاتے ہیں۔“ سالار نے جواب دیا۔

”ماضی بھولنے کے لئے نہیں ہوتا اور جو لوگ ماضی کو بھول سکتے ہیں وہ حال میں بھی زندہ نہیں ہوتے۔“ حامد نے وضاحت کی۔

”تم لوگ اپنی آنکھیں کھلی رکھو اور ان پر نگران رہو۔“

سالار پھر جھکا اور پھر کھڑا رہا۔

”اب تم جا سکتے ہو۔“ حامد نے اسے رخصت کی اجازت دی۔

قہرمانہ کو کہاں ڈھونڈا جائے۔ کس سے کہا جائے۔ کس سے کہا جائے ابن منصور کو تلاش کرنے والی وہی تھی مگر اس کا بنا اطلاع

دیئے غائب ہو جانا اسے کچھ اچھا نہیں لگا۔ حرم کی رازدان اور کنیزوں کی حاکم اس کے لئے کسی نئی عقل و فہیم عورت کو جو نگران ہو سکے

بہت مشکل ہو گیا تھا۔ کہاں تلاش کیا جائے۔

بغداد میں صوفیاء اور اذکیا کا یہ نہایت معمور تھا۔ مسجدیں اور خانقاہیں مدرسے اور صومعے، زاویے اور جامع ان سے آباد تھے۔

ایک دنیا سمٹ کر دجلہ کے کنارے آباد ان مشرقی اور مغربی حصوں میں سما گئی تھی۔ اسٹافن اور فلسفی اپنے شاگردوں کی بھیڑ میں شاموں

کو دجلہ کے کنارے باغوں میں فروکش ہوتے اور بحث مباحثے کی نشستیں جمتیں، اعتقادات و مذہب کا ایک مسئلہ زیر بحث لایا جاتا

تھا۔ آزادی فکر اور دعوت عام سے یونانی اور ہندوستانی کوئی بھی مکتب خیال ایسا نہ تھا جس پر پابندی ہو۔ خلیفہ معتضد باللہ کے جو

وساوس اور خوف تھے اس کے بعد رفتہ رفتہ ان کا ازالہ ہو رہا تھا۔ انسان اور اس کی حدود ممکنات اور کائنات۔ خدا اور اس کی ذات

سب پر مدلل اور طویل مباحث کی مجالس ہوتیں جس میں یہودی اور نصرانی بھی حصہ لے سکتے تھے اور اپنے بڑے بڑے مدارس سے

محض ان میں حصہ لینے آتے تھے۔ مبالغہ اور مکالمہ سب کی اجازت تھی۔ یہ ایک ایسی آزاد دنیا تھی جس کے دروازے کسی پر بند نہ

تھے اور اس لئے حامد کو یقین تھا کہ سوائے گل رنگ کے اس کی آتش انتقام کو سرد کرنے کے لئے کوئی نشاندہی نہیں کر سکتا تھا۔ کبھی بھی

نہیں۔

حسین نے اپنے باپ منصور کو دیکھا کہ باہر منتظر بھیڑ میں سے راستہ بناتا اندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ غلام سری نے اسے نہایت گستاخی سے روک کر پوچھا:

”تم کس کی اجازت سے گھسے چلے آتے ہو۔“

منصور نے نہایت آزرده ہو کر کہا: ”باپ کو بیٹے کے پاس آنے کے لئے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔“

سری نے اس بوڑھے آدمی کو ایک نظر سر سے پاؤں تک دیکھا۔ سفید بالوں میں کہیں کہیں سیاہی کے تار تھے مگر دکھتا ہوا چہرہ حسین کی شبابہت کے لئے تھا، معافی چاہتے ہوئے اس نے کہا: ”معاف کر دیا جاؤں تو بہتر ہے، میں نے دانستہ یہ غلطی نہیں کی۔“

”یہ درویش کی بارگاہ ہے کسی حاکم اعلیٰ کی بارگاہ نہیں۔“ منصور دروازہ کھول کر اپنے بیٹے کی طرف گیا۔

حسین اور وہ زمانوں کے بعد ملے تھے۔ منصور نے دیکھا اس کے بیٹے کے چہرے پر جلال تھا، ماتھے پر ایک رگ تڑپ رہی تھی اور لودیتی تھی۔ ہندی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ دائیں بائیں سے ناک اور پیشانی اور لبوں سے ٹھوڑی تک ہر حصہ برابر تھا۔ یہ ایسا رخ روشن تھا جس کی چمک پر سے نظریں پھسل پھسل جاتی تھیں۔ وہ نظر کی امان کی دعا پڑھتا ہوا جی ہی جی میں اس پر غار ہوتا ہوا بڑھا کہ اسے گلے لگائے مگر حسین اس کے قدموں میں لپٹا تھا جیسے کوئی غلام ہو۔ وہ حواسوں میں تھا اور فسانے جو ابو یعقوب قطع نے اسے سنائے تھے سب غلط تھے۔

حسین نے دیکھا اس کے باپ پر بڑھاپے نے شب خون مارا تھا۔ زندگی اور دنیا سب لہہ گزران تھا اور آدمی کیسے عاقبت کی طرف سفر کرتا تھا۔ ابھی اسے وہ گھڑی یاد تھی جب اس نے قطع کے گھر اپنے دادا کو دوست ہندی سوداگر کو نکل جانے کا کہا تھا۔ یہ عجلت پسندی اور تیزی جو اس کی طبع میں تھی۔ اس کی سرشت اور اس کے خون میں تھی۔ یہ التہاب جو اس کی ذات کا حصہ تھا۔ یہ حدت جو اس کی رگوں میں خون کے ساتھ رواں تھی، یہ اس آتش پرستی کی باقیات تھی جو اس کے آبا کا مذہب تھا۔ شعلے کی طرح بھڑکنا اور الاؤ کی طرح روشن ہونا۔ وہ خون کی امانتوں کو جھٹلانے پر قادر نہیں ہوا تھا۔ ہر گام پر اس کی عجلت پسندی نے اس کے لئے فتنے کھڑے کئے تھے۔

اس کے مطالبے اور اس کی تمناؤں میں یہ شدت وحدت غالب تھی۔

سفر حیات میں

نفس کے ساتھ جنگ میں بھی وہ سرخرو نہیں ہو سکا تھا۔

اپنے مالک کے ساتھ بھی اسے سمجھ نہیں تھی۔

خواجہ نے اسے جو سمجھایا تھا اس کو سمجھنے کے باوجود مطلب اس کے ذہن سے محو ہو جاتے تھے اور وہ سب اس کے خون کی امانتوں کا کرشمہ سمجھتا تھا۔

”حسن تمہیں بہت یاد کرتا ہے اور زینب کی طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ میں نے اب کے وعدہ کیا ہے کہ تمہیں واپس لاؤں گا۔ تمہاری دعاؤں کی اس سرزمین کو زیادہ ضرورت ہے جس کی آب و گل سے تمہارا خمیر ہے۔ پھر دشت سوس کے ساتھ ساتھ قبریوں میں نئے داعی پر اسرار دعوتیں لے کر لوگوں میں عجیب بے چینی پھیلا رہے ہیں۔ اشاروں کنایوں میں باتیں کرتے ہیں اور دولت جمع کر کے مغرب کی طرف بھجواتے ہیں۔ معبد ناہید کے نئے پجاری معبدوں کو درست کر رہے ہیں۔ اس بے چینی کے لئے اور اس کے سد باب کے لئے تمہیں لوٹ چلنا چاہئے۔“ اس نے نکلیوں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے دادا کے کمرے میں تمہاری جلائی ہوئی آتش اب بھی فروزاں ہے۔

”شعلہ جہاں بھی ہوا سے فروزاں ہی رہنا چاہئے۔ سوزدروں کے لئے یہ ضروری تھا۔“ حسین نے جھکے جھکے کہا۔

منصور نے محسوس کیا کہ اس کا بیٹا ہمیشہ کی طرح باتوں کے دوران اس سے دور ہے اور دل سے متوجہ نہیں۔

”قطع خفا ہیں۔“ اس نے کافی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔

”پھر۔“ بیٹے نے پوچھا۔

”وہ کہتے ہیں تمہارا بیٹا کیا خدا ہو گیا ہے کہ بنا سوال کے وہ سائل کے لئے دعا کرتا ہے اور وہ دعا مستجاب ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں یہ سستی شہرت اور رسوائی ہے۔ یہ بلندی اور سرفرازی آدمی زادہ اس بوجھ کو کہاں اٹھا سکتا ہے۔ یہ دیوانگی ہے۔ وہ چاہتے ہیں تم بغداد سے کسی لمبے سفر پر روانہ ہو جاؤ۔“

حسین نے آہ بھری مگر کہا کچھ نہیں۔

منصور اور وہ دودشمنوں کی طرح آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ ایک دوسرے کی طاقت کا اندازہ لگانے والوں کی طرح۔

”میں تستر گیا تھا۔ سہل تمہیں یاد کرتے ہیں۔“ منصور نے کہا۔

”کیا کبھی انہوں نے میرے لئے دعا نہیں کی۔ نہیں کی۔ وہ میرے لئے دعا نہیں کرتے۔“ اس نے نہایت حسرت سے کہا۔

”حسین ان کا فرمان ہے کہ تم اپنے لئے خود دعا کرو۔“ منصور نے نہایت نرمی سے کہا۔

آگ کا جلنا ہی اس کا دشت دعا ہے۔“ حسین باپ کے پاؤں کی گرد جھاڑی۔

”تم آتش فروزاں ہو۔“ منصور نے نہایت درد دل سے کہا۔

”مگر میں اس کی پرستش نہیں کرتا۔ پدر محترم! آپ گواہ ہیں جب آگ پیدا کرنے والے کی طرف نگاہ ہو تو آتش فروزاں کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔“ حسین نے ہنس کر کہا۔

”حسن ریشم کا بہترین نباض ہے۔ مسافروں کو خوب جانتا ہے مگر فیاض اور مہمان نواز ہے۔ بات نہایت سوچ سمجھ کر کرتا ہے اور اکثر دشت سوس میں جنوب کی طرف خراسان سے وارد ہونے والے گھوڑوں کے سودا گروں سے بحث میں الجھتا ہے۔ اسپ تند خو کو سدھانے میں اس کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ کبھی کبھار میں حیران ہوتا ہوں کہ تمہارا بیٹا کس کی صفات دہرا رہا ہے۔“ بحرنا پید میں ڈوبی ہوئی زمینیں بھی سطح آب سے سر بلند کرتی ہیں۔ عشق تو الجھے راستوں والا باغ ہے۔“ حسین نے نہایت سادگی سے کہا۔

حسین نے پھر کہا: ”یہ میری چند کتابیں ہیں انہیں اگر آپ حفاظت سے لے جائیں تو حسن کے لئے اچھا مطالعہ ہیں۔“ منصور نے بڑے غرور سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا جو اگر آتش پرست رہتا تو محمی کی سرائے میں بیٹھا ہوتا اور اگر اس کے پیشے میں بھی نام پیدا کر لیتا تو حلاج ہی رہتا۔ تانے بانے میں الجھا ہوا تیز اور شوخ مدھم اور دبے ہوئے رنگوں میں جان کھپاتا ہوا۔ رف۔ رف۔ رفتن اور دے۔ دے میں مصروف۔ اس نے کتابیں لے کر اپنی گود میں رکھ لیں۔

”تم کب روانہ ہو رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”مجھے ایک کنیز کا انتظار ہے جس کی رہائی کے لئے میرا وجود ضروری ہے۔“ منصور نے سن کر مزید کچھ نہیں پوچھا۔

پائیز کی ہوا میں پھولوں کی مہک تھی جو خانقاہ سے ملحق باغ میں کھلے تھے اور موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ درس قرآن کی محفلوں میں لوگ دور دراز سے آ کر شریک ہوتے تھے۔ اور مشرق و مغرب کے طالب علم نسل اور وطن کی تخصیص کے بغیر گھلے ملنے ان زایوں میں مکین تھے جہاں حکومت ان کی سب ضروریات کا خیال رکھتی تھی۔ حفاظ اور قاری تفسیر اور حدیث کا علم حاصل کرنے والے لوگ امامان دین اور مختلف الخیال مدرسہ ہائے فکر کی وضاحت چاہنے کے لئے پیاسے متلاسی فلسفے کی گتھیاں سلجھانے کے لئے پریشان اور ان خانقاہوں میں ایک دنیا تھی۔ ہر نیال خیال بہت چھان پھٹک کر قبول کیا جاتا تھا اور اس کے باوجود بغدادیوانوں سمجھی پر تھا۔ لوگ سردار پہنچنے کے لئے تاکہ ان کا نام پکارا جائے بے خود کو پڑتے تھے۔ دن رات یکساں تھے۔ سائل کی دریافت کے لئے علماء کے کھ

دروازوں کو جب جی چاہتے کھٹکھٹاتے۔ گو اسلام پر تقریباً تین صدیاں گزر چکی تھیں پھر بھی اس تازگی اور مہک کو جس نے سارے جہاں کو مہکایا تھا لوگوں کی جانیں شدت سے اس کی خواہشمند اور متلاشی تھیں۔

جب گل رنگ داخل ہوئی ہے تو ساری غلام اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

”میں نے اسے روکا ہے مگر اس کا مسئلہ نہایت اہم اور فوراً حل چاہتا ہے۔“ اس نے حسین سے کہا۔

حسین ہنسا اور اس نے لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا: ”میں ابن منصور ہوں۔“

وہ کھڑے سے ایک دم بیٹھ گئی اور یوں جھکی جیسے اسے سجدہ کر رہی ہو۔

سری نے کہا۔ ”یہ سجدہ ریز ہے۔“

”تم کیوں ایسا کہتے ہو۔ وہ چل کر آئی اور گھبرا گئی ہے۔“ حسین نے کہا۔

پھر اس نے گل رنگ کی طرف بڑے افسوس سے دیکھا۔ اس کی شعلہ باز نگاہیں افسردگی اور محبت سے اس کینز کو دیکھ رہی تھیں اور اس سے اپنی آخری ملاقات یاد آ رہی تھی۔

کیا وہ حواسوں میں تھا؟

”کیا تم چاہتی ہوں میں تمہارے ہمراہ حامد بن عباس کی طرف چلوں؟“

”ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔“ اس نے زمین پر پڑے پڑے سر کو دائیں بائیں ہلایا۔

”اٹھ جاؤ اور سیدھی بیٹھ کر آنکھیں بند کرلو۔ انہیں کھولنے کی اجازت نہیں جب تک میں تمہیں کہوں نہیں۔ تمہیں پکاروں نہیں۔“

”ابن منصور۔ ابن منصور۔ یہ میرے آقا کی عزت کا سوال ہے۔“ گل رنگ نے پھر کہا۔

”تم اس زندگی اور جاوداں زندگی میں موت اور حیات میں فرق سمجھتی ہو۔“ حسین نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے سادگی سے کہا۔

”حیات اور موت کی گتھیاں۔“ حسین اپنے آپ سے گویا تھا۔

اس کی بات کاٹ کر گل رنگ نے کہا: ”وہ آنکھیں اب بھی نگران ہوں گی اور مہربان محبت کا چشمہ جاری رہے گا۔ میں اپنی آقا کو اکثر دیکھتی ہوں مگر میں سوچتی ہوں یہ میرا واہمہ ہے۔ دشت و کوہ و بیاں باں راہ کی گردن بن جاتے ہیں دشت سماویہ کے ایک کونے میں وہ بھلایا نہ جانے والا وجود ہوتا ہے جیسے یہ سب میرے پاس ہو۔“ حسین مسکرایا۔

سمری غلام نے حاضر ہو کر کہا: ”باہر کچھ غلام منتظر ہیں۔“

”انہیں ٹھہرنے کا کہو۔“ گل رنگ نے کہا۔ سمری واپس چلا گیا۔ ”ابن منصور! حامد بن عباس مجھے قتل کرا دے گا۔ وہ سمجھ نہیں

سکتا۔“

”نہیں! وہ قتل نہیں کروا سکتا۔ موت اور اذیت کا وعدہ کسی اور سے ہو چکا ہے۔“ اس نے ہولے سے کہا۔

”ابن منصور! اس کی خباثت پر کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔“ گل رنگ سہمی ہوئی تھی۔

”اب غلاموں کے ہمراہ جاؤ اور مقدور کا انتظار کرو۔“

گل رنگ نے اپنی ردالپیٹی۔ آنکھوں تک چہرے کو چھپا کر وہ باہر نکلی اور غلاموں کی حفاظت میں حامد بن عباس کے محل کی طرف روانہ ہوئی۔ وجہ کے پل کو عبور کرتے ہوئے بھی وہ ان کے درمیان تھی۔ شفاف پانی میں ان کے عکس بہتے جاتے تھے اور دھوپ نے ان کو طوالت دی تھی۔ عجیب مافق الفطرت سے سراپے۔ پھر انہوں نے محسوس کیا کہ آنکھ جھپکتے میں ایک بگولے نے ان کو اپنے میں لپیٹ لیا ہے جو موت کی طرح سرد اور کپکپانے والا تھا۔ وہ گرد پیش سے بے خبر ہو گئے جیسے فنا ہو گئے ہوں۔ ان کی آنکھیں بند ہو گئیں جیسے نیند نے انہیں آ لیا ہو۔ یہ کیفیت چند لمحوں رہی۔ وہ ہوشیار ہوئے ہیں تو گل رنگ نہیں تھی۔ انہوں نے حامد بن عباس سے یہی کہا۔ حامد اپنے لمبے دالان میں زخمی جانور کی طرح تیز تیز چلتے ہوئے غرار ہا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ وہ بیسویں بار واقعہ سن چکا تھا، مگر اس کے باوجود وہ ان میں سے ہر ایک کو بار بار ی اسے دہرانے کو کہتا۔

”جب تم ابن منصور کے پاس سے چلے ہو تو کیا وہ تمہارے ساتھ تھی۔ بولا؟“

یاسیدی بیشک بیشک۔ وہ ہمارے درمیان تھی جیسے خاتم کے درمیا۔“ حامد نے نہایت ڈراؤنی ”ہوں“ کی۔

”جب بگولے نے تمہیں گرفتار کیا ہے تو کیا تم لوگ فوت ہو گئے تھے۔ تمہیں موت نے آ لیا تھا۔ تھکے اور محسوس نہیں کر سکتے

تھے؟ تم امانتوں کی حفاظت کرنے والے نہیں۔ یہ ہرگز سمجھ میں آنے والی بات نہیں کہ راستے میں ایک کنیز، جو زندہ اور سانس لیتی ہوئی ہو، بھس میں سوئی کی طرح غائب ہو جائے۔ وہ دریا میں تو نہیں کود گئی؟“

”ہرگز نہیں۔ بالکل نہیں۔“ ان میں سے جو ذرا پختہ عمر کا تھا کانپتے ہوئے بولا۔ ”کیا تمہارے گرد پر اور تھے۔ یہودی نصرانی

ترک، کوئی غیر ملکی ہندی مغل۔“ وہ خود الجھا ہوا تھا۔

”جب ہم پل کو عبور کر رہے تھے تو دور دور تک کوئی نہیں تھا۔“ اس غلام نے پھر کہا۔

فہم سے بالاتر یہ بات ایسی ہے جس کی توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ تم کہتے وہ وہ تمہاری حفاظت میں تمہارے درمیان چل رہی تھی، پل پر کوئی نہ تھا، تم غافل نہ تھے، بگو لے نے صرف چند لمحوں کے لئے تمہیں اپنے سے فنا کیا پھر تاویل کیا ہے۔ کیا راز ہے؟“

”قدرت پتا نہیں کیا اچھا اپنے دامن میں پوشیدہ رکھتی ہے۔“ حامد ہارے ہوئے فاتح کی طرح تھا۔

قہرمانہ غائب ہو گئی تھی۔ گل رنگ ہوا میں تحلیل ہو گئی تھی۔ حسین کی ماں چپ چاپ مر گئی تھی۔ ابن منصور کوئی ساحری تھا اور اس کی زندگی میں دخیل۔ دانت پیس کرا سے نے کہا:

”اگر موت نے مجھے مہلت دی تو میں ابن منصور کو تختہ دار پر چڑھاؤں گا۔ جس طرح میری زندگی کا واحد مقصد آج تک گمشدہ ماضی کو ایک ایک خشت کر کے تعمیر کرنا ہے بعینہ میں اس آدمی کو تخت قتل کروں گا۔ اذیت دے کر۔ ہاں اس نے ابن منصور نے حامد کی جمع جمائی زندگی کو بد مزہ کر دیا تھا۔ گیم پوش۔ غلیظ۔ دنیا کے لحاظ سے نہایت پست جس کی تحویل میں اس دنیا کا ایک گوشہ تک نہیں تھا۔ اور وہ حامد بن عباس کو شکست دے رہا تھا۔ کیوں۔ آخر کیوں؟“

اس کی سمجھ میں گل رنگ کا ایک بیک یوں غائب ہو جانا نہیں آتا تھا اور اسے ابھی تک یہ پتا بھی نہیں چل رہا تھا کہ یہ وہی ابن منصور تھا یا کوئی اور۔ پھر اس نے غلاموں سے کہا:

”تم اس بندہ خدا کے کسی غلام کو میرے پاس لاؤ۔ میں اس سے صورت حال دریافت کروں۔ عمار۔“ اس نے زور سے پکارا۔

”یا شیخ حاضر ہوں۔“ عمار نے جھک کر زمین چومی۔

”ابن منصور کے غلام کو حاضر کرو اور دریافت حال کے لئے اس کو سب کچھ اگلنے پر مجبور کرو۔“ حامد سخت برہم تھا۔

عمار نے سینے پر سیدھا ہاتھ رکھا، جھکا اور اپنے قدموں باہر نکل گیا۔

پانی چاندنی رات خوابناک دجلہ پر برس رہی تھی۔ اس سے بے نیاز کہ دل پریشان ہوتے، گھبراتے اور ملول ہوتے ہیں آدمی سوالوں اور حالات میں الجھتا اور گرفتار ہوتا ہے۔ ابن آدم کے لئے دنیا سکون اور قرار کم ہی کم تھا۔ شاہراہوں پر قافلوں کی گھنٹیاں ان کے کوچ اور آمد اور مرجعت کی ساعتوں میں بج رہی تھیں۔ حدی خوا اپنے گیت گاتے ہوئے چل رہے تھے اور تیز گام ساربانوں کو کئی پکار کر نہیں کہہ سکتا تھا۔

اے ساربان! آہستہ چل کہ میری پسلیوں میں آگ ہے

شبلی نے گدڑی کو اپنے گرد لپیٹا۔

وہ ان بے پناہ سرخ انگارہ آنکھوں والے شخص سے خوفزدہ نہیں تھے، مگر اس کی جسارت پر حیران تھے جو پچھلے کئی مہینوں سے یہاں بغداد کے گلی کوچوں میں موضوعِ سخن بنا ہوا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ آدمی پابندِ سلاطین ایام تھا۔ آدمی غلامِ ممکنات تھا۔ اس کو کب اتنی آزادی ملی تھی کہ وہ جو اس کے جی میں تھا اس کا اعلان بھی کر سکے اور پھر امن میں ہرے۔ امن و سکون اس بادشاہت میں کہاں تھا۔ وہ ریزی ریزہ اپنی طاقت کو استعمال کر رہا تھا۔ کیا وہ اپنے آپ کو آزما رہا تھا۔ کیا وہ اپنے اور اپنے خدا کے رشتے کو رسوا کر رہا تھا۔ اسے ہوا دے رہا تھا۔ ایک عامیانا پن کی وجہ سے جو اس کی طبیعت کے اندر مضمر تھا، اپنے شہر کو ہوا دینا چاہتا تھا۔ شبلی نے بہت الجھ کر اپنے ماتھے غور و فکر سے ابھری لکیروں پر انگلی پھیری۔

”فنا۔“ انہوں نے اپنے ہاتھ میں پکڑے پھول کی پنکھڑیوں کو الگ الگ کیا۔

”فنا۔“ انہیں اپنے گرد ہوا میں سے ایک خوشبو بھری سسکی کی طرح سنائی دیا۔ پھر آوازوں کے دائرے ان کی ذات سے نکل کر بڑھتے گئے۔ جیسے تالاب میں پھینکے گئے ذرا سے کنکر سے دائرے کنارے کی طرف پھیلتے ہیں۔ دجلہ کا پانی اور نغمہ سرا پرندے اور پہاڑوں پر برف کے اوپر برف جو سالہا سال سے صدیوں سے ہدرتِ روشنی کی رہائی کی منتظر تھی، بہتے ہوئے پانی پر سے روشنی اور غاروں کی ظلمت اور اندھیرے کی روچیں درختوں کی جڑوں میں زمیک کی محبت سے ہیوست زندگی کی لہریں اور خلاؤں میں آوارہ بھگی ہوئی آوازیں اس ”فنا“ کے کبھی ختم نہ ہونے والے غنائے میں شامل ہو گئے۔ پھول کی پتیوں نے اپنے رنگوں کے نموکے ساز پر اسے گایا اور شبلی اس میں شامل تھے۔ سو یا ہوا بغداد جاتے ہوئے ابنِ منصور بھی اس میں بخوشی شریک تھے۔

جب میں نہیں ہوں تو پھر کون ہے۔

”فنا کے ساتھ بقاء ہے اور میں ہر لحظہ فنا ہوتا اور بقاء میں سانس لیتا ہوں۔“ شبلی نے سانس روک کر دم کھینچ لیا کیونکہ حسین بن منصور شیر کی پشت سے اتر کر ان کے سامنے کھڑا تھا اور مسکرا رہا تھا۔

شبلی نے گدڑی کو پھر اپنے گرد سمیٹا اور آنکھیں جھکا لیں جیسے کچھ دیکھا ہی نہ ہو۔

”آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا۔“ حسین نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ شبلی مسکرائے۔ پھول کی پنکھڑیاں اب بھی ان کے ہاتھ میں تھیں۔ پھر انہوں نے ان پر ہاتھ پھیرا اور نہایت شاداب تروتازہ مکمل گلاب حسین کی طرف بڑھا دیا۔ حسن ان پھول سوکھتے ہوئے کہا ”خوب بہت خوب۔“

شبلی صرف مسکراتے رہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”فنا کیا ہے؟“ حسین نے جھک کر ان کی طرف دیکھا اور پوچھا۔

ایک زوردار ضرب لگا کر شبلی نے کہا: ”فنا، فنا، فنا۔“

حسین نے محسوس کیا اس کے ہر طرف فنا۔ فنا کی صدا کہیں تھیں۔ ہر شے فنا فنا پکارتی تھی ہوا اور کائنات سب معدوم ہو جاتے تھے۔ زمین اور آسمان، وہ خود اور اس کے ساتھ گھلے جاتے تھے ریزہ ریزہ ہو گئے تھے نہ سمٹا تھا نہ خاموشی۔ کچھ بھی تو نہیں تھا۔ ابدی ازلی نامختم بے انتہا بے کنار۔ حسین کو لگا قریب اور صدیاں اور زمانے اور وقت سب گزر گئے تھے۔ اندھیرے اور روشنی سے بھی فزوں ایک تجلی جس کا نام اسے معلوم نہ تھا، انہیں ڈھانپنے تھی اور شبلی کی ضرب قلندرانہ لہروں کی طرح دائروں میں اس کو جھلا رہی تھی۔ فنا تھی اور بقا بھی، کیونکہ خدا اول و آخر ظاہر و باطن تھا۔ وہ شاہد بھی تھا شاہد بھی۔

کنارہ جملہ بچوں کا ایک گروہ قہقہے لگاتا شبلی کے پیچھے تھا اور ڈمگاتے قدموں سے اپنی میلی گدڑی کو سنبھالتے لپیٹتے مڑ کر بچوں کو دیکھتے اپنے دامن کو سمیٹتے ان سے بچتے، کبھی گرتے، کبھی اٹھتے راہ چلتے خاموش اپنے آپ سے مسکرا کر منہ ہیمنہ میں باتیں کرتے ہوئے کبھی تیز اور کبھی آہستہ رو ہوتے اکثر کسی درخت کی آڑ میں چھپ کر وہ آوارہ لڑکوں کو اگے نکل جانے دیتے جیسے ان سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہوں اور حیران ہو کر ان کا ڈھونڈنا۔ یہاں وہاں جھاڑیوں اور پھولوں اور اونچی نیچی روشوں پر تلاش میں بھاگنا، کھلکھلانا، یہ سب ایک کھیل بن گیا تھا۔ حسین اپنے مریدوں کے جلو میں ایک شان استغنا سے اپنے گوشہ عافیت سے نکلا جیسے بادلوں کے دنوں میں سورج ایک بیک کسی کنارے کو اپنی کرنوں سے جگمگاتا ہے۔

وہ سوال کرتا مگر شبلی جواب دینے کے بجائے مسکراتے۔ وہ چاہتا تھا یہ کوئی بات کریں۔ ان کو سب ان رازوں پر آگاہی تھی جو ابھی اس سے پوشیدہ تھے۔ وہ نوافل کو فرض سمجھ کر پڑھتا۔ رات رات بھر عبادت کرتا، مگر اس پر وہ اسرار کیوں عیاں نہیں ہوتے تھے اس کا مقدّر آخر کیا تھا؟ وہ ہر شے کے درمیان خود کیوں تھا؟ خود موجود پروانہ کیوں نہیں تھا؟ اس کی آتش شوق اسے خود سے بیگانہ کیوں نہیں کر سکتی تھی؟

شبلی اپنے میلے مرقع کی لاتعداد ٹکڑوں کے جوڑوں کو ہاتھ سے سہلا رہے تھے اور حسین کو یاد آیا: ”درویش کیلئے ضروری ہے کہ وہ سیدھا سینا جانتا ہو۔“ رنگ برنگ چوکور گول، آڑی، سیدھی، چھوٹی، بڑی، لمبی اور چوڑی، ریشمی اور سوتی، کترنوں سے بنے اس لہادے کو شبلی نے خود سیا ہوگا۔ وہ سینا جانتے تھے۔ مختلف زاویوں سے ایک دوسرے میں پیوست و مربوط یہ ٹکڑے ایک وحدت بناتے تھے۔ وحدت جو بظاہر بے جوڑ چیزوں سے وجود میں آئی تھی۔ اکائی، جس کو شبلی نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا اور لگتا تھا اس کے سوا

انہیں اور کسی شے کی حاجت نہ تھی۔ سوائے مسکرانے اور مسکراتے رہنے کے وہ کسی سوال کا جواب نہ دیتے تھے۔

حسین کو اپنے ہوش و حواس پر شدید غصہ آیا۔ وہ کیوں دیوانہ نہیں ہو سکتا۔ اس کا وجود اس کے سوالوں کی وجہ سے اس کی راہ میں حائل تھا۔

حسین نے مریدوں کو وہیں چھوڑ کر شبلی کے پیچھے چلنا شروع کیا اور دجلہ کے ساتھ ساتھ گھنی جھاڑیوں اور درختوں کے نیچے روئیدگی میں بھاگنے لگا کیونکہ اسے اپنے سامنے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ شبلی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

”خدا یا تیرے ایک بندے کو میں پا نہیں سکتا تجھے میں کہاں تلاش کر سکتا ہوں۔“ حسین نے با آواز بلند کہا۔

”جیسے تم اس کی تلاش میں ہو وہ بھی تمہاری تلاش میں سرگرداں ہے۔“ حسین کے عقب سے کسی نے کہا۔

جیسے بجلی کا لہریا صحرا پر جھکے آسمان میں نیچے اترے اور بے پناہ کے کسی قافلے پر سے گزرے۔

”حسین ابن منصور۔“ کسی قہقہے کے عقب میں اسے اپنے نام کا پکار سنائی دی۔ پھر شبلی اس کے قریب آئے۔ ”صدائیں غلط بھی

ہو سکتی ہیں۔“

”بخدا“ اس نے ان کے لباس کا دامن تھام لیا۔ ”کوئی صدا تو ہو۔“

”حسین کبھی تم نے سوچا ہے کہ ابلیس نے ایک صدا کے بعد کوئی صدا نہیں سنی۔ ایک نگاہ کے بعد کسی نظر کا محتاج نہیں ہوا۔ ایک نوا

کے بعد اس نے کوئی آواز نہیں نکالی۔ وہ آوارہ بہ دل آوارہ بہ جان سرگرم سفر۔ وہ راندہ درگاہ۔“ شبلی پہلی بار اس کے روبرو تھے۔

”یا شیخ! مجھے اس اسرار آگاہ کریں۔“ اس نے شبلی سے کہا۔

”کوئی اسرار نہیں صرف ہمت ہے۔ انکار کرنے کی اور اس پر کار بند رہنے کی مشیت کو قبول کرنے کی امتحان اور آزمائش میں

کھڑے رہنے کی۔ آسمانوں کی بادشاہت سے وہ دکھیل دیا گیا مگر اس کی سرشاری نہ گئی۔ اگر یہ سرشاری عطا ہو سکے میسر آئے۔“

انہوں نے اپنی دل کے مرقع کو پھر اپنے گرد سمیٹ لیا اور مسکراتے ہوئے وہیں کہیں روئیدگی کے تانے بانے میں اس کی نگاہ سے گم ہو گئے۔

حسین غم صم کیفیت میں جب واپس ہوا ہے تو حامد بن عباس کے شرطے اس کے غلام سری کو لے کر جا چکے تھے اور خانقاہ پر عجیب

سنائے کی سی کیفیت تھی۔ اس کے باوجود کہ لوگ جمع تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ سری کو وزیر

نے کیوں بلایا تھا؟

کوئی کنیز گم ہو گئی تھی اور اس کی تلاش تھی۔

سمری لوگوں سے بہت گھل مل کر باتیں کرتا تھا اور شاید غلط بیانی سے کام لیتا تھا۔

منصور نے حسین سے کہا: ”بغداد تمہارے لئے اچھی رہائش گاہ نہیں۔ بیضا میں تمہاری ضرورت ہے اور تمہیں واپس چلنا چاہئے۔“

حسین نے ہاتھ کے اشارے سے اپ کو گویا تسلی دی۔ غلام کے لئے اتنا پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ حامد بن عباس نے کسی دریافت حال کے لئے اسے طلب کیا تھا۔

حکومت کا ادنیٰ ملازم بھی تھوڑی سی حیثیت رکھنے والا کوئی بھی آدمی خلق خدا کے لئے مصیبت کا باعث بن سکتا تھا۔ اور پھر ایک وزیر باتدبیر کا ایک بوریا نشین کے غلام کو طلب کرنے کا مطلب۔ بغدادیوں بھی سازشوں کی آماجگاہ بن چکا تھا۔ مذاہب اور اقوام اور مسالک اور مختلف طبقہ فکر کے لوگوں کے ہجوم سے اس میں ایسی دلق کی سی کیفیت تھی جس کو حاکم وقت کی درویشانہ صفات ہی سیدھے راہ پر لگا کر ایک خوبصورت مرفقے میں ڈھال سکتی تھیں اور تخت خلافت خود طوفانوں کی زد میں آیا رہتا تھا۔ بغاوتوں اور بے چینوں کے نتیجے میں پلوں پر سربریدہ لاشیں لگتے تھے اور درجلہ کے پانی میں خون ٹپکتا رہتا تھا۔

”میں راضی برضا ہوں پدر محترم۔ کیونکہ خاتون گل رنگ کا جسد خاکی عمار نے تلاش کر لیا تھا اور سمری کی یا وہ گوئی اب بے اثر تھی۔“

”عجیب معموں میں بات کرتے ہو حسین۔ میری مانو ہم اپس بیضا چلتے ہیں۔“

منصور پر جلالی کیفیت تھی۔

ہنس کر حسین نے کہا: ”مشیت سے بچ کر کوئی کہاں جاسکتا ہے۔“

”اگر تم اسی کو مشیت خیال کرتے ہو کہ حکومت کے کارپردازوں سے ٹکرایا جاتا تو یہ تمہاری غلطی تھی۔“ منصور بہت مضطرب تھا۔

”حکومت صرف ایک ہے اور اس سے ٹکرا نہیں سکتا۔ میری یہ ہمت نہیں۔ میں راندہ درگاہ بننا نہیں چاہتا۔“

حسین نے اپنا سجادہ بچھایا اور نوافل میں منہمک ہو گیا۔ یعقوب قطع اگرچہ اس سے خفا تھے مگر سمری کی گرفتاری کا سن کر وہ منصور کے پاس آئے۔

”ایک کامیاب زندگی بھر پور اور مناسب زندگی کے لئے یہ سب ضروری نہ تھا۔“ انہوں نے شکایت کی۔

”خلق خدا کی محبت میں حسین آگے نکل گیا ہے۔“ منصور نے کہا۔

”خلق خدا کی محبت۔“ قطع بنے۔ اپنی محبت کے لئے۔ شدید خود پسندی اور اپنی طاقتوں اپنی حدود کا غلط اندازہ۔“ منصور نے کوئی جواب نہ دیا۔

”زینب اور حسن آپ کی غیر حاضری میں پریشان ہوں گے۔“ قطع اب کے ذرا اپنے پن سے پوچھنے لگے۔

”میں حسین کو واپس لے جانے کے لئے بغداد آیا ہوں۔“ منصور نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

”بغداد کا انتشار آخری حدود کو چھو رہا ہے۔ روحانی بھی اور دنیاوی بھی۔“ قطع نے آہستہ سے کہا۔ ”مدرسہ نظامیہ میں علمائے ظاہر اور فقہاء کا مباحث میں ہر روز تصادم ہوتا ہے۔ عافیت خاموش رہنے میں ہے۔ مذہب میں موٹگافیاں ہوتی ہیں۔ فلسفہ اور علوم باطنی میں ایک ہنگامہ پھا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ حسین مدرسہ نظامیہ والوں سے بھی ناخوش ہے۔ حضرت جنید کے ساتھ بھی اس کے مراسم نہیں ہیں۔ عمر بن عثمان کی تو اسے راندہ درگاہ سمجھتے ہیں اور ہر طرف اس کی تکفیر کے چرچے ہو رہے ہیں، مگر حسین کو ذرا احتیاط سے کام لینا چاہئے۔ کیا وہ سمجھتا ہے کہ اس سے پہلے کسی کو غیب پر آگاہی نہیں ہوئی۔ کسی پر یہ اسرار و انہیں کئے گئے مگر یہ دکھاوا۔ دلوں کا حال جان لینا اور اس کی تشہیر بھی کرنا لوگوں کو پریشان کر دیتا ہے۔ عوام کیا خواص بھی ان باتوں سے بچتے ہیں۔ وہ کیوں اپنے گرد دشمن جمع کر رہا ہے۔“

اس دکھاوے سے اس کی ذات کو کیا فائدہ؟

کیا صرف وہی ہے جس کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی شرم خدا رکھتا ہے۔

”آہستہ آہستہ۔“ منصور نے قطع کے متماتے ہوئے چہرے کو دیکھ کر کہا۔ ”دعا کا ایک اپنا مقام ہے۔ دعا جزو ایمان ہے۔“

”آپ مجھے یہ سب بتا رہے ہیں۔“ قطع اور بھی خفا ہو گئے۔ حسین کیوں حلاج الا اسرار بنا ہوا ہے۔ اگر اسے اپنی عافیت منظور ہے اور روح کی بالیدگی میں کوشاں ہے تو اسے اپنی طرف نظر کرنا چاہئے۔ اسے اپن آپ سے محبت کرنا چاہئے۔ ہاں اسے اپنے آپ سے سمجھنا چاہئے۔ کیا اس نے نہیں دیکھا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وجود کائنات اور بشر کامل ہونے کے باوصف مشیت خدا واندی میں کبھی دخیل نہیں ہوتے تھے۔ وہ دعائے مجسم تھے۔ لوگوں کے دلوں کے بھید ہی نہیں اسرار کائنات پر آگاہ تھے اور پھر بھی انہوں نے قلب کے راز کا کبھی دعویٰ نہیں کیا۔“

”حسین کو ایسا کوئی دعویٰ نہیں۔ وہ تو اپنے آپ کو خاک مدینہ بھی نہیں سمجھتا۔ کہاں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بے

ہمتا اور کہاں ایک ناقص انسان کھویا ہوا بھٹکا ہوا تلاش اور جستجو کے زینوں پر لڑھکتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا روشنی کی ایک کرن کے لئے پریشان۔ منزل کا نشان تک جس کو معلوم نہیں۔“

”یہ آپ بول رہے ہیں ایک باپ بیٹے کے حق میں گواہی دے رہا ہے۔“ قطع طنز آئے۔

”نہیں۔“ منصور نے اپنے ہاتھ سینے پر باندھ کر کہا۔ ”اسے میری گواہی کی ضرورت نہیں۔“

”کبھی کبھار لگتا ہے کہ آدمی کو کسی گواہی کی ضرورت نہیں ہوتی مگر پھر ایسا وقت آ جاتا ہے۔“ قطع نے زچ ہو کر کہا۔

”آپ کیوں چاہتے ہیں کہ وہ یہاں نہ رہے۔ آپ کیوں اس کے مخالف ہیں۔ زینب اور حسن کی وجہ سے۔“ منصور نے سرگوشی

میں پوچھا۔

”یہ سب باتیں موت کو دعوت دینے کے مترادف ہیں اور میں چاہتا ہوں وہ زندہ رہے۔“ قطع نے جواب دیا۔

”لوگ مارے جاتے ہیں اور لٹکائے جاتے ہیں اور ان کی لاشیں جھولتی رہتی ہیں۔“ منصور اندر سے کانپ گیا مگر اس نے کوئی

جواب نہ دیا۔

”وہ اپنی قوتوں کو آزماتا رہا ہے ایک طفل مکتب کی طرح جس نے نیا نیا لکھنا سیکھا ہوا اور ہر ورق کو اپنے نام سے مزین کرے۔

اپنے نام کے سحر میں گرفتار ہو۔“ قطع آج اپنے دل کی بات کہنے پر گویا مصر تھے۔

منصور نے کہا ”آپ معاملہ کو بالکل کسی اور ہی زاویے سے دیکھ رہے ہیں۔“

زاویے اور پیمانے اور نقطہ نظر کی بات نہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ سرشاری جب دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگے تو خطر

ناک ہو جاتی ہے۔ دیوانگی کو مکمل یکسر حرف بہ حرف دیوانگی ہونا چاہئے جیسے شبلی اور فرزانگی کو بھی مکمل ہونا چاہئے جیسے حضرت جنید ہیں۔

حسین کیا کرنا چاہتا ہے۔“

منصور نے نہایت سکون سے کہا: ”اس کی سرشاری اور دیوانگی فرزانگی اور ہویاری کسی کے تتبع میں نہیں ہوں گی۔ سورج تو ایک

ہی ہوتا ہے۔ دھوپ بھی ہر جگہ خشک و تر بحر و بر پر ایک ہی قوت سے برستی ہے مگر کچھ چیزیں تپش پکڑ کر دھوپ بن جاتی ہیں تمازت

منعکس کرتی ہیں آئینے کی طرح اور کچھ روشنی کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں۔ اس کا مزاج بدل دیتی ہیں۔“

”آپ یہ زرتشتی فلسفہ مجھے نہ پڑھائیں۔“ قطع بحت خفا تھے۔ ”اس کیفیت سے جو سحر طرازی لگتی ہے حسین کو ٹکنا چاہئے۔ اس کا

مسک کیا ہے۔“

”آپ حسن کے نانا اور زینب کے والد ہیں اور میں اس دشنام طرازی کو آپ کے مزاج کا حصہ سمجھ کر بھول سکتا ہوں۔“ منصور اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

عین اس گھڑی انہوں نے حامد بن عباس کے ملازم خاص عمار کو آتے دیکھا۔ عمار نے گھوڑے کی باگ خادم کو پکڑائی۔ وہ ننگے پاؤں اندر آیا اور اجازت چاہی کہ حسین بن منصور سے ملاقات کرنے کا خواہشمند تھا۔

قطع اور منصور نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”ان سے ملاقات ممکن تو ہو سکتی تھی۔“ اس نے استفسار کیا۔

”کیوں نہیں۔“ منصور نے بہت خوش دلی سے کہا۔ اسے خوشی تھی کہ قطع کے سوال جواب رک گئے تھے۔

”وہ مراقبے میں ہیں اور اس وقت ملاقات شاید نہ ہو سکے۔“ قطع بغداد کے مزاج سے واقف اور امرا کے دربار کی وضع داری سے خوب آشنا تھے۔

عمار کا آچھا ہوا قدم رک گیا۔ وہ نہایت حیرت سے ان دونوں بزرگوں کو دیکھنے لگا۔

”آپ انتظار کر لیں۔“ قطع نے خانقاہ کے نیم روشن اطاق کی طرف اشارہ کیا۔ پھر قطع اور منصور اس کو حیران چھوڑ کر اندر کی

طرف بڑھ گئے۔ حسین کاغذ پر جھکا ہوا نہایت تیزی سے کچھ لکھ رہا تھا۔

”یہ کیا لکھ رہے ہو؟“ قطع نے اس کی طرف دیکھ کر سوال کیا۔

”قرآن حکیم کا جواب۔“ حسین نے سراٹھائے بنا جواب دیا۔

”قرآن حکیم کا جواب۔“ دونوں نے یک زبان ہو کر کہا۔ ”کیا دیوانے ہوئے ہو۔“ منصور کی آواز میں خوف قطع کے سوال

میں تسخّر تھا۔

حسین نے سراٹھا کر دیکھا اور پھر لکھے ہوئے اوراق سمیٹ کر ایک طرف رکھ کر مودب کھڑا ہو گیا۔

”میں کلام پاک کی کچھ آیات کی تفسیر لکھ رہا ہوں اور یہ سوال کا جواب دینے اس کو حل کرنے ایک گتھی کو سلجھانے اور اپنی عقل

سے اس اسرار تک پہنچنے کی کوشش ہی ہے۔“ حسین نے کہا۔

”کیا عقل انسانی کی موشگافیوں میں ابھی کچھ اور اضافے باقی ہیں۔“ قطع کی آواز کانپ رہی تھی۔

”یہ اضافے نہیں ہیں عم بزرگوار۔ یہ تفاسیر ہیں۔ آپ سے زیادہ انباتوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔“

حسین کا جواب مختصر تھا۔ منصور خاموشی سے بیٹے کی طرف دیکھ رہا تھا اور پھر قطع کی طرف بھی جو مجسم قہر نظر آرہے تھے۔

”میں نے اپنی نہایت ہی عزیز متاع اپنی بیٹی کو تم سے بیاہ کر کتنی بڑی غلطی کی ہے۔ تم تو زود یا بدیر اپنے انجام کو پہنچو گے مگر اس کا کیا ہوا۔ کیا عقل انسانی کی موٹا گیوں میں سے ایک یہ نہیں کہ ایک عورت کی زندگی نوحہ بن کر رہ جائے۔ تم کو چہ بہ کو چہ قریہ بہ قریہ گھومتے ہو اور اپنی دیوانگی کی وجہ سے شہرت حاصل کر چکے ہو مگر.....“ شدت جذبات سے ان کی زبان گنگ ہو کر رہ گئی۔

منصور نے کہا: ”جان پدر! حامد بن عباس کا غلام عمار حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔“

”بسم اللہ۔ اجازت ہے۔“ حسین نے کہا۔

اقطع نے کہا: ”اپنی ان تصانیف کو الگ کر لو۔ امراء دربار کبھی کسی کے در پر نیک نیتی سے نہیں آتے۔ سواری پر نہیں اور غلاموں کی ایک نفری کے ساتھ نہیں۔ وہ تمہیں لینے آئے ہیں اور کل کا سورج پتا نہیں تمہارے لئے کہاں طلوع ہو۔“

حسین حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔

”مگر میں نے ہرگز کوئی ایسا کام نہیں کیا جو کسی امیر سے میرے ٹکراؤ کا باعث ہو یا میرے اور اس کے راہوں کو کاٹتا ہوا گزرے۔ میں گوشہ نشین درویش ہوں۔ وہ مجھے کیا کہیں گے۔“

اس سے پہلے کہ اقطع کوئی جواب دے سکتے منصور عمار کو لے کر اس حجرے میں داخل ہوئے۔

”حسین! یہ عمار ہیں۔“

عمار نے کتابوں کے ڈھیروں اور اوراق کے ذخیرے کی طرف دیکھا اور بیٹھ گیا۔ پھر نگاہیں جھکائے رہا جیسے اس وقتے میں بات کرنے کے لئے لفظ جمع کر رہا ہو۔

”ہمارے امیر حامد بن عباس آپ سے ملنے کے خواہشمند ہیں۔“

”میں صبح سے ہی اس طلبی کا منتظر تھا۔ چلے۔“ حسین نے یہ بات اتنی اچانک اور بے ساختگی سے کہی کہ منصور اور اقطع عمار کے ساتھ حیران ہوئے۔

عمار نے کہا: ”میں ذاتی طور پر آپ کی بہت عزت کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اعیان سلطنت کو روحانی قلم رو کے لوگوں سے تعرض نہیں کرنا چاہئے۔ میں آپ کی دعاؤں کا طالب ہوں اور چاہوں گا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو یہ کوئی حکم نہیں۔“

”حامد بن عباس یہاں آ سکتے تھے۔ فقراء کے آستانوں پر امرا حاضر ہوتے ہیں۔“ اقطع نے بات کی۔

عمار نے کوئی جواب نہیں دیا۔ منصور اب پریشان اور مضطرب تھے مگر حسین نے عمانے کے الجھتے ہوئے پیچ بھی درست نہیں کئے اور عمار سے پہلے دہلیز پار کر گیا۔

اس کے جانے کے بعد اقطع اور منصور چپ بیٹھے رہے اور حجرے کی ٹھنڈک میں ان کے دل اندر ہی اندر کپکپاتے رہے۔ جانے کیا ہو؟ خدا ہی جانے یہ کیسی طبعی تھی؟ کیوں حامد بن عباس نے حسین کو بلایا تھا؟ اقطع جانتے تھے کہ وزیر دولت نہایت بد مزاج، سخت گیر اور تقریباً ظالم آدمی تھا۔ اس نے بکھرے ہوئے ماضی کو جوڑ کر جو عمارت اپنے لئے تعمیر کی تھی اس پر اہری صورت اسے عزیز تھی۔ مگر حسین کس طور سے مطلوب تھا؟ اس کو وہ سمجھ نہیں سکتے تھے۔ دولت و جاہ عہد اور دنیاوی وسائل جن لوگوں کو تلاش رہتی تھی، حسین کے پاس نہ تھے۔ وہ نہایت کم آ میز تھا۔ دربار خلافت کے کسی بھی امیر سے اس کی ملاقات نہ تھی۔ پھر وہ کیوں بلایا گیا تھا؟ منصور ابھی تک حیرت میں گم تھا۔

”اس کا بیٹا حسین دنیاوی طور پر نہ صرف یہ کہ تلاش تھا بلکہ اسے دولت کی تمنا بھی نہ تھی۔ وہ ایک گوشہ نشین صومعہ میں رہنے والا بے ضرر انسان تھا جس کے عقائد شدید اور مطالبات شدید تر تھے۔ جو نہایت مضطرب روح رکھتا تھا اور نوافل میں رات دن منہمک تھا۔ اسے ذات خداوندی سے عشق تھا اور یہ آتش اس کی جان کو جلا رہی تھی وہ ماسوا کو پیچ اور پوچ سمجھتا تھا اور اس کی طلب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اسے ڈر تھا کسی دن اسے کے بیٹے پر کفر کا الزام نہ لگ جائے کیونکہ وہ اتنا مگن تھا کہ اپنے آپ کو بھی بھولا ہوا تھا۔ اس کے شوق بیکراں اس کی منزل کیا تھی۔ اس کا سوال کیا تھا۔ اس کا گریہ کس لئے تھا؟ اس کی طبع ہر شے سے بلند تھی اور اس کا مشرب ایک شفاف رودرواں تھا۔ وہ جستجوئے زندگی کے صحرا میں پیاسے اور جاں بلب انسان کی طرح بھاگ رہا تھا۔ اس کی نگاہ آلودہ نہ تھی اور اس کی جان کی بے تابی راہ شوق میں دیدنی تھی۔ ایک فروزاں شعلہ کہ جس کو دیکھ کر اس کا دل پگھل جاتا تھا اور خل آ کے قریب دھڑھکتا تھا۔“

منصور کو ریشم بننے والوں کی وہ ہستی یاد آ رہی تھی۔ اپنا باپ محمی یاد آ رہا تھا۔ سیاوش اور ہندی سوداگر اور یادوں کی یورش سی تھی جو اس کو شکست دینے کے لئے اس کی طرف بڑھی چلی آ رہی تھی۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں۔

مسموم ہوا کے طوفان میں گھرا ہوا وہ اکیلا تھا اور اقطع اس کی کوئی مدد نہ کر سکتے تھے۔

”سیدی! اب آپ آرام فرمائیں۔ حسین کی نگارشات کو جمع کر کے بند کر لیں اور اس کا انتظار نہ کریں۔“ اقطع کی آواز کہیں دور سے آ رہی تھی۔

”کیوں۔ آخر کیوں۔؟“ منصور نے تڑپ کر کہا۔

اقطع نے کہا: ”آپ زینب سے بہت محبت کرتے ہیں اور حسن سے بھی اس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں اور یوں بھی مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ اول و آخر اس میں میں ہی ذمہ دار تھا اور رہوں گا۔ یہ اطلاع دینا بھی اس لئے میرا ہی فرض ہے کہ بغداد میں اب حسین کا قیام ممکن نہیں ہوگا۔“

”کیوں۔ آخر کیوں؟“ منصور نے اقطع کا بازو زور سے تھام لیا تھا۔

”اس لئے کہ بغداد کا شہنشاہ بن عباس کا خاص الخاص ساتھی ہے اور وہ نہ آدمی کی عزت کرتے ہیں اور نہ آدمیت کی۔ وہ تو خلیفہ وقت کو بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ جو آدمی ایک بار ان کی بارگاہ میں بلایا جاتا ہے لوٹ کو نہیں آتا۔“

”کیا ایسا ہونا ممکن ہے۔“ منصور نے نہایت آزر دگی سے پوچھا۔

”خلافت عباسیہ اب اپنے وقار کے آخری سانس لے رہی ہے اور نیک نہایت بدترین شخصی طوائف الملوک کا دور ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ دربار پر ایسے امرا قابض ہیں جو اپنی ہر جائز اور ناجائز بات منوانے کے لئے اثر و نفوذ رکھتے ہیں۔ فوج کی اتاری عمائدین سلطنت کی بے حسی اور بے بسی پھیلی ہوئی سرحدوں کی طرف سے بے رخی حکومتوں کے زوال کی نشانیاں ہیں۔ پھر مشرق و مغرب میں نئے نئے فتنے اور ان کو ختم کرنے کی طرف سے چشم پوشی اس بات کی دلیل ہے۔ عوام کے مسائل اور ان کی حالت کی طرف سے مکمل انغماض۔“ اقطع ذرا رکے تو منصور نے پوچھا:

”مگر حسین کا تو کسی بھی شعبہ زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ دربار کی زندگی اس کے لئے ایک برا خواب تھی جو اس نے بھلا دیا تھا۔ یکسر۔“

”اس کے عقائد مختلف ہیں اور کیا یہ وجہ کافی نہیں۔“ اقطع نے سوال کیا۔

”میں نہیں سمجھتا جب اس کا اثر دوسروں کے عقائد کو نہیں بگاڑ سکتا۔ اس کو آرزو اور اس کے شدید اشواق بھی اس کے اپنے ہیں جو اسے آتش زیر پا رکھتے ہیں۔ نوافل اور عبادات میں وہ غلو کرتا ہمہ گیر یہ کیا قابل گرفت ہیں؟ ہاں البتہ حضرت عمرو بن عثمان مکی اس کے مخالف ہیں مگر ان کی وجہ عالمگیر تو نہیں۔“ منصور بحث میں کبھی نہیں الجھتا تھا مگر حسین کے لئے۔

”خدا سے دعا کریں کہ زمانہ مخالف ہو تو ہو خدا مخالف نہ ہو۔“ اقطع نے نیک نیتی سے کہا۔

”خدا مخالف نہ ہو۔“ منصور نے بھی اسی آواز میں کہا۔ ”مگر کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ زمانہ مخالف ہو جاتا ہے اور خدا راضی

ہوتا ہے۔“

”خدا کو کس نے دیکھا ہے۔ ہم زمانے کو خدا کہتے ہیں۔“ قطع نے آہستہ سے کہا۔

دو پہر شام میں اور شام گہری شام میں اور پھر رات میں بدلی مگر حسین لوٹ کر نہیں آیا۔

ناموافق ہواؤں نے منصور کے دل اور دماغ میں اپنے جھکڑوں سمیت قبضہ کر لیا۔ صحرا کی زہر آلود آندھی نے بغداد کے ایک دور افتادہ نیم تار یک حجرے کو تار کا تھا۔ کیا زمانہ خدا تھا؟

”غلام سمری نے کہا ہے تم سحر جانتے ہو اور دلوں کا حال بتا سکتے ہو؟“ حامد بن عباس نے نہایت غضب ناک اپنی نشست پر پہلو بدل رہا تھا۔

مسکرا کر حسین نے کہا: ”دلوں کا حال سوائے خدا کے کون جان سکتا ہے۔“

”مگر تمہارے غلام سمری نے ہمیشہ تمہارے متعلق یہی چرچا کیا ہے۔ وہ کہتا ہے لوگ تمہارے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ تم کو خدا کہتے ہیں اور کئی باطنی علوم پر تمہیں عبور حاصل ہے؟“ حامد نے تیزی سے دوسرا سوال کیا۔

”سمری غلام ہے اور اس کے لئے تھوڑی سی خاص بات بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کا پیمانہ اور عقل معمولی ہے۔“ حسین نے نہایت قطعیت سے جواب دیا۔

”عام اور خواص سبھی یہ کہتے ہیں جو شخص تمہارے قریب ہو تمہارے سحر میں گرفتار ہو جاتا ہے۔“ عمار نے حامد کے سامنے جھک کر کہا۔

”اگر یہ سحر اتنا زود اثر ہے تو پھر حاضرین محفل کو اب تک سوال کرنے کا وقت کہاں سے ملا۔“ حسین نے تھوڑا مسکرا کر ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

حامد نے عمار کی طرف اور عمار نے حاشیہ نشینوں کی طرف دیکھا۔ مجلس میں خاموشی چھا گئی تھی۔

جب سمری کو حاضر کیا گیا تو حسین اپنے سامنے لکیریں کھینچ رہا تھا اور لگتا تھا وہ اکیلا تھا۔ اپنے میں گم۔ جیسے وہ زمین کے اندر دور تک دیکھ رہا تھا۔

”تم کہتے ہو لوگ اسے سجدہ کرتے ہیں؟“ عمار نے سمری سے کہا۔

”ہلی یا سیدی۔“ سمری نے آہستہ سے کہا۔

”کیا تم اس بات کو جھٹلا سکتے ہو۔ اگر کوئی جواب ہے تو کہو؟“ عمار نے آگے بڑھ کر کہا۔

”میں سمری کی بات کا جواب کیا دوں۔ اگر آپ لوگوں کو اس پر یقین ہے اور یہ سب سچ جانتے ہیں تو میری بات سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ حسین نے بدستور اپنے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

حامد عباس نے کہا: ”تمہیں اس بات کا جواب ضرور دینا ہے اس لئے کہ اس سے بڑا فتنہ روئے زمین پر اور کوئی نہیں۔“

حسین نے ہنس کر کہا: ”بس ایک سجدہ ہی تو سب سے مشکل ہے جو کسی جبین کو صدیوں کے بعد عطا کیا جاتا ہے۔“

حامد اور عمار نے پھر نہایت گہری نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ”اگر تم اعتراف کر لو تو رہائی ممکن ہے۔“ عمار نے کہا۔

”اس سجدے کا اقرار جو میں ابھی کر نہیں سکا اس سجدے کا اعتراف جو ابھی میری جبین میں خوابیدہ ہے۔ اس سجدے کا اقرار جس کے بعد یا سر رہتا ہے یا سجدہ۔“ حسین بیٹھے سے کھڑا ہو گیا تھا۔

حاضرین محفل اور حاشیہ نشیں اور بغداد کا شہنہ اور موسیقاروں کی جماعت خوشامدیوں کی ٹکڑی اور قصیدہ گو شاعر سب سپانس روک کر اگلے لمحے کا انتظار کرنے لگے۔

”منطق کے انا لہجوں سے تم سوائے اپنے کسی کو بیوقوف نہیں بنا رہے۔“ حامد نہایت بے چین تھا۔

حسین پھر اپنے آپ میں چھپ گیا جیسے بادلوں کی سیاہی مرمغولوں اور پر پیچ دبیز ہوا کی تہوں میں پوشیدہ ہو جائے۔

”کیا تمہیں رہائی کی ضرورت نہیں۔“ عمار نے پوچھا۔

”میں جس کی قید میں ہوں وہ مجھے نہایت درجے عزیز ہے۔ اس کی ایک نگاہ کے لئے میں اس زندگی کو ہی نہیں ایسی سینکڑوں

زندگیوں کو قربان کر سکتا ہوں۔ میری ہست کیا شے ہے۔“ حسین کی آواز غم سے بے پناہ ہو رہی تھی جیسے اس میں گرج ہوا اور جلال ہوا

اور دبدبہ ہو۔ ”اگر میرا اپنا آپ مجھ لوٹا دیا جائے تو میں اسے پھر زیادہ شدت اور محبت کے ساتھ اس در پر قربان کر دوں۔ بخدا مجھے

رہائی نہیں چاہئے۔“

”یہ اپنے آپ میں نہیں دیونا ہے۔ اس کی باتوں میں کوئی مغز نہیں۔“ عہمنہ اس کی باتوں سے محفوظ ہو رہا تھا۔

”تم قمر مٹی ہو؟“ حامد نے سوال کیا۔

حسین نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

عمار نے سوال دہرایا: ”حسین ابن منصور حلاج۔ کیا تم قرمطی ہو۔ تمہارے عقائد اور تمہاری باتوں سے کفر کی بو آتی ہے۔“
”جانتے ہو کفیر کیا ہے؟“ حسین نے سوال کیا۔

محفل میں سوفوشیاں ابھریں جیسے کھیاں ایک دم متعفن ڈھیر پر بھنھنائیں۔

”تمہیں خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یقین کامل ہے؟“ عمار نے اس کے وال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔

”کیا وہ دونوں الگ ہیں؟“ حسین نے سوال کیا۔ ”رسول خدا کی پیشانی میں کون سا نور تھا؟ کائنات کے وجود کا سبب کون تھا؟“

”تم خادم بن عباس کی بارگاہ میں ہو۔ جو پوچھا جائے اس کا مختصر جواب دو۔ سوال کرنا منع ہے۔“ عمار اسے گویا مطلع کیا۔

”رسول خدا ابشر کامل تھے۔ خدا کی ذات سے الگ۔“ عمار نے کہا۔

شمس نے نہایت الجھ کر کہا۔ ”عمار! یہ بحث طویل ہو جائے گی اور حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ اگر تم چاہتے ہو تو اسے قید خانے میں بند کر دو۔ تھوڑے دنوں میں جب اس کی طبیعت بحال ہوگی تو شاید یہ بقائگی ہوش و حواس تمہارے سوالوں کے جواب دے سکے۔“

اور انہوں نے حسین بن منصور کو بندی خانے میں بھجوا دیا۔ عمار نے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا تھا:

”نامحرموں میں اسرار جاں کہنے کی وہی جگہ تھی۔“

حسین نے سر جھکا یا اور حامد کے دجلہ کنارے محل کے تہ خانے میں سبک خرام رات ستاروں سے مزین ردا کو لہراتی تیزی سے رقص کرنے لگی تھی۔ تار حیات پر عشق کے مضرب سے نغمے چھیڑے جارہے تھے۔

ان گنت دائروں کا تصور

پہلا دائری مشیت کا دائرہ ہے

دوسرا دائرہ اور اک کا ہے

تیسرا دائرہ قوت کا ہے

چوتھا اس کے علم کا دائرہ ہے اور ہیئتگی کا

ابلیس نے کہا اگر میں پلے دائرے میں داخل ہوتا ہوں

تو دوسرے میں میرے لئے موت ہے

اور اگر میں تیسرے میں رک بھی جاؤں

تو انجام وہی ہوگا

اس لئے نہیں۔ نہیں۔ نہیں

میں پہلے دائرے میں ہی ٹھہرا ہوں گا

اور دوسرے سے مجھ پر لعنت بر سے گی

میں تیسرے میں پھینکا گیا پڑا گیا

اور میں نے چوتھے کو کھو دیا

مگر چوتھا تھا ہی کہاں؟ چھوٹا دائرہ

اگر مجھے معلوم ہوتا کہ سجدہ میری نجات ہے

میری آزادی

تو میں آدم کو سجدہ کرتا

لیکن مجھے دائروں کے اندر دائروں اور ان کے اندر نامختم دائروں کا معلوم تھا

اور اس لئے میں نے اپنے دل سے کہا مجھے بخش دے۔ مجھے بخش دے

اگر میں مشیت کے پہلے دائرے سے باہر نکل سکتا

مگر اس کے بعد دائرے اور دائرے

آہ! وہ جو یکتا ہے۔ اکیلا ہے۔ جو بھی ہے

کیسے..... بھلا کیسے۔ کیسے؟

حسین نے سوچا وہ جو عز ازیل تھا اور فرشتوں میں صاحب عرفان تھا۔ مشیت کو سمجھتا تھا اور اس درائے سے باہر نہ نکل سکا تو کون

بھلا کون؟ کیسے؟ کیسے؟ اس پہلے دائرے سے نکلا جا سکتا ہے جبکہ نامختم ان گنت بے چمار دائرے ہیں اور ایک سے ہی باہر نکلنا

مشکل ہے۔ رہائی کیسے ہو؟

بہر طور رہائی مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ کوئی مشیت سے کیسے بھاگ سکتا تھا۔

سوال کس سے کیا جائے

کون، کون اور جواب

ہوا۔ ہوا۔

اور یہ لفظوں کا گورکھ دھندا۔ لفظ بھی تخلیق ہیں۔ بھلا مخلوق سے خلق کرنے والی کی طرف اشارہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ وہ تنہا اور یکتا ہے۔ کون سا لفظ اس کی تشریح کر سکتا ہے اور بنا لفظوں کے انسان کے مقدرات کو بھی تو سمجھا نہیں جاسکتا۔ اور حسین نے پھر تہ خانے کے تن مرش پر انگلی سے دائرے کھینچنے شروع کئے۔ نیم تاریکی میں دیواروں سے ٹکرا کر آوازیں لہروں کے ایک تسلسل کے ساتھ واپس آتیں اور ٹکراتیں اور لوٹ کر جاتیں اور آتیں اسے ان گنت لاتعداد دائروں کی طرح پھیلتی اور بڑھتی اور معدوم ہوتی اور پیدا ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ہاں بہتر یہی ہے کہ پہلے دائرے سے باہر نہ نکلا جائے جو مشیت کا دائرہ ہے نہیں اور نہیں اور نہیں۔ صرف ایک سجدہ اور اس کے بعد نہیں۔ نہیں اور نامختم ابا۔ بھلا جس نے آدم کو تخلیق کیا تھا کیا اس نے اس ہمیشگی میں وہ راز پوشیدہ نہ رکھا تھا جس تک کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اس راز سے صرف وہی واقف تھا جس کی نگاہ نہ بھٹکی اور جس نے ادھر ادھر نہیں دیکھا۔

سوائے احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی نے اس کے یکتا ہونے پر صاف نہیں کیا

اور سوائے اس کے کسی پر راز ہائے درون اسرار نہیں کھلے

ابلیس اپنے ہونے اپنی ہستی کے غرور میں ٹھہرا رہا۔ اسے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا

اور احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھنے کا

احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (خدا کی رحمتیں ان پر ہوں) نے دائیں بائیں نہیں دیکھا نہ شمال کی طرف ان کی نگاہ نہیں بھٹکی اور نہ انہوں نے غلط دیکھا۔

ابلیس نے ایک دعویٰ کیا مگر وہ اپنے آپ سے آزادی نہ حاصل کر سکا۔ نہ اس نے اس آتش سے رہائی حاصل کی جس سے وہ بنا تھا۔

اور نہ ہی اپنی ذات سے باہر آ سکا۔

احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (خدا کی رحمتیں ان پر ہوں) نے دعویٰ کیا اور فنا کو پار کر گئے

اور اپنی ذات کے دائرے سے نکل گئے

اور انہوں نے کوئی معاہدہ نہیں کیا

آدمی کی رہائی۔ قید و بند سے نہیں اپنے آپ سے ہونا تھی۔ فنا سے رہائی اور اپنی ہستی سے جو نیستی کی راہوں سے نکلتی تھی اور موت کی تمنا شدید تر تھی۔ جیسے ایک خوبصورت خواب ہو جنّتوں اور قرب باری اور جولہ جاناں کا۔ آسمان کی بادشاہتوں کا۔ قلیل سے جلیل کا۔ کیونکہ سب کچھ فنا کی زد میں تھا سوائے اس کے۔

اس تہ خانے کی تاریکی میں وہ وقت کا حساب بھول گیا تھا۔ لا انتہا وقت پر کون نگران ہوا تھا؟

جب وہ باہر لایا گیا تو سیزہیوں کی پھسلن سے اس کے قدم لت پتہ تھے اور حبشی اسے پیچھے سے سہارا دے کر اوپر لارہا تھا۔ حامد بن عباس کا کمرہ ملاقات خالی تھا جہاں شمعیں روشن تھیں اور نیم عریاں کنیزوں کے پردے دیواروں کے ساتھ تازہ گلاب کی بیلوں کی طرہ آرائش مغل تھے چوکیوں اور بند درپچوں کے سامنے صراحیاں اور شیشے سجے تھے۔ حسین اپنی جلتی ہوئی آنکھوں سے یہ سب دیکھا اور نگاہیں جھکا لیں۔

”تمہیں ان سب چیزوں کا اس زندگی کا شوق ہے؟“ حامد نے حبشی کے جانے کے بعد اس سے پوچھا۔

حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم نظر اٹھا کر ہی نہیں آریب جا کر چھو کر انہیں دیکھ سکتے ہو۔ اگر تمہیں کوئی پسند ہو تو وہ تمہاری ملکیت ہوگی۔“ حامد نے کنیزوں کی طرف اپنے کوڑے سے اشارہ کیا۔

حسین پھر بھی خاموش رہا۔ جیسے کوئی بھی اس سے مخاطب نہ ہو۔

”یا تم سننے اور دیکھنے کی قوتوں سے محروم ہو گئے ہو؟“ اس سے پوچھا گیا۔

”میں سن اور دیکھ رہا ہوں مگر میری نگاہ بھٹک نہیں رہی۔ میں صرف سیدھا دیکھنے کا عادی ہوں۔“ حسین کے جواب نے حامد کو

چونکا ہی دیا۔

”سیدھا دیکھنے سے بہت سی ایسی چیزیں دکھائی دیتی ہیں جو دیکھی جانی نہیں چاہئیں۔“ حامد نے بگڑ کر کہا۔

”مقدرات سے بھلا کون ٹکرا سکتا ہے۔“ جواب نہایت صاف تھا۔

”اپنے کفر الادو کو اب تم ان پردوں میں چھاپتے ہو۔“ حامد نے مسکرا کر کہا۔

”مقدرات کی زد میں سب آتے ہیں۔ اگر یہ کفر ہے تو ایمان کیا ہے؟“ حسین کا سوال کمرے میں گونجا۔ گویا درود یوار ساز و

مضراب و شیشہ و صراحی چراغ اور لوئیں یہ سوال دہرا رہے تھے۔

”میں سوال پوچھنے کا عادی ہوں جو ب دینے کا نہیں۔“ حامد نے کنیزوں کو ہٹ جانے کا اشارہ کیا جو پراسرار دروازوں سے نہایت مختصر وقت میں غائب ہو گئیں۔

”ابن منصور! یہ تماشا ختم ہو گیا۔ میں نے نہایت بے چین بے خواب راتوں کے بعد آخر تم سے سوال کرنا مناسب سمجھا ہے۔ تم اغول کو کب سے جانتے تھے۔“

”موت تو آزادی ہے۔ سوالوں اور جوابوں کے تانے بانے سے ماورا۔“ حسین نے پوچھا۔ ”کیا کوئی ایک بار ان سرحدوں کو پار کر کے واپس آیا ہے کہ وجہ نزاع بنے۔“

”میں سوالوں کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔“ حامد بن عباس نے ٹپکتے ہوئے کہا۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا وقفہ تکلیف دہ طوالت اختیار کر گیا تھا۔

”تم اس سے پہلی بار کب ملے تھے میں جاننا چاہوں گا؟“ اس نے اس کے برابر کھڑے ہو کر کہا۔

”روحیں ازل سے اپنی پہچان میں نہایت تیز ہوتی ہیں۔ یہ ادراک ان کو وعیعت کیا جاتا ہے۔“ حسین کا جواب نہایت الجھا ہوا اور ناقابل فہم تھا۔

”ابن منصور!“ حامد نے درشتی سے کہا۔ ”میرا صبر مت آزماؤ۔ میرے جذبہ رقابت کو ہوانہ دو۔“

حسین نے ہنس کر کہا: ”ایک قیدی اور مقید کرنیوالے کے درمیان رقابت نہیں ہو سکتی ایک کے پاس اختیار اور دوسرے کے پاس مظلومیت۔“

حامد نے جھک کر حسین کے پاؤں میں سے بیڑیاں کھول دیں۔

”اب ہم دونوں برابر ہیں۔“

”حاکم و محکوم کب برابر ہوئے ہیں؟“ حسین نے بیڑیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

حامد نے نہایت گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”بیٹھ جاؤ ابن منصور۔“

”بارگاہوں میں جو بیٹھ گیا وہ اٹھ نہیں سکا۔ میں اگر اس جسارت کے لئے معاف کر دیا جاؤں تو بہتر ہوگا۔“

حامد عجیب بے بسی سے ایک تخت کے کنارے بیٹھ گیا۔

اب نہ کوئی حاکم ہے نہ محکوم۔ تم آزاد ہو اور یہ بارگاہ نہیں ملاقات کی جگہ ہے۔ اگر تم بھی اسی تخت کے کنارے بیٹھ جاؤ تو میرے سوالوں کے جواب بہتر طور پر دے سکو گے۔ ایک اچھی فضا میں نہایت سوچ سمجھ کر بہت کچھ یاد کر کے۔“ اس نے دوسرے تخت کی طرف اشارہ کیا، جس کے قریب جام و مینار روشنی پکڑ کر اپنی شعاعوں سے جگمگا رہا تھا اور قوس و قزح سی پھیلی ہوئی تھی جو رنگوں میں ایک اور شے بن جاتی تھی۔

”اگر میں آزاد ہوں تو مجھ پر کسی سوال کا جواب دینے کی پابندی عائد نہیں ہونی چاہئے۔“ حسین نے کہا۔

حامد اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”ہاں ابن منصور! تمہیں اختیار بھی ہے آزادی بھی۔ مگر ان سوالوں کے جواب بہر حال مجھے معلوم کرنا ہی ہیں۔ کوئی آزادی مکمل نہیں ہوتی۔۔ ہر قید و بند سے آزاد کوئی شے نہیں۔ نہ کوئی جذبہ نہ کوئی خیال نہ ہی کوئی انسان۔“

حسین اپنے سامنے مے و شیشہ کی طرف دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ صراحی اور جام آپس میں ٹکرائے اور بنیڈ پر پہننے لگی۔ روشنیاں بڑھ کر الاؤ بنیں اور دیواریں تمازت آفتاب بن گئیں۔

”تم بے شک جادوگر ہو اور بغداد میں تمہاری موجودگی دوسروں کے لئے پریشانی کا باعث ہوگی۔“ حامد نے تالی بجاتی۔

جبشی نے حسین کو بازو سے پکڑا۔

”اسے لے جا کر عمیق ترین تہ خانے میں بند کر دو جہاں ہوا کا گزر بھی نہ ہو۔“ حامد نہایت بد مزہ ہو کر ٹوٹے ہوئے برتنوں کے پاس کھڑا ہو گیا پھر اس نے کیزوں کو بلائے جانے کا اشارہ کیا تا کہ نشست گاہ کو از سر نو آراستہ کیا جائے۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر یہ سحر بھی ہوتا آدمی کو کون سی طاقت عطا ہوتی تھی جو عالموں کو نہیں ملتی تھی کائنات کے کاروبار میں کیسے دخل ہوا جاسکتا تھا۔ خدا کچھ لوگو کو ایک خاص قوت کیونکر ودیعت کر دیتا تھا۔

انغول اور قہرمانہ اور گل رنگ کا معمہ اسی طرح تھا۔

یہ شخصی قابل گردن زدنی تھا۔

حامد بند عباس کے دماغ میں گرم لہریں سی اٹھ رہی تھیں اور اسے اپنا وجود بادِ سموم کے لہریوں پر خس و خاشاک کی طرح لگتا تھا۔ جلتا ہوا اڑتا ہوا اور پھر بھی آگ کے بغیر بھسم ہونے سے نا آشنا۔ اس کی ساری زندگی بلکہ اس کے آبا کی زندگی برباد ہو گئی تھی۔ وہ جو

آج سے پہلے اپنی کامیابی پر نازاں تھا، کیا نازاں تھا۔

جبشی نے حسین کے ساتھ پھسلواں سیزھیاں اترتے ہوئے کہا: ”تم اب کبھی دن کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ تمہارا جرم کتنا سنگین تھا۔“
 ”سنگین!“ حسین نے ہنس کر اس کے فولای کندھے پر اپنا ناتواں ہاتھ رکھ دیا۔ جبشی کو محسوس ہوا گویا اس کے شانے کی ہڈی اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہے۔ ”آہ“ کہہ کر وہ وہیں اندھیرے میں بیٹھ گیا اور نرم ناک ہوا کے ساتھ جانے کس سوراخ سے روشنی کی کرنیں اندر داخل ہوئیں، کنیزوں کی طرح جنہیں رقص کے لئے بلایا جاتا تھا۔

جب جبشی کی ہاؤدھو بلند ہونے لگی تو حسین نے کہا: ”برادر! تم اپنے شانے کو سہلاؤ۔ خدا تمہیں شفا دے۔“
 جبشی نے پیچھے مڑ کر اپنے قیدی کی طرف دیکھا۔
 ”سہلاؤ۔“ حسین نے کہا

”اوہ۔ اوہ۔ کی صدا اب سیزھیوں میں گونجنے لگی تھی۔

حسین نے ہاتھ بڑھا کر کندھے پر رکھا۔ جبشی پلٹ کر اس کے پاؤں پر گویا پڑا تھا اس لیے کہ اس کا درد یک بیک غائب ہو گیا تھا۔

”تم قید و بند کے لئے نہیں پیدا کیے گئے ہو۔ تمہاری تو پرستش ہونا چاہئے تھی۔ بخدا قید خانے سے زیادہ متعفن اور بری جگہ اور کوئی نہیں۔“ جبشی اس اندھیرے میں بھی اپنے سیاہ چہرے اور سفید دانتوں کی وجہ سے دکھائی دے رہا تھا۔ گڑگڑاتا ہوا جیسے پہاڑ ریزہ ریزہ ہو۔

”دوست اترو اس سے پہلے کہ وزیر کا کوئی اور بلاؤ تمہارے لئے آئے۔“ حسین نے کہا۔

”سب چور دروازوں کی کنجیاں میرے پاس ہیں اور آزادی ایک لمحے کی بات ہے۔“ جبشی نے پر یقین نرم آواز میں کہا۔
 ”مجھے آزادی کی آرزو نہیں۔“ حسین نے کہا۔ ”نیچے اترو۔ روشنی کو کوئی روک نہیں سکتا۔ محبت کو کوئی قید نہیں کر سکتا۔“
 ”یا شیخ! کیا آپ مجھے معاف کر دیں گے۔“ جبشی نے پوچھا۔

”یقیناً۔“ جواب ملا۔ ”تم اپنا فرض ادا کرتے ہو۔ خدایا! یہ بندہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے خدایا۔“ حسین نے پکارا۔

اور بندی خانے میں روشنی قدم قدم پر اترنے لگی۔ تہ خانہ روشن ہونے لگا۔ راہ دکھائی دینے لگی اور باہر دجلہ اپنی لہروں اور شفاف

پانیوں سمیت عجیب سرشاری کے عالم میں بہنے لگا۔ گویا صدف کی حفاظت کے لئے مستعد ہو رہا تھا جس میں ایک درہم پوئیدہ تھا۔
 ”یا شیخ! آپ بندی خانے سے باہر جانا پسند فرمائیں گے؟“ حبشی نے نیاز بندی سے اس کے پاؤں چھو کر کہا۔
 ”بندی خانہ کہاں ہے؟“ حسین نے چاروں طرف دیکھ کر پوچھا۔

حبشی نے دیکھا دیواریں ہٹ گئی تھیں اور دجلہ خاموش اپنی حد میں مودب رکا ہوا تھا اس کی نگاہ نے نہایت فاصلے پر پہاڑوں کو دیکھا اور برف کو اور جاری ندیوں کو چھوٹے چھوٹے آبشار بناتے چشموں کو سفید جھاگوں سے بھرے چاندی کے سیال نالوں کو اس نے ہواؤں کی تند و تیزی اور برودت کو اپنی جان میں محسوس کیا۔ درخت جو غصہ و رطوفانوں میں پھنارتے ہوئے اژدہوں کی طرح جھکتے اور سیدھے ہوتے دوہرے ہوتے اور کھڑے ہوتے تھے۔ روئیدگی اور پھول اوڑتے ہوئے پتھر جو بارش کی طرح نیچے وادیوں پر برس رہے تھے اور گڈریوں کی پھوس کی چھونپڑیوں میں پناہ تھی اور آسرا تھا۔ اس نے بھڑوں کا میا نہ بھی سنا۔ جس کو قافلے نے نہیں روکا تھا۔ پھر چراگا ہوں میں گھوڑے کے ریوڑ دیکھے صحرا اور سمندر جیسے وہ بلندی پر ہوا اور سارا تماشا اس کے سامنے ہو رہا تھا۔

خوفزدہ ہو کر اس نے حسین کی طرف دیکھا۔

”یا شیخ! وہ اس کے قدموں میں جھک کر بولا۔“ آپ اس تہ خانے سے جاسکتے ہیں تو چلے کیوں نہیں جاتے؟“
 ”نہیں! ابھی اس کا حکم نہیں ہوا ہم جس کی قید میں ہیں اذن آزادی بھی تو ہو۔“ حسین نے مڑ کر دیکھا۔
 حبشی کی حیرت سے پھٹی ہوئی آنکھیں جھک گئی تھیں۔

”خدا یا..... خدا یا“ حسین نے ایک سرد آہ کھینچی۔ دیواروں اور چھت آب رواں اور روشنیوں اور اندھیرے سب نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔

”میں وزیر حامد بن عباس سے جا کر التجا کروں کہ آپ کو یہاں سے نہ روکے؟“ حبشی نے کہا۔

”نہیں دوست تم ایسی کوئی التجا نہیں کرو گے قطعاً نہیں۔“ حسین نے جواب دیا۔ پھر سیزھیوں کے سرے پر اس نے کوئی آواز سنی جو حبشی کو پکار رہی تھی۔

”عمار نے مجھے بلایا ہے خدا خیر کرے۔“ حبشی تیزی سے اوپر کی طرف چڑھنے لگا اور حسین نے نوافل کے لئے کھڑا ہونے سے پہلے پھونک مار کر وہ چراغ بھی گل کر دیا جو خدمت گزاری کی خاطر زنداں میں جلایا گیا تھا۔ زندانیوں کو روشنی اور چراغوں سے بھلا کیا

تعلق؟ زندان کو عمیق ترین تاریک ترین اور متعفن ترین جگہ ہونا چاہئے۔ سیاہی کو کسی سفیدی کی حاجت نہ ہو پھر اس کی تکمیل میں سے روشنی اور خوشبو اور العصو و خود ہی پیدا ہو جایا کرتا تھا۔

عمار نے حسین کو بلایا تھا۔ حبشی نے اندھیرے میں ادھر ادھر ٹٹولتے ہوئے چراغ کو پھر سے روشن کیا اور منظر رہا۔ پھر جب نماز طویل ہو گئی اور سیز دھیوں کے سرے پر عمار نے لنگی ہوئی رسی کو پھر جھٹکا دیا اور دروازے کے اندر لگی گھنٹی بجی تو اس نے زور سے دھاڑ کر کہا:

”کیا نماز کا احترام نہ کروں؟“

اوپر خاموشی میں ایک طویل سیٹی بجی۔ حبشی بڑبڑاتا ہوا پھر سیز دھیوں کی طرف لپکا اور نمی کی شکایت کرتا ہوا بھاری قدموں سے چڑھنے لگا۔

”محبت“ حسین نے سوچا..... اشواق محبت کا غافل کون ہے؟ محبت کا منبع اور اس کی انتہا کیا ہے۔ اغول نے اتنی طویل محبت کی کیونکر؟“

اسے چشم باطن عطا کی گئی تھی۔ یہ محض اور صرف عطائے الہی تھا یا اس بنیائی کے لئے مشقت کی گئی تھی؟

جیسے جیسے حسین سوچتا تھا اس کا دل ڈوبتا تھا۔ اس خوف سے نہیں کہ وہ حامد بن عباس کے سامنے جوابدہ تھا بلکہ یونہی کہ اب وہ نہیں تھی اور وہ اس راز کو اپنے طور پر سمجھنے کی جتنی بھی کوشش کرے کبھی آخری حتمی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے گا کہ یہ کس طرح ممکن ہوا۔ اسے بصرہ کا سفر اور قافلہ اور چاندنی رات سب یاد آ رہے تھے۔ محبت کرنے والی ایک روح‘ حسین نے اس سے کچھ نہیں چاہا تھا۔ کوئی فریاد نہیں کی۔ کبھی اس کی آہ بھی اس تک نہیں پہنچی۔ بہت دیر وہ خالی الذہن محض اغول کے نام کو اپنے خیالوں کی بھول بھلیوں میں پرواز کرتے دیکھتا رہا۔ جیسے اس کا وجود کچھ اور ہو وہ حسین نہ ہو اور اغول کی چاہت اس کے لئے اس کی اپنی ہی تمنا ہو۔ اغول نے اپنے آپ کو چاہا ہو وہ حسین اس سے اغول سے جدا نہ ہو اور دونوں کی آرزو ایک ہو۔ دونوں نے اپنے اپنے اندر اپنے خدا کو چاہا ہو۔ یا خدا نے ان دونوں کو چاہا ہو۔ ہاں بیشک خدا بندوں کو چاہتا ہے۔ یہ دراصل اس کی آرزو اس کے لئے اپنے لئے ہوتی ہے۔ آئینے میں جو دنیا ہے اس نے اپنا آپ دیکھا اور اپنے آپ پر خود ہی عاشق ہو اور اپنے عشق میں گرفتار ہوا اور اپنی تمنا کی۔ خالق نے مخلوق کی تمنا کی۔ بے قرار ہوا۔ دوسرا تو کوئی نہیں تھا۔ وہ ہر طرف خود ہی جلوہ آ رہا تھا۔ ضو لگن تھا۔ کیا یہ ممکن نہ تھا کہ اغول کی طرح محبت کی جائے؟ کوئی فریاد نہ ہو۔ کوئی تمنا نہ ہو۔

محبت کا منبع بھی وہی ہو اور انتہا بھی روح بھی وہی ہو اور تمنائے روح بھی وہی ہو۔

اس نے سوچا کہ اس کے جذبات میں صرف شدت تھی جیسے روشنی تو ہو مگر راہنمائی نہ کر سکے اور پھر وہ وقت گزر گیا تھا۔ اب اسے معلوم تھا انتہائے تخیل کی روشنی نے اسے جواب عطا کیا تھا۔ اس کی آنکھوں نے دیکھا تھا، مشاہدہ کیا تھا کہ روح کو علم عطا کیا جاتا ہے اور وہ علم صرف خالق عالم عطا کرتا ہے۔ محبت بھی اللہ ہی کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ اس کی نگاہ خدا کی نگاہ۔ اس لئے کہ خدا انہیں نگاہوں سے مخلوق کو دیکھتا ہے۔ وہ خود خدا ہے محبت ہے۔ روح کی نگاہ اس کی نگاہ اور روح کے اشواق اس کا ثبوت ہیں۔ وہ خود ہی محب بھی ہے اور محبوب بھی محبت کرنے والا ہے میں بھی وی نگاہ ہے اور معشوق میں بھی وہی کار فرما۔ اغول کی محبت اور حسین کی محبت۔ دیوانوں اور فزانوں کی لگاؤ میں سبھی جلوے تھے جلوہ جاناں۔ اب اگر حامد اس سے پوچھے اور وہ اس کے سوال کا جواب بھی دینا چاہے تو کیا دے سکتا تھا بھلا؟

وہ بندی خانوں زندانوں کے فریب نظر سے اپنے آپ کو بہلاتے تھے؟

عمار نے پوچھا: ”حسین ابن منصور حلاج! کیا دوسروں کے دل کا حال معلوم کرنے کے شعبدے کے سوا بھی تم کچھ جانتے ہو؟“

”بغدا نہیں اور نہیں اور نہیں۔“ حسین نے کہا۔

”پھر لوگ یہ فسانہ طرازیوں کیوں کرتے ہیں؟“ اس نے نرمی سے کہا۔

”فسانہ طرازی کرنے والوں کے لئے کیونکر جوابدہ ہو سکتا ہوں۔“

”تمہارا مسلک کیا ہے؟“

”جو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ (میری جان ان پر قربان) لائے تھے۔“

بہت دیر عمار اور حسین کے درمیان خاموشی رہی جیسے کہنے کو بات باقی نہ رہی تھی۔

پھر عمار نے کہا: ”اگر تمہیں آزاد کر دیا جائے تو کیا تم بغداد چھوڑ دو گے؟“

ابن منصور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

عمار نے پھر کہا: میں سمجھتا ہوں ایسا کوئی خیال کسی کو رکھنے کا کوئی حق نہیں جو حقائق کے منافی ہو۔ شرع اسلام کیا کافی نہیں کہ آدمی

اس میں اضافے یا سعی کرنے لگے۔“

”آدمی کی کوئی حیثیت نہیں کہ وہ ایک ذرہ ریگ بھی تخلیق کر سکے۔ ہم سب خالق کے محتاج ہیں۔“ حسین نے کہا۔

خاتون گل رنگ اور خاتون قہرمانہ دونوں تمہاری تلاش میں تھیں۔ گل رنگ تو خیر مگر قہرمانہ کا بھی تک کوئی نشان نہیں ملا۔“ عمار کی گفتگو جاری رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔

”گم ہونے والوں کی نشان دہی؟“ حسین ہنسا۔

”تم بغداد سے چلے جاؤ۔ بغداد ہی کل دنیا نہیں ہے۔“ پھر ٹھہر کر اس نے کہا۔ ”غلام سمری لوگوں سے بہت کچھ کہتا رہا تھا کہ تم مردوں کو زندہ کر سکتے ہو۔ دلوں کا حال جانتے ہو۔ لوگ تمہیں سجدہ کرتے ہیں۔“

”قلوب کا مالک خدا ہے۔ سجدہ صرف ایک ہے اور زندگی کسی بھی آدمی کے اختیار میں کہاں ہے۔“ ابن منصور نے آہستہ سے کہا۔

”بیشک غلام کی بات پر مکمل اعتماد نہیں کیا جاسکتا اور قلوب کا مالک خدا تھا۔“ عمار نے دل ہی دل میں کہا۔ ”کیا محض مفروضوں کی بنا پر ایک بندہ خدا کو قید رکھنا انصاف تھا۔“ اب کہ حامد بن عباس نے یہ کام اس کے سپرد کر دیا تھا وہ ابن منصور کو جانے دے گا۔ وہ نہ زندیق تھا نہ قمر مطلق۔ نہ ظہور مہدی میں یقین رکھتا تھا۔ ایک سادہ مسلمان جو محض اپنی عبادات میں غلو کی وجہ سے زیر عتاب تھا۔

”ابن منصور! اس نے زمین پر بیٹھے ہوئے حسین سے کہا۔ ”اگر تم مجھ سے وعدہ کرو کہ بغداد کو چھوڑ دو گے تو میں تمہاری رہائی کا بوجھ اپنے سر لینے کو تیار ہوں۔ وزیر اعلیٰ حامد بن عباس پتا نہیں کیوں اتنی شدت سے تمہارے مخالف ہیں کہ جس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ اب کچھ عرصہ بعد ہی تمہارے متعلق استفسار کریں گے اور تم بغداد سے نکل جاؤ۔ اگر تمہارے پاس زادراہ نہیں ہے تو اس سلسلے میں بھی میں مدد کرنے کو تیار ہوں۔“ اس نے اپنی لمبی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی تھیلی اس کی طرف بڑھائی۔ چند موتی اور کچھ نقدی۔“

ابن منصور نے اس تھیلی کی طرف دیکھے بنا کہا: ”نہیں۔“

”کیوں؟“ عمار نے نہایت حیرت سے کہا۔ ”کیوں! کیا تم حامد بن عباس کی قید سے رہائی نہیں چاہتے؟“

”میں چوروں کی طرح بھاگنا چاہتا۔ اگر میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں تو وزیر مملکت کو خود مجھے رہا کر دینا چاہئے تھا۔“ حسین کی عجیب منطق تھی۔

عمار نے کندھے اچکا کر کہا: ”وزرا عظام کی یہ عادت ہوتی ہے کہ جب کسی کو بے گناہ باندھیں تو پھر اس کے لئے جواز تلاش کر

لیتے ہیں۔“

”ساری سلطنتیں اور سارے نظام باندھ کر پھر نہ چھوڑنے کے سہارے چلتے رہے تھے سوائے ایک شہنشاہ اور خلفاء کے۔“
جواب میں ابن منصور نے کہا۔

”تمہارے ایسے ہی خیالات جو درویشی کے مفانی اور جہاں بانی کی رسم کی نکتہ چینی ہیں تمہیں لے ڈوبیں گے۔“ عمار نے مایوسی سے کہا۔ ”مگر میں تمہیں یونہی رہائی کا مژدہ نہیں سنارہا تھا۔ وزیر مملکت کا فرمان ہے کہ اگر ابن منصور وعدہ کرے کہ وہ بغداد چھوڑ دے گا تو ہم اس سے مزید تعرض نہیں کریں گے۔ اس شرط پر تمہیں رہا کیا جاسکتا تھا۔“

ابن منصور نے کہا: ”ملک خدا کا ہے اور مجھے رہائی عزیز نہیں۔ بغداد میرا وطن نہیں۔ مگر ایسا وعدہ کیوں کروں جس کی کوئی وجہ ہی نہ ہو۔“

عمار نے حیرت سے بھنویں سکڑ لیں۔ بہت دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔
”بہر حال یہ میری عزت کا سوال ہے۔ میں نے وزیر حامد سے تمہاری سفارش کی تھی اور بغداد سے تمہیں کم از کم ایک سال کے لئے تو نکل جانا چاہئے تاکہ میری بات رہ جائے اور تمہیں گزند پہنچانے کی کوئی معقول وجہ اسے مل سکے۔“

جبشی لگا ہیں جھکائے نہایت بے تابی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ ابن منصور کے قدموں میں جھک گیا اور التجا کرنے لگا کہ اس متعفن بندی خانے سے تو بہر حال رہائی بہتر تھی۔ خدا کا ملک تنگ نہ تھا۔ درویش کے لئے ہر جگہ برابر تھی اور اگر عمار نے اپنی شخصی ضمانت پر یہ اجازت حاصل کی تھی تو ابن منصور نہایت شفقت سے اس کی التجا پر نظر ثانی کر سکتا تھا۔

ابن منصور قافلے کے آخر میں اپنے پدر بزرگوار کے ساتھ بیضا جار ہاتھا اور سرشاری کی کیفیت جو تقریباً دیوانگی تھی اس کا احاطہ کئے تھے۔ بھلا اس کی قبولیت کیوں نہیں ہوتی؟ وہ سر جو اس کے لئے بار دوش تھا کیوں ہر دفعہ نہایت مہمل بہانوں سے اس کے کندھوں پر ٹکا رہتا تھا۔ یہ طول انتظار تھا۔ سرخروئی کے لئے یہ نامختم انتظار تھا۔ جلوہ جاناں کے لئے یہ شدید تپڑ تھی خواہش جس میں چین اور قرار نہ تھا کہ پردوں کے پار دیکھا جاسکے۔ محبوب کون ہے؟

جب پڑاؤ کی گھڑی آئی۔ چاندنی چھٹکی اور پہاڑوں کے دامن میں پھولوں سے بھرے کنج مہکے تو قافلے نے قیام کا۔ نے نواز نے نغمے کا آغاز کیا۔ اونٹوں نے بلبلانا اور بچوں نے رونا بند کر دیا۔ نیند نے انہیں آلیا تھا۔ نغمہ اس کی جان کے اندر اتر رہا تھا۔ کیا

روح اس کو پاسکتی تھی جو اس نغمے کی جان تھا۔

پھر بیتاب ہو کر درختوں پر سے پر نے اڑنے ریت میں سر چھپائے ہوئے حشرات الارض نے اپنے سر باہر نکالے اور ذروں نے اتنی چمک پکڑ لی جیسے آفتاب ان کے اندر اتر آیا ہو۔ انسان اتنا بے تاب کیوں نہیں ہو سکتا کہ چمک پکڑ کر کچھ اور بن سکے۔ اپنی بے چین جان کو وہ کیا کرے۔

کائنات کے راز اس پر کیوں واہوں گے۔ وہ راز جو درختوں اور ذروں اور پرندوں پر واہو گئے تھے۔ منصور نے کہا:

”حسین! کیا تم ایک عام آدمی کی طرح زندگی کے دل میں پھر سے اپنی جگہ حاصل نہیں کر سکتے۔ تم جس خدا کے لئے عبادت و ریاضت کرتے ہو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خدا، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خدا، صدہا عظیم السان آدمیوں کا رب اور مالک ہے۔ وہ انسان کو معمول کی زندگی گزارنے کا کہتا ہے۔ اور وہ ان سے دور کہاں ہوتا ہے؟ اسے پکارو تو وہ سنتا ہے۔ وہ تو قریب رہے۔ سکی سہارے کی حاجت نہیں۔ کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔ تم کن بھول بھلیوں میں گم ہو۔“

”گم کہاں ہوں پدر محترم!“ حسین نے باپ کی آنکھوں کی اس زخمی نگاہ کی تاب نہ لاتے ہوئے کہا۔

”تو پھر کہاں ہو؟“ منصور نے پوچھا۔

کہیں نہیں۔ کہیں بھی نہیں۔ ہاں نہیں نہیں اور نہیں۔ اور وہ انکار کرنے والا تھا کہ اپنے انکار کو اس نے قبول کیا۔ اس پر اڑا رہا اور قانع رہا۔ حسین نے سردو نوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔

منصور نے کہا: ”کیا تم مشیت سے لڑتے ہو۔ مقدر کو بدلنا چاہتے ہو۔ جو ہوا اس سے نکل کر کہاں جاؤ گے۔“

حسین نے باپ کی طرف دیکھا جو نہ ریاضتوں میں لگا رہا تھا نہ تقدیر بدلنا چاہتا تھا۔ جو ایک معمولی ریشم کا سوداگر تھا مگر جسے زندگی کے راستے معلوم تھے۔ وہ اندھیروں اور روشنیوں کے درمیان بھٹک نہیں رہا تھا۔ جس کا سوال کوئی بڑا سوال نہیں تھا۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ اس کا کوئی سوال تھا ہی نہیں۔ منصور جانتا تھا کہ مشیت کے دائرے سے باہر نکلنا مشکل بلکہ ناممکن تھا اور اس نے حسین نے اپنی ریاضتوں سے کیا حاصل کیا تھا۔

زندگی کے دل میں پھر آباد ہونا اسے مشکل نہیں تھا، کیونکہ یہ مشیت تھی جس کا فراموش نہ تھا۔

زینب اور حسن پر جیسے کسی ویران کنج پر برسوں کے بعد بہار آئی تھی۔ سرائے میں جواب مہمان خانہ تھا، مہمان ٹھہرتے اور ریشم کے

دور دروازے سے آئے ہوئے سوداگر اس خاموش اور توجہ سے باتیں سننے والے منصور کے بیٹے کو حیرت سے دیکھتے جو کپڑے سے متعلق ہر گفتگو سن کر بھی سنتا ہوا نہیں لگتا تھا۔ جس کا وجود ایک بجھے ہوئے الاؤ کی طرح تھا۔ راکھ ہونے کی سی کیفیت، بے کیف رنگ، ذرا ڈراما مگر مضبوط جیسے پھسلواں گھانٹوں پر سے اتر رہا ہو۔ پر اعتماد بھی اور بے یقین بھی۔ بے چین اور بے قرار آنکھیں بے خواب لگا ہیں اور منصور اس کی خاطر داریاں کرتا تھا جیسے کوئی نہایت ہی معزز مہمان ہو۔ یہ چہستان تھی جس کی سمجھ انہیں نہیں آتی تھی۔ حسن کبھی باپ سے ہنس کر بات کرتا۔ اس سے عام معمول روزمرہ کی باتیں کرتا۔ گویا وہ ابھی اسے قدم قدم اس خارزار حیات میں چلا رہا تھا۔

وہ سرائے کے پرانے کمروں کو درست کر رہے تھے۔ کچھ دالانوں کو کنگوروں والے جاذب نظر اطاقوں میں تبدیل کر رہے تھے۔ حسن کو یہ جگہ بہت پسند تھی اور وہ یہیں پر آباد ہونا چاہتا تھا۔ ب/ے صحن میں جہاں گھوڑوں کو باندھنے کے لئے سایہ تھا، اسے اٹھا دیا گیا تھا۔ خانہ باغ میں تبدیل ہو کر وہ جگہ اچھی جاذب نظر ہو گئی تھی اور وسیع لگتی تھی۔ جاری پانی کے چشموں کی ایک نہر تھی جو اس باغ کے درمیان سے گزرتی تھی اور حسن اسے ایک آبشار میں تبدیل کرنا چاہتا تھا جو پھیل کر پتھر کی سیریزوں پر سے گرے اور ایک حوض میں جمع ہوا اور پھر چھوٹی نالیوں میں سے ہو کر واپس آبشار کی طرف لوٹ آئے۔

”یہ ایک اچھا معمار ہے جو کسی بھی عظیم الشان معبد کی تعمیر میں اپنے خیال سے جدت پیدا کر سکتا ہے۔“ سیاوش نے کہا جو ستر سے ابھی واپس آیا تھا۔ ”تستر دشت سوس سے زیادہ خوبصورت تھا۔ نہروں اور جاری پانیوں اور ٹھنڈے کنجوں سے بھرا ہوا۔“ سیاوش نے اعلان کیا۔

حسین نے نظر اٹھا کر اس کی مطمئن صورت کو دیکھا تو اس کے جی میں ایک یوک اٹھی۔ کیا وہ اتنا پرسکون ہو سکتا تھا۔ شورش بھرے زمانوں کے بعد کیا بال آخر وہ بھی سیاوش بن جائے گا۔ ہوا اور ٹھنڈے کنجوں کی محبت میں گرفتار۔ پھر اس نے اپنا جی بہلانے اور اس خیال سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے حسن سے کہا کہ وہ آب و دژ کے کنارے ٹھہرنے جانا چاہتا تھا۔

”ضرور جاؤ اور دیکھو کہ تمہاری غیر حاضری میں دنیا کتنی بدل گئی تھی۔“ سیاوش نے کہا۔

بافندوں کی بستیاں دشت سوس کی ریت کو دھکیلنے کے لئے بڑے بڑے بند تعمیر کر کے اب اس کنارے کے ساتھ بس گئی تھیں جن کو نئے راعی اور نقیب اپنا اپنا مرکز بنائے ہوئے تھے۔ صحرا کو عبور کر کے پہاڑوں سے اتر کر اپنے ریوڑوں کو لے کر کچھ قبائل نے آس پاس مستقل رہائش اختیار کر لی تھی اور اپنے مویشیوں کے لئے سردی کے سخت دنوں میں چارہ تلاش کرتے تھے۔ نئی نسلوں کے گھوڑے اور بھیڑیں بکریاں اور دودھ دینے والے جانوروں کی منڈیاں لگتی تھیں اور فضا بدلی بدلی تھی۔ خزاں کے دنوں میں اب بھی جھکڑا اٹھتے

سرخ اور سیاہ ریگ چلتی اور اپنی جگہیں بدلتی مگر اس کی خوشبو اور انداز بدل گیا تھا۔ لہریوں میں وہ مسمومیت نہیں تھی جو جسم کو چھو کر جائے تو کھال کے ٹکڑے کر دیتی تھی۔ صحرا میں کھنڈروں کی شکست و ریخت کے ساتھ جو باریک سرخ غبار سا ہوتا تھا اب بھی تھا مگر وہ اب راہ کی رکاوٹوں کی وجہ سے سرائے تک پہنچ نہیں پاتا اور اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی ٹنٹناہٹیں خواب میں سنائی دینے والی آوازوں کی طرح دور سے آتی لگتی تھیں اور اس بدلے ہوئے ماحول میں حسن خوش تھا۔

حسین نے اسے بتایا کہ پل کے اس پار ریشم والوں کی بستی تھی اور اس کا بچپن وہاں گزرا تھا۔ تو اسے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ آب دژ کے پانیوں کی چمک اور شاہراہ کی خاموشی۔ پچھلے پہر قافلوں کی رواں گئی، حدی خوانوں کے پراسرار گیت۔ یہ سب باتیں جو حسکو نہایت حیران کیا کرتی تھیں اب اپنی اہمیت کھو بیٹھی تھیں۔ اس کے بیٹے کو آنے والے سودا گروں اور ریشم کے بدلتے بھاؤ اور کیڑوں سے زیادہ بڑے کوئے تیار کروانے کے طریقے پتا تھے۔ وہ اپنے دادا اور باپ سے بہتر دنیا دار تھا۔ وہ مچی کا پڑ پوتا اور سیاوش کے کہنے کے مطابق نہایت عمدہ اور مکمل دنیا دار تھا اس لئے اس سے زیادہ محبت کی جاتی تھی یا ہو سکتا ہے دنیا سے اس کے مطالبے ہی کم ہوں۔

حسین نے سیاوش سے کہا: ”دنیا سے میں نے کچھ چاہا تو نہیں تھا۔“

”برخوردار پسر عزیز! نہ چاہنا ایک اور نادانی تھی۔ ہر آدمی اپنے ماحول سے کچھ لیتا اور اس میں کچھ جمع کر کے لوٹتا تھا۔ اچھے معاشرے افراد کی وجہ سے ہی بہتر بنتے تھے۔ اگر تمہارا کوئی مطالبہ نہ ہو، تم کچھ لینا ہی نہ چاہو تو کیا واپس کرو گے۔ نظام حیات یوں درہم برہم نہ ہو جائے۔“ سیاوش کا سر برف کا ایک تودہ لگتا تھا۔ وہ پرانی داستانوں میں رہنے والا ایک دیوتا تھا، جس کو اس کی قوم بھول کر پیچھے چھوڑ گئی تھی۔

خدا سے اس کا رشتہ بھی بنا کچھ دیئے مطالبہ ہی تو تھا اور اس نے اس راہ میں بھی کوئی بڑی قربانی تو نہیں دی تھی۔ آج تک اس کو ہاؤ ہو جنگل میں اکیلے پن کی چیخ و پکار تھی۔ اس نے کسی سے بھی تو کوئی رشتہ استوار نہ کیا تھا۔ ساری محبتیں اپنے آپ سے محبتیں اور ساری چاہتیں خود کی چاہتیں تھیں۔

نہیں۔ اس نے یہ بھی کہاں کیا تھا۔

یہ کھویا ہوا وقت تھا جس میں نہ تو اس نے اپنی خدمت کی تھی نہ دنیا کی۔ عمر کا زیادہ حصہ گنوا کر وہ اب اپنے ساتھ حساب کتاب کر رہا تھا اور دور تک سوائے رخسار کے اور کچھ نہ تھا۔

سیاوش نے کہا:

برخوردار! تم جس دین کا اتباع کرتے ہو اس میں مجاہدوں کی فوج تھی۔ حوصلہ مند اور بے دریغ جانوں سے بے نیاز لوگوں نے ہی تو دنیا کا نقشہ بدل ڈالا تھا۔“

اس نے اپنی جان گھلائی تھی اور حاصل حیات کیا تھا۔

جس دین کے راہ پر اس نے چلنا چاہا تھا اس کے لئے اس نے کیا کیا تھا۔

منصور اور حسن نہایت مصروف ہو گئے تھے کیونکہ سوداگروں کے آنے کا زمانہ قریب تھا۔ حسن حمت اور خوش دلی میں بھی اپنے دادا سے بڑھ گیا تھا۔ خانہ باغ کے پھول مہمانوں کی تواضع آنے جانے والوں کی ضرورتوں کا خیال اور پھیلے ہوئے کاروبار کی نگرانی اس نے اپنے ذمے لے لی تھی۔ اس نے گھر پر رہ کر جو کچھ حاصل کر لیا تھا حسین نے مدرسوں، خانقاہوں، دربار اور فوجی مستقروں کے درمیان بھی نہیں سیکھا تھا۔ یہ سوجھ بوجھ جو اسے ملی تھی خون کی امانت تھی کیا وہ اسے بہتر تھا۔ ”یقیناً وہ نہایت حیرت اور مسرت سے بیٹے کو دیکھتا جو ہر کام اس سے بہتر طور پر کرتا تھا۔

آغاز زمستان میں حریر کے خریدار ہمسایہ مملکتوں سے آنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اور حسن مل کر تہ خانے کی صفائی میں لگے تھے اور پرانی یادداشتیں، نسخے، عبادت کی صد ہا چھوٹی موٹی ضروریات جھاڑ رہے تھے۔ جب حسن نے اسے پوچھا:

”کیا اس تہ خانے کو تھوڑی روشنی پہنچانے کے لئے باہر کی طرف سے ایک لمبا دریچہ نہ لگا دیا جائے تاکہ ہوا کا گزر بھی اس میں ہو سکے۔“

حسین بہت دیر سوچتا رہا۔ کس رخ سے اس میں روشنی داخل کی جائے اور ہوا کے لئے کیا اہتمام ہونا چاہئے۔ یہاں تک کہ حسن کی آواز سنائی دی۔

”یہ راکھ اور یہ چنگاریاں اور یہ سلگتی ہوئی لکڑی۔ اگر اس کی جگہ خالی ہو جائے تو اس آتش دان کو نہایت عمدہ سجاوٹ کے سامان سے آراستہ کیا جاسکتا تھا۔“

”یہ میرا ماضی ہے بچے اور بہت دور تمہارا بھی۔ ہمارے سفر کا یہ آغاز تھا۔ اس نشان کو رہنے دو۔ ورنہ ہم بھٹک جائیں گے۔ کبھی کبھار آغاز سے آدمی اپنے انجام کی طرف بہتر سفر کر سکتا ہے۔“ حسین کو اپنا دادا محمی یاد آ رہا تھا۔

ہنس کر حسن نے کہا۔

”تھوڑی سی راکھ ذرا سی چنگاری کو سنبھال کر رکھنا ہی اگر یاد ماضی ہے تو عجیب یاد تھی۔“

”ہاں بیٹے! کبھی کبھار آدمی کی سمجھ میں یہ بات آتی ہے اور کبھی نہیں آتی کہ آگے بڑھنے کے لئے ماضی کتنا ضروری ہوتا ہے۔“
حسین کی بات کو حسن نے چیزیں ادھر ادھر کرتے ہوئے توجہ سے نہیں سنا تھا۔

”اب آباء کی امانتوں کو سنبھال کر رکھتے رہنے سے تو سوائے کباڑ اور فالتو ٹوٹی پھوٹی اشیاء کے کسی اور کے لئے جگہ ہی نہ بنے۔“
حسن نے اسی ہنسی سے کہا۔ وہ بہت پر اعتماد اور تھوڑا سا خود سر تھا۔ اسے اپنی عقل پر ناز اور سارے کام اپنے طور پر نمٹانے کی صلاحیت سے بھی آگاہ تھا۔ پھر اس نے باپ کا ذکر ہی سنا تھا اور وہ اس کی زندگی میں زیادہ دخیل بھی نہیں رہا تھا۔ حسین کو اپنے قریب پا کر جہاں وہ خوش تھا وہاں کبھی کبھار جھنجھلا بھی جاتا تھا۔ منصور میں جو سمجھ بوجھ تھی اور برداشت کا صلہ دنیا داری اور بچوں کی بات سننے اور اسے سوچنے اور ماننے کی ہمت۔ دل کے اندر تک جھانکنے کی صلاحیت وہ حسین میں کہاں تھی اور اکثر یوں ہوتا کہ دونوں الجھ پڑتے اور منصور کو محسوس ہوتا کہ اس کا پوتا اس کے بیٹے کو ایک نہایت عزیز اجنبی مہمان سمجھتا ہے جسے آخر رخصت ہو جانا تھا اور جس کو چندے برداشت کیا جاسکتا تھا۔

زمستانی برف بار ہوا ہندی سوداگر کے لئے کچھ زیادہ ہی تھی۔ وہ چادر کو اپنے سر کے گرد لپیٹے ہوئے حسین اور اس کے بیٹے کو غلاموں کے ساتھ دیوار بناتے دیکھ رہا تھا۔ سردی میں ان کے ہاتھ سرخ ہو رہے تھے اور چہروں پر خون کی روانی تیز ہوئی جاتی تھی اور ہونٹ نیلے تھے۔ کلاہ نہ ہونے کی وجہ سے سر کے بال اڑے اڑے تھے۔

”تم لوگ کیوں اتنی محنت مشقت کرتے ہو؟“ اس نے حسین سے پوچھا۔

”یہ تو عین راحت ہے۔“ حسن نے کہا۔ ”اتنے زمانوں کے بعد میرے پدر بزرگوار زندگی کے کاموں میں حصہ لے رہے ہیں۔ گو مجھے معلوم ہے وہ اس زندگی کے عادی نہیں ہیں۔ صرف نہایت مضبوط سری اس زمستان میں کندھوں پر ٹکا رہ سکتا ہے۔“ حسین نے محبت اور تعجب کے ملے جلے جذبات سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”سر کو ہوا سے بچانے کے لئے ایسی نرم اور گرم نہایت ہلکی ردائیں ہیں۔ تمہیں معلوم ہے ہمارے پہاڑوں میں نہایت بلندی پر ایک پرندہ ہوتا ہے شاہ طوس۔ اس کے سینے کے پروں کے اندر ردائیں ہوتے ہیں جو بے وزن اور بہت گرم ہوتے ہیں۔ اس کیاب طائر کو کسی طرح مقید کر کے اس کے سینے کے پروں کو نوچا جاتا ہے اور جوان لڑکیاں سرد موسم کی طویل راتوں میں ان ریشوں کو سوت بناتی ہیں۔“

”خوب۔ بہت خوب!“ حسن نے کہا۔ ”نہایت حسین خواب بھی تو اس تانے بانے میں بنے جاتے ہوں گے۔“
ہندی نے کہا۔

”آدمی نے اپنے آرام کے لئے دلچسپ اور عجیب چیزوں کا سراغ لگایا ہے۔ خدا نے دنیا بنائی تھی اور انسان اس کے ممکنات کو اپنے لئے بقدر توفیق فتح کرتا ہے۔ جو یار ہنا غور کرنا نئے تجربات میں منہمک ہونا۔ راستوں کی تلاش، پہاڑوں کی دشوار گزار بلندیوں اور عمیق ترین گھاٹیوں میں اترنا، پانی کے اندر کی مخلوق کو زیر کرنا، ہواؤں کی حرکتوں، آسمانوں کی پہنائیوں اور روشنیوں اور اندھیروں، سایوں، ستاروں اور ان کی ناقابلِ تسخیر دنیاؤں کو اور پراسرار کائنات کے اندر دور تک دسترس رکھنا جس میں وہ محض ایک نکتہ ہے۔ نکتہ پر کارِ عشق۔“

حسین کا مٹی پھیلاتا ہوا ہوا ہاتھ گویا معلق ہو کر رہ گیا تھا۔ گھبرا کر ہندی نے کہا۔

”تم کبھی ہندوستان آؤ نا۔ وہاں ایسی برف بار ہو تو چلتی مگر سردی میں تال اور تلیا، جو ہڑ اور کنڈ سب کی ح پر ایک بار یک تہ برف کی جم جاتی ہے اور گھاس کے تنکوں پر شبِ نیم ٹھہری رہتی ہے اور سورج ان قطروں کو سات رنگوں میں رنگ دیتا ہے۔ سارے میں قوس و قزح پھیلی رہتی ہے۔ پھر دم کے دم میں یہ رنگ ہوا میں گھل جاتے ہیں۔“
وہ دم لینے رکا تو بادل کی گرج سنائی دی جیسے تو پیں داغی جا رہی ہوں۔ صحن میں گدھوں اور گھوڑوں نے اپنے پچھلے پاؤں زور زور سے زمین پر پٹختے۔ اونٹ بلبلائے۔

”اگر ہمارے ہاں کی برساتیں ان پر گزریں تو خدا جانے یہ کیا حشر کریں۔“ ہندی نے درپے کو بند کرتے ہوئے کہا۔

حسین اندر آ کر نشست پر ٹک گیا۔ غلام جانوروں کو پناہ گاہوں اور محفوظ جگہ میں لئے جاتے تھے۔ اولے پڑنے لگے تھے اور چھتوں پر پردوں میں لپٹا ہوتا شور ہو رہا تھا۔ جیسے گیندیں لڑھکائی جا رہی ہوں۔
”آپ کہاں برسات کا کیا مزاج ہوتا ہے؟“ حسین نے پوچھا۔

”گھٹائیں امنڈ کر آتی ہیں۔ باغوں پر دریاؤں پر بستیاں پر جھکتی ہیں اور گھروں میں اندر گھسا چلا آتا ہے۔ انہیں ڈھانپ لیتا ہے۔ سیاہی کا طوفان سب طرف پھیل جاتا ہے۔ ہوا اپنے پراسرار راگ گاتی ہوئی چلتی ہے۔ شاندار زمان بھری اس کے دامنوں میں جنگلوں کے پوشیدہ نغمے اور میدانوں پہاڑوں وادیوں کے گیت ملے ہوتے ہیں۔ اس کے باجے کی دھنیں سمجھ میں آنے والی اور نہایت گہری ہوتی ہیں۔ اس لمحے آدمی کی حیثیت ایک گھاس کی پتی سے بھی کم ہوتی ہے۔ کیونکہ گھاؤں اور چوٹیوں کے اندھیرے

اور روشنیاں، سرگوشیاں اور شور شیشیں، نرمی اور تیزی سب جمع ہو جاتے ہیں اور دل اتنے بڑے سا پر گائے سر اور لے سے مکمل نغمے کو اس کے آہنگ کو اپنے خون میں محسوس کرتا ہے۔ طوفان کا سارا آہنگ۔“ ہندی نے بات ختم کی۔

”سارے طوفان اپنی اصل میں ایک ہوتے ہیں۔“ حسین نے اپنے میلے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر سوچا۔ وہ باہر جا کر انہیں صاف تو کر رہی لے۔

”طوفان دنیا کو حسین اور رہنے کے قابل بناتے ہیں۔ یہ شعلوں اور صرصوروں کی کشمکش سے پیدا ہوتے ہیں۔“ ہندی نے گویا انکشاف کیا۔ اس نے درپچہ کھول کر پھر باہر جھانکا۔ باہر مسلسل سفیدی بڑھ رہی تھی۔ صحن میں درختوں کے تلے پتے کے ڈھیروں پر شاخیں گر رہی تھیں۔ چٹخ رہی تھیں۔

”طوفان تو گھاس کی پتی کے دل میں بلند و بالا کو ہزاروں کے شوق بے پناہ سے پیدا ہوتا ہے۔“ حسین نے ہولے سے کہا۔

ہندی نے مڑ کر اسے گہری نظر سے دیکھا۔

”خوب، بہت خوب اور ناقابل یقین۔“

حسین مسکراتا رہا۔

اذانوں کی آوازوں سے بستی گونجتی رہی۔

”یہ گھاس کی پتی کی آرزو ہے کیا۔“ ہندی نے ہنس کر کہا۔

”پیشک“ حسین بھی درپچے میں آکھڑا ہوا۔

”جب کوئی صدا بارگاہوں کو پار کر کے پردوں کو چاک کر کے عرش الہی کو چھو کر باریاب ہوتی ہے تو یونہی ہوتا ہے۔ ہوا کرتا ہے اور جس کی صدا انہیں سنی جاتی وہ ایسا ہوتا ہے۔“ اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ ”تھکا ہوا بھٹکا ہوا راندہ درگاہ، محض اور صرف دیوانہ راستوں کا ٹٹنے کی جگہ پر ٹھہرا ہوا۔ ہر زاویہ نگاہ سے بھلایا ہوا۔“

”ایسی ناامیدی کی باتیں کیوں کرتے ہو جب در بجایا جائے تو وا کیا جاتا ہے۔“ ہندی کی آواز بہت نرم اور درد سے آتی ہوئی لگتی تھی۔ افسوس سے بھری۔

”جواب ہی کافی نہیں۔ در وا کیوں نہیں ہوتے۔“ حسین نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

”پکارنے کی لے تیز کرو۔ نوا میں اپنے آپ کو لگا دو۔ کھلا دو۔“ ہندی نے کہا۔ ”ہم تو مٹی اور مہتر کے بتوں کو پکار لیتے ہیں اپنے

ہاتھ سے اپنے خدا بنا کر اپنے رب تکمیل دے کر نہیں سنوار کر ان کو اس تخت پر بٹھا کر۔“

حسین اب شاید سن بھی نہیں رہا تھا۔ درتپے کے اندر اولوں کی کھٹکھٹاہٹ جاری تھی ملی جلی خوشبو میں سب طرف سے احاطہ کئے تھیں۔

”حسین! مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کیا تم سمجھا سکو گے؟“ ہندی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”کہئے؟“ اس نے بدستور باہر دیکھتے ہوئے کہا۔

”جمنا ہمارے یہاں پاک کرنیوالی ایک ندی ہے۔ سورک یعنی جنت کی ندی، بھگوان کرشن کے جسم کی روشنی لے لھوے اس کے کنارے دنیا کو چھوڑ کر بڑے آدمی بیٹھ جاتے ہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ خدا یا پر آتما جو بھی تم سمجھ لو۔ گیان یا فہم جو بھی تم اسے پکارو انہیں وہاں ملتا ہے۔ وہ بارش اور دھوپ۔ رات اور دن سردی اور گرمی کی پروا کئے بنا وہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ جنگل اور آبادیاں ان کے لئے برابر ہیں۔ ان کی عبادتوں میں بڑے بھیدے ہوتے ہیں اور پھر بھگوان اپنی مہربانی کرتا ہے۔ ان کے من میں بستا ہے۔ ان کی آنکھوں کو عام لوگوں سے زیادہ روشنی ملتی ہے۔ انہیں بیتا وقت آنے والا اور جو ہے سب پتا رہتا ہے۔“

”یہ سب تو ہو سکتا ہے۔ ہو جایا کرتا ہے مگر اس سے زیادہ اس سے الگ۔“ حسین نے بے صبری سے کہا۔

”بندرا بن میں میری ملاقات ایک مہاتما سے ہوئی تھی۔ اس سفر کے لئے ابھی میں اپنے آپ کو تیار کر رہا تھا۔ جب میں نے ان سے دعا کی درخواست کی تو انہوں نے پوچھا کہاں کہاں تک جاتے ہو؟“

میں نے فارس و بغداد کا نام لیا۔ تھوڑی دیر چپ رہ کر انہوں نے کہا: ”روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی ہے۔ سرزمین میں عرب کو دیکھا ہے؟“

میں نے حیرت سے کہا: ”وہ سارے مقامات میرے راستے میں نہیں ہیں اور پھر میں اس مذہب میں یقین نہیں رکھتا۔“

”وہ مذہب کوئی دوسرا نہیں ہے بیٹے۔ وہ سارے جہان کا مذہب ہے، کیونکہ رسول خدا رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔“ مہاتما تن کر بیٹھ گئے تھے۔ ”یہ ان کے نام کی برکت ہے کہ میں یہاں جمنا کے کنارے بیٹھا ہوں۔ یہ انہی کا فیض ہے۔ یہ کائنات ان کے لئے بنائی گئی تھی۔“

”مجھے لگا تھا میرا سانس رک جائے گا۔ میرے فہم و خیال سے یہ بہت زیادہ تھا۔“ ہندی کا سانس تیز تیز چل رہا تھا۔

پھر حسین کو اپنا دل یوں دھڑکتا لگا جیسے پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل جائے گا۔

”مہاتما نے اپنے ہاتھ کو سامنے کی طرف پھیلا یا۔“ میرے حال پر جو کرم ہے جو نظر ہے وہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا اس لئے کہ میں تو روزانہ کی زیارت کرتا ہوں۔ وہ تو دنیا کے لئے خدا کی محبت اور شوق کا اظہار ہیں۔

حسین کو لگا اس کی جان لرز ہے سے زرد ہو رہی تھی۔ پتی کی آرزو اور اس کے خواب شدید تر اس کے اشواق ناقابل حصول اپنی نارسائی پر اس کا نالہ آتش سوزاں شعلے کی کپکپاہٹ اس کی لپک ہے۔ حسین نے سر زمین پر دے مارا۔ یہ جان کب تک اس کے راہ کو روکے گی۔ خشک اور زرد گھاس کی پتی طوفان کے دوش پر سوار ہونا چاہتی تھی۔ وہ اس بڑے نغے کا حصہ بننا چاہتی تھی جو اسے معدوم کر دے۔ جو طوفان بن جائے۔ جو شعلہ بن جائے۔ جو اظہار شوق میں ساری دنیا کا احاطہ کر سکے۔ اس کے عشق کی شدت اسے اس سے ہمکنار کر دے۔

پھر حسن اور منصور اور غلام بھاگے ہوئے آئے۔

ہاں بہت دنوں باہوش و خرد نہیں رہا جاسکتا۔ تھوڑی سرمستی ضروری ہے تاکہ آسمان کی پہنائیوں، وسعتوں اور خلاؤں میں پرواز کیا جاسکے۔ خروش جان نغمہ سردی کا حصہ بن جائے۔ برق فنا کا نظارہ اس میں معدوم ہو کر ہی کیا جاسکے گا تاکہ برق فنا بنا جاسکے۔

”اے ساربان آہستہ چل کہ میری پسلیوں میں آگ ہے“

قافلہ میں وہ دیوانہ بھی تھا جسے لوگ ابن منصور کہہ کر پکارتے تھے اور جس سے دور رہتے تھے وہ خاموش رہتا اور ایک ہی طرف ٹھٹکی باندھ کر دیکھتا تھا۔ پھر کبھی کبھار گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ جا یا ہاں تک کہ کوچ کا وق آ جاتا۔ منصور اسے حجاج کے قافلے کے ساتھ ارض حرکی طرف لئے جاتا تھا۔ اس کی جان کی بے تابی اور شورش جو ہندی سے باتیں کرنے کے بعد سے شروع ہوئی تھی کسی طور کم نہیں ہوتی تھی۔ وہ دیواروں سے اپنا سر مارتا اور اپنے خون کو دیکھ کر خوش ہوتا۔ اس کی بڑھی ہوئی دائرہ اور بے ترشے بال خشک ہوا کے جھوکوں کے ساتھ اس کے چہرے کے اطراف پہرہ دیتے ہوئے لگتے۔ کبھی جوش گریہ سے اس کا چہرہ آنسوؤں سے دھل جاتا۔

”خدا یا!“ منصور دعا کرتا۔ ”میں تیرے حضور حاضر کرنے کے لئے اسے لئے آتا ہوں مگر تھوڑا ہوش تو دے۔“

خروش کرتی اس کی نگاہیں، ٹھٹکی ہوئی آنکھیں۔

ہو کیوں نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مہاتما کی طرح اپنے اپنے ہاتھ پھیلا کر کیوں نہیں کہہ سکتا۔ ”ہم تو انہیں روز ہی دیکھتے ہیں۔“

مہاتما نے دروغ بیانی سے کام لیا تھا۔

مگر وہ جو رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے۔ ٹھیک ہی تو تھا وہ دونوں جہانوں کے لئے ریت تھے۔ بھلا کوئی تخصیص کیونکر

ہو سکتی تھی۔

اونٹ پر چونکہ وہ سیدھا نہیں بیٹھ سکتا تھا اس لئے اسے ہودے میں بھی باندھ کو بٹھایا جاتا۔ اسے کھانے پینے تک کا ہوش نہ تھا۔ کبھی وہ اپنے سر کے بال نوچتا اور سینہ کو بی کرتا۔ اس کی جان ناتواں طوفانوں کی زد پر گھاس کے تنکے کی طرح جانے کہاں محو پرواز تھی۔ جب اس کے ہاتھ کھول دیئے جاتے تو وہ آنکھ بچا کر ریت اپنے منہ اور آنکھوں میں بھر لیتا۔ اپنے بالوں میں ریت ڈالتا۔ منصور کی حالت دیدنی تھی۔ اس کو دعا کے لئے لفظ نہ ملتے تھے۔ وہ ہاتھ پھیلائے بیٹھا رہتا اور آسمان کی طرف دیکھتا۔ زمانے نے اس کے سر پر کیا خاک ڈالی تھی۔ وہ حسین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر چپ چاپ خلا میں تکتا کیونکہ اس سے بات کرنے جواب پانے اور ہوش میں لانے کی سب کوششیں بیکار تھیں۔ شورش ہاؤ ہو بھی نہیں۔ سانس رو کے حسین اور بارگاہ الہی میں بے لفظوں کی دعا کرتا منصور کرب سے اس کا اڑا ہوا چہرہ ڈوبتا ہوا دل۔ زندگی سے اس نے جو پایا تھا اسے کھونہ دینے کا خوف پتا نہیں وہ کون سی منزل تھی جب آدمی کو نہ خوف ہوگا اور نہ ڈر۔

یا ہو سکتا ہے اب حسین اس منزل پر ہو! قلب و نظر ہوش و خرد سب سے آگے نکلا ہوا۔

اور عقائد رواں تھا۔ جاری پانیوں اور لبریز خیروں اور چاندنی رات میں زرد دکھائی دینے والے حوضوں پر سے گزرتا ہوا۔ جب یہ بستی دم لینے کو رکتی تو کوئی گانے والا اپنا طنبور نکالتا اور موت کی مدح میں اشعار لگاتا۔ موت کے لئے اولاد پیدا کرو

اور ویرانہ پینے کے لئے عمارتیں تعمیر کرتے رہو

اور یاد رکھو تم سب فنا سے ہمکنار ہونے والے ہو

اے موت! تجھ سے کوئی مضمر نہیں۔ تو آ کر رہتی ہے

تو میرے بڑھاپے پر اسی طرح حملہ آور ہو رہی ہے

جس طرح بڑھاپا میری جوانی پر حملہ آور ہوا تھا

اولاد آدم منتظر ہے منتظر

تاکہ موت ک آنندھی اس پر چھا جائے!

منصور اب خوشی اور زندگی کے انتظار میں نہیں تھا۔ مایوسی کفر تھی۔ وہ کہاں جائے۔

”مسلم کے درخت کے صدقے نواح کاظمہ میں ریشمی ریت کے ذرات کے صدقے، باد صبا اور بوئے مشکبو کے صدقے، میرے حال زار پر رحم کر۔“

منصور کو جو دعائیں یاد تھیں وہ پڑھ کر بیٹے پر پھونکتا۔

وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور جا رہا تھا۔ حاضر ہونے اس در پر، ناصیہ فرسائی کرنے تستر میں حضرت شیخ کی انگلی کی سیدھ میں دیکھنے سے جو نظارہ اس نے کیا تھا وہ اس کے مقدر اور خوش بختی سے بڑھ کر تھا، اس کی دیرینہ آرزو پوری ہونے جا رہی تھی مگر کس طرح! اس ہمیشہ چاہا تھا وہ سر کے بل وہاں پہنچے۔

کاظمہ کی طرف سے ہوا چل رہی ہے

یاشب تار یک میں کوہ صنم سے بجلی چمک رہی ہے

یہ ہوا آتش شوق کو دہکا رہی ہے، بجلی کی مچک دل دیوانہ کو شفیقتہ بنا رہی ہے

قافلے والے ان سے دور ہی دور رہتے۔

وہ پیغمبروں کے لشکر کے پیشرو اور سردار کے حضور حاضری کے لئے تیار تھا۔ منارۃ القرون کے بیاباں میں عمود کی شکل کا ایک مینارہ تھا جس پر ہرن کے سینگ ہشت پہلی عمارت پر جا بجا لگے تھے اور دور سے یہ شیر کی پشت کی طرح نظر آتا تھا۔ چونے کا پختہ آصر اور اس کے دو برج تھے۔ فسانوں کی سی فاقھی۔ مسافر طرح طرح کی کہانیاں کہہ رہے تھے۔ منصور نے چا حاسین بھی حیران ہو مگر وہ اس طرح سے بے پروا خاموش اور زمین کی طرف دیکھتا رہا۔ پانی کے لبریز حوضوں کی طرف دیکھ کر اس کے بدن میں کپکپاہٹ سی ہوئی مگر پھر وہی ادا سی تھی۔

ژبالہ سے بھی وہ گزر گئے۔ بدویوں کے مکانوں میں انہوں نے آرام کیا۔

برکتہ المرقوم کے اونچے ٹیلے پر حوض سے نیچے جو بچے میں پانی گر رہا تھا۔ یہ راہیں جو پانی کی کثرت سے نہایت آباد تھیں زبیدہ بنت سفاح منصور پہلے عباس خلیفہ کی دختر نیک اختر ہارون کی بیوی کی بنوائی ہوئی تھیں۔ شفا خانے اور آبادیاں اور معمورے اور زاویے اس نے زر کشیر کے خرچ سے بنوائے تھے اور مسجدیں تاکہ حجاج کو اور سودا گروں کے قافلوں کو کسی زحمت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ پھر عباسی حکومت کمزور ہو گئی۔ راہیں پر خطر ہو گئیں مگر یہ نیکی کے کام اپنی ساری شفاعتوں سمیت قائم رہے۔ اب مفتی باللہ کے دور میں یہاں حسنی، حسینی، علوی، جعفری آباد تھے اور سقائی کر کے لوگوں کے کام کر کے اہل قافلہ کی خدمت سے اپنا روزگار حاصل

کرتے تھے۔ دنیا سوائے عبرت کے اور کچھ نہیں۔

ہاں۔ اے بھجد کی ہواؤں!

تمہارے سرور اور بکی نے مجھے شاد کام کیا۔

مقام یسیرہ سے پانی کنویں کھود کر نکالا گیا مگر پانی کھاری تھا۔ صرف لوگ دودھ اور گھی اور گوشت لائے تھے اور منصور نے بھی کچھ خریداری کی۔ دام و درہم کے بدلے نہیں صرف کپڑے کے بدلے۔ ریشم کے تھان لے کر وہ لوگ حیرت سے دیکھتے تھے اس لئے کہ اس نواح میں تو سادہ سوتی کپڑے بھی بہت محبت سے پہنا جاتا تھا۔

ان کی اگلی منزل دشت مجید کا وسط تھی۔

خوشگوار آب و ہوا۔ ٹھہری ہوئی دھلی ہوئی فضا، پاکیزہ موسم، صحت نفس اور قوت بدن کے لئے مفید۔ قافلے والوں نے سرشاری کی کیفیت محسوس کی۔ منصور نے سوچا شاید اس فضا کی برکت سے اس کے حسین کی جان بھی اپنے خروش میں کمی پائے اور دیوانگی سے باہر آئے۔۔۔ مقام قروری میں چونچے اور تالاب بارش کے پانی سے بھرے تھے۔ قافلے والوں نے نہانے دھونے سے اپنی جان میں امن محسوس کیا۔ پانی کے سوت پوشیدہ تھے اور خرچ کرنے کے باوجود اس میں کمی نہیں ہوتی تھی۔

وادی عروس میں لگا ہوا ایک کشادہ میدان تھا اور نگاہ اس کی دوسری حد کو پا نہ سکتی تھی۔ اس دشت کے آخر میں وہ مبارک بستی تھی جس کو آسمان سے زیادہ شرف ہے جہاں شرافت کی باگوں اور مہاروں کے مالک ازل کے بھیدوں سے واقف علم و حکمت کا سرچشمہ دونوں جہانوں کے جسم و جان کی روح اللہ کے دوست سرداروں کے سردار اللہ کے دلدار رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مقیم تھے۔

منصور نے حسین کو روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے لئے لے جانا چاہا اور اس کے بیٹے نے یوں چھپنا چاہا جیسے وہ ان سب کچھ دیکھتی اور جانتی لگا ہوں سے اپنے آپ کو پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ خرے کے باغوں میں خوب رونق تھی اور آسمان سورج کی تپش کو تھامے ہوئے تھا۔ حوا میں حدت تو تھی مگر دشت کی جسم کو جان کو جلا نیوالی لہروں سے یہاں امن تھا۔ فرحت بخش جھونکوں سے صبح دم قلب و روح کو راحت ملتی تھی اور حسین کو شرش جان اور ہیجان میں سکون آیا، مگر منصور کی نہایت عاجزی سے کہنے کے باوجود اس نے دشت سے بستی میں آ دم نہیں رکھا۔ قافلے والوں نے بھی اپنی سی کوشش کی اور پھر شام کی نیلا ہٹوں اور فضا میں نیچے اترنے امدھیرے اور افق پر دیر تک ٹھہری رہنے والی سرخی میں وہ سب آگے چلے گئے تھے۔

”یہاں سے آگے جانے کا اذن نہیں ہے کیا؟“ منصور نے حسین سے پوچھا۔ اس نے سر کو نفی میں ہلایا۔ آنکھیں جھکالیں۔ اپنے

بکھرے ہوئے خشک بالوں پر ہاتھ پھرا اور میل سے تقریباً نیلے ناخنوں کو اپنے جسم پر رگڑنے لگا۔

منصور نے اس کے ناخن ترا سے۔ بہت دنوں کی گرد سفر کو دھویا اور پھر وہ اسے دشت کے کنارے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ سفر جاری رہنا چاہئے۔ چلتے جانا ہی شرط زندگی ہے۔

دعاؤں سے معمور فضائیں امن کا شہر جس کی گلیوں میں خوشبوئے حرم نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ منصور اس آتش سوزاں سے اس تشنگی سے اس انتظار سے بالآخر زندگی کی سب سے بڑی تمنا کی تکمیل تک پہنچا مگر کس طرح!

اس نے سوچا تھا جب وہ ڈشہر میں داخل ہو تو پندیہ پر اس کی طرح اس کا وجود بکھر جائے۔ وہ نہ رہے۔ ہیبت و جلال والے اس مقام پر اس کی ہستی معدوم ہو جائے۔ وہ نہ رہے تو جی کا زیاں نہ رہے۔ ساقی کوثر کی سخاوت سے وہ نوازا جائے تو سوچیں اور پریشانیاں حیران کرنے والے یہ معاملے سب ہی خود بخود سلجھ جائیں۔ شہنشاہ کے دربار میں وہ حاضر ہو تو ہیبت سے وہ گھاس کی پتی کی طرح تیز ہوا میں کانپے۔

اس نے فوراً شوق سے اس سرزمین کو بوسہ دیا۔ اس کا جی چاہا ہر ذرے پر جبین نیاز کھکائے دربار شہنشاہ میں پہنچے تو سب کا سب سجدہ شوق ہو۔ اسے زندگی سے کوئی شکایت نہ تھی۔ اور اس کو بہت زیادہ کی طلب نہ تھی۔ وہ تو بس حاضر ہو گیا تھا اور قبولیت دعا کے عرض گزار تھا۔ اس کے لئے یہ سعادت بہت تھی کہ پیاسی جان کو ساقی کوثر کے حضور یار بانی کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ سیراب ہوا تھا۔ پہروں جان کو ساقی کوثر کے حضور باریابی کی اجازت مل گئی تھی۔ وہ سیراب ہوا تھا۔ پہروں وہ روضہ مبارک کی جالی کے سامنے دست سوال دراز کئے بیٹھا رہتا مگر مطمئن وہ کوئی بات نہ کہتا۔ الحاح و زاری نہیں کوئی خواہش نہیں۔ ایک لفظ نہیں دانائے بل ختم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ختم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب جانتے ہیں۔

اسے اپنے مقدر پر رشک آتا تھا۔ وہ ایک گبر آتش پرست، مظاہر قدرت کی پرستش کرنے والا، ایک بیک ان شعلوں کی مستعار روشنی سے نکل کر نور مبین سے سینچی گئی کھیتی بن گیا تھا۔ مزرع گلاب۔

نواح مجد سے نہایت مخدوش خبریں آرہی تھیں۔ قمر مطلی جو پہلے خلفا کے عہد میں خاموش تھے اب مکتفی کے عہد میں پھر لوٹ مار مچا رہے تھے۔ قافلے لٹ جاتے تھے اور مسافروں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ وہ حوضوں کو پھٹے پیٹ والے اونٹوں کی لاشوں سے پاٹ دیتے اور سوتوں جاری پانیوں جو بچوں کو بند کر دیتے تھے۔ حجاج کے قافلوں کا سامان ان کے لئے بہت بڑی کشش تھا، کیونکہ منزلوں کے لئے وہ سامان تجارت بھی ساتھ رکھتے تھے۔ پھر جن چھوٹی حکومتوں اور صوبوں کو خراج کی رقم مرکز کی طرف بھجوانا ہوتی تھی وہ بھی ایسے

قافلوں کو محفوظ سمجھ کر انکے ہمراہ کر دیتے تھے سوداگر اور عام لوگ بہت بڑے بڑے قافلے بنا کر چلتے اور مسلح ہو کر حفاظت اور احتیاطی تدابیر اختیار کر کے۔ مگر اکثر یوں ہوتا تھا کہ قزمطیوں کے آوارہ ٹولے جمع ہو کر ایک لشکر کی صورت میں ایسے بڑے قافلوں پر شب خون مارتے۔ ان میں معزول شدہ حاکم، مفرور ملزم، قزمطی اور ان کے ماننے والے شامل ہوتے۔

زکرویہ باغی کی خبر ملی کہ مکے کی طرف بڑھا چلا آتا تھا۔

حکام نے اس قافلے کو جس میں منصور جاربہا تھا حکم بھیجا تھا کہ وہ اپنے رئیسوں اور کاتبوں، سرداروں اور قاصدوں سمیت سیدھے راستے سے ہٹ کر فید یا مدینے کی طرف لوٹ جائے کہ لشکر خلافت پہنچ جائے تو پھر بڑھے، مگر قافلہ سالاروں نے جن کے ساتھ مبارک النبی تھا اور احمد بن نصر بھی تھا، احکامات کی کوئی پروا نہ کی اور بڑھتے رہے۔ یہاں تک کہ فاجروں سے ان کا آمنہ سامنا ہو گیا۔ سخت لڑائی ہوئی اور قریب تھا کہ اہل قافلہ فتح یاب ہو جائیں، مگر قافلے کے درمیانی حصے میں جہاں عورتیں اور بچے جمع تھے غفلت تھی اور قزمطیوں نے اپنے نیزے اونٹوں کی پسلیوں اور پیٹوں میں مارے۔ اونٹوں نے گھبرا کر اس موت کے سامنے حاجیوں کو کچل ڈالا، حملہ آوروں نے خوب تلوار چلائی اور سب کو قتل کر ڈالا۔ عورتوں کو جنہیں پسند کیا قتل کر دیا۔ مقتولین کو جمع کر کے ایک کو دوسرے پر رکھا اور بہت بڑا ٹیلہ تعمیر کر دیا۔ جنمردوں نے مزاحمت کی تھی اور ان کو شکست دینا چاہی تھی انہیں ایک قطار میں کھڑا کر کے انہوں نے پہلے دونوں ہاتھ اور پھر دونوں پاؤں کاٹے اور آڑ میں ان کی گردن مار دی۔ قاتلوں کی عورتیں اور بچے پانی لے کر مقتولین کے درمیان گھومتے تھے اور جو پانی مانگتا یا جس میں زندگی کی ذرا سی رمت بھی ہوتی اس پر مطلع ہو کر آتل کر دیتے۔

منصور اونٹوں اور ہودوں، عماریوں کو ایک ڈھیر میں تقریباً دبا ہوا تھا۔ نیزہ اس کا کاٹا ہوا آر پار ہو گیا تھا۔ مگر حیرت ہے وہ پھر بھی زندہ تھا۔ اس کی سانس چل رہی تھی اور وہ صحرا کی مشکبہ ہوا کو یوں محسوس کر رہا تھا گویا کسی لمبی سرنگ کے آخری بند سرے پر وہ ہوا اور ایک آدھ آوارہ جھونکے کی سانس اس تک پہنچے۔ ستاروں جزا آسمان اور اس کی نیلا ہٹ اس کی آنکھوں میں گھسی چلی آتی تھی۔

بال آخر وہ سکون سے روبرو تھا۔ اس لئے زندگی کی سب سے بڑی آرزو کے مطابق روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کر لی تھی۔ وہ حسین کے لئے مترد نہیں تھا کہ اسے بارگاہوں سے باہر جب تک اذن باریابی نہ ہو ٹھہرے رہنا تھا۔ حسین آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے در پر تھا۔ اسے اپنی قسمت پر نازاں ہونا چاہئے تھا کہ وہ اس بستی کے باہر تھا۔ حاضر تو تھا۔

ہوش و خرد کا معاملہ بالکل دوسرا معاملہ تھا۔

آگہی اور عشق۔

کیا کبھی آدمی آگاہ ہو پاتا ہے؟

یہ مکمل ترین خوبصورت ترین عشق تھا جو بالآخر اس تک پہنچا تھا۔ اسے ریشم بننے والوں کی بستی میں یک یک جولوہ فیض نصیب ہوا تھا ساری زندگی اس کی طویل سرگزشت تھی اور اب ان اوٹوں کے درمیان جیسے عرش نے اس کی آنکھوں میں جھانکنے کیلئے انہیں کھڑا کیا ہو پھر آسمان دھواں دھواں ہونے لگا۔ لمحہ فیض اس کے پاس ایک مغنی آتش نفس کی طرح آ کر کھڑا ہو گیا اور صدا دینے لگا اور چاروں طرف سے نغمہ ہائیں شیریں اس کی طرف بڑھنے لگے اور شمعیں روشن ہوئیں اور چراغوں کی لوتیز ہو گئی اور پروانہ لپک کر شعلے کے اندر درانہ گھس گیا۔ تاکہ اس کا راز معلوم کر لے اور بے کراں نیند اس کے اوپر سے دائیں بائیں سے گزرنے لگے۔ جیسے فرشتے بارگاہوں اور ایوانوں پر سے تیز تیز گزریں اور ان کے پروں کی ہوا کو منصور نے اپنے اندر اور باہر محسوس کیا۔

اور پھر وہ سو گیا!

صحرا پر سورج کی آخری شعاعیں خرمے کے باغوں میں سایوں کی طوالت اور بعد عطا کر رہی تھیں۔ ہوا ان کو جھلاتی اور پر ہیبت بناتی تھی۔ مٹی ہوئی سرخی میں اندھیرا مل رہا تھا اور خیموں سے دھواں آسمان کی طرف مائل پرواز، نیلا ہٹ میں گہرا اور شام کے واحد نجم مغرب کو زیادہ روشن کر رہا تھا جب..... حسین نے انا الحق کہا۔ بستی کے جوان اس کے پاس سے ہنستے ہوئے گزر گئے۔

ایک نے کہا: ”یہ سیدی! یہ ذرہ کیا کہتا ہے۔“ وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

دوسرے نے اس کے قریب آ کر اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی جو مچ مچاتی ہوئی اور غلیظ تھیں۔ پھر ایک دم دور ہٹ گیا اور زور زور سے قہقہے لگانے لگا:

”خدا اتنا کمزور اور نحیف و زار بھی ہو سکتا ہے۔ یہ اب پتا چلا ہے۔“

حسین کی خروش کرتی ہوئی آواز۔ ضرب لگا کر اس نے کہا: ”انا الحق۔“

بچوں نے اس کے گرد گھیرا بنالیا۔ گدڑی کو کھینچنے لگے اور انا الحق، انا الحق کا شور مچانے لگے۔

”انا الحق۔“ حسین نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

قہقہوں اور شور و غوغا کی صداؤں سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ایک نیا کھیل بچوں کے ہاتھ آیا ہے اور وہ اس کو پورے جوش اور ولولے اور ہمت سے سیکھ رہے ہیں۔

جو بہت شیریں تھے انہوں نے اس کی بڑھی ہوئی ڈاڑھی کو ذرا سا کھینچا:

”پھر کہو انا الحق۔“

وہ خاموش ہوتا تو اسے دیوانہ سمجھ کر وہ پھر اس کا مذاق اڑاتے۔ گہری شام میں جب صحرا کی طرف سے ہوا چلتی اور اس میں خشکی بڑھتی۔ ریت میں سے تمازت آفتاب کم ہوتی اور جھونکے شفق کی سرخ کواڑائے لاتے۔ ذرے چمک پکڑ کر ننھے ننھے آفتاب بن جاتے تو وہ جو ذرا جوان تھے اور صحرا میں گھومنے پھرنے کو آزاد تھے کچھ سمجھ رکھتے تھے اسے کہتے ”تم روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب حرم نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس یہ کیونکر کہہ سکتے ہو۔“

”انا الحق۔“ وہ سہمی سہمی سی ڈری ڈری بمشکل کھلتی آنکھیں جھکائے کہتا۔

مسجدوں میں اذانیں بلند ہوتیں جیسے وادیوں سے لہریا ریت تک پہنچنے کے لئے صرر رعنائیوں کے ساتھ اٹھے اور اپنی بے پناہی کا ثبوت دے۔

”یہ تمہاری تقدیس ہو رہی ہے۔“ اس کی گدڑی کو جھنکا دے کر وہ کہتے۔

”بیشک بیشک۔“ وہ سر کے اشارے سے کہتا ”یہ میں ہوں۔“

”جب ہم تمہیں چھو رہے ہیں تو خدا چھو رہے ہیں۔“ وہ نہایت بے صبری سے کہتے۔

”بیشک بیشک جو ہوا مجھے مس کتہ ہے تو اسے مس کرتی ہے۔“ وہ اپنے بالوں کو کھجاتے ہوئے کہتا۔

”واہ واہ۔ سبحان اللہ۔ سیدی مولائی۔ آپ خدا ہیں۔“ وہ چڑ جاتے اور انکا جی چاہتا اس کے ساتھ اٹھکیلیاں کریں۔ اسے کھینچ کر دائرے میں لا کر اس کے گرد بے پناہ شور اور رقص کریں۔

”بیشک بیشک۔ جس طرح شراب اور پانی مل جاتے ہیں اسی طرح سے میں اور وہ مل گئے ہیں۔“

اس کی پیشانی پر کوئی شکن نہ تھی۔ آواز صاف تھی اور گرجدار جیسے اس پر کسی عظیم طاقت کا غلبہ ہو۔

وہ تھوڑا سا ڈرے اور پیچھے ہٹے تو وہ ہنسا: ”انا الحق۔“

وہ خندق کے کنارے کھڑا تھا جسے دشمنان دین کے جہوم کے وقت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنوایا تھا۔ کبھی کبھار وہ جھک کر اس کی گہرائیوں میں دیکھتا تو وہاں مجمع کئے ہوئے لوگ سوچتے وہ اب اس میں کود جائے گا۔ جیسے کشف ہو۔ اس نے ان کے خیالات پڑھ لئے اور زور زور سے سر سے اوپر لے جا کر بازو پلانے لگا۔

”ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔ پوری زندگی تو میں خندق میں رہا ہوں۔ اس میں سے ڈوب کر نکلا ہوں۔ کھلی فضا میں سانس لے رہا

ہوں۔ ہر قید و بند سے آزاد ہوں۔ بھلا میں کیوں اس خندق میں کودوں گا۔“
لوگ حیرت زدہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس نے پھر کہا: ”انا الحق، انا الحق۔“ جیسے اسے ضد ہو اور نادیدہ طاقتوں کو یقین دلارہا ہو۔ اس کے آتش شوق سے پتے پتے ہوئے جسم بے پناہ روشنی سے بند ہوتی آنکھوں اور شدت احساس سے کانپتے ہاتھوں، راح محبت میں ادھر ادھر بھٹکتے قدموں کی لغزش دیکھ کر لوگوں نے کہا۔

”پتا نہیں اس کا انجام کیا ہو۔ اس کا سودائے خام اسے کہاں لے جائے۔

”انا الحق۔“ حسین نے خندق کے کنارے سے واپس آتے ہوئے کہا۔

”یہ کلمہ کفر ہے دیوانے۔“ کانپ کر ایک کتاب اللہ کے حافظ نے کہا۔

”یہ نور جو تمہارے سینے میں بجھ گیا اس کی روشنی میں بھی تم دیکھ نہیں سکتے کہ یہ کلمہ کفر نہیں ہے۔“ حسین نے کہا۔

بہت دیر غور کرنے اور ٹھہرے رہنے کے بعد حافظ قرآن نے اس بات کو محض اتفاق سمجھا اور اپنے راہ پر چلا گیا۔ بھیڑ ہولے ہولے اس کے گرد سے چھٹ گئی اور وہ چشمے کے پانیوں خندق اور آسمان کی نظر کے سامنے اکیلا رہ گیا۔

نہیں۔ یہ کفر ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت الہیہ ہے کہ!

تمہارے اور میرے درمیان سوائے اس کے کوئی فرق نہیں

کہ تم خدا ہو اور مالک الملک (ال الہیہ و روبیہ)

وہ تم جو میں ہوں

اور میں جو تم ہو

کوئی فرق نہیں تمہارے ہو اور میرے عین میں

سوائے ناسوت والا ہوت کے

اور یوں مدینہ منورہ کے باب الحدید کے سامنے اس نے نہایت عاجزی سے اس راز کو جو اس پر آشکار ہوا تھا اپنے لئے قبول کیا۔

وہ ذرہ اپنی دانست میں آرتاب ہی نہیں آفتابوں کا خالق بن گیا تھا۔

وہ میری شنا کرتا ہے اور میں اس کی شنا کرتا ہوں

وہ میری حمد کرتا ہے اور میں اس کی حمد کرتا ہوں

ایک حالت میں میں اس کو قبول کرتا ہوں

اور اعیان میں میں اس کا انکار کرتا ہوں

وہ مجھے جانتا ہے مگر میں اسے نہیں جانتا

میں اسے جانتا ہوں اور اسے دیکھتا ہوں

وہ مجھ سے کیسے دستبردار ہو سکتا ہے جب

میں اس کی مدد کرتا ہوں۔ اس کی حمایت کرتا ہوں

اپنے علم سے میں اس کی تخلیق کرتا ہوں

اور ہم روایت پر اطلاع پاتے ہیں

میں اس کی تخلیقی منتہا ہوں

وادی فاطمہ میں پتھروں کو تراشا جاتا تھا ان کو چھوٹی اور بڑی خشت سازی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور تیس فرسخ کا فاصلہ طے کرنے کے لئے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک جو اونٹ منتخب کئے جاتے تھے وہ نہایت خوبصورت ہوتے تھے اور بار برادری کے کسی اور کام میں انہیں نہیں لگایا جاتا تھا۔ اسے ساربانوں کو ان کی خدمت سپرد تھی جن کا حسب نسب اعلیٰ تھا جو حافظ قرآن تھے اور جو کاذب و فاجر نہیں ہوتے تھے۔ ان قبیلوں کے فرد معمار تھے جن کو شریف النفس ماؤں نے کبھی بے وضو و دھند نہیں پلایا تھا۔ جن کے اسلاف نے ناقابل فراموش خدمات انجام دی تھیں۔

ترکوں کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے جو انتہا محبت اور بے پناہ عقیدت تھی حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد ان کی اجتماعی زندگی میں اس اسم مبارک سے جو تبدیلی آئی تھی اس کا انہیں اعتراف تھا۔ یہ عجز و انکساری بھی اس کا حصہ تھی کہ وہ قبول کئے گئے تھے۔ خلافت کے نہایت منصب ان کے لئے مختص ہوتے تھے اور اس سرزمین پر اجنبی ہونے کے باوجود دربار میں سلطنت کے رکن رکیں اور بادشاہ گر تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ خاک کے ذروں کو حسن جاودانی بخشنے والا اور کوئی نہ تھا۔ وہ اپنی اصل کو بھولے نہیں تھے اور اس لئے خاص اجازت حاصل کر کے وہ مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعمیر از سر نو کر رہے تھے۔

مدینہ منورہ امن کی بستی تھی اور وہ اس تعمیر کے باوجود پر امن تھی۔ پتھروں کو دھویا پاک کیا جاتا تھا اور اگر کسی پتھر کو تراشنے کے

لئے کم و بیش کرنے کے لئے اٹھانا پڑتا تو اس کی تراش خراش وادی فاطمہ میں ہوتی تھی تاکہ نواح حرم نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں کوئی شور نہ ہو۔ معمار ہر ذرے پر دل باندھ رہے تھے۔

حسین اب وادی فاطمہ سے دور صحرا میں نکل گیا تھا۔ اس کو یہ جرات کہاں سے ملتی سوائے فیض الہی کے کہ وہ آستانہ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حاضری دیتا۔ وہ تو بس دروازوں سے باہر ٹھہرا رہے گا تا آنکہ اسے اذن باریابی ہو کوئی اشارہ کوئی حکم اس کے لئے ضروری تھا۔ بارگاہ رسالت ماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں درانہ گھسنے کا اس کا حوصلہ نہ تھا۔ لوگ چاہتے تھے کہ اسے باندھ کر ہی کیوں نہ ہو اس کے جنوں کی کمی کے لئے روضہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرب میں لے جائیں اور ان کنوؤں کے پانی سے اس کے سر کو پاک کریں تاکہ یہ شورش اس کی جان سے باہر آئے۔ وہ شفا پائے اور اپنا مقام عبودیت پہنچانے اور انا الحق کہنے سے باز رہے۔ یہ کلمہ جس کو ادا کرنے کی سرخوشی نے اس سے ہوش و خرد چھین لئے تھے وہ ہنستا چلا جاتا اور بھاگتا ہوا صحرا کی لہریاں ریت پر گر جاتا جو ہوا کے دامنوں نے اس پر بنائے تھے۔

جب اکیلا ہوتا تو خاموش رہتا، ہجوم خلق میں اسے اپنا آپ منوانے کے لئے ہستی کو نیستی سے نکالنے کے لئے لاہوت و ناسوت کا جھگڑا مٹانے کے لئے کچھ کہنا پڑتا تھا۔ وہ شمع تھا گویا جس سے وجود میں روشنی تھی وہ پروانہ تھا جو اس شمع کی گردنار ہوتا تھا۔ یہاں وہاں سب جگہ وہ تھا اور داخلی خارجی دنیا اس سے معمور تھی۔ وہ عقبی تھا۔ وہ قیامت تھا۔ وہ طوفان تھا جو ہستی پر نہایت شدت سے محیط تھا۔ وہ کنار پیر بھی تھا اور ڈوب بھی رہا تھا۔ کائنات اور تخلیق سب وہ تھا۔

انا الحق

اصل حیات و ممات

وادی فاطمہ کے پتھروں نے کہا: ”ہم حرم نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ تم بھاگ کر جہاں بھی جاؤ تمہیں امان یہیں ملے گی۔ ہم اس پاک اور عظمت دیئے گئے مکان کے جس کو نے میں بھی ہوں گے ہم پر امان ہوگی۔ تم امان نہیں چاہتے اور صرف انا الحق کہتے ہو۔ حق تو خود اس ذکر کو بلند کرتا ہے۔ رات اور دن کی گزری ہوئی اور آنے والی سب ساعتیں اور ریزہ ریزہ گزرتا اور گزرنے والا وقت اور تخلیق آدم سے سضع کی گئی ساری محبتیں اس ایک نام کے لئے ہیں۔ ساری پینائیاں اور سارے کان اسی ایک اسم کی تقدیس کو دیکھنے اور سننے کے لئے بنائے گئے ہیں۔

وہ کل مقرر بانالی اور اہل شہود پر مقدم نہیں وہ منزلت کے اعتبار سے مقدم ہیں اور تو انا ترین ہیں اور اس لئے بشر کامل ہیں۔

وادی فاطمہ میں سب طرف پتھر پتھروں سے محو گفتگو تھے اور اکیلا حسین اپنے آپ سے محو تکلم تھا۔

میں وہ ہوں جسے میں چاہتا ہوں اور جس کو میں چاہتا ہوں وہ میں ہی تو ہوں۔

ہم دور و حیں ایک جسم میں مقیم ہیں

جب تم مجھے دیکھتے ہو تو گویا اسے دیکھتے ہو

اور اگر تم اسے دیکھو تو ہم دونوں کو دیکھ لو گے

پھر ہوائیں اور مظاہر قدرت چاند ستاروں آسمان زمین فضاؤں میں سے آواز آنے لگی۔

خدا نے آدم کو اپنی صورت پر تخلیق کیا ہے؟

حسین نے مسکرا کر گرد و پیش دیکھا۔ اس کا دل ہر شے میں دھڑک رہا تھا۔ یہ اس کی آواز تھی کہ اطراف سے اسے احاطہ کئے تھی۔

ہاں خدا نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا تھا بیشک!

حمد و ثناء میں کھوئی ہوئی اپنے آپ سے آشنا بھی اور اپنے سے گم بھی۔ پر تو بھی اور اصل بھی۔ انا الحق۔

معماروں اور پتھر تراشنے والوں نے اس کو وادی فاطمہ سے دور بھگا دیا۔ بھلا یہ کلمہ کوئی کہنے والا تھا؟ انسان اور دعویٰ ربوبیت

الوہیت۔ یہ دیوانگی کا مذہب تھا اور اس پر جو کیفیت طاری تھی اس سے باہر آنے کا اسے کوئی شوق نہ تھا۔ نہیں اسے کوئی راستہ دکھائی نہ

دیتا تھا۔ یہ وادی پر خار تھی کہ جس طف سب راہیں آتی تو ہیں مگر یہاں سے آگے کوئی جا نہیں سکتا جانا نہیں کرتا۔ اس کے نیم روشن

راستوں سے اوپر آسمان دکھائی دیتا ہے اور انسان کا جی چاہتا ہے کہ وہ پر کھول کر فضا میں غوطہ لگائے اور ستاروں کو چھو لے۔ مگر پھر

ستارے نیچے اتر آتے ہیں اور قلب انسانی عرش معلیٰ بن جاتا ہے۔

رجب کا چاند دکھائی دیا تو سنگ تراشوں نے صحرا کی ریت کو ان پر سے بہنے دیا اور آندھیوں کی شرشوں میں وہ سنگ رخام کو یونہی

چھوڑ کر جانب حرم کعبہ روانہ ہونے لگے۔

اور حسین تو حرم نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پتھر بھی نہیں تھا جس پر سے وادی فاطمہ کی ریت اور گرد باد کے طوفان ہی اسے

ڈھانپ سکیں۔

بنو اسد کے چرواہوں نے ریوڑوں کی روئیدگی اور کانٹے دار بوٹیوں اور ریت میں سے سر نکال کر جھانکنے والے چھوٹے پودوں کی

طرف چھوڑ دیا اور ٹیلے پر بیٹھ کر سورج کی تپش کے باوجود کھیلنے لگے۔ وہ سب ننھے لڑکے تھے جو اونٹوں اور بھیڑوں کے رکھوالے تھے اور جانوروں کی رمزوں کو پہچانتے تھے اور موسموں کے مزاج شناس تھے۔ انہوں نے صحرا میں اس دیوانے کو دیکھا تھا جو انا الحق کہتا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا جو ان کے قریب آ کر کھڑا رہتا اور ہنس کر انا الحق کا نعرہ لگاتا۔ جو دھوپ سے کسی پناہ اور اوٹ میں نہیں جاتا تھا۔ جو ہوا کا حکم دیتا کہ چلے جو دھوپ اور روشنی کو روک دیتا مگر پھر ہنس کر غائب ہو جاتا۔

ایک بیک ان میں سے ایک نے کہا: ”میں وہ دیوانہ بنتا ہوں۔“

تالیاں بجا کر انہوں نے کہا: ”خوب بہت خوب۔ مگر تمہیں مکمل دیوانہ بننے کے لئے اسی طرح انا الحق بھی کہنا پڑے گا۔“

”میں انا الحق کہوں تو تم مجھے خدا مان لو گے۔ پھر بہت مزہ آئے گا۔ میں تمہیں حکم دوں گا اور تمہیں ریت کے ٹیلوں پر ادھر ادھر

بھگاؤں گا۔ تم میرے بندے ہو گے تو تم میری نظر کر کے محتاج ہو گے۔ میں تم پر خوب سختیاں کروں گا اور تم کچھ کرنے پاؤ گے۔“

”تم سمجھتے ہو خدا صرف قہار ہے اور وہ محبت نہیں کرتا۔ اب دیکھو ہم اس سے بارش اور پانی کی دعا کرتے ہیں اور وہ سنتا ہے۔“

انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ دھر کر کہا۔

”مگر میں دوسری قسم کا خدا بنوں گا۔ میں صرف سزا دوں گا۔“ اس نے ہنس کر کہا۔ ”اگر تم کو یہ منظور ہو تو کھیل شروع کرتے ہیں۔“

”ٹھہرو اور سنو۔“ دوسرے ننھے لڑکے نے کہا۔ ”تم خدا نہیں ہو تم صرف بہانہ کرو گے۔ جھوٹ کہو گے کہ تم آدمی نہیں ہو۔ پھر ہم

سب اس جھوٹ کی سزا تم کو دیں گے اور جو فیصلہ کریں تم کو وہ ماننا پڑے گا۔“

انا الحق کہنے والے نے سر کھجا کر کہا: ”دیکھو کوئی سخت سزا نہ دینا۔ میرے خدا ہونے کا خیال رکھنا۔ جب ایک بار دیوانہ خدا بن گیا

تو اس میں دوسروں سے زیادہ طاقت ہوگی۔ ٹھیک ہے نا۔ تو اب میں دیوانہ ہوں..... انا الحق انا الحق۔“ اس نے ایک نعرہ مستانہ

لگایا اور ریت کے ٹیلے پر سے بازو پھیلا کر اتر جیسے کو پھر نہ پروں کو جھنکا کر فضا میں پرواز کرے۔ نیلگوں عرش اور دھواں دھواں بے

ستونوں کے آسمان تلے اڑان میں لگ جائے۔

وہ بھی اس کے پیچھے ٹیلے سے اترے اور بھاگ دوڑ شروع ہوئی۔ ذرا ذرا سی جھاڑیوں خشک درگھاس میں سے آواز سنائی دیتی۔

چھوٹا سا چمکتا ہوا چہرہ کسی شاخ کی اوٹ سے دکھائی پڑتا۔ پھر کسی ٹیلے کے عقب سے وہ کمزوری گرجدار بننے کی کوشش کرتی صدا انا الحق

سنائی دیتی۔ ہنستے ہوئے چرواہے ان کی عبا میں گرم ہوا سے بھری ہوئیں جیسے حلاج نے روئی کو دھن کر ان میں بھر دیا ہوا اور رُف رُف

بھی سنائی دے۔ وہ سب بازو پھیلائے ہوئے صحرا کی ان وسعتوں میں جو ان کے سامنے بیکراں سمندر کی طرح پھیلی تھیں اس ایک

”انا الحق“ کو ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ سب سیٹیاں بجا رہے تھے۔ بھیڑیوں اور سگان ہوشیار کی طرح بول رہے تھے اور دشتِ عجب کی لطیف ہوائیں انکی آنکھ پجولی میں شریک تھیں۔ ٹیلے اور ذراتِ خاک چھوٹی گھاس پراڑتے ہوئے سفید پروں والے پرندے اور خلا کی پنہائیوں میں ڈکیاں لگاتے ڈوبتے اور تیرتے نظر نہ آنے والے صد ہا جاندار انا الحق۔

جب بال آخر وہ پکڑا گیا اور چاروں طرف سے اس کے ساتھیوں نے اسے اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہ وحشی جانور کی طرح ہونکتا، تیز سانس لیتا اور پھرانی ہوئی سی آنکھوں سے اپنے گرد دیکھتا۔ جب وہ اسے چھوتے تو نہایت زخمی اور اداس نگاہ سے ان کی طرف متوجہ ہوتا مگر اپنے آپ کو چھڑانے کی کوئی سعی نہ کرتا۔ شاید اونچے نیچے ٹیلوں کی بلندیوں اور دامنوں میں بھاگ بھاگ کر اس کا جی بھر گیا تھا اور اس کی دیوانگی کا یہی تقاضا تھا کہ اب وہ پکڑا جائے اور اپنے دوستوں کی عدالت میں ایک گنہگار کی طارح حاضر کیا جائے آخر انا الحق کہنے والے کو سزا تو ملنا ہی چاہئے۔

سب سے چھوٹے چرواہے نے جب انصاف کی جگہ سنبھالی تو ہوا بھاری اور نرم آلودی ہو گئی تھی۔ اور فضا میں جھونکوں کے آگے قلعے دشتِ عجب کے پرندے نقیبوں کی طرح اڑ رہے تھے۔ اس کے دوش پر سوار بھی اور اس سے بے پروا بھی۔ پیش کرنے والے نے کہا:

”یا شیخ! یہ دیوانہ کہتا ہے کہ ”وہ خدا ہے“ وہ اسے آگے دھکیل رہا تھا اور ڈھیلے سر بند کے نیچے سے اس کی زلفیں بکھری جا رہی تھیں۔

سننے والے نے تھوڑی دیر تو قف کیا اور پھر کہا:

”کیا یہ سچ میں دیوانہ ہے یا محض شہرت کے لئے اس نے اپنے کو دیوانہ بنایا ہے۔“

دیوانے نے آنکھیں گھمائیں اور پتلیوں کو یوں پھرایا کہ باقی ساتھیوں کو شک ہوا ہو سکتا ہے وہ اصل میں دیوانہ ہو۔

”یا سیدی! یہ اصل دیوانہ نہیں ہے۔ اپنے کو خدا کہتا ہے اور ہم اسے دیوانہ کہتے ہیں۔“

”جواب دو۔“ منصف نے ذرا گرجدار آواز میں کہا۔

”ہر چیز کو خدا نے بنایا ہے۔“

”پیشک۔“

”مجھے بھی خدا نے بنایا ہے۔“

”بیشک۔“

”اس کا نور اور جلوہ ہر شے میں ہے۔ وہ زمینوں آسمانوں کا مالک ہے۔“

”بیشک۔“

”وہ بندوں کے اندر رہتا ہے۔“

”بیشک۔“

”میرے اس حصے نے انا الحق کہا ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ آدمی اس لئے حق ہے کہ وہ حق ہے۔“

”لغو۔ جھوٹ۔ دیوانگی۔“ پاس کھڑے دوستوں نے تالی بجا کر کہا: ”آدمی کو بنایا گیا ہے اللہ کی مخلوق۔“

”تم سب چپ رہو۔“ چھوٹے لڈرے نے کہا۔ ”ہمیں سوچنے دو۔“

”ضرور۔ ضرور! مگر اس دیوانے کو سزا دوتا کہ ہمارا جی خوش ہو۔ ہم اس رست خیز سے تھک گئے ہیں۔“

”بات تو یہ بھی صحیح ہے کہ ہر آدمی کے اندر خود موجود ہے اور آدمی اگر بندہ ہو کر یہ بھی کہہ دے کہ.....“ وہ رک گیا۔ ”میرے

فہم میں یہ اسرار الجھ گیا ہے۔ بندہ تو اس نے بنایا ہے جیسے ہم مٹی کا کھلونا بناتے ہیں اور کھلونا ہم تو نہیں ہو جاتا۔ گیند یہ کیسے کہہ سکتی ہے کہ

وہ بھی بنانے والے کے کام میں شریک ہے۔ آدمی سچ ضرور ہے حق مگر حق بن نہیں سکتا۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔“

باقی بچے آپس میں باتیں کر رہے تھے اور دیوانہ ہنس ہنس کر دوہرا ہوا جاتا تھا۔ وہ انہیں بتا رہا تھا کہ ٹیلوں پر سے اترتے اور

پرواز کرتے ہوئے اسے کتنا مزہ آیا۔ لگتا تھا پاؤں میں پر لگ گئے ہیں۔ وہ ایک شاخ سے دوسری شاخ پر اڑکی بیٹھنے والا پرندہ ہے۔

وہ پھر قریب کے ٹیلوں کی طرف بھاگا اور اس نے زور سے انا الحق کہا۔ اپنے پیچھے آنے والوں کو گویا لکارا۔ بھاگا اور چھپ گیا۔ پھر

اس نے انگلیاں منہ میں رکھ کر سیٹی بجائی جو سکاریاں بھرتی ہوئی ہوا کے دوش پر سوار ہو کر دور دور فضاؤں میں گونجی۔ سیاہ بادل جھکے

چلے آتے تھے جیسے اصحاب قیل نے حملہ کر دیا ہو۔ سپاہ سیاہ پوش، کڑک اور بجلی اور آفاق کو گھریے ہوئے گھٹائیں اور پانی کے بوجھ

سے جھکے ہوئے تہ در تہ ابر پارے جو گھٹتے ہوئے پہلوانوں کی طرح ایک دوسرے کو روندتے، رگیدتے ہوئے خلا میں جھکتے، اٹھتے اور

پچھاڑے جا رہے تھے۔ بچے پناہیں ڈھونڈنے لگے کیونکہ اونٹوں نے بلبلا نا شروع کر دیا تھا۔ بھیڑ میار ہی تھیں۔

”سنو۔ واپس آؤ۔“ مصنف چرواہے نے کہا۔ ”اگر دیوانہ انا الحق کہتا ہے تو کوئی بات نہیں اس کی مجبوری ہے اس کا ذہن حدت

پکڑ گیا ہے۔“

”یہ بنا ہوا دیوانہ ہے۔ سب سمجھتا ہے۔“ ایک اور ساتھی نے اسے یاد دلایا۔
 ”جب کوئی آدمی بن کر کوئی بات کہے تو اسے سچ ہی سمجھ لینا چاہئے۔ اگر وہ نقصان نہیں کرتا تو اسے رہنے دو۔“
 پھر جیسے کوئی مشکیزہ الٹ دے۔ ایک دم بادل امنڈ کر آیا اور ایک لمحہ میں جل تھل ہو گیا۔
 ”اسے رہنے دو۔ اسے چھوڑ دو۔ انا الحق کہنا کوئی جرم نہیں۔ اس کی کوئی سزا نہیں۔“
 سب بھاگ گئے۔

دیوانے نے کہا: ”کیا مزہ آیا۔ کچھ بھی نہیں۔“

”کیوں یہ کھیل تمہیں پسند نہیں تھا؟“ ننھے مصنف نے پوچھا۔

بھگے ہوئے کپڑوں کو جھاڑتے ہوئے اس نے جواب دیا: ”دیوانہ ہونے میں بہت مزہ ہے مگر لوگ بس اسے بیکار سمجھ لیتے ہیں اور اسے سزا بھی نہیں دیتے۔ سزا پانے میں ہی تو سب کچھ ہے۔ دھکیلے جانے اور تعاقب کئے جانے میں تو سب جان ہے۔ ورنہ لوگ دیوانہ کیوں ہوں۔“

”تم کیا دار پر لٹکنا پسند کرو گے۔ تمہاری تسلی اس طرح ہوتی۔ عجیب خواہش ہے تمہاری۔“

دشتِ مجید پر بجلیاں کڑکیں، بلند یوں اور پستیوں پر سے پانی بہا اور دیوانے نے دور کسی ٹیلے پر بیٹھے اپنے بدن میں کسماہٹ محسوس کی۔ گویا طوفان اس کے خون کے اندر تھا اور وہ گزر گاہ تھا۔ نہیں وہ طوفانوں کا بنانے والا تھا۔ شعلہ بھی اور شمع بھی۔ پروانہ بھی اور دو چراغ بھی۔ خلاؤں میں بھی وہی تھا اور ہواؤں میں بھی۔ اس کی کوئی سمت نہ تھی اور سب سمتوں میں وہ تھا۔ وہی حرمِ بنوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حرمِ کعبہ تک۔ عرشِ معلیٰ سے لے کر زمین کی گہرائیوں پانی کی اتھاہ میں ہوا اور فضا میں اُفس و آفاق میں زمان و مکاں میں۔ فاصلے مٹ گئے تھے۔ وہ یعنی حسین بن منصور حلاج سب طرف تھا۔ انا الحق۔ انا الحق۔

حسین سفرِ ہندوستان پر نکلا تو اس کے بیٹے حسن نے کھوئے ہوئے دادا اور گمشدہ باپ پر صبر کر لیا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو علمِ دین کے ساتھ علمِ دنیا بھی سکھاتا تھا۔ وہ ریشم کے سوداگر ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ مسلمان تھے جو خازنِ حیات میں اترتے ڈرتے نہ تھے جنہیں چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں مضبوط قدم جمانے کے لئے تیار کیا جا رہا تھا جو سیاست دنیا کو بہتر سمجھ بوجھ سے نبھانے کے قابل تھے اور جن کو اپنی عقلوں پر بھانا تھا۔ ان کی آرزوئیں حبِ جاہ کے لئے شدید نہ تھیں اور ان کے امیدیں زندگی سے قلیل ہونے کے ساتھ ساتھ جلیل تھیں۔ جب وہ چین اور ہندوستان اور ترکستان کی سیاحت سے واپس بیضا پہنچا ہے تو سرائے میں اجنبی لوگوں کی بھیڑ تھی۔ اس

کے باوجود کہ سوداگروں کا موسم گزر چکا تھا اور عید نوروز کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سارا ملک پھولوں سے منگبو ہو رہا تھا۔ درختوں کی سبزی میں ایک عجیب شان دلربائی تھی۔ پانیوں کی چمک بڑھی ہوئی اور روانی تیز تھی اور آب و ہوا کے ساتھ دشت سوس میں قافلوں کی روانگی کے طبل بجائے جا رہے تھے۔ نقاروں پر چوٹیں پڑ رہی تھیں۔ آبادی کتنی بڑھ گئی تھی۔ رونق زیادہ ہو گئی تھی۔ اس گہما گہمی میں سکون کہاں تھا؟

حسین نے دیکھا کہ اس کے پوتے رنگین ریشمی عبا میں پہنے اور ان کے انداز گفتگو میں ایک نرمی ملائمت کے ساتھ انداز تھا۔ جس میں مردانگی کم تھی۔ وہ چھوٹی حکمتوں کے فرستادہ سوداگروں کو چینی دیا اور حریر و ریشم ایک بے نیازی سے دے رہے تھے۔ اور نئے حاکموں کو ذرا سی خستوں پر بھی بحث کرتے جاتے تھے۔ ان میں سے جو بڑا تھا وہ لا پرواہ اور شہزادگی کے اطوار رکھتا تھا اور چھوٹا نہایت چالاک و بین و فطین اور فوراً بات کی تہ تک پہنچنے والا تھا۔ وہ سیاست کی رمزیں سمجھتا تھا۔

جب بھیڑ کم ہوئی تو حسن کے پسر مہتر نے پوچھا:

”بزرگوار! آپ رات قیام کا ارادہ رکھتے ہیں۔“

حسین کو سمجھ نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کہے:

”کبھی کوئی اپنے گھر میں بھی اجنبی ہو جاتا تھا۔ آدمی کی شناخت کیا ہوتی ہے۔ اپنائیت اور غیریت کیا ہوتی ہے۔ کیا خون کی پہچان بھی کوئی شے ہے۔“

اس کے سامنے سوال کو دہرایا گیا۔ مبادا وہ سن نہ سکتا ہو۔

پھر ای غلام نے قریب آ کر کہا: ”آپ رات یہاں آیا کریں گے۔“

”حسن کہاں ہے؟“

”وہ خلیفہ وقت کی بیعت کے لئے بغداد تشریف لے گئے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں ہے امیر المومنین مفتی باللہ کا انتقال ہو گیا تھا اور نقیب نے نئے لوگوں کی بیعت کی دعوت دے رہے تھے۔ دارالسلطنت میں حالات مخدوش تھے۔ کئی داعی خلافت تھے اور مقتدر باللہ ابھی کم سن تھا جو اپنی ترکی ماں اور ترکی سردار مونس کی نظر کرم کا محتاج تھا۔“

”کیا تم حسن کی ماں تک میری رہنمائی کرو گے۔ وہ مجھے پہچانتی ہیں۔“

غلام نے غور سے جھک کر حسین کی طرف دیکھا۔ دیر تک دیکھتا رہا اور پھر ”آقائے حسین“ کہہ کر اس سے لپٹ گیا۔

پھر بھاگا اور چیخا ہوا آقائے حسین کہتا ہوا دالانوں اور صحنوں میں بندھے ہوئے گھوڑوں اور اونٹوں کے پاس گزرتا ہوا اندرونی مکان کی طرف چلا گیا۔ اس کی سانس سینے میں سانپیں رہی تھی۔ وہ ادھیڑ عمر کا نہایت مضبوط حنشی تھا مگر اب تنکے کی طرح لرز رہا تھا اور اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی جیسے اس نے کوئی جن دیکھ لیا تھا۔

زینب نے اس زندگی میں اپنی امیدوں کو حسین سے دوبارہ ملنے سے خالی کر رکھا تھا۔ اس نے ابو یعقوب قطع کی بیماری سے اب تک جو کچھ اٹھایا تو وہ اٹھایا تھا۔ حسن ناس کو نازک آگینے کی طرح حفاظت اور محبت سے سنبھال کر رکھا تھا۔ وہ اس کے لئے بچپن اور جوانی اور محبت رہی تھی۔ اور دادا کے گم ہونے کے بعد سے ان دونوں نے ایک لمبا سفر کیا تھا۔ گم ہوؤں کی جستجو تھی بھی انہیں بھی۔ جب شام گھری ہوتی اور دن کے قافلے رات کے سفر پر نکلتے اور ستاروں کی طرح محو خرام ہوتے۔ زینب امید بھرے خیالوں سے دعاؤں میں ان کو یاد کرتی جو بس بغیر کوئی اطلاع دیئے کوئی نشان چھوڑے ٹوٹنے والے ستاروں کی طرح غائب ہو گئے تھے۔ پتا نہیں یہ رشتوں اور خون اور محبتوں، وطنوں اور انسانوں کی محبت خدا نے کویں بنائی تھی۔ اسے یہ خوب لگتا تھا کہ سینے حدت ہجر سے پتاں رہیں اور شعلوں کی شدت کوئی محسوس نہ کر سکے۔ خدا نے اس کا مقدر کیوں ایسا بنایا تھا۔ کوئی لمحہ اتنا فیصلہ کن کیوں ہوتا ہے۔

غلام کو یوں ہانپتا اور بات کرنے سے عاجز دیکھ کر اس نے ایک کنیز سے کہا کہ وہ اس سے معلوم کرے۔
 ”آقا حسین۔ آقا حسین۔ بس یہی کہہ رہا ہے۔“

زینب کو لگا اس کا سارا وجود سن ہو رہا تھا۔ خون ایک دم دل کی طرف بڑھا جیسے طوفان کا ریلہ کسی پرانے بند سے ٹکرائے اور چوہوں کے چھلنی کئے ہوئے سوراخوں میں اسے اندر ہی اندر بنیادوں میں جا گھسے۔ اسے منہدم کر دے۔

چمڑے پر نہایت عمدہ خط میں ایک عبارت تھی جس کو حامد بن عباس بار بار پڑھ رہا تھا اور فارس سے آیا ہوا آدمی اس ملاقات کے کمرے میں ایک کونے میں زانوں تہ کئے بٹھا تھا اور بہت دل گیر لگتا تھا۔ حامد نے ڈوبتے سورج کی روشنی میں جب ابھی کنیزوں نے چراغ روشن نہیں کئے تھے اس ٹکڑے کو اٹھا کر پھر پڑھا۔

درود و سلام!

ابلیس اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا اور کسی کا خاص مقام نہیں

عزائیل اپنے مقام سے گر گیا جبکہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (ان پر درود و سلام)

انہوں نے معافی کے معافی کو پالیا

ابلیس سے کہا گیا تھا سجدہ کرو
اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا گیا تھا دیکھو
ان کی آنکھوں نے دائیں بائیں نہیں دیکھا اور دھوکا نہیں کھایا اور نہ ہی گم راہ ہوئیں
ابلیس اپنے انکار پر صا د کیا

اور اپنی پہلی حالت پر واپس نہیں ہوا
محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیکھنے کے بعد اپنی حالت پر لوٹے
میں تم میں اپنی حایت پاتا ہوں اور تم پر تکیہ کرتا ہوں۔ تو دونوں کو پھیرنے والا ہے۔

تیری حمد کیسے کروں جبکہ تیری ثنا ہونی چاہئے
عرش کے مکینوں میں ابلیس سے بڑھ کر کون عابد تھا

وہ آگاہی سے پلک جھپکنے کی مہلت بھی آگاہ نہ ہوا۔ وہ شدید اشواق پر تنہائی میں اس کی حمد کرتا رہا۔
اس پر تہمت کی گئی جب وہ دوسری تنہائی تک پہنچا۔ اور اس سے سوال کیا گیا جب اس نے لامتناہی تنہائی مانگی۔
خدا نے کہا سجدہ کرو۔ ابلیس نے کہا تمہارے سوا کسی کو نہیں

خدا نے کہا چاہے تم پر میرا عذاب پڑے

ابلیس نے کہا تیرے دیئے ہوئے عذاب سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی میرا انکار تمہاری تقدیس کی وجہ سے ہے اور میری عقل
تم میں سرگرداں ہے آدھ تمہارے مقابلے میں کیا ہے۔ اور میں کیا ہوں کہ تم سے ماسوا کی طرف دیکھوں
وہ غرور جلالت کے سمندر میں گرا اور اوندھا ہو گیا

اس نے کہا میرے لئے سوائے تیرے اور کوئی راستہ نہیں۔ میں ایک افتادہ عاشق ہوں۔
تم مغرور ہو گئے ہو۔ جواب ملا

لامتناہی وقت سے پہلے میں صرف تم سے آشنا تھا اور یہ آدم سے بہت پہلے تھا اگر تم مجھے چھوڑ دو تو جدائی اور عشق ایک ہی تو ہیں
فاصلہ اور قرب بھی ایک ہی ہیں

میں تم سے یاد کیا جاؤں گا اور ہم دونوں لامتناہی وقت کے ساتھی

ہم ایک ہی تو ہیں!

کم سیال فطر روشنی پکڑ کر خاکی اور سنہری ہو رہے تھے اور چھیل کر ملائم کئے ہوئے کھال کے ٹکڑے پر خوب چھیلے ہوئے پرت پرت قطار اندر قطار فوجوں کی طرح جو نعیم پر حملہ کو تیار ہوں۔ قدم ایک ساتھ ملائے، شام کی سرخی میں فاصلے اور راستے طے کریں۔

اس نے تالی بجائی۔ پردوں کے عقب سے حبشی نے سر نکال کر آقا کے حکم کے لئے سرخم کر دیا۔

حامد بن عباس اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہ کام حبشی کا نہیں تھا۔

”تم واپس جاؤ۔“

کنیز جو چراغ روشن کرتی پھر رہی تھی اس سے اس نے کہا: ”کسی محافظ سے کہو عمار کو میرے پاس بھجوائے۔“

بغداد میں حالات بہت مخدوش تھے۔ خلافت کی کشتی ابھرتی ڈوبتی مکتفی باللہ کی وفات کے بعد سے تھپیڑے کھا رہی تھی۔ مقتدر باللہ کو تخت خلافت پر رونق افروز کرنے کا صلہ بیعت عباس بن حسن نے ایک بڑی رقم خزانے سے نکال کر حاصل کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ فتنہ کبھی بھی ظاہر نہیں ہوا تھا اور جو شغب (مقتدر کی ماں) کا حکم تھا وہی ہوتا تھا۔ وہ بیٹے کی کم سنی سے فائدہ اٹھا کر جو چاہتی کرتی تھی۔ دربار کے معاملات میں اس کا عمل دخل بہت زیادہ تھا۔ اور پھر اس کی منظور نظر کنیزوں اور لونڈیوں اور اُلجھے ہوئے بالوں کی طرح کے معاملات تھے۔ ترک اندر اور بغداد سے پرے تک قرامطہ پھیلے تھے۔ زندگی درہم برہم تھی اور ایسے میں جب ہر وزیر اپنی گردن کی فکر میں تھا، ابن منصور کے اس طویل مکالمے کو جو اس نے ابلیس کی شان میں تصنیف کیا تھا، کون درخور اعتنا سمجھتا۔ مگر حامد بن عباس کو ابن منصور کی فکر تھی۔

بغداد کی حکومت کے مقابلے میں فاطمی حکومت مغرب میں مضبوط واسطوں سے قائم ہو چکی تھی۔ گو مکتفی باللہ نے عیسیٰ نوشری عبید اللہ المہدی کے گرفتار کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ یہ حضرت جعفر صادق کے بیٹے امام اسماعیل کی امانت کے قائل تھے اور یہ دعوت کوئی نئی نہ تھی اس لئے مغرب میں اس کے قیام کے ساتھ ہی یمن، بحرین عراق اور خراسان میں مدتوں سے مصروف مبلغین نے بھی اپنے قفس کے بند دروازے کھولے اور فضا میں زقندیں لگانا شروع کر دیں۔

مونس بہت ہی طاقتور تھا۔ اس ترکی غلام نے عروج پایا تھا اور وہ دربار کے سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا تھا۔ حامد بن عباس کو اس سے بہت چڑھتی مگر فتنے سے نبرد آزما ہونے اور اسے شکست دینے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ سیاست ایک ایسی دلدل تھی جس میں وہ دھنستا چلا گیا تھا اور ایسے میں جبکہ نئے عقائد پرانی رعبتوں دعوؤں نے اپنی جگہ بنالی تھی مذاہب اور فرقوں کا کوئی شمار نہ

تھا۔ ابن منصور کے ان رسائل اور خطوط سے کیا نقصان پہنچ سکتا تھا۔

عمار جب اندر آیا تو حامد بن عباس نے اس پارچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”یہ ابلیس کی فتوحات سے متعلق ایک دستاویز ہے۔“ اس نے ہنس کر اوپر دیکھا۔

”آقائے سیدی! کل محلہ جلابیہ میں ایک عورت کے پاس بھی ایسی دستاویزات ملی ہیں آدمی جب گھبرا جاتا ہے اور داو گیر میں اسے کچھ نہیں سوچتا تو وہ اپنی تسلی کے لئے سہاروں کی تلاش میں نکلتا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی انسان خدا ہونے کا دعویٰ بھی کرے اور یہ بھی وعدے کرے کہ وہ نجات دلا سکے گا تو کون ہے جو اس پر یقین نہ کرے گا۔“

ہو چپ ہو گیا تو وزیر نے کہا:

”مگر بخدا یہ شخص نہیں۔ یہ نہیں۔ نہیں نہیں اور ہرگز نہیں۔“ اس نے جوش سے کہا۔ اور کھڑا ہو گیا۔

”آقائے! مغرب میں ایک پوری سلطنت ان فتنوں سے عالم وجود میں آئی ہے۔ یہ ابن منصور تو کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ اس کے خطوط اور رسائل آپ کو کیوں مضطرب کرتے ہیں۔“ عمار نے مقرب ہونے کی وجہ سے ذاتی سوال کر رہا تھا۔

حامد بن عباس پشت پر ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا اور پہلی رات کا چاند رتے پچے کی اوٹ سے لہریا ریت میں دبے سکے کے کنارے کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

”تم پوچھتے ہو یہ بات مجھے مضطرب کیوں کرتی ہے۔ بخدا اس کا جواب میرے پاس بھی نہیں، مگر اس ہنگام رست خیز میں بھی اس دیوانے کا خیال مجھے تکلیف دیتا ہے۔ عمار! تم کبھی اپنی جان سے عزیز شے، خواب سے بھی خوبصورت شے کے متعلق سنو کہ اس پر تمہارا نہیں کسی اور قبضہ تھا تو تم کیا کرو گے؟“

عمار یک بیک اس سوال سے گھبرا گیا۔ یہ عجیب پر اسرار سوال تھا۔ اسے جان سے عزیز اس کی وہ عزت تھی جو اس نے حامد کی ملازمت اور رفاقت میں پائی تھی۔ وہ کسی طور اسے برباد کرنا پسند نہیں کرے گا۔ پتا نہیں اس کا آقا اپنے جی میں کیا دکھ رکھتا تھا۔ اس کے سوز اور انتشار اس کی سوچ کو وہ کیسے پاسکتا تھا۔ اور یہ باتیں نہایت بے ربط تھیں وہ تو ابھی ابن منصور کی باتے کر رہے تھے اور اس نے بڑھیا کے پاس جو پایا تھا وہ ابن منصور کو گرفتار کرانے کے لئے کافی تھا۔

بڑھیا کے پاس تھیلے میں چند خطوط تھے جو اسے ترکستان سے ابن منصور نے لکھے تھے۔ ان تحریروں نے یہ ثابت کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے۔ دیوانہ، مذبذب، منحوس! مگر یہ کیسے..... اسے وہ رات یاد آ رہی تھی جب اسے قید خانے سے زبردستی نکالا

گیا تھا اور پھر وہ تقریباً بغداد میں کبھی دکھائی نہیں دیا!

اور اب!

پتا نہیں وہ کس فرقے کا مبلغ اور کون سے امام کا داعی تھا۔

عمار کو پھر وہی فضا اپنے گرد محسوس ہوئی جس کے بوجھ سے اس کا دل بیٹھنے لگا تھا جیسے پہاڑ لڑھکائے جا رہے ہوں۔ ارد گرد آوازیں اور خوشبوؤں اور نظارے اس سے بند ہونے لگے ہوں گے۔ وہ قید خانے میں کھڑا ہو۔

اس نے سرکھ جھٹکا تو وزیر اعلیٰ نے پوچھا۔

”گم کیوں ہو گئے ہو عمار! میں چاہتا ہوں چند نہایت باہوش جوانوں کو بھیج کر اس کی خبر لو۔ اسے گرفتار کر کے یہاں بغداد کے بندی خانوں کو زینت بخشی جائے۔ جو ہماری رسائی سے دور ہیں انہیں بھول جاؤ لیکن جو ہماری دسترس میں ہیں انہیں کیوں آزاد چھوڑا جائے۔“ اس نے نگاہ اٹھا کر عمار کی طرف دیکھا۔ ”تمہارا جی تو اچھا ہے؟“

عمار کھڑے سے بیٹھ گیا جیسے اسے سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی ہو۔ روشنیاں اور اندھیرے اور ہر شے جو اس کے گرد تھی اس پر بارگراں بن کر مسلط ہوتی چلی گئی اور اس نے سانس لینے کے لئے منہ کھولا تو ہوا بھی اس پر بند تھی۔ وہ اپنے آقا کے قدموں میں بے ہوش ہو گیا۔

”موت بھی عجیب چیز ہے۔“ حامد بن عباس نے کہا۔ ”عرش کی بلندیوں سے زمین کی پہنائیوں پر جاری و ساری ہے۔ کہاں سے آتی ہے فلک کج رفتار یہ کہاں سے آتی ہے۔ کون اسے بھیجتا ہے۔“ اس نے عمار کو پکارا ”عمار عمار!“

باہرات کا پرندہ چیختا ہوا دجلہ کے پانیوں پر سے لمبی اڑان لگا کر زقندی سی بھر کر گزر گیا۔ اس نے پردے کو ہٹا کر دیکھا۔ بغداد میں دریا کے دوسرے کنارے پر محلات کے درہتچے روشن تھے اور موسیقی کی دلنوا تانیں رقص کی دھنوں میں ڈھل رہی تھیں جیسے برف پگھل کر شفاف پانی میں بدل رہی ہو جیسے زندگی گھل کر موت کے دھارے پر بہتی جائے۔

ریشم بننے والوں کی بستیوں کے آخری سرے پر اس زاویے میں جس سے حد نظر تک دشت سوس کی سرخی مائل زرد سیاست ریت پھیلی تھی انہوں نے حسین ابن منصور کو ڈھونڈ نکالا۔ انہوں نے ہر شے کو الٹ پلٹ کر دیا تھا تا کہ کاغذ کا ایک پرزہ بھی جو وہاں سے ملے قبضے میں کر لیا جائے۔ ان کے لئے یہی حکم تھا۔

حسین نے اپنی بے پناہ آنکھیں اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ذکر محفل درہم برہم ہونے کے بعد انہوں نے مریدوں، درویشوں، مقلدوں،

کبھی کبھار اس میں شریک ہونے والوں کو گرفتار کر لیا اور خانہ تلاشیاں شروع ہوئیں۔ حسین کے سب رسائل، ہندوستان سے اس کے نام آئے ہوئے خطوط، دعا کے لئے درخواستیں جو ترکستان اور چین سے کبھی کوئی آتش پرست اور کبھی کوئی سوداگر لے کر آتا تھا، دنیا کے کناروں تک کاروانوں کے ساتھ پھیرنے والے درویشوں اور مغنی اور زمانے کے ستارے ہوئے درباروں کے لئے جانے والی طالع آزمائوں بھی یہ پیغامات لاتے تھے۔

ہندوستان والے اسے مغیث، ترکستان والے مقیت، خراساں والے ممیز، خراسان والے ابو عبد اللہ زاہد، خوزستان والے شیخ علاج الاسرار اور بغداد سے آئے ہوئے خطوں میں مصطلم لکھا تھا۔

خانہ تلاشی کے لئے آنے والوں میں سے ایک حسین کو گھیرے تھا اور دوسرے زاویے کو درہم برہم کر رہے تھے۔ کلام پاک کے حواشی اور تفاسیر اور غیر مانوس زبانوں میں لکھے ہوئے الفاظ..... انہوں نے اس کی گدڑی کو اتروایا اور جھٹکا۔ مگر اس میں سے کچھ برا آمد نہیں ہوا۔

”حیرت ہے اس مفلوک الحال شخص کے لئے ہمیں اتنے فاصلے پر بھیجا گیا جس کے زاویے میں بھی کوئی شے سلامت نہیں۔ مہمانوں کے لئے کوئی بندوبست نہیں اور ہر وار و صدر کو کھانا کھلایا جاتا ہے تو بندوبست کیسے ممکن تھا؟“

پھر دشت سوس کی آندھیاں بے وقت اٹھیں اور فنا کی ہوا بن کر تیز گونج کے ساتھ سب طرف پھیلنے لگیں۔ حسین نے اپنے مہمانوں کی طرف دیکھا۔ خوف سے ان کے رنگ زرد تھے اور ول لرز رہے تھے۔ ایسی خوفناک صحرائی صدائیں انہوں نے پہلے کبھی نہ سنی تھیں۔

حسین نے انگلی اٹھائی اور دنیا کا سانس رک گیا۔ اسے گرفتار کرنے والوں نے اور کچھ نہیں دیکھ اصراف یہ محسوس کیا کہ یک لخت صرصروں اور طوفانوں نے اپنے دامن سمیٹ لئے تھے۔

پھر وہی بغداد اور اس کی رونقیں تھیں جیسے فنا کی ہوا کے عادی لوگ اس میں سانس لیتے ہوئے ہی اپنی بقا پاتے ہیں اسی طرح شورشوں اور بغاوتیں، ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے ماحول میں بھی دجلہ نہایت سکون سے اپنے دونوں کناروں کے محلات اور باغوں اور رعنائیوں کو دامن میں لئے بہ رہا تھا۔ اس آئینے میں جو بھی تھا اس کا عکس لرزاں، ترساں، گزراں تھا۔

معتضد کے زمانے میں شہر رنگ طلیساں پہنے والے لوگ اب خال خال نظر آتے تھے۔ یہ نہیں کہ اب شہر ذمیوں، نصرانیوں، مجوسیوں، یہودیوں سے خالی ہو گیا تھا بلکہ اس کے جانشینوں نے سارے پابندیوں کو غیر ضروری سمجھ کر ان کی طرف سے چشم پوشی شروع

کردی تھی۔ خلقت کا اثر دھام چاروں طرف سے ایک بے چندے کے پیالے میں پانی کی طرح مسلسل شہر میں در آتا اور کسی نہ کسی طور پر اپنی جگہ بنانے میں جت جاتا۔ سوداگروں اور قافلوں کی دھوم اور آمد و رفت سے ایک ایسے میلے کا سماں تھا جس میں لوگ آخری تماشا دیکھنے کے لئے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے مگر ایک دوسرے کو برداشت بھی کرتے تھے۔

مدرسہ نظامیہ میں جنید درس دیتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے سب شاگردوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ خالی درس گاہ میں وہ خالی الذہن بیٹھے تھے اور ان کا دل ایک نئی وحشت کو پار کر دھڑک رہا تھا۔

حسین ابن منصور کو وہ پابجولاں لائے تھے اور بندی خانے میں ڈال دیا تھا۔ جب وہ مجنون تھا اور دادی فاطمہ کے نواح میں دشت نور دی کرتا تھا تو انہوں نے ایک قافلے والوں کی زبانی سنا تھا کہ انا الحق کہتا تھا۔ پھر مدتوں اس کی کوئی خبر نہیں آئی کشف سے انہیں یہ خبر بھی تھی کہ وہ جہاں بھی خیریت سے ہے۔ پھر یک بیک اسے دارالسلطنت میں لایا گیا۔ دیوانگی اور ہوش کی درمیانی کڑیاں ان کی نظر سے حجابات میں تھیں۔ اس دوران کیا ہوا تھا۔ دیوانگی سیوہ ہش میں آیا تھا۔ وہ لے گیا تھا اور پھر لوٹا یا گیا تھا۔ وہ اپنے سے گم تھا اور اس میں آئم تھا۔ پھر وہ اپنے میں قائم کیا گیا تھا اور بندہ خدا تھا۔ دنیا میں رہنے کے قابل۔ یہ منزلیں تھیں جن سے گزرنا اپنے دروس اپنے لئے خود پسند کرنا اور اپنی تعلیم اپنی تربیت شامل تھی۔ مرشد ایسی راہوں میں دست شفقت پر رکھتے تھے اور تاریک راہیں روشن ہوتی تھیں مگر اس نور مبین کی روشنی تو آدمی کو اندر اور باہر سے ہمہ روشن بنا دیتی تھی۔ حسین کو کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

جب شام کی اذانیں ڈوبتے سورج کی سرفی میں لعل گوں پانی پر تیز لہروں کی طرح پھیلیں۔ دشت و جبل میں ہوا کے ساتھ لمبے دامنوں سمیت اڑیں تو جنید اٹھے تاکہ بندی خانے میں کسی کو دریافت حال کے لئے بھیجیں۔

شبلی پھول کی چٹیاں نوچتے ہوئے درس گاہ کے دروازے میں انہیں مل گئے۔ انہوں نے کوئی بات نہیں کی مگر ہنسے اور دیر تک ہنستے رہے جیسے کیف و سرور کی کسی کناں ستونوں اور دالانوں میں پھرنے لگے۔ پھر انہوں نے اپنا سر پتھروں سے ٹکرایا اور روتے رہے۔ جنید نماز کے لئے مسجد میں داخل ہو گئے تھے۔

حسین زمین پر لکیریں کھینچ رہا تھا۔ جب شبلی نے جھروکوں پار سے اسے آواز دی:

”ابن منصور۔“

ابن منصور نے سراٹھا کر نہیں دیکھا تو انہوں نے کان کے پیچھے اڑسا ہوا گلاب اس کی طرف پھینکا۔

”جو تمہارا حال ہے وہی میرا ہے مگر تم نے اسے لوگوں پر ظاہر کر دیا۔ تمہاری عقل نے تمہیں اس حال تک پہنچایا۔“

حسین نے وہ پھول شبلی کو دیتے ہوئے کہا:
”برادر وقت کا انتظار کرو۔“

”بخدا ابن منصور۔ میں اس لمحے سے خوفزدہ نہیں ہوں مگر مجھے رشک آتا ہے۔“ شبلی نے پھول پھر کان کے پیچھے اڑس لیا۔

”شبلی۔ میرے ایک سوال کا جواب دیں۔ جب مولانا نے ایک شخص کو اس کے نفس کے قبضہ سے لے لیا اور اس کو اپنی بساط انس تک پہنچا دیا۔ اس کو تم کیا سمجھتے ہو۔“ حسین کی نظریں شبلی کے چہرے کی متلاشی تھیں۔

ایک نورانی مسکراہٹ شبلی کے خالی چہرے پر پھیلی جوان کے وجود میں سے یوں ظاہر ہو رہی تھی جیسے لہریں کچھ چمک پکڑ رہی ہوں۔ وہ کھڑے سے بیٹھ گئے۔ پھر انہوں نے اپنی انگلی سے سامنے کی زمین پر لکیریں کھینچیں۔

”انس مع اللہ سے بڑھ کر کون سی جنت ہوگی۔ جنت بھی اسی انس کی وجہ سے جنت بنی ہے۔ خوش حالی ہے اور مبارک ہے ایسے نفس کے لئے جو مولیٰ کا مطیع ہو اور حقیقت کے آفتاب اس کے قلب میں چمک رہے ہوں۔“

حسین نے کہا: ”شیخ کامل سے کہہ گا میرے لئے دعا کریں کیونکہ لوگوں نے راہیں پر خار کر دی ہیں اور میرے گرد فسانے بنا لئے ہیں۔“

”نہیں۔ لوگ فسانے نہیں بناتے صرف اپنے خیالوں کو نئے جامے پہناتے ہیں جو خود انہوں نے تیار کئے ہوتے ہیں۔“ شبلی پھر بنے۔

”شاید۔“ حسین نے نہایت عاجزی سے کہا۔ ”شاید۔“

”تم نے مغلوب الحال ہو کر جو کہا تھا جو کیا تھا اس کو انہوں نے حال سے قال تک حرف بہ حرف تسلیم کر لیا تھا۔ اس میں ان کی بھی تھوڑی دیوانگی شامل تھی اور عام لوگ کسی خیال کو پر چھائیں کو پر اور پرزے خود ہی لگا لیتے ہیں۔“ شبلی حسین کی بنائی ہوئی زمین پر کھنچی لکیروں کی طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔

”شاید۔“ حسین نے پھر کہا۔ ”شاید۔“

”حامد بن عباس نہایت سخت گیر آدمی ہے۔ رہائی اور خلاصی ذرا دیر میں ہوگی۔“ شبلی نے دالانوں سے پرے ان آوازوں پر دھیان دیا جو بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ ”یہ لکیریں ابھی مٹا دو۔ یہ سوال قبل از وقت ہے اور بہت زیادہ ہے۔ تم یوں سرخروئی کیوں چاہتے ہو۔ دشت بے دروازہ ہے۔ اور کون بروئے کار آئے۔“

حسین نے بے پناہ آنکھوں سے شبلی کی طرف دیکھا جن میں نہ زندگی کی محبت تھی نہ جینے کے لئے منت تھی نہ دعا کے لئے اضطراب تھا۔ صرف بے پایاں تپش تھی اور عشق و ہجر کی مسلسل داستان کا ایک باق رقم ہو رہا تھا۔

شبلی نے منہ پھیر لیا اور لوٹ آئے۔ ”دیوانہ ہمیشہ دیوانہ رہتا تھا۔“

بعد ا میں یہ دباؤں اور آسانی آفتوں کا سال تھا۔

اس دن صبح سے برف باری ہو رہی تھی۔ مکانات سفید ردا میں ڈھانپے جا رہے تھے۔ جیسے ان پر کفن پھیلا یا جا رہا تھا۔ درخت اپنی شاخوں سمیت جھک کر سجدہ ریز ہونے کی کوشش میں ایسے آدمیوں کی طرح لگ رہے تھے جنہوں نے پہلی بار نماز کے لئے جھکنا چاہا تھا مگر کوع کی حالت میں ان پر جمود طاری ہو گیا تھا۔

گزشتہ شام عجیب پر ہیبت تھی۔ ہوا کی بخ بستی میں بے چین پرندے بیسرا کرنے کی بجائے چیختے اور اڑتے تھے اور شام کی سرخی غبار کی طرح اوپر چڑھتی، پھیلتی، بیٹھتی، اڑتی اور لگتی تھی۔

کاؤز دیار پر نیچے تک اتر آتیں اور پھر فضا میں گھومنے اور دائرے بنانے اور چکر کاٹنے لگتیں۔ کوئے سینکڑوں کی تعداد میں کائیں کائیں شور مچا رہے تھے اور چیلیں کتیں، کتیں، چلاتیں گرتیں، اٹھتیں اور منحوس آوازوں سے آبادیوں پر منڈلا رہی تھیں۔

جب اذانوں کی آوازیں رعب و جلال کے ساتھ فضا میں بلند ہوئیں تو گویا ہوا ایک قرار پکڑنے والے بے چین بیمار کی طرح ذرا تھمی رکی، اپنا سانس ٹھیک کیا پھر مار سیاہ کے بادلوں کے مرغولوں نے شہر کے روشن اور زندگی کی گہما گہمی سے پر خالی جگہوں اور ویرانوں کو یوں ڈھانپ لیا جیسے نیند پہوٹوں کو بوجھل کر کے آنکھوں پر چھا جائے۔

حامد بن عباس سیاست کی بساط پر ایک پتے ہوئے مہر کی طرح تھا۔ اس کا بیٹا حسین اسے چھوڑ کر مغرب میں عبید اللہ المہدی کے پاس جا چکا تھا۔ اس کی تربیت کے لئے حامد کی ساری پریشانیاں آخر شکست ہو گئی تھیں۔ راہ محبت میں اس کی مایوسیاں المناک تھیں۔ اسے معلوم تھا انہوں نے ایک لمحہ کے لئے بھی اسے نہیں چاہا تھا۔ چاہت کیا شے ہے۔ قہر مانہ اور گل رنگ اور صد ہا ترکی کنیزیں جن سے اس کا حرم بھرا تھا۔ یہودی اور نصرانی اور نسطوری عورتیں جنکی وجہ سے اس کے محلات میں قوس و قزح اتری ہوئی لگتی تھیں۔ وہ ان کے بیش لباسوں میں چھپے سراپوں سے بھی آشنا تھا۔ مگر ان کے دل دل تک کبھی کوئی پہنچ نہیں پاتا۔ دل کی دنیا کن ناموں سے آباد ہوتی ہے، کسے خبر ہو سکتی ہے۔

اس سے کسی نے کبھی محبت نہیں کی تھی۔

بنانے اور بگاڑنے، دربار کی سالیستوں میں دوستوں اور دشمنوں کی تعداد کا حساب رکھنے ترقی کرتے رہنے اور اپنی جگہ برقرار رہنے میں ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ اس کے بالوں کی سیاہی میں راکھ نے اپنے دامن جھاڑے تھے اور دجلہ کے کنارے اس محل میں جہاں بے شمار داروغے اور محافظ تھے وہ تقریباً اکیلا تھا۔ تنہا وہ کیوں تنہا تھا۔

عذاب کے ایک جانکاہ خیال سے اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ یہ ساری دولت دنیا، جاہ و جال و کس لئے اپنے گرد سمیٹ رہا تھا جبکہ وہ خود اس ڈھیر میں دفن ہوا جا رہا تھا۔ آہ اس کی ساری ناکامیوں اور نامرادیوں کا ذمہ صرف ایک شخص تھا۔ ایک گدڑی پوش۔ وہ اس کی ذلت سے اپنا انتقام لے سکتا تھا۔

اس نے تالی بجائی۔

”دشت سوس کے قریب سے جو قیدی لائے گئے ہیں ان میں سے ابن منصور کو حاضر کرو مگر اس کی بیڑیاں کھول دو۔ میں اس سے تنہائی میں ملنا چاہتا ہوں۔“

پر چیخ راہدار یوں اور ان گنت سرنگوں اور ٹیڑھے میڑھے راہوں سے جب اسے لایا گیا تو وہ نہ ہراساں تھا نہ ہارا ہوا۔ نہ ہی پڑ مردہ اور نہ ہی نادم۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب بے نیازی تھی جو اپنے انجام سے بے پروا ہونے والا ہے کے آس پاس ہوتی ہے۔ ایک فضائے آزادی جس کو قید اور عذاب کبھی نہیں مٹا سکتے۔ ایسی صورتیں خال خال ہی نظر آتیں ہیں۔

”تمہیں اس طلبی کا مطلب معلوم ہے؟“ حامد نے نہایت نخوت سے کہا۔

حسین نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”تم کیا ابلیس کے پرستار ہو اور کسی پر اسرار مذہب کے داعی ہو؟“

وہاں وہی خاموشی تھی۔

”خدا تمہارے چہرے کو تاریک کرے۔ کیا تم میری بات سن نہیں سکتے یا بہرے ہو؟“ حامد کی ہنسی اس کے چہرے پر برف کے نوکیلے ٹکڑے کی طرح تکلیف دہ اور ٹھہری ہوئی تھی۔

”شیطان پرست اور جادوگر۔ خلق خدا کو خراب کرنے والے۔ خدا کے بھلائے ہوئے۔“ حامد نے دانت پیش کر کہا۔ وہ ٹہل رہا تھا اور کوڑے کو ایک سے دوسرے ہاتھ جمیں بدل رہا تھا اور بہت مضطرب تھا۔

”وزیر اعلیٰ حامد بن عباس! کیا اس داروغہ زمانہ میں یہ مسلک اتنا اہم مسئلہ ہے کہ اس لئے میں نصف شب کو بلا یا جاؤں؟“

حسین کی آواز خالی کمرے میں گونج گئی۔

”تمہاری جگہ صرف اور صرف جہنم ہے۔“ حامد نے زور سے کہا۔

”میں تو یہاں بلایا ہوا آیا ہوں۔“ حسین نے نہایت آہستگی سے کہا۔

حامد نے حلق سے عجیب آوازیں نکالیں مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔

”تمہیں معلوم ہے ابلیس کی پرستش کی کیا سزا ہے؟“ کافی دیر کے بعد وزیر اعلیٰ نے کہا۔

”میں ابلیس کا پرستار نہیں اس کی ہمت کا قائل ہوں مگر سزا اگر مقدر میں ہے تو اس کے لئے بھی تیار ہوں۔“

”تم سزا کا مفہوم اگر جانتے تو اس سے پناہ چاہنے کی استدعا کرتے۔ عمیق ترین جہنموں سے بھی زیادہ تکلیف دہ۔ بخدا تمہارا ایک ایک جوڑ کاٹا جائے گا۔ پارچہ پارچہ گوشت علیحدہ کیا جائیگا۔ روئیں روئیں سے الگ الگ جان نکلے گی۔ کیا اس اذیت کی برداشت ہوگی؟“

حسین کا چہرہ کھل اٹھا مگر اس نے سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

”کیا تم دیوانے ہو؟“

حسین کا قہقہہ اپنی صدائے بازگشت سے دیواروں اور پردوں چھت اور درپچوں میں سرایت کر گیا۔ ساز جام و مینا سب نے اس ہنسی کو گویا پکڑ لیا تھا۔ باہر دجلہ کی لہریں بھی سرخوشی سے دستک دینے لگیں جیسے اس سے بے پناہ ہنسی کے سیلاب میں شریک ہونا چاہتی ہوں۔

حامد بن عباس کو پچھلی ملاقات بھی یاد تھی۔ اس لئے دروازے کو جو صرف اس کے لئے مخصوص اور تقریباً پوشیدہ تھا۔ کھول کر برف باررات میں اس نے حسین کو باہر دھکیل دیا۔

”جاؤ خدا تمہارا چہرہ تاریک کرے..... پھر میں تمہیں بغداد میں نہ دیکھوں ورنہ ان شعبدوں کے باوجود میں تمہیں ضرور قتل کر دوں گا۔ تمہارا انجام اچھا نہ ہوگا۔“

”تمہاری مشکل میری سمجھ میں آتی بھی ہے اور نہیں بھی۔“ خراسانی نانابائی نے تنور پر جھکے جھکے روٹیوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا۔ ”تم کہتے ہو کہ بغداد میں رہنا تمہارے لئے ضروری تھا۔“ اس نے متمتاتے ہوئے چہرے سے پسینہ پونچھا۔

”جب تم وزیر اعلیٰ سے پوشیدہ رہو گے تو شہر میں کیونکر رہو گے۔ قاضی عمرو جو شہنہ ہے اس کا بہت عزیز دوست ہے۔ وہ تمہیں

ڈھونڈ نکالیں گے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم یمن چلے جاؤ یا فارس یا عراق۔ خدا کی زمین بہت وسیع ہے۔ ہر ملک ہمارا ملک ہے کہ ہمارے خدا کا ملک ہے۔“ اس نے ہنس کر ننان ایک ریشمی کپڑے میں لپیٹے۔

”نہیں میرے احکامات یہیں کے ہیں۔“ حسین نے چاروں طرف نظر ڈالی۔

”تمہارے لئے یہ حکم کون دیتا۔“ نانابائی نے حیرت سے پوچھا۔ وہ دیر تک بڑی سوچتی ہوئی گہری نظروں سے حسین کی طرف دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ تنور میں سے نیلا دھواں نکلنے لگا اور جلن کی خوشبو سے ہوا بھر گئی۔

یہ دارالحربہ اور باہر کے مکانات سے دور جنگل کے قریب ایک قلعہ نما مکان تھا جو اب سرائے بنایا گیا تھا۔ اس سمت سے کاروانوں کا گزر بہت کم ہوتا تھا کیونکہ آباد شاہرہ دوسری طرف اور صاف تھی۔ جس شخص نے پہلے پہل اس کو خریدا وہ تھوڑے دنوں بعد ہی بھیڑیے کے کاٹنے سے مر گیا تھا۔ اس کے بیٹے نے اس جگہ کو منحوس خیال کرتے ہوئے کبھی اس میں رہنا پسند نہ کیا۔ یوں بھی وہ دربار جیسے کاتب تھا اور شہر کی زندگی کا عادی۔

تہہ خانوں میں تاریک چکر دار سیرھیوں سے داخل ہوتے تھے اور پر پیچ گھٹے ہوئے راستے جنگل میں غاروں میں کھلتے تھے۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سازیشیں اور بغاوتیں جنم لیتی پروان چڑھتی اور پرورش پاتی ہیں۔ کاروں سرائے بن کر اس ویرانے میں زندگی اور رونق لوٹ آئی۔ خراسانی کا مزاج عمدہ اور معلومات لا انتہا تھیں۔ وہ ایک داستان طراز اور مغنی ہی نہیں شاعر بھی تھا۔ اس لئے بغداد کے ناکام مغنی دربار کی امید میں عمر گزارنے والے شاعر بے ٹھکانہ آوارہ گرد سپاہی، خوابوں اور سایوں میں پناہ لینے والا نیم دیوانے سیاست سے بیزار اور ناکام ہو کر گوشہ نشین ہونے والے طالع آزمایہاں اکثر شامیں گزارتے ہیں۔ یہ محفل جانانہ یوں آباد تھی۔

تہ خانہ حسین کے لئے ایک عمدہ جائے پناہ تھی۔ پانی کی ذمہ داری علی بن احمد نانابائی نے اٹھائی تھی اور ایک درپچہ اس نے ہوا کے لئے چند اینٹیں نکال کر اس میں بنادیا تھا جسے بند بھی کیا جاسکتا تھا۔ روشنی کے لئے چراغ بھی اس نے مہیا کیا اور بوریا نشین درویش کے وجود کو اس نے اپنی سرائے کے لئے بابرکت سمجھ کر ساری خدمات اپنے ذمہ لے لی تھیں۔ خدا سے محبت کا نانا اس کے بندوں سے محبت کرنا ہے اور اسے خدا سے کوئی خاص شکایت بھی نہیں تھی۔ کاروبار میں حسین کے آنے کے بعد بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ یک بیک خراسانی سرائے کی روٹیوں کی مانگ بغداد میں بڑھ گئی تھی۔ کاروان ڈی شاہرہ چھوڑ کر ادھر سے نکلنے اور یہاں ٹھکانہ کرنے لگے تھے اور راتوں کو چہل پہل سے ایک نہایت آباد میلے کا گمان ہوتا تھا۔ پاس کے دیہات سے لوگ کارواں والوں کے لئے روٹی اور مٹھن اور ضروریات کی دوسری چیزیں لاتے۔ باتوں اور ہنسی اور قہقہوں کا شور کبھی دالانوں میں سے ہو کر دیواروں کو پار کر کے ہوا کے لئے

بنے ذرا سے درتے کو پھلانگ کر اندر حسین تک جا پہنچتا اور اسے بیضا یاد آنے لگتا۔ جہاں اس کے دادا کے زمانے میں ایسی روئیں رہی ہوں گی۔ منصور کا قوس زندگی جس کے دونوں کنارے نامعلوم تھے اور نصف دائرہ اس کے سامنے تھا۔ اس کا باپ یکا یک لا پتہ ہو گیا تھا۔

مدتوں اسے اپنی خبر بھی تو نہیں ملی تھی۔

اور اب اسے اپنی خبر کب تک تھی جیسے بجلی کا لہریا بادلوں کی سیاہی کو چند لمحوں کے لئے زیادہ نمایاں کر دیتا ہے۔ اس کے احوال حجابات ہوش اور سکڑوہ ایک کوڑے کی طرح لہرایا جاتا تھا مگر لہرانے والے ہاتھ سے باخبر ہونا حاصل حیات تھا۔ وہ ایک عاشق تھا جسے شراب محبت نے مد ہوش کر دیا تھا۔

اس نیلہاس ظاہری کوتار تار کر دیا تھا اور خودی کا پیر ہن چاک کر ڈالا تھا۔ اس کی ایک نام کی بازگشت نغمہ محبت تھی۔

بغداد اپنی جولانیوں اور رنگینیوں اپنی کثافتوں اور دلاویزیوں سمیت اس کے لیے حکم تھا اور یہیں اسے منتظر رہنا تھا۔ وہ دشت سوس سے یہاں لایا گیا تھا۔ گریہ کنائں رہ راہ محبت میں رفیقوں کو تلاش کرے اپنے نغمے میں ان کو ہمنوا بنائے اور درس محبت کو عام کرے مگر سمنون محب اسے کہیں دکھائی نہیں دیئے۔ اس کے پردہ دل پر ان کی تصویر منعکس نہیں ہوئی۔ شبلی اس کی بساط انس سے دور تھے۔ جنید جانتے ہوں گے جیسے بازید جانتے تھے۔ ابن عطار کا دل بھی اس نغمہ عشق کو اس کی ہمنوائی میں گاتے ہوئے ایسا ہی تھا جیسے پر نیاں میں شعلہ لپٹ جائے اور اس کو شعلہ بنادے۔ راہ محبت میں بھلا کون کسی کا رفیق ہو سکتا تھا۔

فضا میں اتنا اضطراب تھا اور اتنی خاموشی جیسے طوفان سے پہلے کا سناٹا ہو۔

خراسانی سرائے میں لوگوں کا مجمع، کاروانوں کی آمد و رفت اور میلے کی سی کیفیت میں کمی آگئی تھی جیسے یہ اتار کی تاریخیں تھیں اور چاند گھٹ رہا تھا۔ سمندر ساحل سے دور ہٹ گیا تھا اور اس کے شور میں کمی آگئی تھی کیونکہ حسین پر ایک گمشدگی کی کیفیت تھی اور خراسانی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ زیادہ وقت تہ خانے میں گزارتا تھا۔

حسین کا انا الحق اب ایک الہامی کیفیت بن کر ان کے درمیان گونجتا۔ یہ ان کی امانت تھا جس لفظ کی حفاظت وہ اپنی جان سے کر رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے عرش ان کے درمیان آتر آیا تھا اور دل آئینے کی طرح اس کے عکس کو اپنے میں دیکھ رہا تھا۔ جیسے مکہ کی پہاڑیوں کے درمیان خلیل ابراہیم کی بیوی ہاجرہ اور چھوٹے بچے اسمعیل کے ساتھ عرش اترتا تھا۔ صفا اور مروہ کے درمیان اور قبہ زمزم

میں آباد ہو گیا تھا۔ حسین کے دل میں بھی عرشِ معلیٰ اتر آیا تھا۔ وہ اپنے مکین سے مزین ستاروں سمیت آفتابوں اور ماہتابوں سے وضو قلن!

نصرِ قشوری نے جب اجازت چاہی کہ وہ اس سال امیر حج بنا کر حرمِ کعبہ جا رہا ہے تو حسین نے ہنس کر کہا:
”تم میرا طواف کرلو۔ سات بار میرے گرد چکر لگا لو۔“

نصر کی آنکھوں میں شدتِ جذبات سے آنسو تھے۔ اس نے جھک کر زمین پر سجدہ کیا تھا۔ اس در ماندہ حالت میں جب ہر لمحہ باہر والوں کے در آنے کا خطرہ تھا، وہ بھلا حسین کو چھوڑ کر جاسکتا تھا؟ ذکر کی محفل میں وہ سب اپنا آپ بھول کر منہمک ہو گئے تھے اور انہوں نے سرائے کے دروازوں کو بند کر دیا تھا۔ خراسانی کے پاس وقت کہاں تھا؟

وہ بے پناہ آنکھیں بیدار اور ہوشیار ہو لے ہو لے انا الحق کہہ رہی تھیں۔ ہر بنِ مو سے انا الحق کی صدا آنے لگی تھی اور پھر خراسانی سرائے اور سب کچھ جو اس میں تھا، جیسے ساری کائنات اس گونج میں سما جائے۔ ہوش و خرد، قلب و نظر۔

اگر میں خلق ہو کر ”میں“ کہوں

اور وہ بھی ”میں“ کہے

تو یہ میری توحید ہوئی

وہ میری توحید اور مجھ سے منزہ ہے

اگر توحید اس کی طرف لوٹ جاتی ہے، میں کہتا ہوں اسے واحد کی طرف لوٹنا ہے تو میں توحید کو بھی خلق کیا ہوا کہوں

اور پھر بنانے والے کا بنائی ہوئی تخلیق کی شے سے رشتہ؟

توحید تو اللہ سے علیحدہ ہے

ایک ذرا سی آب جو اپنے اشواقِ شدید میں بڑھ کر بحرِ بیکراں بن گئی تھی زرد و لوگ حیرت زدہ گنگ بے حس و حرکت منتظر رہے تا

کہ حسین اپنی اس حالت سے باہر آئے

اس کا یہ نعرہ مستانہ!

شبلی تہ خانے کے دروازے میں کھڑے تھے اور پھول سو نگہ رہے تھے۔

”حسین! تم تو جری اور بہادر ہو۔ جو کچھ تمہیں سپرد کیا گیا ہے، اس پردہ راز میں رکھو۔ تمہارا فہم و فراست سے یہ سب بالا تر ہیں۔“

اس کو لفظ نہ دو۔ ہاں لفظ لا محدود کو محدود کر دیتے ہیں۔ لفظ..... یہ افشائے راز ہے۔ اس کی سزا سخت ہے حسین..... گمراہی سے بچو۔“

لق و دق صحرا کا ساتھ خانہ تھا اور لوگ دم بخود تھے۔ وہ زانوتہ کئے بیٹھے تھے اور حسین کی خون کبوتر سے بھی سرخ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس کے وجود پر ریشہ تھا۔ جیسے زور کے لرزے سے بخار چڑھ رہا ہو۔ اس کی جان اتنی بے تاب تھی اور پیش کی لپٹیں دوسرے دلوں تک یوں جارہی تھیں جیسے سورج کی جلانے والی حدت و حرارت ہو۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد اس کا وجود یوں ہلایا جاتا جیسے بچے درخت کو پھلوں کے لئے شاخوں سے پکڑ کر جھول جائیں اور جب اس شاخ کو آزاد کریں تو وہ پورے زور سے دوسری شاخوں میں ملے۔

تڑپ کی یہ کیفیت دیکھ کر شبلی آگے بڑھے۔

”حسین“ انہوں نے پکارا۔

بجلی کے لہریے نے اس کے وجود کو چھولیا۔ بے قراری میں اس کو موت کے سانس کی ٹھنڈک اپنے گرد محسوس ہوئی۔

”انا الحق“ اس نے آنکھیں جھکا کر کہا۔ وہ نہایت تن کر بیٹھ گیا اور شبلی کی موجودگی کو نظر انداز کرنے کی کوشش میں اپنے آپ کو سمیٹنے لگا۔

”یہ تڑپ تو دیدنی تھی مگر راز عرش اپنی زان سے کیوں کہتے ہو۔“ شبلی پھول کو ایک سے دوسرے ہاتھ میں بدل رہے تھے۔

”انا الحق“ خراسانی سرائے کے درو دیوار کہہ رہے تھے۔ ننھی چھتوں کے راستوں سے لمبی سرنگوں سے جو جھگل میں کھلتی تھیں یہی صدا آ رہی تھی۔ عرش و فرش اور درخت یہی کہہ رہے تھے۔ دنیا جیسی کہ وہ تھی اور قریہ بغداد اپنی رونقوں میں گم، رو دو جہلہ اور ہر ذرہ ریگ پکار پکار کر کہہ رہا تھا۔ ”انا الحق“

جنید اپنے مدرسے میں درس دیتے ہوئے کچھ سوچنے لگے۔ درس میں شامل طالب لم خرقہ پوش، گدڑی سپننے والے اور فقیر وغنی۔ کبھی دلوں کو سنبھالتے اپنے ساتھ کشمکش اور حالت جنگ میں تھے۔

سارے سنائوں اور دو پہروں کی خمیدہ ساعت میں وقت رک گیا تھا اور صدائیں ٹھہر گئی تھیں۔ صرف ”انا الحق“ سنائی دے رہا تھا۔ بانگ کی طرح ساعت میں گھلا ہوا صحرا میں جس کا رواں۔

مدرسہ نظامیہ کے علماء اور فقہیا متوحش اور سرا سیمہ آنے آپ کو دیکھ رہے تھے۔ جیسے آہوئے فتنن نافے کی خوشبو کوڑا ولیدہ سوریت

کے لہریوں پر رُمیدہ اپنے گردا گرد پھرے اور اس بوئے خوش کے منبع کو تلاش کرے۔ تیز دیوانی دوڑ میں وہ اس کے تعاقب میں شکاری بن کر بھاگے اور اٹھی ہوئی دم اس کے نہایت حیران اور خوفزدہ ہونے کا پتہ دے۔ لمبی اڑان کی سی جست لگا کر وہ بڑی بڑی آنکھوں سے پیچھے بھی نگاہ رکھے۔

جنید کسی الجھے ہوئے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے یکا یک چپ ہو گئے تھے اور اس جان کے خروش کو سن رہے تھے جس کی بے حوصلگی، بے ترتیبی، عنقریب اس سارے فرقہ درویشاں کو مبتلائے عذاب کرنے والی تھی۔ صوفیا بغداد جو جرات و بے باکی کو پردوں میں پوشیدہ رکھتے تھے اور جن کے علم کی کوئی انتہا نہ تھی جو اپنی کھال کو بچانے کی نہیں، حرمت تو حید کے گردا گرد نثار ہونے کو حاصل حیات سمجھتے تھے۔ یہ مبتدیوں کی توحید تھی کہ اپنی ذات کے وساوس اور خوف بھی قائم رہیں اور آدمی اس کو اپنا واحد و احد خدا سمجھے۔ اپنے یقین کی ڈوری اسی سے باندھ کر رکھے۔ اپنی امیدیں اور ارادے اس کو سمجھنے خوف ورجا میں بھی گرفتار ہو۔ پھر اس کی وحدانیت کا اقرار کرے۔ اس سے محبت کرے اور اس کی محبت میں غرق ہونا چاہے۔ ہو جائے اس بحر کی شنوری کرنے کے قابل بنایا جائے اور جلوہ جاناں سے شاد کام ہو اور میثاق عہد یاد کرے تو اپنے خدا سے اپنا اقرار بھی اسے یاد آئے مگر یہ کلمہ انا الحق۔ منصور کے بیٹے حسین کو کیا ہو گیا تھا۔

اس شام مدرسہ نظامیہ کے حضرت جنید کے ہاں ایک مجلس مشاورت ہوئی۔ ابن عطاء دؤم اور شبلی اور لوگوں کے ساتھ حاضر مجلس تھے مگر ان تینوں میں سے کسی نے کوئی بات نہ کی۔ جنید اس پہلے مقدمے کا ذکر کر رہے تھے جس میں غلام الخلیل نے خلیفہ ک عدالت میں صوفیاء پر الزامات عائد کئے تھے اور ان کی تعلیمات کو نو جوانوں اور خود اسلام کے لئے زہر قاتل قرار دیا تھا۔ اگر خدا کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو چھ نکار خود اسلام کے لئے زہر قاتل قرار دیا تھا۔ اگر خدا کا فضل شامل حال نہ ہوتا تو چھ نکار مشکل ہو جاتا۔ اس لئے لوگوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں احتیاط کرنی چاہئے۔

”اے سردار طاقتہ۔“ سمنون محب نے کہا ”حسین دیوانہ نہیں، صرف خدا کبھی کبھار اس اس سے لے لیتا ہے۔“

”شدت اسے لے ڈوبے گی۔ یوں عوام کے درمیان نشست جمانا اور خدا سے اپنا رشتہ بے حجابانہ اعلان نہیں کرنا چاہئے۔ خدا بہت غیور ہے۔ پردوں میں رہتا ہے اور رازوں کو سرعام کہنے کی سزا دیتا ہے۔“ ابو حمزہ نے کہا۔

فاطمہ نیشاپوری ایک تیز دھار تلوار کی طرح خفگی اور جلالت میں تھیں۔ ”خدا اور آدمی کا عشق لوگوں کو کیوں چونکا دیتا ہے۔“

”لوگوں کی غیرت کہ وہ صوفیوں کا خدا کے نام کے ساتھ وہ سب منسوب کرنا پسند نہیں کرتے جو صوفیا کہتے ہیں۔ ان کی عقلیں ان

حدوں سے ادھر ادھر کہاں دیکھ سکتی ہیں۔ لوگ ان مناجاتوں، عبادتوں، ریاضتوں کو نہیں سمجھ سکتے جن سے جان فروش میں گرفتار ہوئی ہے۔“ جریری نے فاطمہ نیشاپوری کی طرف منہ کر کے کہا۔

”حسین ابن منصور سب کو کسی نہ کس مصیبت میں مبتلا کریں گے۔“ شبلی نے مسکرا کر چاروں طرف دیکھا۔

”کیا ان کو روکا نہیں جاسکتا۔ باز رکھا جائے تو کیا وہ ہوش و خرد کی طرف لوٹ نہ آئیں گے۔“ دائرے میں سے کسی نے پوچھا۔
شبلی مسکرائے اور پھول کو اس کے ذخیل سے گھماتے رہے۔

ہولے ہولے یہ نہایت نرم رو لوگ مباحث میں الجھ گئے اور نشست طویل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ حضرت جنید کی خادمہ زیتونہ نے اعلان کیا کہ ہسائے میں کوئی وفات پا گیا تھا۔ لوگ منتظر تھے کہ جنازہ اٹھے اور اس کے لئے وہ ان کی شرکت چاہتے تھے۔
اٹھتے ہوئے جنید کہنے لگے۔ ”میں تو مدرسہ کا استاد اور فقیہ ہوں، صرف حسین کو دیوانگی اور اس کا اعلان حق مجھے نہایت بد صورت لگے ہیں۔ میں چاہوں گا کہ اگر معاملہ آگے بڑھے تو میں دربار کی حاضری سے معافی قرار دیا جاؤں۔“

دوئم عطا اور شبلی نے پوچھا ”اگر طلبی ہوئی تو کیا جواب ہوگا؟“

”طلبی“ جیند جاتے ہوئے کہنے لگے ”حسین کا اعلان دیوانگی ہی نہیں شریعت میں رخنہ اندازی تھی اور خلق اس سے فساد میں مبتلا ہو سکتی تھی۔ خلق کی خاطر اسلام کے لئے ہمیں وہی کچھ کہنا تھا جو شرع کا حکم تھا۔“

خلقت حسین کی وجہ سے فتنے میں مبتلا ہوئی جاتی تھی۔ ذروں کی ممکنات! ہر ذرہ ایک مکمل جہان ”انا الحق۔“

اس کا حلقہ عقیدت منداں اور اس سے حسن ظن رکھنے والے لوگ خراسانی سرائے کے باہر جمع ہو کر اس سے دعا کے طالب ہوتے تھے۔ ذکر کی محفلوں میں شرکت کرنے والوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی اور ایک اژدھام اس کی ذات سے مستفیض ہونے کے لئے منتظر رہتا۔ بغداد میں ایک سیلاب انواہوں کا ابلا پڑتا تھا۔

لوگ اس کے ”انا الحق“ کو شک و شبہ سے دیکھتے اور پھر اس کے معتضد ہو جاتے تھے۔ وہ تماشا بن گیا تھا۔ اسرار جہاں اور اسرار حال کی سمجھ نہ رکھنے والاے مرد اور عورتیں امنڈے پڑتے تھے۔ وہ اس صورت حال سے بے خبر اپنا تار حیات پر مضرب بے خودی سے نغمہ الست سنتا تھا۔ اس کا دھنکا ہوا وجود ہوائے الوہیت کے دوش پر جانے کن جہانوں، کون سی دنیاؤں میں محو پرواز تھا۔ خراسانی نانباکی ایک بڑے راز کی طرح اس کی حفاظت کرتا مگر سیاب کو بھلا بند کیا جاسکتا تھا۔ پہاڑ پر شور ندی کی طرح اس کی آواز ہر بند کو پھلانگ کر صور اسرافیل بن گئی تھی۔

قاضی بغداد کے حکم سے وہ اسے خراسانی سرائے سے بندی خانے میں لے آئے۔

نوری خفا تھے کہ حسین نے ان سب کو رسوا کر دیا تھا۔

سمنوں مسکرائے۔

”بھلا راہ محبت میں کوئی کسی کا رفیق ہوا کرتا ہے۔ حسین اس نعرہ مستانہ انا الحق سے کسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا تھا۔“

ابوحزہ نہایت غمزہ حضرت جنید کے پاس آئے۔ بہت دیر خاموش بیٹھے رہے۔

”یہ آتش شوق جو سیل بے پناہ بن کر بغداد کے اوپر بہہ رہی ہے حسین کی التهاب ذات تک ہی محدود نہیں ہو سکتی تھی۔“

مدرسہ نظامیہ کے علماء اور فقیہ اور مدرس اس اسرار سے آگے کوئی بند نہیں باندھ سکتے تھے کہ یہ راز افشا نہ ہونے پائے۔

جنید سوچتے ہوئے اور بہت افسردہ بیٹھے تھے۔ جب زیونہ نے انہیں یاد دلایا کہ ہمسائے میں لوگ جنازہ اٹھائے جانے کے

لئے ان کے معطر ہیں تو وہ گویا مراقبے سے باہر آئے۔ ابوحزہ سے کہا:

”کبھی ایک قطرہ بھی لبریز پیالے کے لئے بہت ہوتا ہے بہت زیادہ اور یہ کون بتا سکتا ہے کہ حدود کہاں ہیں۔ میں نے اصول

وضع کرنے اور اسرار کو اپنے طور پر سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے۔ یہ توفیق کہ کون اس چشمہ حیواں سے آب حیات کی تلاش کے بعد واپس

آ سکتا ہے میں جان نہیں سکا۔ ابوحزہ حسین کے لئے اس کا حال کیوں ناقابل برداشت ہو گیا ہے۔“

پاس کی مسجد میں اذان خشک زمین پر بارش کے قطرے کی طرح سننے والوں کے دلوں پر ایک سنسناہٹ پیدا کرتی ہوئی روح و

قلب دل و جگر کو رحمتوں کا پیغام دیتی ہوئی برسنے لگی تھی۔ وضو خانوں میں جاری پانی پر لوگوں کا جھوم تھا اور درود و سلام کی تکرار سے فضا

معمور تھی۔ حق، حق، انا الحق۔

حسین کا جرم کیا تھا۔

یہ اس کے نعرہ انا الحق کی آزمائش کی گھڑی تھی۔

ابو یعقوب قطع اور عثمان کی میں زینب کے بعد وہ تلخی آہستہ آہستہ کم ہو گئی تھی۔ پھر وقت نے بھی اس دراز کو پر کیا۔ وہ دونوں کسی

نہ کسی طور حسین سے وابستہ تھے اور لفظ انا الحق کو سن کر نہایت پریشان ہوئے تھے۔ عثمان سوچتے تھے یہ تربیت اور تہذیب نفس کی کمی

تھی۔ حسین نے کبھی کسی مرشد کے سامنے اپنے آپ کو پیش نہیں کیا تھا۔ جیسے درخت کی فالتوں شاخوں کا کاٹنا اور سنوارنا ضروری ہوتا

تھا، بعینہ راہ ہدایت پر چلنے والے کو قدم قدم پر دعاؤں اور نظر التفات کی ضرورت ہوا کرتی تھی۔ رہنما کے بغیر اس دشت بے در میں

آدمی بھٹک جاتا تھا اور حسین بھٹک گیا تھا۔ جن تجلیوں تک پہنچ کر وہ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا، ان کی برداشت کے قابل اسے بنایا جاسکتا تھا۔ اگر وہ کسی واقف راز سے خیر و برکت حاصل کرتا مگر وہ گنج نامہ کو اپنے طور پر سمجھنے میں لگمکردہ راہ تھا اور آندھیوں کی زد پر ایک ذرہ نا چیز کی طرح اٹھایا، گرایا، پٹخا جا رہا تھا۔ اسے اپنے آپ پر کوئی دسترس نہ تھی۔ سب سے بڑی سعادت تو راہ حق میں احوال کو پہچاننا تھا۔ ابلیس نے انا خیر کہا تھا اور عرش کی بارگاہوں، جنت کے مرغزاروں اور قرب الہی سے راندہ درگاہ بن گیا تھا۔ انا الحق کہنے والے کا حشر معلوم؟

قطع کو اس کی آزادی روی پسند تھی۔ اپنے طور پر فیصلے کرنے کی صلاحیت۔ اپنی ممکنات کی نہایت کو سمجھنے کی تڑپ اور بے قراری۔ اس راہ میں مشقت اٹھانے کا حوصلہ۔ یہ باتیں کسی اور میں نہ تھیں یا انہوں نے حسین کو جن مقامات سے گزرتے پایا تھا، زینب کے گزر جانے کی خبر انہیں بہت زمانوں کے بعد ملی تھی۔ منصور کے پوتے دولت دنیا اور طلب جاہ کے عام راستے پر چل نکلے تھے تو یہ باعث فخر بات تھی۔ بہر حال دنیا اتنی ناکارہ شے تو نہ تھی کہ اسے بیکار سمجھ کر دھتکار دیا جائے۔ خراسان کی روز روز بدلتی حکومتوں کے لئے حسین کے بیٹے معتبر رفقاءے کار تھے کیونکہ وہ اپنے کام سے وابستگی رکھتے تھے اور کسی دربار کے عہدے کے منتظر نہ تھے۔ وہ نہایت معزز مسلمان جن کے خون کی آبیاری میں آتش پر سوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کو لگا دیا تھا اور بیاض کی خوشبو سے بھری ہواؤں نے ان کی چمن بندی کی تھی۔ قطع نو اسوں کی طرف سے مطمئن تھے مگر حسین یہاں وہاں ایک اجنبی کی صورت ہی رہا جس کی واردات دل سے رسوائی کی طرف لے گئی تھی۔ پتہ نہیں اسے حوصلہ اور برداشت کی نعمتوں سے محروم کیا رکھا گیا تھا۔ خدا اس سے کیا چاہتا تھا۔ کچھ زندگیاں دوسروں کے لئے باعث عبرت بنائی جاتی ہیں۔ نہایت دشوار راہوں سے پراسرار قوتوں کے عقب میں وہ درداٹھانے کی لذت سے آشنائی کی تو جاتی ہیں مگر درد کو عام نہ کرنے کی وجہ سے انہیں لوگوں سے بیگانہ بنا دیا جاتا ہے۔ ہوش و خرد سے اور اپنے آپ سے۔

حسین تو بندی خانے میں ہمیشہ سے تھا۔ اپنی ذات کے قید خانے سے نکل کر وہ جس کی قید میں تھا، وہاں سے نکلنا صرف خیال اور محال تھا محض جنوں!

قطع نے اپنے سر کو جھٹکا اور نماز کے لئے خانقاہ کے طویل دالانوں کی طرف بڑھ گئے جہاں تسبیح و تہلیل سے فضا معطر تھی۔ بخ بستہ ہواؤں کے چلنے سے موسم نے بغداد کو خوفزدہ کر دیا تھا۔ کوہ البرز سے چلنے والی برف بار آندھیاں زندگی کو معطل کر دیتیں۔ دجلہ میں لہریں آہستہ خرام ناقاؤں کی طرف ناز سے اٹھلاتی کشیوں کی مہملوں کی طرح ”جن میں نازک آہگینوں کسی سی کنواریاں

ہوں) اپنی پشت پر بلند کرتیں جبکہ ٹھٹھرے ہوئے درخت آب رواں میں اپنے تاریک سایوں کا لرزنا بھی برداشت نہ کر پاتے۔ راتوں کو مغربی کنارے کے محلات کے باہر محافظ دیکھے ہوئے نیم خوابیدہ سطح آب پر نظریں جمائے گرم باددشت کے خواب دیکھتے اور اوگھٹتے تھے۔ شاہراہیں ویران راستے خاموش اور محلے چپ ہوتے تھے۔ لوگوں کا سیل رواں جو بازاروں میں خانقاہوں، مدرسوں، مسجدوں، نصرانی عبادت گاہوں کی طرف جاتا تھا نہ ہونے کے برابر تھا اور ستارے بے ستونوں کے دھواں دھواں آسمان کی نیلاہٹ میں تیزی سے چمکتے۔

حسین نصر حاجب کے زندان میں اسیر تھا۔

ام مقتدر کی سب رفتار کشتی کنارے سے لگی اور پچھلے گلیاروں سے ہو کر بڑی راہوں پر کھلتے تھے وہ اپنی کنیزوں کے ہمراہ (جنہوں نے اپنے روشن چہرے نقابوں کے پیچھے چھپا رکھے تھے) اس طرف رواں ہوئی۔ ان کا نصرانی غلام راستہ دکھاتا آگے جا رہا تھا اور پہچانے جانے کے ڈر سے وہ سب سیاہ رداؤں میں لپیٹی تھیں۔ سب بستر تاریک رات کا حصہ بنی ہوئیں۔

شغب کا دل انجانے خوف سے دھڑک رہا تھا۔ اسے حسین کے اس تصرف کا بتایا گیا تھا کہ مستقل میں جو پوشیدہ ہو تو وہ جان لیتا تھا۔ مستقبل میں اس کے لئے اس کے بیٹے کے لئے اور عباسی خلافت کے لئے کیا تھا۔ جاننے کی خواہش اسے زنداں کی طرف لئے جاتی تھی۔ ترک بادشاہ گروں کی نظر التفات کدھر ہوگی۔ غلام مونس جس نے چند سالوں میں نہایت اہم عہدوں پر ترقی حاصل کر لی تھی، وقتی مغائرت کے بعد اب کیا کرنا چاہے گا۔ خود مقتدر جو ماں کے اثر سے آزاد ہونے کے لئے کروٹیں لے رہا تھا، کیا ایک پر خلوص اولاد ثابت ہوگا۔ خلیفہ کے مزاج میں بہت زیادہ دخیل حامد بن عباس کہیں وزارت عظمیٰ کا خواب تو نہیں لے رہا۔ آنے والا زمانہ کیا آفتیں یا مسرتیں لانے والا تھا۔ وہ آتش فشاں کے دہانے پر تھی اور وسوسوں، ہموں، خوف سے پریشان رہا کرتی تھی۔ گزرے زمانوں کے فسانوں میں اسے اپنے آنے والے دنوں کی پرچھائیں دکھائی دیتی تھیں۔ ہر آہٹ پر کان رکھے، چوکنی صحراؤں میں گھومنے والی ہرنی کی طرح وہ سایوں سے بھی بدگمان ہو جاتی تھی۔ شاہی زندگی میں سکون کے سوا سب کچھ تھا اور شاید حسین اسے اس متاع گرانیہ کا نشان دے سکے۔ وہ سوتے اور جاگتے میں جو خواب دیکھتی تھی، ان کی اصل کیا تھی، یہ جاننا اس کے لئے ضروری تھا۔

برف پوش وادیوں میں چراگاہوں اور شفاف پانیوں کے ساتھ گزرا بچپن اسے یاد آتا تھا جہاں غاروں میں اس کا کنبہ سرد موسموں میں تقریباً بند ہو کر بھیڑوں کے ساتھ ایک ہی چھت تلے گزارا کرتا۔ بھیڑوں کے جسموں سے نکلتی ان کے موت اور گوبر کی بو ان کے سانسوں میں بھی رچ جاتی۔ مینگنوں سے جلائی گئی آگ پر یکا یا ہوا شور بہ اس دھوئیں کی بساند لئے ہوتا اور چربی کے ساتھ

مزرے میں بھی ملا رہتا۔ مدھم روشنی میں وہ اس کی ماں رنگین تاؤں سے لباسوں پر اور ٹوپوں پر موتی ٹانگتیں اور نیل بوئے بناتیں۔ شوخ رنگ زندہ رنگ جن کی ترتیب ان کے تصور سے پھولوں کا مرقع بن جاتی تھی۔

آزادی کے دنوں کا انجام آخر آ پہنچا۔ کنیزوں کے سوداگر جب ان دور دراز پہاڑی علاقوں میں آئے تو انہوں نے اس کی بہنوں میں سے اسے چن لیا۔ چشمے اور مرغزار پہاڑوں کی نیلی ہوا میں اور وادیوں میں گونجتی صدائیں سب کسی اور زندگی کی طرح فراموش ہو گئے۔ تربیت گاہوں سے نکل کر جب وہ بغداد لائی گئی اور مقتدر کی ماں بنی تو اس نے اپنے مقدر سے صلح کر لی تھی۔ دربار اور اس کی ریشہ دوانیاں، سازشیں، طاقت، سیاست سب ایک رنگین ردا کی طرح اس کے سامنے پھیلے تھے تا آنکہ وقت نے اس کو تا کا اور مقدر اس پر مہربان ہوا۔ مکتفی نے اپنے کسب بھائی کے حق میں وصیت کی اور وہ تخت خلافت پر لایا گیا۔ اسے عہدوں اور حکومت کی ہوس تو نہ تھی مگر جب قسمت اس پر مہربان ہوئی تو اس کو سر جھکانا اور لوگوں کی فرش راہ نظروں پر قدم دھرنا بہت اچھا لگا۔

قید خانے میں اندھیرا تھا اور صرف چراغ کی کمزور لولرزاں تھی۔ وہ سلاخوں سے پرے روشنی کے دائرے سے باہر رک گئی۔ تاریکی کی طرف اشارہ کر کے حسین نے کہا۔

”آگے آؤ۔“

شغب نے چیخ کو روکنے کے لئے ہاتھ اپنے منہ پر بھینچ لیا۔

وہ نہایت عاجزی سے جھک گئی۔ اسے سب وقتوں سے زیادہ اس گھڑی خدا اور اس کے مقربین کی نظر کرم کی ضرورت تھی۔ اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے سینے کی حدوں کو توڑ کر باہر نکل جائے گا۔

”پردہ غیب میں جو ہے وہ سوائے خدا کے کون جان سکتا ہے امیر المومنین۔“

”میں صرف دعا کی طالب ہوں۔“ اس نے سلاخوں کو تھام لیا تھا۔

”ام مقتدر! کیا آدمی مقدر سے لڑ سکتا ہے؟“ حسین نے چپٹ کی طرف دیکھا ”بجدا نہیں ابن منصور! میں اسی لئے دعا کی طالب ہوں کہ مجھے مستقبل کی تاریکی سے خوف آتا ہے۔“ شغب کی آواز آنسوؤں سے بھاری تھی۔

پھر اس نے دیکھا کہ حسین کا وجود آندھی کے دوش پر سوار گھاس کے تنکے کی طرح کانپ رہا تھا۔ شعلے کی طرح لرزاں چراغ کی لو کی طرح ترساں۔ ام مقتدر نے ایک جلانے والی تپش کو اپنا احاطہ کرتے پایا۔ تیز گرم ہوا کے جھونکے جو سلاخوں کو ناقابل برداشت حدت سے پگھلا رہے تھے۔ پھر وہ ہلکی ہوتی چلی گئی اور بے وزنی کی کیفیت میں اوپر اٹھالی گئی تھی۔ بلندی سے سارا بغداد اس کے

قدموں تلے تھا اور اس کی نگاہیں گھروں، گلیاروں، عبادت گاہوں، محلات و بارگاہوں کو دیکھ سکتی تھیں۔ اس کے سارے خوف اور سوال اسے بیجا اور فضول لگ رہے تھے۔ آدمی اتنے ذرا ذرا سے اور نہایت ہی کمزور حشرات الارض تھے۔ پھر وہ بلند ہوئی تو بغداد دھوپ میں چھپ گیا۔ نہری ہوئی فضا سے اس نے نیچے کی طرف نظر کی۔ سب دھول تھا بے معنی لایعنی۔ لا حاصل۔

اغول کے بیٹے حسین کی گمشدگی کو ایک زمانہ ہو گیا تھا۔ عبید اللہ المہدی کی سلطنت کی سرحدیں اس عرصہ میں پھیل گئی تھیں۔ اس نے اپنے اس رفیق اور جانثار کو جس نے بغداد کی خلافت کے مقابلے میں ایک بڑی خلافت کی بشارت دی، کوشش کی، اپنی محنتیں اور محبتیں قربان کی تھیں۔ نامعلوم وجوہ کی بنا پر قتل کروایا تھا اور حسین کو عبید اللہ کے ساتھیوں میں شامل ہونے کی وجہ سے موت کا پیالہ چکھنا پڑا جو امام کی طرف سے آئے!

حامد بن عباس کی طرف اس خبر کا سفر بہت ہی آہستہ ہوا۔ جو آدمی یہ خبر لایا، وہ اس گروہ میں تھا۔ کسی نہ کسی طرح جان بچا کر بھاگا تھا اور کئی سال ادھر ادھر بھٹکتے رہنے کے بعد چھپتا چھپتا یہاں پہنچا تھا۔ وہ مہدی کے باپ الحلبیہ کے مقررین میں سے تھا اور ان کے حکم سے اس نے عبید اللہ کے ساتھ مغرب کی طرف مراجعت کی تھی۔ اسے عبید اللہ کی بے قراری دیوانگی، خلوص اور عاجزی کا بہت احترام تھا۔ وہ برہنہ پا عبید اللہ المہدی کے استقبال کے لئے نکلا تھا اور سلجماسہ میں قید کئے جانے کے دوران رہائی کے لئے کوشاں رہا تھا۔ مختلف علاقوں سے داعی جو رقم جمع کر کے لائے تھے، وہ اس نے مہدی کی نظر کی تھی اور اس کا خون تک آبیاری کے کام آیا تھا۔ دیوانوں کا انجام دار ہی تھا۔

اس دارو گیر کی گھڑی جب اس نے حسین سے بھاگنے کا کہا تو اس نے نہایت خوش دلی سے کہا تھا۔

”موت کو آخر آنا ہی تھا۔ کسی طور کسی رنگ، کیا تم زندگی کے اتنے شیدائی ہو؟“

”یاسیدی! اس وقت تو مجھے فرار میں نہایت خفت محسوس ہوئی مگر زندہ رہنا اور ایک کھلی فضا میں سانس لینا بہر طور خدا کی رحمت ہے۔ میں ایک تنگ درتپے سے نکلا تھا اور ستاروں کو دیکھ کر میرا دل زندگی کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ زندہ رہنا بہر طور ایک عظیم فتح ہے۔ جب چاروں طرف سے موت کی یورش ہو۔“

حامد کے منہ میں راکھ کا مزہ تھا اور بلند شعلے اس کے گردنا چنے والے جنون کی طرح محور قص تھے۔

تو سب لایعنی، بے معنی لا حاصل!

وہ ایک دشت تنہائی میں کھڑا تھا اور ریگ رواں کے بھنور میں نہایت آہستگی سے ڈوب رہا تھا۔ وہ آگ کے بحر خاد پر ایک

آتش گرفتہ تینکے کی طرح اپنے وجود کی حدت سے جل رہا تھا۔ اس کی عمر عزیز لا حاصل تمناؤں میں گزری سوختہ جان! دل گرفتہ رنجور و مجبور عہدوں اور طاقت اور دربار خلافت میں اس ک رسائی سے اسے منفعت نہیں ہوئی..... آخر کیوں؟ ایوان اس کے سامنے منہدم ہو گئے تھے۔ اب وہ کیا کرے۔ احساس شکست خوردگی ہی باقی رہا تھا۔ وقت اس کے ہاتھوں سے ریگ رواں کا دھارا بن کر پھیل گیا تھا۔ سارا جاہ جلال، کنیزوں سے آباد قصر کا ہر کونہ حکم دینے اور منوانے کی قوتیں سب لا حاصل! یعنی۔

وہ خانہ باغ کی روشوں پر ٹہکتا رہا۔ تاریک رات میں جب محافظوں کی آوازیں اور چالیں ہر کونے کو آباد کیں تھیں، وہ وحشت زدہ دیوانہ بنا اپنے ہی گرد طواف کرنے والا پروانہ تھا۔ اس نے آغاز میں ایک لائحہ عمل اپنے لئے تیار کیا تھا۔ سارے زاویے صعود و ک طرف اشارہ کرتے ہوئے سارے خطوط بالترتیب مائل پرواز نقطوں سے جو نقشہ بتاتا تھا اس میں کہیں جھکاؤ نہ تھا۔ پریب بیک قطب نما کی سوئی گریوں گئی تھی۔ لا یعنی! لا حاصل!

اس نے حسین کی تربیت کرنے اور اسے شہزادوں کی صفات سے متصف کرنے میں کوئی سکر نہ اٹھا رکھی تھی۔ کلام پاک کے رموز و اسرار، تفاسیر، فقہ، حدیث، فلسفہ، ایک عمدہ سپاہی کی سی برداشت سب اس میں موجود تھیں۔ جن حرب اور یہاں تک کہ علم الکلام مذاہب کا تقابلی مطالعہ، کئی زبانیں جن پر سوائے اس کے اور کسی کو عبور نہ تھا، وہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا۔ پھر ایک بیک کہیں تو کوئی غلطی رہ گئی تھی جس رخنے سے موت اور ہجرتی ہواؤں نے اس کا احاطہ کر لیا تھا۔ وہ چپکے چپکے عبید اللہ المہدی کے فرقے میں داخل ہوا اور آخر مغرب کی طرف چلا گیا۔ یہاں تک کہ موت نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ موت سے کسی کو مفر نہیں مگر موت نے اس کا گھر کیوں تاک لیا تھا۔ وہی حامد بن عباس اس کی نظروں میں کیوں تھا!

اغول کے چہرے پر کھنڈی زردی کے ساتھ ایک صبر کی جھلک ہوتی تھی۔ اتنے زمانوں کی دوری سے اب اسے سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ اپنی حالت پر راضی ہوتے اور خدا کی مرضی کو تقدیر الہی جان لینے کے بعد کی طمانیت تھی جس میں کوئی گلہ یا شکایت نہ تھی۔ اسے اپنے آپ سے کوئی ہمدردی یا مقدر پر غم نہ تھا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ اغول اپنی نہایت خلوتوں میں بھی اپنا آپ سیٹے رہتی تھی۔ محلات اور چمک دمک اسے کبھی پکڑ نہ سکے۔ دو انسان اس کی زندگی میں داخل ہوئے اور دونوں اب موت کی آغوش میں پناہ گیر تھے۔ عالم جاوداں میں! اس کے سوالوں اور طوفانوں سے نا آشنا وہ اجنبیوں کی طرح اس کے دروازوں کے سامنے سے رخصت ہو گئے تھے۔ کیونکہ اس کا دل آپ سے حساب فہمی کر رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سیلن اور بوکی اس کیفیت میں کوئی ذی روح وہاں قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ نہ کوئی خیال اور نہ ہی کوئی محبت!

حسین اور ام حسین دونوں کی دسترس سے باہر رہے ہمیشہ اور آدمی کا اختیار کس پر تھا۔

اغول عجیب سایوں اور روشنیوں کی سی زندگی گزار کر وہاں دشتِ سماویہ میں سو گئی تھی۔ وہ ابن منصور کو روح اللہ سمجھتی تھی۔ میٹل مسیح، مہدی آخر الزماں، موعودہ نبی جو مردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا اور وہی اب نصر حاجب کے زنان میں کئی سال سے تھا۔ اغول کا روح اللہ قید میں تھا۔ غم کے باوجود ہنسی کا دورہ سا اس پر پڑا۔ جیسے دالان اندر دالان گوشے اونچی چھتوں والے کشادہ ایوانِ صناعی کا نمونہ بارگاہیں اور طویل و عریض غلام گرد شیش سب اس کے ساتھ مل کر اس روح اللہ کی ہنسی اڑا رہے تھے۔ پھر اس کا دل ایک خلا سے معمور ہو گیا اور خلا نے اس پر محیط ہو کر اس پر طاری ہونا شروع کر دیا۔ کوئی اس طلسم سے پرے کہہ رہا تھا۔

”حامد بن عباس کہاں ہے؟“

یہ گونج ایک تیز چٹچ کی طرح اس محیط کے اندر سے ابھری۔ اسے اپنے چاروں طرف تسخراڑاتی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ خالی ایوانوں اور کھلے درپچوں اور بند کمروں اور نیلے آسمان تلے شور مچاتے پرندے فضا میں ڈبکیاں لگاتے کوئے سب کہہ رہے تھے کہاں ہے..... کہاں ہے..... کہاں ہے.....!

مہمانوں کی آمد آمد تھی۔ قصر کے راستوں پر روشنیاں درختوں کی گھنی شاخوں اور پتوں کے اندر پوشیدہ تھیں۔ جیسے ستارے ضو فشاں تو ہوں مگر ظاہر نہ ہوں۔ لمبی راہداریاں اور ایوان پر اسرار رنگوں سے آراستہ تھے اور ستونوں پر لپٹے پھولوں اور بلند و بالا چھتوں میں سے آبشار کی طرح گرتے نور کی وجہ سے یہ نشست گاہ جہاں حامد بن عباس لوگوں کا استقبال کر رہا تھا نہایت پرکشش تھی۔ کنیزیں ساقی تھیں اور ان پر خلد کی حوروں کا گمان ہوتا تھا۔ وہ چلتی نہیں اڑتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ بالوں میں چھوٹے چھوٹے گل رنگ سجائے وہ کسی اور سیارے کی مخلوق تھیں۔ شوخ اور دلیر خاموش اور خوفزدہ دلربا اور نظر باز آہستہ خرام اور شرمیلی۔ لوگ باتیں کرتے اور نگاہ غلط انداز سے ان کی طرف دیکھ لیتے۔ شمشاد قد اور ہوش و خروش کرد و شکار کرنے والی حرم کی یہ ساری آبادی خدا معلوم کہاں سے آئی تھی۔ دور دراز ملکوں کی نہایت حسین عورتیں جن کو آسمان کی نظریں بھی دیکھنا چاہیں مگر حامد کا دل اسے یاد کرتا تھا جواب نہ تھی۔ جو ان مجموعوں میں کبھی نہ تھی مگر پس پردہ روشنی کی طرح ہر چہرے کے پر تو میں شامل رہی تھی۔ رہنے والی تھی۔ اس لئے وہ کبھی اسے فراموش نہ کر سکتا تھا۔ پرسکون، مکمل خاموش باوقار تمکنت۔ وہ ایک مکمل خاتون تھی اور اس لئے اس کا دل عجیب ہیجان اور اذیت کی کیفیت میں سے گزرتا رہتا تھا۔

نصر حاجب کو بہت نمایاں جگہ پر بٹھایا گیا اور اس پر خصوصی توجہ دی گئی تھی۔ لوگوں نے محسوس کیا تھا کہ صاحبِ خانہ اس کی طرف

بہت مہربان تھا۔ سب سے عمدہ غلام نے نہایت مودب طریقے سے اسے نبیذ پیش کی تھی اور نقرئی جام جن میں قیمتی پتھروں سے مینا کاری کی گئی تھی اسے پیش کیے گئے۔ نصر کا دال گھرایا ہوا تھا۔ آخر اس سے یہ خصوصی سلوک کیا جبکہ محفل میں تقریباً عہد دیار اور اکثر وزراء جو بغداد میں حاضر تھے موجود تھے۔

موسیقی خوشبو کی طرح ہر سو پھیلی تھی جیسے دیواروں اور فرش اور چھتوں سے پھوٹ رہی ہو۔ فضا اس سے معمور تھی اور گفتگو کو روک کر اسے سننے کی زحمت اٹھانا نہیں پڑتی تھی۔ خورد و نوش کا انتظام نہایت عمدہ تھا۔ شاہی دعوت کی طرح مکمل اور ہر نقص سے بالاتر۔ لوگ گروہوں میں منتشر ہو کر فراغت کے بعد باتیں کر رہے تھے۔ جب حامد نے نصر کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

”سیدی! آپ کا خانہ باغ بہت خوبصورت ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ ان روشوں کا ملاحظہ کریں جو میں نے اپنے چمن میں ابھی ترتیب دی ہیں۔“

وجہ کا پانی چھوٹی چھوٹی نہروں میں رواں تھا اور پھر آبشار کی صورت میں نیچے گلستاں کی طرف گرتا تھا۔ حامد اور نصر آپ رواں کے درمیان گھومنے لگے۔ عرش تاروں سے مزین اور نیلا ہٹ قریب آگئی تھی۔ خیمے کی طرح تنا ہوا آسمان زمین کو ڈھانپے ہوئے اور نارسائی کی حد تک دور نہیں تھا۔

ٹہلے ہوئے وہ ایک پھولوں سے ڈھکی پہاڑی کے زینوں پر بیٹھ گئے۔ نصر نے کہا ”میں تو اس خوبصورتی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا سیدی۔“

حامد کچھ سوچتا ہوا خاموش اور نہایت اداس تھا جیسے یکنف ایک عجیب تھکن اس کو گھیر لے۔

نصر نے اس کی طرف دیکھا اور خاموش ہو گیا۔

حامد نے بہت دیر کے بعد کہا: ”مگر سب لا حاصل، لا یعنی بیکار۔“

”کیوں؟“ نصر نے کھڑے ہوئے ہوئے کہا۔ ”یہ ساری بے نظیر خوبصورتی بیکار کیوں؟ جب اس سے ایک دل بھی مسرت محسوس کرے تو یہ بیکار نہیں۔“

”میں اس ایک دل کی بات کر رہا تھا جو اس مسرت کو محسوس نہیں کر سکتا۔“ حامد نے منہ نصر کی طرف کر کے کہا۔

”سیدی! آپ کے پاس کیا نہیں ہے۔ جاہ و دولت، صحت و مسرت تقریباً ایک مکمل زندگی۔“

”تقریباً ایک مکمل زندگی۔“ حامد نے نصر کے لفظ دہرائے۔ ”کیا یہ مکمل زندگی ہے جس شے کو چھو لو وہ راکھ بن جائے۔ تمہارا سراپا

ایسا زہرا آلودہ ہو کہ تمہاری ذات سے متعلق سب کچھ اندھیرا ہو جائے۔“

نصر کے لئے یہ انکشافات بہت تھے۔ اسے سانس رکتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کا دل حامد کی محبت سے بھر گیا اور اتنے بڑے جہان دیدہ سپہ سالار، وزیر، عہدیدار اور عمدہ دنیا دار کی زندگی کا یہ پہلو اسے نہایت عجیب لگا۔ اسے معلوم تھا کہ حامد کی ایک خوب روکنیز مسافت طویل کے دوران نہیں رہی تھی مگر یہ قصر تو روشنی کی سی رنگارنگ صورتوں اور غیر ملکی لونڈیوں سے پر ایک حرم بھی مشتمل تھا اور وہ ساری داستانیں جو یہاں وہاں سے اس تک پہنچی تھی غلط تو نہ تھیں۔

”کیا کوئی ایسا نہیں جو اپنی دعا سے یہ مقدر پھیر سکے۔ صاحب نظر، مرد خدا جس کی گاہ سے تقدیر بدل جائے۔

حامد کی آواز میں عاجزی، درماگلی، خستگی، بیچارگی تھی۔ کسی رو باہی کا شائبہ تک نہیں تھا کہ کے لئے وہ نہایت مشہور تھا۔

نصر سوچنے لگا۔ ”کیا وہ اس سے حسین کی بات کہے۔ حسین جو صاحب نظر تھا اور جس کی دعائیں مقدر پھیر دیتی تھیں۔“ اسے وہ بے پناہ آنکھیں یاد آئیں وہ نحیف و نزار قیدی جو اس کے سپرد کیا گیا تھا کہ انا الحق کہتا اور نہایت جنون و تشنج کی حالت میں لرزہ بر اندام ہوتا تھا اور جب ان کیفیات سے باہر ہوتا تو نوافل میں خشوع و خضوع اور الحاج و زاری سے گریہ کننا نہایت خاموش لگا رہتا۔ اسے یاد تھا کہ اس نے باقی بندیوں کو کیسے آزاد کر دیا تھا۔ بس نظر بھر کر کسی کی طرف دیکھ لینا ہی سب کچھ بدل دیتا تھا مگر صبر و سکون سے وہ اپنی عبادات، مجاہدوں اور ریاضتوں میں لگا رہتا۔ پھر اسے حامد کی وہ صفت یاد آئی کہ وہ ہر خوبصورت اچھی شے کو اپنا حق سمجھتا تھا اور اگر حسین کی صفات اور تفرقات کا اسے پتہ چل جائے تو وہ ہمیشہ اپنے بندی خانے میں مقید رکھے گا تا کہ وہ اس کی دعا پر بھی باختیار ہو۔ حامد صرف باختیار ہونا چاہتا تھا اور یک بیک اس پر انکشاف ہوا کہ ہمیشہ سفر میں رہنے والی اس کی کنیز کیوں اس سے فاصلے پر تھی اور اس کا بیٹا حسین کیوں اس سے دور زندگی کے بوجھ سے آزاد ہوا تھا۔ حامد کا سانس موت کا سانس تھا اور اس کا اتنا باختیار ہونا قہر تھا۔ وہ اسے ہرگز جنجن بن منصور حیلانج پر دسترس نہیں ہونا چاہیے اور اسے یہ خبر بھی نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کہاں تھا۔

”کوزہ گروں کے محلے کی طرف سنا ہے کوئی صاحب نظر ہے۔“ حامد نے خود ہی نصر سے کہا۔ نصر کا گھر وہاں سے قریب تھا۔

”نہیں سیدی! میں نے کسی ایسے کا تذکرہ نہیں سنا اور پھر میں سمجھتا ہوں کہ خدا انسان سے اتنا دور کہاں ہے کہ واسطے تلاش کئے جائیں۔ آدمی دعا کرے اور صدق دل سے دعا مانگے۔ نالہ عرش سے بھی پرے جاتا ہے۔“

حامد نے عجیب نظروں سے نصر کو گھورا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی اور ایک فیصلہ جانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔

پھر اس نے آہ بھرا اپنے ساتھی سے کہا ”ایسے مقدر سے انتقام لینا چاہیے۔ اس بے بے نیاز ہو جانا چاہیے۔ ہم دنیا داروں کو کہاں

اتنی فرصت ہے کہ خدا سے سیدھا تعلق پیدا کریں۔ مجاہدوں اور ریاضتوں کے لئے تو ایک اور زندگی چاہیے۔ سب کچھ چھوڑ دینے کی بے بنیاز ہو جانے کی زبردست خواہش۔ موت کی آرزو تا کہ حیات ابدی مل سکے اور میں مستقبل میں دور تک دیکھ کر کوئی معاملہ نہیں کرنا چاہتا۔ چاہے وہ مالک الملک سے ہی کیوں نہ ہو۔“ وہ ہنسا اور اس کا قہقہہ نہایت کھوکھلا اور بے وقت پریشان کرنے والا تھا۔

جب وہ دونوں ایوان میں واپس آئے ہیں تو ہر آنکھ نے انہیں دیکھا اور سرگوشیوں کی بھینھناہٹ سب کونوں سے ابھری۔ لوگوں نے نصر سے مختلف سوال کئے دربار کی سیاست میں منوس کے بعد حامد ہی تھا اور یہ خاص الخاص سلوک تعجب خیز تھا۔ نصر حاجب تھا، بغداد کے دربار کی ہر لحظہ بدلتی ہوئی لہروں پر اس کی نظر رہتی تھی اور خلیفہ کے نزدیک اس کا درجہ جو کچھ بھی ہو مگر تقدیر کی مادر ہوشیار اس پر نظر کرم رکھتی تھی۔ وہ اکثر حرم کے دربار کے باہر سراپردوں کو تھا مگر کھڑا رہتا تھا اور احکامات حاصل کر کے ان پر مہر ثبت کرواتا تھا۔ گویا ایسے احکامات جن کا تعلق براہ راست حرم سے ہو، حاجب کی وجہ سے اسی کے واسطے سے پایہ تکمیل کو پہنچتے تھے اور یوں دربار کی خبروں کو حرم تک پہنچانے کا بھی وہ براہ راست ذریعہ تھا۔ حامد اور حاجب کو ایک جگہ جمع دیکھ کر اور دوستی کا تعلق سمجھ کر لوگ چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ خود نصر اپنے کندھوں کو سر پر بمشکل سنبھالے تھا اور دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ حامد نے یک بیک اپنا دل اس کے سامنے کھول کر کیوں رکھ دیا تھا۔

وزیر جو مکمل دنیا دار اور دنیاوی جاہ و جلال میں نہایت کو پہنچا ہوا تھا جس کا حکم عدالتوں اور دربار یہاں تک کہ ترک سرداروں پر بھی بھاری تھا۔ اس مکمل شام میں روشنیوں سے مزین ایوانوں سے باہر اسے کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

سازندوں نے ساز درست کئے اور مدعو شاعروں نے اپنا کلام انہیں مرحمت کیا کہ بھگی ہوئی شب ماہتاب کی نیلاہٹ میں روشن ستاروں کی خواب ناک کیوں کی باتیں سنائی جائیں۔ گانے والے نے گایا:

خالص شراب پلا کر میرے غم و فکر نابود کر دو

اور زمانہ کو چھوڑ دو کہ جو ہونا ہو گا وہ ہو کر رہے گا

اسے ملامت کرنے والے میں عتاب کے باوجود بوڑھا ہو گیا ہوں

اور اب جوانی پر بڑھا پا نہیں رہا ہے

میں نے اپنے کو خدا پرستی پر مائل کر لیا ہے

اور اسے اسی طرح قرار آ گیا ہے جیسے تلوار کو میان میں سکون ملتا ہے

حاسد مجھ دیکھ کر بے تکلف ہنستے ہیں

جیسے بنی بیک وقت جلتی بھی ہے اور ہستی بھی ہے

ہولے ہولے جب شمعوں کو نیند آتی گئی۔ کنیزوں کے لباسوں کی چمک میں ستاروں کی روشنی ملتی گئی اور ماہتاب آسمان کے واٹرگوں پیالے کی تلپھٹ میں آخری جرعب ہوشی کی تلاش میں ڈوبنے لگا تو حامد بن عباس نے ایک ایک مہمان کو رخصت کرتے ہوئے نصر کو اپنے پہلو میں منتظر رکھا۔ نسیم سحر خوشبوئیں، دجلہ کی نمی، باغوں کی مہک اور بھولی یادوں کو تھکی ہوئی روشنیوں کے گرد پھلا رہی تھی۔ گویا کوئی دوشیزہ نہ آنے والے محبوب کے انتظار میں بے قرار ہو کر ماتم کناں دھڑکتے دل سے اپنا دامن ہاتھوں پر اٹھائے دعا گو ہو اور اس کی بے تاب جان لرز رہی ہو۔

نصر کئی روز سے تقریباً گوشہ نشین ہو گیا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ حامد بن عباس کی درخواست کا کیا جواب دے۔ اس نے خلیفہ مقتدر کے اجازت نامے کے ساتھ اسے کہلوایا تھا کہ اپنے ذاتی زندان سے حسین بن منصور حلاج کو اس کے پاس منتقل کر دے۔ حسین درہمیتم تھا کہ اسے حامد بن عباس کے پاس ایک تحفے کی صورت میں بھجوا دیا جائے۔

وہ حاجب تھا مگر یہ حکم اس سے بالا بالا کیسے حاصل کر لیا گیا تھا۔

حامد اس انا الحق کہنے والے کی ذات میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا تھا۔

نصر جانتا تھا کہ جب حسین پر ایک خاص کیفیت طاری ہوتی تھی تو اسے اپنے آپ کا ہوش نہیں رہتا تھا۔ عام زندگی میں نہایت شریف النفس، متقی، پرہیزگار، عبادت گزار، متوکل، کم گو، کم خواب، شب زندار، عابدان لحوں میں اپنے حواس کے اختیار میں ہوتا تھا۔ ایسی حالتوں میں وہ جس امر کا حکم دیتا، وہ ہو جاتا تھا۔ چہرہ بازوؤں کے حلقے میں چھٹائے اپنی بے پناہ آنکھوں کو بند کئے وہ جانے عرش معلیٰ پر ہوتا تھا کہ تحت الثریٰ میں۔ خشک گھاس کی پتی کا سا جسم بے پناہ طاقت کا سرچشمہ معلوم ہوتا تھا جیسے پوری کائنات سمٹ کر ایک ذرے میں سما جائے۔ وہ آواز اس مرکس سے یوں پھیلتی جیسے سورج کی کرنیں، لاتعداد ان گنت ذروں کو قوس و قزح کے رنگوں میں تبدیلی کر دیتی ہیں۔

وہ نصر حاجب کیا کرے؟

مایوسی میں اسے شغب کا خیال آیا۔ اس کے باوجود کہ وہ جانتا تھا کہ حامد بن عباس ام المومنین کے حکم سے اکثر سرتابی کرتا تھا۔ حرم کے دربار سے جواہر کلمات صادر ہوتے، وہ کبھی پس پشت ڈال دیئے جاتے تھے اور کبھی وہ فرمان اتنی مسخ شدہ شکل میں عمل کے عمل

سے نکلتے کہ ان کے معافی بدل جاتے۔ ام خلیفہ کی رقابت سے صرف حامد خوفزدہ نہیں تھا۔ جانے کیوں؟

حسین کے پاس شغب کے پیغامات اور تحائف اکثر پہنچتے تھے۔ شغب نے اس کی رہائی کی آج تک کوئی کوشش کیوں نہ کی تھی۔ وہ بہت دیر سوچتا رہا۔ خلیفہ مقتدر اپنی ماں کے اثر سے آزاد ہونے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ ترک بچوں کے ساتھ کھیلتے ایک سلطنت اسے ملی تھی اور وہ اپنی ماں کا رہین منت تھا جو نہایت طرحدار اور خود سر بلکہ خود پرست عورت تھی۔ اس نے خطرات میں گھرے ہوئے اس تخت پر اپنے کمشن بچے کو ایک قابل حکمران اور فاتح حاکم، مضبوط اور ناقابل شکست بادشاہ بنانے کے لئے جانفشانی سے مگر نہایت خاموشی سے لائحہ عمل تیار کیا تھا اور اس کے راستے کی ہر دشواری پر اپنی تدبیر سے اس نے ہمیشہ قابو پالیا تھا۔ اس سے نجات حاصل کر لی تھی۔

نہایت آغاز میں مقتدر نے بھی ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح ماں کا احترام کیا۔ اس کے انتہائی احکامات کو خندہ پیشانی سے سر جھکا کر ہمیشہ مانتا رہا تھا مگر اب شعور کے ساتھ ساتھ سن و سال کا تھا خداوند اس کے دربار میں مختلف الخیال لوگوں کا مجمع تھا اور منوس ام خلیفہ سے بیزار ہو چلا تھا کیونکہ وہ ہر بات میں دخیل تھی۔ یہاں تک کہ امراء دربار کی ذاتی زندگیوں پر بھی اس کی نظر رہتی تھی۔ ان معلومات کے لئے اس کے ذرائع ناقابل فہم تھے۔ لوگوں کی خلوتوں میں بھی اس کے جاسوس در آئے تھے اور ترکی سردار اپنی حکمت کے باوجود ذرا خوفزدہ رہنے لگے تھے اور جب وہ اس کے سامنے حاضر ہوتے تو اکثر نظریں جھکائے رکھتے۔ مبادا اس کی دلوں کو ٹٹولتی ہوئی نگاہیں اس احتساب کے خلاف شکایت کو پڑھ لیں۔ اس سے بحث مباحثہ بیکار تھا کیونکہ اسے کسی کی بات سننے کی تاب نہ تھی۔ وہ ٹھنڈے دل سے کسی بات پر غور کرنے اور اس کو سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کرتی تھی۔ بجلی کے کوڑے کی سی اس کی آواز لہراتی اور جھکنے کے سوا کوئی راستہ نہیں رہتا تھا مگر لوگ جھکنا پسند نہیں کرتے اور اندر ہی اندر اس دوہری دربار کی حاضری سے آزاد ہونا چاہتے تھے۔ کسی نہایت نجی محفل میں جب خلیفہ سے اس موضوع پر گفتگو کرنے کی کوشش کی جاتی تو وہ سر جھکا کر کہتا۔

”ام محترم جو مناسب سمجھیں۔“

حامد بن عباس نے جب سرتابی کرنے میں پہل کی تو اسے خاص مخالفت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

”کاروبار جہانبانی میں کبھی کبھار جو بہتر ہو ہو کرنے کی اجازت ہے۔“

خلیفہ کے یہ احکامات کافی سے زیادہ تھے اور حامد عمال اور حسابات اور اخراجات میں اکثر اپنی سی کرتا تھا۔ پھر یہ شکایت عام ہوتی تھی۔ شغب کے دربار سے خلیفہ کی مہر سے جو احکامات دیئے جاتے، انہیں اکثر درخور اعتنا نہ سمجھا جاتا۔ دبی دبی سرگوشیاں اور بلند

آوازیں، احتجاج، سختی، درشتی۔ مقتدر کی حرم میں اکثر طلبی سے معاملات کو شغب کے ہاتھ سے تقریباً نکال دیا جاتا۔ جھنجھلا کر وہ ان ترک امیروں کو اپنے گرد جمع کرنے کی کوشش کرنے لگی تھی جو اس کے دربار کے باہر سراپردوں کو پکڑے اکثر منتظر رہا کرتے تھے مگر اب وزرائے باختیار کے گرد جمع کئے رہتے تھے اور سازشوں، تحریکوں میں کسی نہ کسی طور شریک تھے اور مقتدر کی نگاہوں کو پھیرنے کے لئے بھی کوشاں تھے۔ شغب شیرنی کی طرح گھات میں منتظر اپنے زخموں کو چاٹ رہی تھی اور پھر اس نے حسین کی طرف رجوع کیا تھا۔ دعا کسی بندہ خدا کی دعا، اس کی طوفانوں کی زد پر آئی ہوئی کشتی کے بھنور سے نکال سکے۔ اندھیری راتوں میں وہ رازدان لونڈیوں کے ہمراہ بھیس بدل کر مختلف راستوں سے کوزہ گروں کے محلے سے گزرتی اور نصر کے بندی خانے میں حاضر ہوتی۔ جھکتی اور خاموشی سے دعا کی طالب رہتی۔ وہ حسین کے مراتب سے آگاہ تو نہ تھی مگر یہ سمجھتی تھی کہ وہ اگر اپنی خاص حالت میں نہ ہو اور چاہے تو ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے تو وہ ضرور سنی جائے گی۔ بارگاہ خداوندی سے حکم صادر ہو سکتا تھا، مقدر بدل سکتا تھا۔ شغب نے جب اس امر پر اطلاع پائی تو تو وہ بہت رنجور ہوئی اور اس نے اپنے بیٹے سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

مقتدر کے محل خاص میں اس کی والدہ کی آمد کی اطلاع کوئی معمولی سانحہ نہ تھا۔ غلام اور کنیزیں بدحواس انتظاموں میں لگے تھے۔ مستعد چاک و چوبند ہوشیار باخبر سرداروں نے انتظام اپنے ذمے لیا تھا اور ہر طرف رونق اور چہل پہل تھی۔ روشیں اور گلستاں آراستی کئے جا رہے تھے۔ پھولوں کے پودے عمدہ تراش خراش کی وجہ سے سنورے ہوئے اور صحن چمن کی رونق میں رنگ برنگ لہریوں کی طرح بکھرے تھے۔ جیسے سر پر کلاہ رنگین پہنے دورو یہ استقبال کے کھڑے ہوئے جنگجو سپاہی ہوں۔ سائے اور دھوپ مرقعوں کی طرح سبزے پر بکھرے تھے اور فوارے ترل ترل سطح آب پر موتی بکھیرتے تھے۔ کہیں پانی سفید جھاگوں سے دیوان بنا اپنے سب کچھ ہونے کا ظہور ذات کا پرتو ہونے کا سناٹا تھا اور پر پیچ تاریک کنہوں میں کبھی چمکتا کبھی چھپتا ماریاہ کی طرح مستی میں کٹڈی مارے سویا ہوا لگتا تھا۔ ذرا ذرا سی آب جو اپنے اندر آسمان کے بادلوں کے سائبان لئے کائنات کو سمیٹے رواں تھیں اور خوشبوئیں اپنی آوارگی میں پرکشش اور مشام جان معطر کر رہی تھیں اور زندگی کی قوس کو چھو کر نکلتی ہوئی ہوائیں اپنے ابدی دائروں میں پریشان تھیں اور حکایت زمانہ کہتے ہوئے درد و دیوار ہمد تن گوش تھے۔ مگر شغب کی پیشانی شکن در شکن جیسے موج در موج خیالوں کی یورشوں کو تھامے ہوئے اقصائے عالم سے جمع کنیزیں اپنے حسن و جمال اور بے مثالی میں لا جواب اس کے عقب میں حبشی غلام رنگین لبادوں میں عصا تھامے دورو یہ قطاریں بنائے جیسے زرگل کی حفاظت کی آنسوئی شاخیں ہوں۔

”ام عزیز! آپ کی آمد میرے لئے باعث مسرت ہے۔“

شغب خاموش مگر دلچسپی سے اس محل میں دائیں بائیں نظریں دوڑاتی بیٹے کے ساتھ ایوان نشست میں آئی۔ اس کا دل مسرت سے دھڑک رہا تھا۔ اس کے خواب جن کی پرچھائیاں بھی کسی نے نہیں دیکھی تھیں، بالآخر پورے ہو رہے تھے۔ وہ عظیم پھیلی ہوئی عباسی سلطنت کے خلیفہ کی ماں تھی جو نہایت الجھے ہوئے راستوں سے اپنے مقدر تک پہنچی تھی اور شاداں تھی کہ ایک فرمانبردار بیٹا جو اس کے اشاروں پر عمل پیرا ہو رہا تھا اور جس کی شکل پر اب بھی کھلنڈرا پن تھا، جو ڈرا اور سہا ہوا اس کے حکم کا منتظر تو نہیں مگر اس کی ہر بات پر سر جھکا کر صا د کہنے کو سعادت سمجھتا رہا تھا۔

خیال کی طرح نازک اور خوبصورت کنیزیں نظریں جھکائے بے حس و حرکت ایستادہ تھیں اور دور کہیں موسیقی گویا فضا میں سے برس رہی تھی جو ان دونوں کی گفتگو میں حائل نہیں تھی۔ یہ اس خواب کی نہایت تعبیر تھی جو اس ترکی کنیز نے دیکھا تھا۔ خلافت کے ایوانوں میں شطرنج کے مہروں کی طرح وہ بھی تھی۔ پھر کسی کھیلنے والے نے اسے اٹھا کر جیت کے تخت پر بٹھایا دیا مگر اس درمیان صدا ہل آزار باتیں بھی ہوئیں جنہیں بھلانے کو وہ تیار تھی۔ شرط یہ تھی کہ مقتدر اسی طرح اس کی طرف حکم کے لئے کھتا رہے اور اس کا اپنا دربار حرام اتنا ہی فعال رہے کیا ایسا ہونا ممکن تھا؟ بہت دنوں سے وہ محسوس کر رہی تھی کہ مقتدر کی جبل متین اس کی انگلیوں کے درمیان سے پھسل گئی تھی۔

ہنس کر اس نے بیٹے کی طرف دیکھا۔

”جان ام! کیا تم خیریت سے ہو؟“

”بے شک، بے شک ام عزیز۔“ اس نے حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے ابرو اٹھا کر دیکھا۔

شغب نے محسوس کیا کہ اس حیرت میں وہ خلیفہ بھی کہیں موجود ہے جو خود سرا اور برسر اقتدار ہے اور بہت دنوں تک اس کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتا۔ جس کو احکامات دینے اور اپنی بات منوانے کی عادت تھی اور جو اس کا بیٹا ہی نہیں، مقتدر باللہ بغداد کی سلطنت کا وارث اور تخت پر متمکن تھا اور ترک، عرب سردار اس کے اشاروں کے منتظر تھے اور اس کی آواز مشرق مغرب تک سنی جاسکتی تھی۔ اس نے سوچا، کیا وہ حسین کے لئے بات کرے۔ اقتدار کے مرکز میں کیا اسے یہ بات دہرانا چاہیے۔

فصیل اندر فصیل یہ قصر تھے اور باہر وسیع و عریض دنیا، اس جگہ سے ایک ایک لفظ اور اشارے کے لئے ٹھہری رہتی تھی۔ کیا اسے وہ بات کرنا چاہیے۔ کہنا چاہیے، کیا اسے دخیل ہونا چاہیے۔ وہ حالات کے دھارے کو اسی طرح بھنے نہ دے۔

”آپ کسی گہری سوچ میں ہیں۔“ مقتدر نے پوچھا۔

”ابن عزیز! سوچیں مجھے بے چین رکھتی تھیں۔ آتش زیر پا گرا ب نہیں۔ میں پرانے مضطرب دنوں کو بھلا دینا چاہتی ہوں۔“ اس نے نیچی نظروں سے اپنے بیٹے کی طرف دیکھا۔

بہت بے چین ہو کر مقتدر نے پہلو بدلا۔

”تلخ دنوں کی یاد ہمیں آئندہ سے محتاط بنا دیتی ہے۔ وہ ساری غلطیاں دہرائی نہ جائیں۔“ اس نے ہولے سے کہا۔

”بے شک، بے شک۔“ شغب نے بڑی گہری نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا اور گزرے ہوئے سارے زمانے منصور سفاح سے لے کر اس گھڑی تک کے اس کی نگاہوں کے سامنے گزر گئے۔ جیسے متحرک تصویریں ہوں۔ جمی جمائی سلطنت جو کو معتقد نے پھر سے ایک حصن حصین بنایا تھا، پھر آندھیوں کی زد پر تھی۔ وزراء اور امرا بادل خواستہ اور اپنے اپنے مستقبل کی خاطر اس کا اور مقتدر کا ساتھ دیتے رہے تھے۔ بغداد کی پھیلی ہوئی آبادی اور محلے اور دریا کے دونوں کنارے اور مختلف النوع خیالوں کو لئے مختلف النسل عربی اور عجمی مغرب اقصیٰ کے مسافر چین اور وسطی ایشیائی لوگ، تاتاری اور ترک اور ان سب سے بلند اس کا بیٹا مقتدر بھلا اس کا حکم کیوں قابل قبول نہ ہو۔ اگر وہ حسین بن منصور کو حامد بن عباس کی تحویل میں دینے پر راضی ہے تو وہ اسے کیا کہے۔ خدا ہر طرح اس مرد عجیب کی حفاظت کرے گا۔ ہاں ضرور..... بھلا کیوں نہیں!

سر کو جھٹک کر اس نے متانت سے کہا۔

”میں تمہاری کامیابی اور درازی عمر کے لئے دعا گو ہوں۔“

کنیزیں ہوا پر کھنچی تصویروں کی طرح ایوان سے محو ہو گئیں اور وہ دونوں اکیلے رہ گئے۔ مقتدر نے شغب کی گود میں سر رکھ لیا۔

”ام عزیز! یہ نہایت تھکا دینے والا ہوش و خرد سے بیگانہ کر دینے والا کام ہے۔“

”کار جہان بانی کے لئے جو سر بنایا جاتا ہے، اسے بوجھ برداشت کرنے کی بھی عظیم قوت عطا کی جاتی ہے۔“ شغب نے بیٹے کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”زندگی ایک ہی بار دی جاتی ہے۔ کیا آدمی بار بار پیدا ہو سکتا ہے۔ بادشاہ ہو یا درویش سب ہوا کی راہ میں ہے۔“ اس نے ماں کے چہرے کو چھوا۔ اس طبع چہرے کو جو اس پر جھک کر اسے لوریاں سناتا تھا۔ اس کی ماں کی آواز میں رس تھا اور نغمہ جو سنانے کے لیتھا مگر اس میں ایک اور بات بھی تھی۔ بے رحم سنجیدگی اور بے پناہ عزم جو اس کی رگوں میں تو انائی بن کر دوڑنے والے خون میں ملا تھا، شغب کے حکم میں قطعیت ہوتی تھی اور اس میں لچک نہ تھی۔ اس کی تربیت میں اس نے اپنی طبع کی ساری سختی کو استعمال کیا تھا تاکہ اس

کے کردار کی عمارت جن بنیادوں پر تعمیر ہو اس پر ثبات تک ایک مضبوط قلعہ تعمیر ہو سکے۔ شغب الیکٹر عزم ماں تھی جس نے اس کے لئے ایک سلطنت حاصل کی تھی۔ وہ اول تا آخر اس کا احسان مند تھا۔

دعائے نیم شبی میں وہ ہمیشہ اپنے بیٹے کے لئے اپنے خوابوں کی تعبیر چاہتی تھی۔ زندگی تو گزر جایا کرتی ہے مگر جینے اور زندہ رہنے میں بھی فرق ہے۔

اسے ہمیشہ یہی پڑھایا جاتا تھا کہ صفت روباہی بھی بادشاہ کے لئے ضروری ہے۔ اس کی نظر آدمیوں پر نہیں ان یافتوں پر ہونی چاہیے جو اس کا مضمون نظر ہیں۔ اس میں سفاکی صفت بلا امتیاز ہونا چاہیے تاکہ وہ فیصلے کرتے ہوئے شخصی پسند اور ناپسند میں الجھ نہ جائے۔ لوگوں کو اپنی تعمیر میں اینٹ اور چونے کی طرح استعمال کرنا چاہیے۔ چاہے یہ چونا ان کی ہڈیوں کو پیس کر ہی کیوں نہ بنایا جائے۔ نرم خوئی، خوش دلی اور رحم بے شک اچھی صفات ہیں مگر اچھے گلستان کی پرورش کے لئے نہایت بڑھی ہوئی شساخوں کو کاٹنا بھی انتہائی ضروری ہے۔ ریاض جنت، خدا نے کچھ لوگوں کو پیدا کیا تھا کہ وہ حاکموں کے لئے سیر ڈھیوں کی طرح ہوں جن پر قدم بہ قدم بام عروج تک پہنچا جاسکے۔ خلیفہ قوت کا سرچشمہ ہے۔ اپنے پیشہ حیات کا شیر جس سے لوگ ترساں رہتے ہیں۔ خوف کھاتے ہیں اور جس کی اطاعت میں بھی عافیت سمجھتے ہیں۔ وہ انگڑائی لیتا ہے اور دکھائی دے تو اوسان خطا کر دے۔ لوگ کندھوں پر اپنے سر کلو اس کی مہربانی سمجھیں۔ اس کی امانت خیال کریں اور کوشاں رہیں کہ اسے خوش رکھ سکیں۔ سرچشمہ قوت! ہاں خلیف کو ایسا ہونا چاہیے۔

مقتدر کو اپنی تعلیمات میں یہ سب یاد تھا۔ وہ دونوں خوش دنوں کی برے دنوں کی باتیں کرتے رہے۔ تخت کی باز یافتگی کی باتیں، مولنس کی ہمدردیاں اور دلیری کی باتیں اور کسی نہ کسی طور پر حامد بن عباس کا ذکر بھی آ گیا۔

”حامد سے محتاط رہا کرو بیٹے۔ نخوت پسند اور پر غرور شخص ہے۔“

”ام عزیز! ایسے ہی لوگ تو سلطنت کو مضبوط بنا سکتے ہیں جو اپنے زور میں کسی سے بھی لڑ جائیں۔“

”کسی سے بھی؟“ شغب نے کانپ کر کہا۔ ”بخدا ہرگز نہیں۔ ایسے شخص کی سزا تو دار ہے۔“

”دار پر لٹکے ہوئے سر بہر طور کوئی نفع بخش کام نہیں کر سکتے۔ نہ ہی خدمت اور نہ ہی نیک نامی لاتے ہیں۔ حامد کی نخوت اور کم

آمیزی اس کی تلخی اور خود پسندی اسے دوسروں سے الگ رکھتی ہے۔ وہ سکی سازش میں ملوث نہیں ہو سکتا۔“

مقتدر کی بات غور سے سن کر شغب نے نہایت گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا بیٹا فہم و خرد میں سفر کر رہا تھا۔ اپنے تجربے کو اپنی بنفوں پر جانچ سکتا تھا۔ بیان کر سکتا تھا۔ وہ ایک عمدہ حاکم کی طرح لوگوں کی قیمت جانتا تھا اور مہروں کی طرح ان سے

کھیل کو کامیاب بنانے کا گرجان گیا تھا۔

”حامد بن عباس سے میں ذرا سی مہربانی اور محبت زیادہ رکھتا ہوں۔ کبھی کبھار اس کی جاو بے بجا درخواستیں بھی سنلیتا ہوں۔ یہ بھی بہت ضروری ہے۔ وہ میرے لئے ایک کارآمد شخص ہے اور ایسے میں جب مغرب میں ایک وسیع سلطنت پھیل رہی ہے، مہدی نے اپنے پاؤں پھیلائے شروع کر دیئے ہیں۔ مجھے دربار کو زیادہ سمیٹ کر اپنے قریب رکھنا چاہیے۔“

”بے شک بے شک۔“ شغب جی ہی جی می حامد کی گستاخیوں کو یاد کر رہی تھی مگر مقتدر سے وہ کیا کہے۔ ایسے میں جب وہ نئے عزائم اور نئے ساتھیوں کے ساتھ خوش تھا، وہ اسے کچھ نہیں کہے گی۔ نہ کوئی حکم، نہ کوئی سفارش تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ حاکم ہو رہی ہے! ہرگز نہیں۔ وہ اس کے راستے کے لئے دیوار نہیں بنے گی۔ اس کا دل کیسا بھی خون خون ہو رہا ہو مگر وہ اپنے احسانات نہیں جتائے گی۔ اس نے جو کچھ کیا، اولاد کے لئے کیا اور ایک بیک اس پر اتنی تھکن طاری ہو گئی جیسے زندگی میں کہنے سسنے سوچنے اور خواہش کرنے کے لئے کچھ باقی نہ رہا ہو۔ اس گھڑی اگر موت اسے آ لے تو اس کے سینے میں کوئی حسرت نہ ہوگی۔ پھر حسین کے لئے وہ کیا کہے۔ عام حالات میں وہ ایک قیدی تھا اور ایک سے دوسرے زندان میں منتقل ہونا اتنا بڑا سانحہ نہیں تھا کہ اس کے لئے رنجیدہ ہوا جائے۔ حسین کی اپنی ہستی اور طاقتیں بھی تو تھیں۔ وہ جس جگہ ہوگا، اپنے لئے سہولتیں پیدا کر لے گا۔ لوگ اس کے گرد غار ہوں گے۔ دعا کے طالب اپنی آرزوؤں کے لئے بے تاب ہوں گے۔ کوئی حمی ہو اس کے مقناطیسی اثر اور شخصیت کے سحر سے بچ نہیں سکتا۔ وہ آخر اتنی پریشان کیوں تھی۔ خدا اپنی رحمتوں کی ردائے محبت اس پر پھیلائے ہوئے تھا۔ ہمیشہ سے ہمیشہ سے ورنہ بغداد تو ایک عرش منور تھا اور صوفیائے کرام سے معمور تھا۔

”ام مہربان! آپ میرے لئے فکر مند نہ ہوا کریں۔ وقت بے وقت کے زلزلوں نے مجھے طوطانوں کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ عطا کر دیا ہے۔“

وہ ایک ٹک اپنے بیٹے کی طرف دیکھتی رہی۔

کیا یہ وہی مقتدر تھا جو در بچوں سے باہر جھانکتے ہوئے بھی خوفزدہ ہو جایا کرتا تھا۔ رات میں قدموں کی ٹاپ اسے بے قرار کر دیا کرتی تھی۔ سہا ہوا بے یقین سانو جوان جواب ایک انداز بے پرواہی سے اس کے قریب بیٹھا تھا اور اسے فکر مند نہ ہونے کی تلقین کر رہا تھا۔ کیا بال آخرا اس پر بڑھاپے نے چھاپہ مارا تھا۔ ہر عام عورت کی طرح اس کے بالوں میں سفیدی نے ڈیرا جما لیا تھا؟ خاکستری دھول اس کے سر پر بھی انڈیل دی گئی تھی۔ وہ آنکھیں جنمیں بحر ذخار کی سی لہریں اور طوفان پوشیدہ تھے، دھندلا گئی تھیں۔ اسنے خیالوں

میں کم ہوتی روشنی میں تو دیکھنے کی کوشش کی۔ یہ انکشافات تھے جو اس پر ہوئے تھے۔ رازوں کے بند دروازے اس پر کھلے تھے اسے کار جہان بینی سے علحدہ ہونا ہو جانا چاہیے۔ اسے مقتدر کے لئے صرف دعا کرتے رہنا چاہیے۔ حسین ابن منصور اگر کسی اور زندان میں ہوگا تو بھی اس سے دعا کا طالب ہوا جاسکتا تھا۔

وہ مرد عجیب تھا کہ عاجزی اور خاکساری میں بالکل ذرہ ناچیز، گرد و پیش سے بے خبر یا نہایت باخبر خاموش اپنی آنکھوں کو بند کئے مناجاتوں میں منہمک۔ گویا وہ کہیں تھا ہی نہیں۔ معدوم! اور ایک بیک تیز حدتوں کی لپیٹ میں آیا ہوا اس کا وجود گھلتا ہوا سراپا طاقوتوں کو نمود عطا کرتا ہوا۔ یہ عالم فنا و بقا تھا جس کی مسافتوں کی اسے شغب کو خبر نہ تھی۔ یہ مملکت باطن جس کا ربط ظاہر سے تھا اور نہیں بھی مگر حکمران کون تھا؟ دنیاوی جاہ جلال کے دوام کے لئے اس کی ضرورت پڑتی تھی۔ آخر کیوں؟

کیا دنیا خدا نے نہیں بنائی تھی؟ اسے ثبات کیوں نہیں تھا؟ انجام ہمیشہ ایک ہی کیوں ہے؟ فنا؟ فنا؟ اور بگولوں کی طرح خیالات کے تیز آندھی سی اس کے دماغ میں اٹھنے لگی۔ زرد اور سیاہ اور سرخ جیسے دشت سوس پر سے آ رہی ہو۔

”آپ کا مزاج تو اچھا ہے؟“ مقتدر نے گہرا کرماں کی طرف دیکھا جس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے جگمگا رہے تھے۔ جیسے پھول پر صبح دم شبنم ہو۔ متغیر ہوتے چہرے کا اتر تارنگ جیسے آہستہ آہستہ سفیدی میں بدلتی ہوئی شفق کی سرخی رات کے دامن میں پناہ لیتی ہوئی چاندنی کی ردا تلے چھپتی ہوئی بھلیر کا لہرایا بادلوں میں گم ہوتا ہوا اور ابر سے ہوئے سحاب سبک رفتار نیلا ہٹ تلے ٹھہرے ہوئے۔ پھر وہ چہرہ دھواں دھواں ہونے لگا۔ شغب کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ گویا اسے نیند کے جھکڑوں میں اڑایا جا رہا ہو اور ریت اس کے پوٹوں کو بو جھل کر رہی ہو۔ وہ بے ہوش ہو کر وہیں مسند پر ڈھلک گئی۔ مقتدر نے تالی بجائی۔ کنیزوں نے ام المومنین کو اندر کے وسیع و عریض ایوانوں میں پہنچا دیا۔ یہاں سے وہاں تک طبیبوں کے لئے دوڑ ہونے لگی۔ شہد رنگ طلیساں پہنے ہوئے نصرانی اور یہودی اطباء کا ایک جھوم اس ترکی کنیز کے لئے سرگوشیوں میں صلاح مشورہ کرنے لگا جو مقتدر کی یاوری سے عباسی سلطنت کے لئے مادر مہربان بن گئی تھی۔

حامد بن عباس جب مغرب سے لوٹا ہے تو حسین بن منصور کو اس کے زنداں میں منتقل ہوئے ساتواں سال تھا۔ مغرب میں عبید اللہ المہدی کے مقابلے میں شکستوں اور ذلت آمیز ہزیمتوں نے اس کا ذہنی توازن تقریباً خراب کر دیا تھا۔ وہ اپنی ناکامیوں سے سخت دلبرداشتہ اور پریشان تھا۔ اس کی زندگی میں زمانوں پہلے شکست اغول کی صورت میں داخل ہوئی تھی اور بغداد کے سوق العامہ سے اس نہایت مکمل دوپہر میں اس کے گرد نحوست کا سایہ بن کر پھیلی تھی۔ خوابوں کی سی صورت جو اصل نہیں پر چھائیں تھی۔ اس صورت کو وہ بھی

زیر نہ کر سکا، پکڑ نہ سکا تھا کیونکہ اس کے عقب میں ہمیشہ حسین بن منصور کا خیال رہا تھا، رہا ہوگا۔ خلوتوں، جلوتوں، تنہائیوں، مجلسوں میں جیسا کہ کنیز نے اسے بتایا تھا، وہ ہمیشہ اس کے خیال میں غلطاں رہتی تھی۔ ثولیدہ خیالوں کے پیچ و خم میں الجھی۔

اگر اغول نے اس سے محبت کی ہوتی، وہ ذہنی طور پر آزاد ہوتی تو دنیاوی جاہ و جال کی ساری برکتیں جو اس کے لئے مہیا کی جاتی تھیں، اسے خوش کرنے کو کافی ہوتیں۔ وہ عجیب گم کردہ راہ روح کی طرح بھول بھلیوں میں بھٹکتی پھری۔ کیا حسین بن منصور کا عشق اتنا فتنہ انگیز اور آتشیں تھا۔

وہ زور زور سے قہقہے لگاتا۔ اپنے پرہنسا۔ اپنی نامرادی پر اپنے مٹ جانے پر اسے بے حد کوفت ہوتی۔ اس کے منہ میں راکھ کا سا مزہ ہوتا۔ دنیا کا ہر عیش اور دنیاوی فوق سب خاک تھے۔ وہ مٹ چکا تھا۔ ناکام اور اب شکست خوردہ نامراد وہ خلیفہ کو کیا جواب دے۔

ماتم یک شہر آرزو اس کا مقدر تھا۔

حسین بن منصور حلاج کی طرح عبید اللہ الہدی بھی ناقابل تسخر تھا۔ وہ نہایت درویش صفت حاکم، پہاڑوں کا سا حوصلہ رکھنے والا اس کی فوجوں کے لئے ایک آتشیں دیوار ثابت ہوا جس سے ٹکرا کر سب فوج خاک ہو گئی۔ خود حامد نہایت مشکل سے جان بچا کر بغداد کی طرف پلٹا تھا۔ وہ ان کا بدلہ کس سے لے۔ ملامتوں کا حدف کس کو بنائے۔ رسوائی کا ذمہ دار کون تھا۔ نامرادیوں کا مواخذہ کس سے کرے؟

وہ دانت کچکچاتا اور پروں لقی و دق نشست میں ٹہلتا یہاں تک کہ دجلہ کے کنارے پر کھلنے والے دریچوں کے پردے ساکت چاندنی میں باد صبا کید ز دیدہ در آنے والے کسی جھونکے کی شوخی سے ہلتے۔ اس دن اور رات کی بے خوابی نے سے چڑچڑا اور نہایت غصیل بنادیا تھا۔

وہ آ خر کس سے خفا تھا؟

اس کے خون میں حدت بڑھتی یہاں تک کہ کنپٹیاں پتے لگیں۔ وہ ایک ہاتھ کو نہایت بے بسی سے دوسرے پر مارتا۔ وہ آ خر کیوں اتنا بے بس تھا۔

”جعفر مقتدر کی ماں شغب۔“

اور اسے نئے سرے سے غصہ آیا۔ وہ عورت تھی جو بغداد سے اس کی غیر حاضری کے دنوں میں برابر زندان میں حسین بن منصور

کے پاس حاضر ہوتی رہی تھی۔

ہر طرف وہی تھا۔ چار سو اسی گھیرے ہوئے۔ اول و آخر۔ اس کی ناکامیوں کی عمارت کی تہ میں وہی تھا۔

ایک بے بضاعت کرم جو لچکاتا ہوا مٹی کی تاریکیوں میں اس پر خندہ زن تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی بے بسی کیا تھی اور اس کا باعث وہ خود تھا۔ زندان کے اندر بند سلاخوں کے پیچھے بیڑیاں پہنے ہوئے عبادات میں منہمک اپنے نعرہ انا الحق کو اپنی آہوں میں بدائے اپنی خاک نشینی میں اپنی برتری کو سمجھتا ہوا۔ اپنے ہونے پر فخر کرتا ہوا۔ وہ جس کی آنکھیں بے پناہ تھیں مگر جنہیں روشنی سے حجاب آتا تھا۔

خرقہ پوش جس کو اپنی دلق مرقع میں پٹی ہوئی جوؤں تک کی خبر نہ تھی۔ دیوانہ جس کو ہوش و خرد کی برد تک نہ تھی۔

خدا رسیدہ جو عبادات سے دوڑتا ہو گیا تھا جس کی کجروی کج کلاہی کو چھوٹی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

جب اپنے سفر کے بعد وہ زندانیوں کو دیکھنے گیا تو اسے محسوس ہوا تھا کہ حسین بن منصور تو آزاد تھا۔ دراصل زندانی تو وہ تھا حامد بن

عباس!

کلام اللہ کو پڑھتے ہوئے جس پر یوں لرزہ طاری تھا جیسے وہ تیز و تند ہواؤں کے دوش پر اڑتی ہوئی ایک گھاس کی خشک پتی ہو جس کی اپنی کوئی بساط ہی نہ ہو اور ہوا سے آسمانوں کے اوج کی طرف لئے جا رہی ہو۔

نودہستہ پو یہ اس کی پیشانی سختیوں کے باوجود اسی طرح جیسے اس میں سے شعاعیں نکل رہی ہوں۔ آفتاب طلوع ہوتے ہی گل رنگ شفیق روشنی سے جہان کو منور کر رہا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا یا شاید یہ نظر کا دھوکا تھا کہ زندان اس سے لبریز تھا۔ جیسے منئے ناب سے

پیانہ!

وہ لوٹ آیا تھا اور درود یوار دیدہ پینا کی طرح اس کے ضمیر بے ضمیر کو تک رہے تھے۔ گویا سے سرزنش کر رہے ہوں۔ وہ گھبرایا جاتا

تھا اور اس کے ہر بن مو سے پسینہ پھوٹ بہا تھا۔ گویا اغول اور اس کا بیٹا حسین ہنس رہے ہوں۔ اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ خون اس

کو اپنے سر کی طرف جاتا ہوا لگا تھا۔ سننا ہٹ اور کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں اور کوئی آہستہ خرام اس کے دماغ کی بھول بھلیوں میں

رواں تھا جیسے ہوا خالی ایوانوں میں درپچوں اور دروں کو چھڑتی چل رہی تھی۔ آتشیں ہیولے اور مدھم مدھم پرچھائیں سی اس کی آگ

سے لبریز آنکھوں کے سامنے تیر رہی تھیں۔ یہ ہیولے کبھی شعلوں کی طرح لرزاں رقصاں اور کبھی منجمد آتش نمرود کی طرح اپنی سردی

سے کپکپا رہے تھے۔

دشمن اگر برابر کا ہو تو آدمی مقابلہ کرتا ہوا جی میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اگر کمتر ہو تو اس پر رحم کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس کو معاف کر دیا جائے تو انسان کی حس نرم خوانی کو تسکین ملتی ہے مگر یہاں تو دشمن یکسر بیگانہ تھا اور نہایت فرزانہ بھی۔ وہ تو کسی ترازو کے پلڑے میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ کمتر بھی نہیں کہ یہاں پر بھی کوئی نہ کوئی مقابلہ ہونا چاہیے۔ بدتر بھی نہیں اور برابری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ قابلِ رحم بھی نہیں کہ اس نے کبھی کوئی درخواست ہی نہ کی تھی۔

وہ کیا کرے کہ وہ ہر پیمانے سے ماورا تھا اور اس کے لئے کوئی لفظ نہ تھا۔ لفظ حامد کی اس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر تھے۔ بے بضاعت تھے لفظ کیا تھا؟

مدرسہ نظامیہ کے استاد اور فقیہ شیخ کامل اور فلسفی یہ سارے ”اربابِ توحید“ جو لفظوں کے اندر اتر کر ایک جہانِ معانی کی طرف نو ڈال رہے تھے۔ یہ کیا کر رہے تھے۔ کوئی ایک جوف جو اس کی کیفیت کی ترجمانی کرے اسے مل نہیں رہا تھا۔ وہ سخت جھنجھلا گیا اور اس جھٹیلای بجائی۔

لبے حریری پردوں کے پیچھے سے کنیزوں نے متوحش نظروں سے اسے دیکھا۔ درپچوں کے باہر کھڑے غلاموں نے اندر جھانکا۔

کیا حکم کیا گیا تھا؟

چہروں، آوازوں اور سراپوں سے وہ گھر گیا تھا۔ جیسے یک ایک وہ ایک بڑی فوج کے ہمراہ اسیری کی حالت میں زندان میں ہو۔ اپنے گرد گھوم گھوم کر وہ دیکھ رہا تھا۔ کیا وہ دیوانہ تھا؟

وہ کھڑے سے بیٹھ گیا اور اس نے اپنا سر تھام لیا۔ کیا وہ گر رہا تھا۔ نشست گاہ کی ہر شے محورِ قص تھی۔ کنیزوں کے چہرے چھت میں آویں تھے اور قدیلوں کی طرح جو طوفان میں دائیں بائیں حرکت کریں تیزی سے قریب آتے تھے اور قدیلوں کی طرح گرداب میں مبتلا کشتی ڈوبنے سے پہلے دائروں میں گرفتار تھی اور پھر آہستگی سے ڈوب گئی۔ لہریں اور موجیں اس پر سے گزر گئیں۔

مدرسہ نظامیہ کے اربابِ توحید اس کے ہاں مدعو تھے اور آج محفلِ کارنگ دوسرا تھا۔ مسندوں پر شیوخ متمکن تھے اور گفتگو نہایت محتاط طریقے پر بڑھائی جا رہی تھی۔ حامد بن عباس کی ایک مسند کے سامنے زمین بوس ہوتا اور کبھی دوسری کے پاس جا کر سر نیا جھکاتا پھر تیسری طرف نہایت مودب خادم کی طرح منتظر ہوتا تو کسی اور کے سامنے زبانِ گنگ کئے کھڑا رہتا۔

یہ اس کی نہایت سعادت اور خوش بختی تھی کہ حضرت جنید نے اس کی دعوت قبول کر لی تھی اور چونکہ وہ مدرسہ نظامیہ کے لئے بمنزلہ

شیخ کامل کے تھے اس لئے ان نہایت احترام سے جو عام مہمانوں بلکہ خواص کے لئے بھی مخصوص نہیں تھا، یہاں ملحوظ رکھے ہوئے تھے جیسے دیواریں بھی ہمہ تن گوش ہوں اور سانس روکے کھڑی ہوں۔

حضرت جنید کے پاس جب حامد حاضر ہوا تھا انہوں نے فرمایا تھا۔

”میں گوشہ نشین فقیہ ہوں۔ شاہی بارگاہوں میں میرا آنا جانا ٹھیک نہیں رہتا۔ آپ کس لئے ہمیں بلانے کے لئے مضطرب

ہیں؟“

”میرے گھر کی ویرانی میں آپ کے قدم رنجہ فرمانے سے بہار آ جائے گی۔“ اس نے دہراتے ہوئے کہا تھا۔

حضر سوچنے لگے۔ سوچتے رہے تھے۔ دنیا کی ساری رونقوں اور خوشیوں تک رسائی رکھنے کے باوجود انے یہ کیوں کہا تھا۔

”حضور! کسی چیز سے دل بستگی نہیں ہوتی۔ سیدی میں بے نوا ہوں۔ میرے اندر سوائے پرشور آندھیوں کے اور کچھ نہیں۔“

حضرت اس کی طرف دیکھتے رہے۔

وہ خاموش بیٹھا رہا۔ زانو تہ کیے سر جھکائے۔ یہ عمائد سلطنت جو مغرب کی مہمے ناکام لونا تھا مگر جس نے دعا کے لئے نہیں کہا تھا

پتہ نہیں سوالیوں کے سوال کیا ہوتے ہیں؟ دل کے اندھیروں میں جب چراغ بجھ جائیں تو پھر سوائے نہایت عظیم قوت ایمانی کے

انہیں کسی طرح روشن نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا سوال صرف ان کے قدم کی برکت حاصل کرنا تھا۔ وہ اتنا شکست خوردہ، بکھرا ہوا اور غمزہ

تھا، زرد و اور بوڑھا دیا ہوا کہ انہیں اس پر ترس آ گیا۔

”حامد بن عباس! گو ہمارا دستور نہیں کہ ہم شاہوں کے ایوانوں میں حاضر ہوں مگر متہایر ہاں آئیں گے۔ پورے مدرسے کے

اساتذہ۔“

حضرت کیس نے کتابت شدہ نسخے کی تصحیح میں لگ گئے تھے۔

اور اب اپنی قسمت پر نازاں وہ دلق مرقع پہنے ہوئے لوگوں کے درمیان غلاموں کی طرح خدمت میں محو تھا۔ عقیدت اور محبت

کے جذبات سے سرشار اس کے نہایت خاص دوست بھی فرش پر بیٹھے تھے۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہ تھی۔ یہ عام دعوت نہ تھی۔ یہ عام

مہمان نہ تھے۔ مے و مینا سے بے نیاز سرشار اور سرمست لوگ جو ساری زمین کو اپنی ٹھوکر پر سمجھتے اور عیش و عشرت، جاہ و جلال کن کے

لئے پرکاش سے بھی کم حیثیت رکھتے تھے۔ مقررین خداوند عالم!

جب وقت رخصت قریب آیا تو حامد بن عباس دوزانوں ہوا۔ سر کو جھکایا اور گویا ہوا۔

”میرا ایک سال ہے۔ کیا اجازت مل سکے گی کہ میں پیش کروں؟“

حضرت جنید نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ان کی پیشانی پر دونوں ابروؤں کے درمیان ایک لکیری سی ابھری۔

وہ جب حیران یا محفوظ ہوتے تو یہ گہرا خط ان کے چہرے کو روشنی کو لوہن کر نورانی بنا دیتا تھا۔ ان کے جلال و جمال میں مسکراہٹ کی تابانی سی گھل جاتی جیسے ہوا میں پھولوں کے رنگ اور خوشبو ہوں۔

اساتذہ اور فقیہ، فقراء اور فلسفی سب حضرت جنید کی مسند کی قریب کھڑے تھے ار حامد مرکز تو جہ تھا۔ میزبان کا کیا سوال ہو سکتا ہے۔ وہ طالب دعا ہی ہوگا اور اس کے حسن سلوک سے متاثر ہو کر اس کی عاجزی دیکھ کر سبھی اس کے لئے دعا گو تھے۔ یہ سادہ لوگ اس کے لئے اپنے دل میں جگہ رکھتے تھے۔

”ایک دستاویز ہے شیخ کامل جس کے حسن و قبح پر آپ کی اعانت چاہتا ہوں۔“

مدرسہ نظامیہ کے نہیں بغداد کے ہی نہیں، سارے عالم اسلام کے آفتابوں اور ماہتابوں نے حامد کی طرف نہایت غور سے دیکھا۔ وہ کسی دستاویز پر رائے معلوم کرنا چاہتا تھا اور اس کی عاجزی بے غرض نہ تھی۔ سارے چہرے اس سوال کے لئے منتظر تھے۔ اور پیشانیاں شکن و شکن تھیں۔

حامد نے تالی بجائی تو غلام نے ایک طلائی طشت میں کاغذوں کا ایک پلندہ پیش کیا۔ شمعیں اور قریب لائی گئیں تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔

حضرت جنید نے وہ کاغذ الجری کی طرف بڑھا دیا۔ ان کا چہرہ کسی بھی جذبے سے خالی تھا۔

سب علماء نے وہ پرت ایک نظر دیکھ کر واپس اس طشت میں رکھ دیئے۔ کسی نے کچھ بھی نہیں کہا۔ ان سب کے چہرے بھی شیخ کامل کی طرح تھے۔

”شیوخ مکرین! میں آپ کی رائے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔“ حامد بن عباس نے بہت ہی جھک کر کہا۔

”کسی دیوانگی پر سند کی کیا ضرورت ہے وزیر مملکت۔“ حضرت جنید اٹھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

”اگر کفر کی حدوں کو چھونے لگے تو اس پر باز پرس ضرور ہوتی ہے۔“ اس نے نہایت نرمی سے کہا۔

”جو دیوانہ ہے وہ کفر اور ایمان کو نہیں جانتا اور جو دیوانہ نہیں وہ فرزانہ بھی نہیں ہو سکتا۔“ جریری دہلیز کے پار اتر گئے۔

حامد ان کو رخصت کر کے واپس آیا۔ خالی نشست گاہ میں چپ چاپ کھڑا رہا اور طشت میں رکھے کاغذوں کو درپچوں سے آنے

والی دلچہ کی غم آلود بوئے خوش رکھنے والی ہوا بکھیرتی رہی جیسے خزاں زرد پتوں کو مزاروں کے گرد چمک پھیریاں دیتی ہے۔

قبوہ خانے کے دھواں دھواں اور تقریباً نیم تاریک گوشے میں بیٹھے ہوئے ایک شاعر نے کہا۔

”ابوبکر صلی اور حامد بن عباس میں آج کل خوب گاڑھی چھن رہی ہے۔“

”یہ تقریباً دنیا کی سب سے اہم خبر ہے۔ اس لئے خلیفہ کے ندیموں اور حاشیہ نشینوں سے وزیر مملکت کو سب سے زیادہ کد تو صولی سے تھا۔ خود صولی کو میں نے کسی سے کہتے سنا ہے کہ حامد کے اور اس کے تعلقات میں سرد ہری ہے۔ اب شاید مغرب سے لوٹنے کے بعد حامد کو دربار میں ایسے دوستوں کی ضرورت محسوس ہوئی ہوگی جو کسی وقت خلیفہ سے اس کی سفارش کر سکیں۔“

”اگر اسے اصل ساتھیوں اور بھی خواہوں کی ضرورت ہے تو خاتون شغب کے دربار میں حاضری کیا بری ہے۔“ اس نے اپنی میلی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے کہا۔

”یہ واسطہ ذرا طویل ہے اور اس رشتے میں دو چار سخت گرہیں ہیں۔ پھر ہو سکتا ہے مادر مقتدر کسی وجہ سے حامد کو دیکھنا بھی پسند نہ کرتی ہوں کیونکہ ماضی بعید میں عبید المہدی کے واقعہ سے ذرا پہلے اس نے انہیں دربار کے کاموں میں بے جادخل اندازی کا الزام دے کر سخت خفا کر دیا تھا۔“

دوسرے نے ماتھا بجاتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ بات ہے تو پھر ابوبکر صولی بھی ذرا طویل مسافت ہوگی۔“

”سیاست کی بساط پر مہرے صرف استعمال کئے جاتے ہیں بغیر اس امتیاز کے۔“ انہوں نے قبوہ کے ترکی فحان خالی کر کے اپنے سامنے رکھ لئے۔

”کیا صولی خلیفہ کے مزاج میں اس حد تک دخیل ہے؟“ واصف نے پھر پوچھا۔

”یقیناً۔ ورنہ حامد کو کیا مصیبت تھی کہ ہر شام اسے اپنے ہاں مدعو کرے اور بہترین لے سے زریں نشست گایوں میں اس کی تواضع کرے۔“

”مقتدر نے اسے طلب نہیں کیا۔“

”کیا تھا مگر دونوں آ کے رکے رہے۔ دفتر امور خارجہ کے وزیر نے تو یہی کہا تھا۔“

شاہوں کے مزاج پر موسموں کا اثر ہوتا ہے شاید۔ اس دن آسمان گرد آلود ہوا تیز ہوا یا آکھی خوفناک ہو یا خلیفہ نے اپنی مادر مہربان کے سکی اصولی بات پر زک اٹھائی ہو یا صد بابا تیں ہو سکتی ہیں۔“

اس نے غلام کو اشارہ کیا جو گرم قبوہ فجانوں میں بھر رہا تھا۔

”مگر حامد نے کچھ دن پہلے مدرسہ نظامیہ کے مشائخ اور علماء کو مدعو کیا تھا۔ یہ تمہیں معلوم ہوا۔“

”گوشہ نشین علماء سے اسے کیا فائدہ ہوگا۔ حامد کی طبیعت میں پراسراریت البتہ ہے۔ جو اسے لوگوں کے لئے ذرا قابل توجہ اور خوف انگیز بناتی ہے۔ لوگ نہ اس کی محبت پر اعتبار کرتے ہیں اور نہ ہی اس کی توجہ کو درخور اعتنا سمجھتے ہیں۔ وہ عجیب سا پلٹ جانے والا مسموم آدمی ہے۔ البتہ دشمن سخت ہے اور اس کی طبیعت میں ضد نے جو استواری پیدا کی ہے وہ لوگوں کو خائف کر دیتی ہے۔ امر اس کے راستے کاٹنے میں نہیں۔ دربار میں اکثر لوگ اس سے بچ کر رہتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اپنے حسب ضرورت استعمال کر لیتا ہے۔ جیسے چھتے میں سے شہد حاصل کر کے اسے بیکار کر دیا جاتا ہے۔“

”اس نے خوبصورت توجیہ اور کوئی نہیں ہو سکتی۔“ اس نے فجان میں سے جردہ جردہ قبوہ پیتے ہوئے سوچا۔

قاضی ابو عمر نے کہا: ”سیدی حامد! آپ مدرسہ نظامیہ کے صوفیا اور اساتذہ سے کوئی امید وابستہ نہ کریں کہ وہ خود شکوک و شبہات کا شکار رہتے ہیں۔ ان کا مذہب اسرار و رموز کا ایک جنگل ہے جس کو انہوں نے خود اپنے گرد آباد کیا ہے اور خود ہی اس میں راہیں تلاش کرتے ہیں۔ میں پورے وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا مگر اصل معاملہ وہاں پر بھی کچھ اور ہے۔ فلسفہ اور الہیات اور علوم کی اتنی گرد وہاں اڑتی ہے۔“ ”توحید“ کے موضوع پر ایسی ایسی موٹگافیاں ہوتی ہیں کہ آدمی ان مباحث کو سن کر ہی گمراہ ہو جائے۔“

”کیا ان سے باز پرس نہیں کی جاسکتی؟“ حامد نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ایسے مخفی عقائد رکھنے والے لوگ اس عظیم سلطنت کے طول و عرض میں ہر جگہ موجود ہیں۔ آپ کس کس سے باز پرس کیجئے گا۔ کہاں کہاں قدغن لگائیے گا۔ کون کون اس میں ملوث ہے؟ کیا معلوم اور پھر یہ و با جو عقائد میں طوفان مچا کرتی ہے۔“ قاضی ابو عمر کافی سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

”ابلیس کو محرم راز سمجھتے ہیں یہ لوگ۔ موحد اور خدا کا چاہنے والا۔ کیا یہ کفر نہیں؟“ حامد نے ذرا جوش سے کہا۔

”صریحاً کفر۔“ ابو عمر نے نشست پر پہلو بدلا۔

”پھر ان لوگوں پر کوئی گرفت نہیں۔ کوئی حد نہیں۔ کوئی احتساب نہیں۔“ حامد اٹھ کر کمرہ نشست میں ٹہلنے لگا۔

”میں پھر عرض کروں گا وزیر اعلیٰ کہ احتساب ممکن نہیں۔ یوں بھی بغداد نے خیالوں، نئے عقیدوں اور مختلف النوع لوگوں سے بھرا ایک جنگل ہے جہاں ہر درخت کی اوٹ میں ایک نیا چہرہ ہے۔ ہر اجنبی گھات میں ہے۔ سب سے زیادہ آزاد روی تو یہیں پر ہے۔

یہاں کے سارے ذاتی حکومت کے بندی خانے بھی کم ہوں۔ اگر گرفت مضبوط کی جائے۔ پھر خلیفہ کی والدہ ام المومنین، شغب کا غیر ملکی خون سے اڑائے اڑائے پھرتا ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی درازی عمر کے لئے طالب دعا رہتی ہیں اور جس شخص کے متعلق انہیں ذرا سا علم ہو جائے کہ وہ مستجاب الدعوات ہے، وہ اس تک رسائی حاصل کرتی ہیں۔ ایسے ضعیف العقیدہ لوگوں سے جو خوفزدہ اور ہراساں ہیں، بغداد کے گلی کوچے آباد ہیں۔“ وہ دم لینے کو رکا۔

”ظاہر تو کوئی چارہ نہیں۔ خلیفہ المسلمین کی مادر مہربان جو دربر پر اپنی کنیزوں اور اپنے غلاموں اور ترکی سرداروں کی وجہ سے قابض ہیں، عقائد کی اس گرد میں نہ ایمان کے لئے پریشان ہیں اور نہ ہی کفر کے لئے مضطرب۔“ دونوں نبیذ پیتے رہے۔

حلبی شیشے کے جام روشنی پکڑ کر طلائی لگ رہے تھے اور درپچوں میں سے بہار کی ہوا دجلہ کی لہروں کی بوئے خوش اور دوسرے کنارے سے آوارہ مغنیوں ک آوازیں کبھی کبھار اندر لاتی تھیں۔ راہدار یوں کید و سرے سرے پر غلام چپ چاپ گوش بر آواز تھے اور کنیزوں کے آنے جانے کا دروازہ بند تھا۔

”میں سمجھتا ہوں اب وقت آ گیا ہے کہ خاتون شغب کی اس بے راہروی اور کفر کی حوصلہ شکنی کی جائے۔“ حامد نے جام طشت میں ایک آواز سے رکھا۔

قاضی ابو عمر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ گہری سوچ میں ڈوبا تھا اور جام کو مضبوطی سے پکڑے تھا۔ حامد نے نشست گاہ کے طویل فرش پر ایک دیوار سے دوسری دیوار کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے سوچنا شروع کیا۔ ”شب خون ہونا چاہیے۔ مکمل یلغار ہونی چاہیے۔ فتح کے یقین کے ساتھ۔ طبل جنگ بجانے کی ضرورت نہیں۔ یورش اتنی مخفی ہو کہ اس اسرار کو کوئی پانہ سکے۔ دشمن کو سنہیلنے کا موقعی ہی کیوں دیا جائے۔ وہ اپنی برات میں کچھ کہہ ہی نہ سکے۔ مغرب میں جنگ اور شکست ہر جگہ میرا مقدر نہیں ہو سکتی۔ بخدا یوں نہیں ہوگا۔ عبداللہ المہدی جس طرح ایک نئے مذہب کا داعی ہو کر ایک بغداد سے مماثل سلطنت کا مالک بن بیٹھا ہے۔“

قاضی ابو عمر اور وہ دسترخوان پر بھی تنہا تھے۔

”آپ کو میری اعانت کرنا ہوگی۔“

حامد نے گوشت کا ایک بڑا سرخ پارچہ ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

”میں کفر کے لئے عاقہ قہر بلا ہوں۔ جہاں الحاد کو دیکھتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ میں اس پر حاوی ہو سکتا ہوں وہاں پر میں اپنے سارے وسائل آزماتا ہوں۔ آپ کسی جگہ بھی مجھے خوفزدہ نہیں پائیں گے۔“ اس نے ایک بڑا سانوالہ منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے آپ کی مدد کی ضرورت اکثر پڑے گی۔“ حامد نے جام بھرا۔

”میں دوست ہوں مجھ پر اعتماد کیا جاسکتا ہے مگر“ قاضی بہت انہماک سے کھانے میں لگا تھا۔ ”خاتون شغب کے جاسوس بہت خبردار ہیں۔“ اس نے بات ختم کی۔

”ہمارا ان سے واسطہ۔ ہم تو کفر کے لئے لڑیں گے تاکہ ایمان سلامت رہے۔ اس پر کوئی آنچ نہ آئے ار آپ نے دیکھا اسی چشم پوشی اغماض اور لاپرواہی کا نتیجہ تھا کہ مغرب میں ایک مقابل پیدا ہوا۔ مہدی موعود اس کی سلطنت میں روز بروز وسعت وہ رہی ہے۔ ہم سب کی زندگی اور نجات اسی میں ہے کہ ہم بغداد میں کسی آوارہ خیال کو رہنے نہ دیں۔ آپ میرا مطلب سمجھ رہے ہیں نا!“

”بالکل بالکل۔“ قاضی نے جام اٹھاتے ہوئے کہا۔

ہمارا کام نہایت آہستہ رو ہونا چاہیے۔ ایک ایک الگ الگ تاکہ لوگوں کو یہ خبر پہنچ ہی نہ پائے کہ اصل راہ ارادہ کیا ہے اور ہماری منزل کیا ہوگی۔ اس کام میں سوائے آپ کے دوسرا شریک نہیں ہوگا۔ شرکت سے راز طشت از بام ہو جایا کرتے ہیں۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

یوسف بن الحسین نے کہا:

”آج حامد بن عباس کے ہاں میری طلبی ہوئی تھی۔ گویا وے کا طریقہ دوستانہ تھا مگر سرتابی کی مجال اس قطعیت میں نہیں ہوتی۔ مجھ سے ایک تحریر پر رائے مانگی گئی تھی۔“

جنید نے سنہری روشنائی میں ڈوبا ہوا قلم رکھ دیا اور ان کے دونوں ابروؤں کے درمیان ایک گہرہ خندق کی سی لکیر تھی جیسے دونو جھوں کے درمیان حد فاصل۔

”ایسی تحریریں اس سے پہلے بھی لکھی گئی ہیں۔ لوگوں نے یوں بھی سوچا تھا۔“ انہوں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”مگر مجھ سے قطعاً رائے مانگی گئی تھی اور میں نے کہا۔ عزازیل کی شان میں یہ قصیدہ کسی ابلیس پرست کے سوا اور کوئی نہیں لکھ سکتا۔“ یوسف ذرا گھبرا سے گئے تھے۔

”آپ کا مبلغ یہی کہتا تھا۔“ پیشانی پر لکیریں گہری ہو گئیں۔ آواز نہایت نرم تھی۔

یوسف قریب آئے۔ تقریباً جھکے اور معذرت چاہنے والوں کے سے انداز میں انہوں نے سر جھکا لیا۔

”جو ہو چکا اور کہا جا چکا اس کو آپ لوٹا نہیں سکتے۔ حامد فتنوں کی تلاش میں ہے۔ وہ مغرب میں اپنی شکست کی ذلت کو یوں مٹانا

چاہتا ہے۔ عبید اللہ المہدی میں اور اس میں کوئی مماثلت نہیں۔“

جنید قلم اٹھا کر چوڑے حاشیے میں کچھ لکھنے لگے۔

”اس کے نزدیک بغداد کا مدرسہ نظامیہ مشرکوں، زندیقوں اور آواگون میں یقین رکھنے والوں کا مسکن ہے۔ ہر طرف وہ آنکھ کفر

دیکھتی ہے اور اس کا ہاتھ رسائی کی تلاش میں ہے۔ وہ مقتدر باللہ کی نظروں میں سرخروئی چاہتا ہے اور اس کے عزائم خطرناک ہیں۔“

یوسف نے ذرا تیزی میں بات ختم کی۔

”آنکھ جو دیکھتی ہے۔“ جنید نے حاشیے میں خوشخط نہایت باریک لکھ کر قلم ہاتھ سے رکھ دیا تھا ”اور پھر میں سمجھتا ہوں سرخروئی

حاصل کرنے کے اور ہزاروں طریقے ہیں۔ مقتدر کو خوش کرنا اور اپنی انگلی کے گرد گھمانا حامد کے لئے ناممکن بات نہیں۔“

پھر انہوں نے ایک سرد آہ بھری۔ بہت دیر خاموش رہے۔

”صرف کسی بے گناہ کا زیاں نہ ہو۔ یہ وقت نہایت نازک ہے۔“ انہوں نے لکھے ہوئے صفحات کو پھر سے پلٹا اور کہیں کہیں تصحیح

کی۔

”یہی وقت نازک کیوں؟“ یوسف بن الحسین نے استفسار کیا۔

”تصوف کی بساط آج بیس سال پہلے لپٹی جا چکی ہے اور کوئی بھی طرز نگارش آدی کو گرفتار کروانے کے لئے کافی ہے۔ اگر حامد کسی

تحریر پر آپ کی رائے چاہتا ہے تو وہ اس کی نظروں میں تکفیر ہونا چاہیے اور کفر کے لئے کوئی بھی سزا تجویز کی جاسکتی ہے۔“

”مگر کیوں؟“ یوسف خوفزدہ سے ہو کر ایک دم اپنی جگہ سے آگے جھکے۔

”اشاراتی زبان اور رازداری کم آمیزی اور خاموشی۔ یہی اس زمانے میں عمدہ ہتھیار ہیں۔“ جنید نے اپنی کتاب میں سے چند

اور لفظوں کو قلم زد کیا اور ان پر روشنائی کی لکیر ایک کرن کی طرح جو دوزادیوں کے درمیان پکڑی جائے ماند ماند چمکی۔

”کوئی بیچارہ ابلیس کی عالی ہمتی کو جانے کیوں قابل تعریف سمجھتا تھا کہ میں نے اسے کفر کہہ کر اس پر گویا مہر لگا دی۔ اب وہ سب

تعریفیں کفر شمار ہوں گے اور میں کچھ کرنے پاؤں گا۔“

”رائے یافتورے بہت عظیم ذمہ داریاں ہیں۔“ جنید نے کتاب کسی اور وقت کے لئے بند کر دی۔ وہ اطمینان سے بیٹھے اور

یوسف سے گویا ہوئے۔

ابلیس سے موٹی سینا میں ملے

اور پوچھا تھا کہ کس شے نے تمہیں آدم کو سجدہ کرنے سے روکا۔

ابلیس نے جواب دیا اگر میں سجدہ کرتا تو اپنی فطرت کے خلاف کرتا۔

تمہیں کوہ طور کی طرف نظر کرنے کا حکم ملا اور تم نے دیکھا

اور میں بار بار سجدے کے لئے پکارا گیا تھا

ماور میں نے تسلیم نہیں کیا

یوسف بن الحسین نے کہا ”اسے بار بار سجدہ کے لئے پکارا گیا تھا۔“

”ہاں اسے بار بار سجدے کے لئے پکارا گیا تھا“

”مگر اسے کیوں بار بار سجدے کے لئے پکارا گیا تھا“

”اس کی فطرت ابا کرنا تھی۔“

”پھر وہ راندہ درگاہ خداوندی کیوں۔“

”شیخ کامل کوئی فطرت کے خلاف تو نہیں جاسکتا۔ یہ قانون قدرت ہے۔ ازل سے ابد تک۔“ وہ نہایت مضطرب تھے۔

جنیس نے نشست پر پہلو بدلا اور ہنسنے نہیں صرف مسکرائے۔ یوسف بن الحسین کے اضطراب کو سمجھ کر ان کی طرف نہایت دلچسپی

سے دیکھتے رہے۔

”آپ کیا کہتے ہیں۔ اس مسئلہ کا کوئی تو حل ہونا چاہیے۔“ یوسف نے بڑے غیر یقینی انداز میں پوچھا۔

”عقل مہربان کا ساتھ جب تک رہے گا یہ مسائل سمجھ میں نہیں آسکتے اور توفیق تو اس کی عطا ہے۔ اس کی رضا سے اور رضا پر وہ خود

قادر ہے اور انسان کی فہم کی قوتیں ہی کیا ہیں؟“

یوسف بن الحسین کو ماورا کے ماورا اسے بھی ماورا کے الفاظ یاد آ رہے تھے۔ آدم کا اختیار ہی کیا تھا۔ ریاضتوں، عبادتوں،

مناجاتوں سے ایک روشنی کی کرن کبھی کبھار ذہن کا اجاغتی ہے۔ وہ خواب میں دیکھا گیا جواب ہوتا ہے۔ جیسے تازہ کٹی لکڑی کی مہک

سے بھرا جنگل ہو اور اس میں راستہ تلاش کرنا خواب کے سائے کے ساتھ چلنے جیسا ہوتا ہے۔

ایک طویل خاموشی کے بعد یوسف نے پوچھا ”حامد پتہ نہیں کس کے درپے ہے اور کیوں اس تحریر پر گواہی حاصل کرنا چاہتا ہے۔“

”یہ بھی راز درون مملکت ہے۔ ہو سکتا ہے اس کی تحریر اصلی کچھ بھی نہ ہو اور معتبہ پر محض گواہی حاصل کر کے اس کو گرفتار بلا کرنا مقصود ہو۔ بقائی ہوش و حواس اس خطرناک دور میں کون اپنے اسرار و رموز انکشافات کو ضبط تحریر میں لانے کی جرات کر سکتا تھا۔“

اذان کی آواز خوشبو کی طرح ہر درتپے اور در میں سے چھت کے خلا میں ہر گوشے اور ہر کونے کو معمور کرتی ہوئی دالانوں پر نشست گاہوں درس گاہوں اور زایوں گنبدوں اور طاقوں میں پھیل گئی تھی۔

نماز کے لئے اٹھتے ہوئے جنید نے کہا۔

”تم پھر طلب کئے جاؤ گے۔“

”میں اسی طلبی سے بچنے کے لئے کل خراسان روانہ ہو رہا ہوں اور حامد کے گرد مجھ سے کہیں زیادہ مستعد لوگ جمع ہیں جو اس کی بات کو اپنے لئے نشان راہ بنالیں۔“

ستونوں کے پیچھے نیم تاریک قبة میں خواتین بھی جماعت میں شامل ہونے کی غرض سے موجود تھیں۔ خلیفہ کے خاندان کی مستورات اور مقتدر کی ماں شغب جب کبھی مضطرب ہوتی یا اسے خصوصی دعاؤں کی حاجت ہوتی یا پھر اسے کوئی سخت مہم درپیش ہوتی۔ دربار کے امرا اس کے احکامات سے شادی ہوتے اور وہ اپنے ارادوں میں ناکام مہونے لگتی۔ لوگ سرگوشیوں میں اس دولت کا تذکرہ کرتے جو اس کے پاس تھی اور لاتہا تصرف جو سلطنت کے ہر کام میں اسے حاصل تھا، خطرے میں پڑنے لگتا تو وہ مشائخ کے پاس طالب دعا ہوتی۔ ”جعفر کی زندگی اور اس کی طاقت۔“ اس کے دو ہی سوال تھے۔

کئی اور اجنبی چہرے بھی تھے جو ایک نظر میں کبھی کبھار دیکھے ہوئے لگتے تھے مگر انکی پہچان مشکل تھی۔ ابن صولی نے کبھی بدر سے کا رخ نہیں کیا تھا۔ دربار سے وابستگی اسے اتنی فرصت ہی کب دیتی تھی کہ وہ دجلہ کے پلوں کو پار کرنے اور کوچوں میں سے گزر کر یہاں پہنچے۔ وہ ان شاعروں میں سے تھا جو اپنے علم کا زور بادشاہوں کی مدح و ثناء کو سمجھتے تھے اور امرا کی دلداری بھی کرتے رہتے تھے۔ مبادا کسی آڑے وقت میں انہیں مدد کے لئے ہاتھ پھیلا نا پڑے۔ وہ صاحب طرز فسانہ طراز داستان گو تھا اور اسے کسی دعا کی بھی ضرورت نہ تھی۔ دنیاوی نعمتوں میں سے جو اس نے چاہا تھا، پالیا تھا اور جس چیز کی خواہش کرتا تھا، پالیتا تھا۔ درسہ نظامیہ کے مشائخ اور اساتذہ سے اس کا رشتہ تفاخر کا تھا جیسے منہ کا مزہ بدلنے کے لئے یا ہو سکتا ہے کسی خاص اطلاع کے لئے وہ مغرب کی نماز میں شامل ہو جایا کرتا

تھا۔

ابوذر طبری، عریب بن سعد قرطبی اور خطیب تھے اور ان کے ساتھ گروہ درگروہ اور لوگ بھی تھے۔ ہاشمیوں کی ایک حمایت تھی اور عراقیوں کی ایک بھیڑ تھی جو شہر میں نئے وارد معلوم ہوتے تھے کیونکہ ان کے گاہ گرد آلود کپڑے میلے تھے شاید کوئی قافلہ کہیں قریب ہی ٹھہرا تھا اور سوق النشاشہ کی طرف سے آیا تھا۔ وضو خانوں میں ہجوم تھا اور طالب علم تیز تیز جاری پانی کے سوتوں کی طرف جو اقامت گاہوں میں تھے بھاگ رہے تھے۔

”میرے ایک عزیز کے لئے خصوصی دعا کیجئے کہ خدا سے فتنوں اور دشمنوں سے محفوظ رکھے۔“

شغب کا پرچہ پڑھ کر جنید نے دوبارہ دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے اور دیر تک اپنی خصوصی توجہ اس شخص کی طرف مبذول کی کے الحاح و زاری سے سوالی رہے مگر وہ ایک گونہ سرخوشی محسوس نہیں کر پائے تھے جو دعا کی قبولیت کے طور پر دل میں آتی ہے۔ جو قلب و نظر کو ایک کیفیت سے دو چار کرتی ہے۔ جو خدا کی طرف سے پیغام بن کر روح میں اترتی ہے کہ تمہاری التجاسنی گئی۔ رحمتوں کی تنی ہوئی چادر کا احساس فضل و کرم کی بارش کے امطار انوار یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دیواریں حائل ہیں جو لفظوں کے ساتھ ساتھ بلند ہو رہی تھیں اور انکو گھیرے میں لے کر ہر صعود کی پرواز کی قبولیت کی کوشش کو ناکام بنا رہی تھی۔

وہ نشست گاہ کی طرف لوٹے ہیں تذبذب انہوں نے صولی کو دروازے کے باہر منتظر پایا۔ آسمان پر نیلا ہٹ میں تارے نہایت مدہم غمناک تھے۔ جیسے نئے جلے ہوئے چراغ ہوں۔ ”یا شیخ! میرا ایک سوال ہے۔“ صولی نے سر جھکا کر کہا۔

اس کے باوجود کہ شیخ کامل کی طبیعت رکی رکی اور بوجھل تھی، انہوں نے سر کے اشارے سے سوال کے لئے اذن دے دیا۔ حضور کیا حکم ہے اس شخص کے لئے جو جاہل ہو اور عاقل بنے۔ گفتگو سے عاجز ہو مگر فصاحت اختیار کر سکتا ہو۔ جو لوگوں کے رنگ میں رنگا جائے اعتزال دیکھے تو مائل بہ معزل ہو جائے۔ امامیہ لوگوں میں امامیہ ہو اور اہلسنت کے طریق پر ہو تو سنی بن جائے۔ جو بڑے بڑے دعوے کرے اور کیمیا گر ہو اور خبیث بھی۔“

جنید مسکرائے۔ ”ابو بکر صولی! کیا ایسے تضادات ایک آدمی میں جمع ہیں؟“

”یا شیخ! وہ ایسا ہی ہے بالکل۔“ صولی نہایت پیچھے باندھ رکھے تھے اور سر کو جھکائے ہوئے تھا۔

”کیا کسی فتنے کے کھڑے ہونے کا امکان ہے؟“ انہوں نے پوچھا۔

”اگر اس کے دعوؤں پر لوگوں کا یقین بڑھ جائے اور عوام اس کی راہ اختیار کریں تو کفر کا فتنہ پیدا ہو جائے۔“

”مفروضوں پر تو کسی شخص کو معتب نہیں کیا جاسکتا۔ اگر وہ آدمی دیوانہ نہ ہو جیسا کہ وہ ہوگا تو قابل معافی ہے۔ دنیا دیوانوں اور فرزانوں سے مل کر ہی تو بنی ہے۔“

جنید خاموش ہوئے تو رات کا پرندہ زور زور سے بولنے لگا۔ پھر سیاہ پروں والی بڑی سی چیز یا طویل چیخ کے بعد زایے کے باہر درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔ شاہراہ پر قافلے کی گھنٹیاں سنائی دیں۔ اقامت گاہوں میں چراغوں کی روشنیاں ظاہر ہوئی اور نسطوری عیسائیوں کی عبادت گاہوں میں شام کی عبادت کا گھنٹہ مسلسل بجنے لگا۔

ابوبکر صولی جو خلفا ہم نشین اور دربار میں ایک مقام رکھتا تھا خاموشی سے جھکا اور آداب بجالا کر بڑے دروازے کی طرف چلنے لگا۔

جنید یہ سوچتے ہوئے کہ فتنوں کے خیال ہیولوں سے گھبرا کر احکام کیا مضحکہ خیز حرکتیں کرتے اور ان کے رفقا کس تفصیل سے اپنی کارکردگی اور مستعدی کا مظاہرہ خیز حرکتیں کرتے اور ان کے رفقاء کے تفصیل سے اپنی کارکردگی اور مستعد کا مظاہرہ کرتے ہیں اپنی نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ غلام نے لکڑی کے چراغ دان کو لا کر برابر رکھا اور سنہری روشنائی میں ڈوب کر وہ حاشیے میں نہایت باریک قلم سے لکھنے لگے۔

”انفرادیت کے مکمل طور پر مٹ جانے اور انسان کی رضا کا خدا کی رضا میں مل جانے کا نام ہے فنا۔ انسان کا مشاہدہ اور بصیرت اس سے الگ ہو جاتی ہے اور خدائے تعالیٰ و شوتیک کے ساتھ قائم رہتا ہے۔“

غلام نے دوبارہ اندر داخل ہو کر کہا۔ ”حضرت شبلی تشریف لائیں۔“

اور اس سے پہلے کہ وہ حجرے سے باہر نکلتا وہ تقریباً دروازے میں ہی داخل ہو رہے تھے۔

شبلی نے غوغا کیا۔ ”وہ..... وہ..... وہ“

دیواروں کی طرف مضطربانہ دیکھتے ہوئے آسمان کی طرف انگلی اٹھائے ہوئے۔ جنید نے چاہا انہیں تھا میں اور انتہائی کرب اور درد کی اس کیفیت کا معلوم کریں مگر وہ مدرسے کے ستونوں اور دالانوں میں بھاگنے لگے۔ جیسے کوئی آتش جہنم لے کر ان کا تعاقب کر رہا ہو۔ پھر تھک کر ایک ستون سے ٹیک لگا کر رونے لگے۔ انہیں ہوش آ رہا تھا۔ جنید انہیں شانے سے پکڑ کر کشاں کشاں حجرے میں لائے۔

”شہادت میرا مقدر کیوں نہیں؟“ انہوں نے ضدی بچے کی طرح سوال کیا۔

”مجھے شہادت چاہیے۔“

”مثیت۔“ جنید نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

”شہادت..... شہادت..... شہادت..... سعادۃ و رفعت..... مقدر..... مثیت۔“ وہ اپنے آپ سے کلام کر رہے تھے۔

”ازل سے جو لکھا گیا۔“ جنید زمین کی طرف دیکھ رہے تھے۔

شبلی نے آسمان کی طرف منہ کیا اور کہا ”محبت اور مقدر۔“

وہ اٹھے اور باہر نکل گئے۔

اس حوض کی طرف گئے جہاں پانی پوشیدہ سوتوں سے ابلتا ہے۔ مسجد اور وضو خانوں اور زوایوں کی نہروں میں داخل ہو کر لوٹ جاتا ہے۔ گنبدوں کا عکس اس میں لہروں کے ساتھ یوں مضطرب ہوتا جیسے توحید کے موضوع پر عارفوں کیدلوں کے آئینے اپنے ہی پر تو سے کانپتے تھے۔ کار شیشہ گراں مشکل اور مقام شیشہ مشکل تر تھا۔ اس کا تعین کون کرے۔

جنید نے آہ بھری اور کہا۔

”آئینہ تمثال دار مگر جس آئینے کا مقدر کرچیوں میں بننا ہو اس کے لئے افسوس کیوں آخر کیوں؟“

ہوا کا جھونکا کہیں سے آیا اور کھلے درپچوں کے سامنے شمع کو بجھا نکل گیا۔ غلام کو پکارنے کے لیے حجرے سے باہر آئے تو انہوں نے دیکھا کہ آسمان ستاروں سے مزین اپنی رفعتوں میں نہایت پرسکون تھا۔

نیلگوں سیاہ رات اپنی ٹٹمٹھاہٹوں سمیت بہت حسین اور آراستہ۔ انہیں بھولے ہوئے اشعار یاد آئے۔

اس کے دم صحرا آباد ہیں اور سراب پانیوں میں بدل جاتے ہیں

چراگا ہوں کے سبزے کی لہریں ہوا میں چمکتی ہیں

وہ نگاہیں مے کو خوش رنگ بنا دیتی ہیں

رات اس کچھیرے کی ضیا سے درخشندہ ہے

میرا مقدر اس کی زلفوں کی طرح سیاہ ہے

مشاقی سے چلائے گئے نگاہوں کے تیر میرے سل کے پار ہو گئے ہیں

ارمیری پسلیوں میں آگ ہے!

حسین بن منصور اور اغول۔ پھر ایک گزرا وقت اور ایک ٹھہرا ہوا وقت ایک ماورا وقت جیسے بجلی کا کوندا جاری پانیوں کو روشن کرتا، ان کی بے پناہی اور اسرار پر مطلع کرتا گرجتے دھارے کو دور تک سیل نور بنا دیتا ہے۔

حامد خراسان سے دستاویزات کا منتظر تھا اور بے قراری سے ان روشوں پر ٹہل رہا تھا جو خوشگوار ہوا کے رنگ آلود جھونکوں سے معطر تھیں۔ درختوں کے مہکے ہوئے سائے ڈوبتے سورج کی سرخی میں ایسے حنائی تھے جیسے کسی عروسِ نو بہار کے عکس سے محل کی دیواریں۔ حواسِ باختہ غلام نے بھاگ کر اس کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ وہ سخت سہا ہوا پریشان تھا۔ جیسے اس نے کوئی بہت ہی خوفناک منظر دیکھا ہو۔ اس کی آنکھیں وحشت سے ابلی پڑتی تھیں۔ منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی اور سانسِ حداد کی دھونکی کی طرح چل رہا تھا۔

”کیا بات ہے؟“ حامد نے ذرا دور ہوتے پوچھا۔

”وہ..... وہ..... وہ.....“ غلام کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

حامد نے ذرا گھبرا کر ارد گردِ نظر کی۔ شام کے دوش پر رات اتر رہی تھی۔ پتوں اور شاخوں میں چھپے نڈوں نے یک بیک مسلسل چرچر بند کر دی تھی۔ سناٹا بوجھ بن کر دل پر گرنے لگا تھا۔

”کیا بات ہے؟ بتاؤ۔“ حامد نے ذرا خفگی سے کہا۔

”وہ..... وہ..... زندان..... وہ.....“ اس نے بات کرنے کی کوشش کی۔ کانپتا ہوا گرا اور سجدہ ریز ہو گیا۔

پھر اور غلاموں کو اس نید دیکھا کہ بھاگے آتے ہیں۔ شرطے اور پہریداروں کی ایک بھیڑ اس کی طرف چلی آتی تھی جیسے آسمان گر گیا ہو۔

”کیا فساد وقت ہے؟“ اس نے زور سے پوچھا۔

”ہم اس کے تعاقب میں آئے ہیں کہ زندان میں کھانا لے جاتا تھا کہ چیخ کر پلٹا۔ طباق کو پھینک دیا اور سیدھا آپ کی تلاش میں ہوا۔“ وہ سر جھکا کر مودب کھڑے ہو گئے۔

”زندان میں کون ہے؟ کون سے زندان کی بات کرتے ہو؟“ حامد نے بے نیازی سے پوچھا۔

”جس کے دروازے محلہ رخ کی طرف کھلتے ہیں۔ زندانی وہی ہے جس کی دعا میں بہت اثر ہے۔ جو ہاتھ اٹھا کر کسی کے لئے کچھ

مانگے تول جایا کرتا ہے۔“

”بس بس۔ یہ وہی شخص نہیں جو خبیث، کیمیا گر اور حیلہ جو عبادت گزار ہے۔ ابلیس کا پرستار؟“

حبشی پہرہ داروں کو لگا انہیں غش آ جائے گا۔

”اس کے کسی شعبہ نے اس غریب کو بتلائے مصیبت کر دیا ہوگا۔ اسے اٹھا کر لے جاؤ اور صورتحال سے مجھے فوراً مطلع کرو“

فوراً۔“

اب رات ستارے بھری چادر کے دامنوں کو گھسیٹتی ہوئے دریاؤں اور پہاڑوں، وادیوں اور صحراؤں، روشنی اور اندھیرے پر محو پرواز ہونے کے بعد نیچے اتر آئی تھی اور حامد اس تلخی کے سوا کچھ محسوس نہیں کر رہا تھا جو اس کی روح میں شکست بن کر رہتی تھی۔ یہ احساس کہ وہ ناکام و نامراد آدمی ہے۔ محبت اور زندگی میں روندنا جانے والا، ہر محاذ پر ہچھاڑا گیا شہسوار، بد قسمت محض اور صرف بد نصیب اور اس ساری شکست خوردگی کا باعث ایک شخص جو بے بضاعت تھا، دنیاوی لحاظ سے ایک نفی..... مگر اس کا تمسخر اڑانے والا۔ لوگ سمجھتے تھے وہ خدا کا مقرب ہے۔ اس کے غلام سمجھتے تھے کہ وہ جس کے لئے ہاتھ اٹھا کر دعا کرے قبول ہو جاتی ہے۔

”ہاں اس کی دعائیں صرف دوسروں کے لئے قبول ہوتی ہیں۔ جب اس کی اپنی باری آئے گی تو دعا کے دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔“ اس کا تہقہ نشست گاہ میں دیر تک گونجتا رہا..... وہ عمار سے سب صورت حال سمجھ سکتا تھا۔

اس نے تالی بجائی۔

کنیزیں اندرونی راہدار یوں سے طویل نشست گاہ میں داخل ہوئیں۔ یہ ایک عجیب رقص تھا نیم ترکی نیم ہندی۔ کچھ ایرانی اور ایام جاہلیت کی عربی موسیقی کی دلنواز دھنوں پر ترتیب دیا گیا۔ ہر درجب وا ہوتا اور پردہ اٹھتا تو ایک جہان دیگر سامنے آتا۔ یہ رقصاں عورتیں اسے آج اغول کی یاد دلا رہی تیں۔ جیسے وہ سب اغول کے مختلف چہرے ہوں۔ اس کے سراپے ہوں۔ اس کے وجود ہوں جیسے وہ آئینہ خانے کا نظارہ کر رہا ہو اور آئینوں سے گھرا ہوا یہ رقصاں ہو پلے دراصل اس ایک کے پرتو ہوں۔ سارا کرشمہ نظارگی کا تھا۔ قریب آ کے لرزاں سائے دور ہٹتے ترساں سائے وہ سب وہی تھی۔ رنگوں میں لپٹی ہمیشہ گریزاں گریزاں اور وہ خود دشت ساویہ میں تھا۔ جہاں آنندھیاں آدمی کو دیوانہ بنا دیتی تھیں۔ راستہ کھوجاتا تھا۔ ٹیلے سفر میں رہتے تھے پھر اسے اموی شاعر کے اشعار یاد آئے۔

ہمارے درمیان ایسے لقمے و دق صحرا ہیں جن میں قافلے چلتے چلتے تھک جائیں۔

اے عزہ! تم نے ہمارے ساتھ برا سلوک کر دیا بھلا

ہماری طرف سے تم کو ملامت نہیں کی جائے گی

اور اگر تم دشمنی کرو تو بھی ہم تم سے دشمنی نہیں کریں گے

ہمارے درمیان لقمہ و دق صحرا ہیں

ہاں صرف لقمہ و دق صحرا

میں کبھی اس تک پہنچ ہی نہیں پایا۔

یہ ایک خواب تھا کہ وہ تھی

اور جب آنکھ کھلی تو ہمارے درمیان لقمہ و دق صحرا تھے!

”بھدا وہ دشت سا وہ یہ کے ایک کونے میں سوتی ہے اور میں یہاں ہوں۔ حسین بن منصور یہاں ہے۔ کتنا ستم ہے کہ حسین رہے

اور اغول نہ رہے۔ روح نہ رہے اور روح اللہ رہے۔“

اس نے بازو لہرا کر اشارہ کیا۔

موسیقی تھم گئی۔ کنیزیں سرخم کر کے کھڑی ہو گئیں اور پھر اٹھنے قدموں انہیں پردوں کے پیچھے غائب ہو گئیں۔

خالی نشست گاہ میں وہ دیوانوں کی طرح پھرتا رہا..... کیوں؟ آخر کیوں؟ حسین رہے اور اغول نہ رہے۔ وہ شعبہ باز حیلہ جو

ہے اور وہ سچائی تھی، مٹ جائے۔ وہ ہر اس نقش کو منادے گا جو اغول کے اور اس کے درمیان تھا۔ اس کے حامد بن عباس کے نصیب

میں محبت نہیں نفرت تو تھی۔ شدید عمیق نفرت۔ سب چارہ گرنا کام ہو چکے تھے۔ زہر آلود نیزے کی انی، دل میں چھ رہی تھی۔ وہ آخری

کوشش کرے گا۔ ساری شکستوں کا انتقام لے گا۔ اگر محبت اس کا حق نہیں تو نہ سہی۔ نفرت کرنا، مٹانا، معدوم کرنا تو اس کے اختیار میں

تھا۔ ہاں وہ ہمیشہ ان لقمہ و دق صحراؤں میں آوارہ ہواؤں کی طرح سرگرداں نہیں رہے گا۔ وہ قرار پائے گا۔

”عمار۔ عمار۔“ اس نے زور سے پکارا۔ ”کوئی ہے؟“

اس کے حلق میں کانٹے چھب رہے تھے۔ شدید پیاس اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ اب ایسا اکثر ہوا کرتا تھا۔ وہ جب بھی سوچتا

پریشان ہوتا، پیاس اس پر غلبہ پالیتی۔ پھر کوئی مئے لالہ، کوئی شراب ناب، کوئی شربت خوش ذائقہ اسے تسکین نہ دے سکتا۔ حکیم اس

کی اس بیماری کا علاج کرنے سے عاجز تھے۔ بخ پانیوں اور نبیذ سے یہاں بھڑکتی، یہودی اور نصرانی اطباء دربار کے نہایت معزز معالج

خود خلیفہ مقتدر کے ذاتی طبیب ناکام ہو چکے تھے۔ مغرب سے لوٹنے کے بعد اس کا حملہ اکثر ہوتا اور دوائیں اس کی کوئی مدد نہ کر سکتیں۔ یہ کس قسم کی پیاس تھی۔

”عمار۔ عمار۔“ حامد نے پھر پکارا۔ اس کے حلق میں کانٹے تھے اور اندر صحرائے لق و دق میں بگولے جیسے آندھیوں کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ کنیزیں دم بخود سہی ہوئی پردوں کے پیچھے کھڑی تھیں۔

حبشی غلام نے کہا ”سیدی عمار ایک خراسانی مہمان کو لے کر ابھی ابھی قصر کے زریں حصے کی طرف گئے ہیں۔“

”بھاگو اور اسے کہو حکیم بخشیشوع کو بلائے۔“ حامد کو بے دم کرنے والیا ایک خشکی جو زبان کو جکڑ رہی تھی، اپنے اندر سے غبار کی طرح بڑھتی محسوس ہوئی۔

پردوں کے پیچھے دیواروں سے پرے دالانوں اور راہداریوں میں بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی جیسے دفاع کی تیاریاں ہو رہی ہوں۔ حکیم بخشیشوع تقریباً خانہ نشین تھا نہایت ضعیف اور چلنے پھرنے کے تقریباً ناقابل۔ بھلا اسے کس طرح سے لایا جاسکتا تھا۔ یہ عجیب مرض تھا کہ سب چارہ گر عاجز تھے۔ کوئی تو چارہ ہواے چارہ گراں!

وہ بے حال ہو چکا تھا سوچ اور ذہن دل اور جسم سب سلامت تھے صرف منہ میں ریت کا مزہ تھا اور زبان لکڑی کے ٹکڑے کی طرح تھی۔ خشک ٹکڑے ہوتی ہوئی۔ ”دوائیں تو آزمائی جا چکی ہیں۔“ کوئی کہہ رہا تھا۔ ”اب دعا کی ضرورت ہے دعا کی۔“

دوسری سرگوشی سنائے میں ابھری۔ ”زندانی حسین بن منصور اگر دعا کرے تو مشکل آسان ہو سکتی ہے۔“

خود اس کے قصر میں اس کے گردا گرد حسین بن منصور تھا۔ زندان میں اسیر ہی نہیں۔ اور یوں تھا کہ وہ خود اسیر تھا اور وہ جو اسیر تھا آزاد تھا۔

کیا یہ ستم نہیں تھا؟

قدرت اس سے کیا کھیل کھیل رہی تھی؟

اس کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر کہے کہ میں اس کھیل میں جیتنا چاہتا ہوں۔ سب کچھ داؤ پر لگا کر یہاں یہاں تک اپنا آپ بھی۔

اغول کے بعد اپنے حسین کے بعد وہ اب خود حامد بن عباس وزیر مملکت اور خلیفہ کا نہایت معتمد خاص اپنے آپ کو اس آگ میں جھونکنا چاہتا تھا۔ اب برداشت کی آخری حدوں کو چھو چکی تھی اس کی قوت برداشت۔ ای ایک بے بضاعت آدمی سے جو دیوانہ تھا، کیوں شکست اٹھائے؟ اسے دعا کی ضرورت تھی دعا کی تھی چاہے اس کا جسم ٹکڑے ہو کر سوکھ کر اس کی ہڈیوں سے گر جائے وہ حسین بن منصور

کو مٹا کر رہے گا۔ ہاں وہ اسے مٹائے گا، دچا ہے اس پر کچھ ہی کیوں نہ بیٹے!

قاضی ابو عمر نے خراسان سے آئے ہوئے مکاتیب اور دستاویزات کا معائنہ کیا۔ خراسانی سرائے سے کتابوں کے مسودات اور رسائل کو اپنے ماتحت قاضی یحییٰ کو بھجوادیا۔ حامد کی خاص ہدایات تھیں کہ ان سب دفاتر کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے۔ ذاتی خطوط، عقیدت مندوں کے مراسلے، دعا کے لئے درخواستیں، حکایات، جنون، القابات سے مزین عبارتوں کے لحاظ سے سمجھ میں نہ آنے والے گنجشک، اچھے ہوئے حیران کن خیرہ کن انکشافات، عاجزی، الحاح، وزاری، درد مندی، غم و سوز کی روداد سیاہ۔ آدمی ان خطوط میں کتنا بے بس، سہما ہوا پریشان اور خوفزدہ تھا۔

انسان کو خوف سے کوئی نجات نہیں دلا سکتا۔ جب تک زندگی ہے اور اس کے فتنے ہیں، تماشے ہیں، بازی گری ہے، یہ خوف رہے گا۔ آدمی گناہ کے عذاب سے ڈرتا ہے۔ توبہ و استغفار اختیار کرتا ہے مگر پھر بھی لرزاں ترساں افتاں و خیزاں، امید ورجا کے راستوں پر چلتا رہتا ہے۔

قاضی ابو عمر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ خطوط خود انہوں نے لکھے ہوں۔ ایسا تو کبھی انہوں نے سوچا نہیں تھا مگر اب جبکہ ترتیب واریہ اجنبی انجان معروضے انہوں نے دیکھے تو لگایہ ان کی اپنی آواز ہے۔ خدشات، وسوسے سب اس دل میں بھی تھے۔ کیا وہ ہر دل میں تھے؟ کیا سب انسان ازلی، بنیادی سطح پر ایک ہی ہیں؟

کیا وہ ایک ہی کل کے جزو نہیں ہیں؟

”توبہ توبہ۔“ انہوں نے سر کو جھٹکا۔ کیسے کافرانہ خیالات کا ہجوم انہیں گھیرے تھا۔ کل کا جزو! انسان تو اتنا زار و زبوں و درد مند تھا۔ آرام میں گھرا، شکوک و شبہات کا شکار۔

کبھی یوں بھی ہوتا کہ پے در پے حادثات و واقعات آدمی کے حواس پر چھاپہ مارتے اور وہ اس سے منکر ہو جاتا۔ سوال کرنے لگتا۔ باغی ہو جاتا۔ کیوں؟ آخر کیوں؟

وہ اپنی مرضی کے بناء پیدا کیا گیا تھا۔ دنیا میں بھیجا گیا تھا جیسے گہرائیوں میں پھینکا گیا تھا۔ وقت کی موجیں اور لہریں اس پر سے گزرتی تھیں۔ حالات و واقعات، زمانہ اس پر اپنے طوفانوں سمیت ایک بڑے آبشار کی طرح وارد ہوتا تھا۔

کیا آدمی بے بضاعت نہیں تھا؟

قاضی ابو عمر اپنے خانہ باغ میں ٹہلتے رہے اور ان کی کنیزہ زہرہ جھانکتی رہی۔ شاید وہ وضو کے لئے تازہ پانی طلب کریں۔ شاید

کوئی حکم دیں۔ اکثر یوں ہوتا کہ ایک بیک وہ اٹھ کر بیٹھ جاتے اور کسی کتاب کی اصل جگہ بتا کر اسے کتاب نکال لانے کا حکم دیتے۔ یہ کتابوں کی دنیا تھا جس میں انہوں نے اسے ایک کتاب کی ہی حیثیت دی تھی اور جس کے اوراق انہوں نے کبھی کھولنے اور اس میں لکھی عبارتوں کو پڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ نہایت عمدہ درباردار ہونے کے ساتھ ساتھ متقی اور پرہیزگار بھی تھے۔ انہوں نے سوائے نبیذ کے مے کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ راتوں کو بیدار رہنے والے سوچ میں ڈوبے رہنے والے۔ غور و فکر کرنے والے۔ زہرہ نے صبر و شکر سے اپنے آپ کو ان حالات کا عادی بنالیا تھا۔ ان کی عادتوں سے وہ یونہی واقف تھی جیسے اپنے ہاتھ کی لکیروں سے مگر اس دفتر کی ورق گردانی کرتے ہوئے ان کی بے چینی کیوں دیدنی تھی؟

کیا تھا؟ آخر کیا تھا؟ وہ یہ جاننے کے لئے بے چین تھی۔

قاضی کبھی اندر آتے، پھر گھبرا کر نکل جاتے۔ ہوا پھولوں سے لدی بیلوں کو ہولے ہولے جھلا رہی تھی۔ دیواروں پر سرخ اور سفید گلاب مہک رہے تھے اور فضا چاندنی اور ستاروں کی ضیا اور رات کو بولنے والے تیز چیخ کی سیٹی بجا کر گم ہونے والے پرندے کی صدا سے لبریز لگ رہی تھی۔

”زہرہ“ انہوں نے بالآخر پکارا۔

وہ پردہ اٹھا کر اندر آئی۔

”یہ سارا دفتر اٹھا کر کسی خالی صندوق میں بند کر دو۔ ہو سکتا ہے میں کچھ عرصے کے بعد انہیں طلب کروں مگر ان کی حفاظت ضروری ہے اور انہیں دوسری دستاویزات کے ساتھ خلط ملط نہ کر دینا۔“

وہ رات انہوں نے خانہ باغ میں ٹہلتے ہوئے گزاری۔

حامد کیا چاہتا تھا؟

وہ کیوں اس شخص کے درپے تھا؟

دعا طلب کرنا کفر نہیں..... کفر کیا تھا؟

حد فاصل اتنا باریک تلواریں طرح تیز ایک پل صراط تھا اور اس کی دھار پر چلنا ہی تو زندگی تھا۔ وہ خوف وہی ڈر گھات میں لگے ہوئے گناہ سے خائف رہنا..... ہر ذی روح اس قید میں ہے۔ بلا تخصیص ہر ذی روح اور جو اس سے آزاد ہے وہ قابل گرفت ہے۔ گرفت میں ہے۔ بلا تخصیص ہر ذی روح..... اور جو اس سے آزاد ہے وہ قابل گرفت ہے۔ گرفت آزادی پر تھی، اسیری پر نہ

تھی۔ باز پرس یہ تھی کہ جو آزاد ہو گیا وہ کس طرح اور کیونکر ہو گیا!

قید میں کوئی قدغن نہیں تھا۔ حداد راک سے پرے کون چالاک، گستاخ اور بے پرواہ جانے کی جرات کر سکتا تھا۔ کون اتنا آزاد تھا؟

ایسی آزادی کی سزا تھی۔ ایسی آزادی کی قیمت تھی۔ جو جس کے پاس ہو، بیش قیمت ترین متاع!

قاضی ابو عمر نہایت مضطرب ٹہلتے رہے۔ یہاں تک کہ گھاس کا وہ قطع شعبنم سے نم تختے پر الگ دکھائی دے رہا تھا۔

انہیں کہا گیا تھا کہ وہ حسن بن منصور کے خلاف شواہد اور دلائل جمع کر کے پیش کریں..... اس کے باوجود کہ ہر لفظ کے مطالب کو مسخ کر کے پیش کیا جاسکتا تھا وہ ان سے اس کے خلاف کچھ ثبوت مہیا نہیں کر سکتے تھے۔ پھر وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ حامد اس زندانی کے ساتھ کیا کرنا چاہتا تھا۔

انہونی صد ہا لوگوں کو ایسے معاملات میں معذور سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ اگر اتنی بڑی خدائی میں ایک آدمی آزاد ہے۔ تو وی ایک در

بے بہا تھا۔ اس کی حفاظت کرنا چاہیے۔

وہ حامد کو یہ سب بتانا چاہیں گے!



زمزمہ موت

حسین بن منصور چاند کی سلاخوں سے چھن کر آتی روشنی میں زندان کی نرم زمین پر محو سجدہ تھا اور دوسری طرف عمار نے اسے دیکھ کر سوچا۔ ”جانے سجدہ اتنا طویل کیوں ہو گیا ہے۔“ پھر خوف نے اسے گھیر لیا۔ اگر زندانی کو اس حالت میں موت نے آیا تو وہ حامد کے لئے اپنے آقا کے لئے کس سے دعا کا طالب ہو گا۔ العطش لا عطش پکارنے والے کے لئے حوض کوثر کا پانی چاہیے مگر اس کے لئے تو جان سے گزرنا پڑتا ہے۔ زندگی کے میدان کی دوسری اوٹ میں ہے وہ چشمہ حیات۔ بخ مزاج آب سراد سے تسکین کیوں نہیں دیتا؟ حامد انکا آقا کے نامدار اس کے ہونے سے انکی پہچان تھی۔ ہر مولے اپنے مالک سے پہچانا جاتا تھا۔ اور وہ مہربان آدمی تھا۔ کینہ پروری غصہ اس کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ اب اتنے لمبے عرصے میں عمار کو اس سے بچنے کا ڈھنگ آ گیا تھا۔ اور وہ وزیر کے مزاج میں بہت دخیل تھا۔ اس کے باوجود جو کچھ اسرار تھے جن پر اس کو آگاہی نہیں ہو پاتی تھی۔ آدمی کو سمجھا مشکل کام ہے۔ بہت ہی مشکل!

عمار کو یقین تھا کہ اگر حسین بن منصور دعا کرے تو حامد کا مرض جاتا رہے گا چاہے مرض الموت ہی کیوں نہ ہو۔ اس نے یہاں زندان میں لوگوں کو نہایت دشواری سے رسائی حاصل کرتے اور لا علاج امراض سے محض دعا سے نجات حاصل کرتے دیکھا تھا۔

عمار نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ سجدہ سے سر اٹھا کر حسین نے کہا:

”جو پیاس خون سے بجھ سکے گی اسے آب زمزم نہیں بجھا سکتا۔“

”کسی پرندے کا خون!“ عمار نے نہایت مودب پوچھا۔

باہر قریب ہی زندان کے احاطے میں کوئی پرندہ آشیاں میں بے چینی سے چیخا اور سناٹے میں وہ دیر تک گونجتی چیخ تیز سیٹی کی سننا ہٹ گئی۔

حسین اور عمار اس زردی میں جو پتوں اور ہوا کے ساتھ پراں لے تھی۔ شہبروں کو اڑتا ہوا دیکھتے رہے۔

”یا شیخ۔ کس چیز یا کا خون۔“ اس نے سلاخوں کے ساتھ اپنا چہرہ لگا دیا تھا۔ یوں کہ وہ اس کے چہرے کو تین حصوں میں تقسیم کر رہی تھیں بالکل چسپاں۔

”کسی پیاسے کی پیاس چیز یا کے خون سے نہیں بجھ سکتی۔“ حسین نے مسکرا کر کہا اور مراقبہ میں چلا گیا۔

کوچے میں دوسری طرف قدموں کی چاپ پتھر پلے فرش پر گونجی۔ کوئی گنگناتا ہوا گزر رہا تھا۔

جو جو پیہم سفر کرنے والا

زمین کی مسافتیں طے کرنے والا ہے

جنگلوں پھرنے سے اس کے بال

پریشاں اور گر آلود ہیں!

عمار نے اس کے گزرنے کا انتظار کیا۔ جب وہ آواز دور خاموشی میں گم ہو گئی اور چاپ کو پتھر نکل چکے تو وہ واپس پلٹا یہ سوچتا ہوا کہ عجیب علاج ہے؟ خون سے بجھنے والی اس پیاس کے لئے آخر کونسا خون ہو۔ شیخ زندانی کا اشارہ کس طرف تھا۔ یہ اتنا پار سا اور بے ضرر انسان تھا کہ سارے فسانے جو لوگوں نے اس کے گرد بن لئے تھے کذب و اخترا سے زیادہ نہ تھے۔ یہ کہ وہ اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہے۔ خدا کہتا ہے انا الحق! وہ دیوانہ بھی نہیں لگتا اور دیوانہ بھی ہے! بھلا کسی بیماری کا علاج خون آشامی ہو سکتا ہے۔ حامد بن عباس کے لئے اس نے چلتے ہوئے یاد کرنا شروع کیا۔ ذہن پر زور دے کر۔ اس کے آقا کی عادات نہایت نفیس تھیں۔ بہترین کی بھی معراج۔ وہ قصر خانہ نگہبان تھا اور جانتا تھا کہ ہر عام شے سے انہیں رغبت ہی نہ ہوتی تھی۔ آرائش و زیبائش میں یہ گھر بغداد کے بہترین گھروں میں شمار کیا جاتا تھا باغیچے اور وپدے اور نظارے ترتیب سب انوکھی۔ حیران کن۔

کنیزیں اور ان کے لباس اور اس کی تراش خراش سب بے مثال۔

اور سب سے لا جواب تو خاتون اغول تھی۔ اغول کو جہاں سے گزرے زمانے گزر گئے تھے۔ مگر حامد کے دل نے کسی کو اتنا قریب قبول نہیں کیا تھا۔ دل سے زندگی گویا تھم کر کر رک رک چلتی بلکہ چل ہی نہیں رہی تھی۔ عمار کو اس کا خریدا جانا اور نکاح کے لئے منتخب کیا جانا اب بھی یاد تھا۔

موسم کا خوشگوار ترین دن تھا جب خاتون اغول کو تیار رہنے کا کہلوا یا گیا تھا۔ محلہ عشابیہ کی طرف سے ہوا ماتم کی آوازیں لاری تھی۔ پتہ نہیں لوگ کیوں رو رہے تھے۔ کوئی نصرانی فوت ہو گیا تھا۔ باجے بجائے جا رہے تھے اور بین بھی ہو رہا تھا۔ اغول کا نپ رہی تھی اور اپنے سفید پاؤں تک لبادے میں بھی دراز قد معلوم ہوتی تھی جیسے سرو میچ ہو۔ اس کے سنہری بالوں میں مانگ کے قریب ایک بڑا سا ہیرا چمک پکڑ کر ماتھے پر آفتاب کی طرح روشنی اور نور تھا۔ وہ آنکھیں جھپکا میونا جانے کہاں دیکھتی ہوئی لگتی تھی۔ کسی اور ہسر زمین کی طرف۔ اور وہ صحراؤں اور پہاڑوں سے لائی گئی مخلوق تھی جو بغداد کی سر زمین پر گویا ہوا سے اتر کر وارد ہوئی تھی۔ چہرے پر

پڑے باریک نقاب میں سے وہ سپاٹ چہرہ جھلکتا تھا جس پر غم تھا اور نہ خوشی۔ باقی کنیزیں اس کی خوش بختی پر حیراں تھیں مگر وہ ایسی عروس نو بہار تھی جسے نہ اپنے عروس نے پر آ گائی تھی اور نہ ہی مکمل ہونے پر۔

عمار کو پھر وہ دعوت یاد آئی جس میں نفیس ترین گوشت، بہترین نبیذ اور عمدہ روٹیاں با افراط تھیں ار ہر مہمان کی تواضع ایسے کی گئی تھی گویا وہ اکیلا ہی مدعو تھا۔ رقص کی محفل حامد کے جانے کے بعد دیر تک جمی رہی اور رخ تک جاری رہی۔ یہ عمائدین سلطنت میں سے ایسی کبھی نہ بھلائی جانے والی محفل تھی جس کو لوگوں نے مدتوں یاد رکھا کیونکہ بعد میں عمائدین دربار کے لئے یہ حکم تھا کہ وہ رزق اور یہودی عورتوں سے شادیاں نہ رکھیں اور کنیزوں سے بھی نہیں کہ وہ تو خرید و فروخت کی شے تھیں مگر رگوں میں خلط ملط خون سے کئی اور فتنے اٹھتے تھے۔ خلیفہ کی بات جدا تھی کہ وہ اپنے طاقتور سرخ خون کی وجہ سے حاکن بن سکتے تھے اور ترکی کنیزوں نے قصر خلافت میں ہمیشہ حکم چلایا تھا۔ کم سب عباسی خلفا اپنی ماؤں کے سائے میں تخت پر جلوہ افروز ہوتے تھے اور اس سے پہلے وہ ترک سرداروں کے بچوں کے ساتھ کھیلتے دھکیلے جاتے اور پٹتے تھے۔

اس نے اس ہجوم بے پناہ کو جو یورش کر کے اس کے گرد جمع ہو رہا تھا، پیشانی پر ہاتھ پھیر کر جھٹکا اور سوچا۔ آقا کے لئے اس مرد زنداں نے جو دوا کھی ہے وہ شرخ شراب ہونی چاہیے۔ خون سے کبھی کسی کا علاج کیا گیا ہے۔ یقیناً شرخ شراب ہی ٹھیک ہے۔ مگر اس شدت اور قہر کی پیاس آخر کیوں؟

تھکست اور ناکامی کا علاج خون کیوں؟

وہ لرز گیا۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ ہاں مئے ارغوانی کو اگر نہایت ٹھنڈا کیا جائے بالکل بخ بستہ تو وہ خون کی رنگ کی مئے ناب تسکین دے سکے گی۔ اس کے جی کے اندر کوئی کہہ رہا تھا۔ ”مرد اسیر کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ یہ توجیہ غلط ہے۔ یہ مطلب فضول ہے۔ یہ بات کذب ہے۔“ شاید وہ خود کلامی میں اس حد تک منہمک اور اپنے ساتھ مباحثے میں الجھا ہوا تھا کہ اسے اپنی بات کا جواب اپنے عقب میں آتی ہوئی اندھیرے ہیولے کی سی ایک صورت نے دیا۔

”خون اور شراب دو الگ چیزیں ہیں اور جو پیاس خون سے بجھے گی وہ خون ہی سے مٹے گی۔ بشرطیکہ یہ خون، خون ناحق ہو کہ اس میں صدیوں تک پکارنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔“

عمار کے پاؤں اس گلیارے کے وسط میں جم گئے۔

پھر وہ سایہ قریب آیا..... اور قریب..... عمار کو اپنا سانس گھٹتا ہوا لگا۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔

”ڈرنے کی بات نہیں دوست۔ خون ناح آ میں موت کا زمزمہ ہوتا ہے۔ فنا کا نشہ ہوتا ہے۔ جاودانی زندگی کی طرف ایک ہی جست میں پہنچ جانے کی صلاحیت ہوتی ہے اور اس لئے وہی خون عود کر آنے والا پیاس کو تشنگی کو تسکین دے سکتا ہے۔“

”کونہ تم جو ایسی ناروا کہانیاں سناتے ہو۔“ عمار کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

”کوئی بھی۔ کوئی بھی۔ مگر تمہاری پریشانی اس تفصیل کی منتظر تھی۔ جاؤ اور حامد بن عباس سے کہہ دو کہ پیاس کسی چڑیا کے خون سے نہیں، خون ناحق سے بجھے گی۔ اس پر اس شدت کی تشنگی کے دورے پڑتے رہیں گے تا آنکہ وہ کسی بے گناہ کے خون کو مباح سمجھے۔“

”یہ بادشاہوں اور شہنشاہوں کا کھیل ہے۔“ عمار اب ذرا سنبھل گیا تھا۔

”حامد بن عباس اس کھیل میں پٹے ہوئے مہرے کی طرح ہے وہ موت کی بازی کو کیا سمجھے گا۔“ سائے نے پھر کہا۔

”کیا مغرب کے محاذ پر ناکام ہونے کا مطلب پٹ جانا ہے۔ فتح و شکست تو جگن میں کسی نہ کسی کا مقدر ہوا کرتی ہے۔“ عمار گویا دیوار کے ساتھ جم کر کھڑا تھا اور پشت کی طرف سے محفوظ محسوس کرتے ہوئے دشمن کے وار لوٹا رہا تھا۔

وہ ناکامی کا مطلب نہیں سمجھتا۔ وہ شکست کیا جانے۔ شکست ہر کسی کے مقدر میں کہاں۔“ کہنے والے نے گویا نہایت مسرت سے اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ شکست کے ذائقے کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

عمار اب عجیب سحر زدہ تھا۔ سنار ہا۔

”مشیت کو سمجھتے ہو۔“ سوال کیا گیا۔

”نہیں تم مشیت کو کیا سمجھو گے۔ یوں سمجھو گویا لکھنے والے نے لکھ دیا۔ اپنے قلم سے اس لوح پر رقم کر دیا۔ اب اسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ کوئی مٹا سکتا ہے بھلا۔ وہ جو میثاق ازل کی رو سے مقرر ہوا۔ اس پر خوش ہونا، اسے برداشت رنا، اس کے لئے تیار رہنا مگر نہیں۔ میں تم پر اپنا مطلب واضح نہیں کر سکتا۔ اس لئے جاؤ اور اپنے آقا سے کہہ دو کہ اس کی پیاس کا علاج خون ناحق ہے۔“

میرے آقا ہی کو کیوں منتخب کیا گیا ہے۔ عمار نے یک بیک پوچھا۔

”یہی تو اسرار ہے۔ جو جس چیز کے قابل ہو۔“

”جو جس چیز کے قابل ہو۔“ عمار نے نہایت بے بسی سے کہا: ”جب مشیت ہے اور ازل سے طے ہے اور آدمی کا اختیار نہیں ہے

تو پھر؟“ بہت دیر خاموش رہ کر اس نے کہا: ”تو پھر وہی ہے جو چاہا گیا۔ اور انسان کہاں سے اس سارے اصول میں در آ یا۔“

لبی خاموشی کا ایک وقفہ تھا۔

”مگر تم کون ہو۔“ عمار نے سوال کیا۔

”کوئی بھی۔ کوئی بھی۔“ نہایت آہستہ سے جواب دیا گیا۔

گلیارے میں جھک کر تقریباً راستے پر چھائے ہوئے درخت کی شاخوں میں پھڑپھڑاہٹ ہوئی۔ پرندے نے خواب پریشاں سے ڈر کر چیخنا شروع کیا۔ اور سیٹی کی سی یہ صدا افضائے بسط میں ایک نقارے کی طرح گونجی۔ پھر وہ چیخ پھیلی اور اس کی گہائی زمزمے کی سی ہر شے پر جاری و ساری ہو گئی جیسے فنا کا طبل بج رہا ہو۔ بولنے لگی اور اس کی گویائی میں ہر ذرہ شامل ہو گیا۔ ہوتا چلا گیا نشے کی سی صورت مدہوشی لانے والا موت کا زمزمہ..... فنا..... فنا..... فنا!

”قاضی ابو عمر نے وضو کا پانی مانگا اور نماز تہجد کے لئے کھڑے ہو رہے تھے کہ ایک عجیب سنناہٹ سی محسوس کی جیسے تیز شوریدہ لہریں طوفان کی رفتار سے بڑھتی چلی آتی ہوں۔ ایک ایسی آواز جیسے صور پھونکا جا رہا ہو۔ ہر شے فنا ہو رہی ہو..... سمندر اور آسمان اور زمین اور کائنات اور ہر سیارہ اور ستارہ ٹوٹ کر جل کر راکھ میں تبدیل ہو رہا ہو۔ یہ کیسا نغمہ تھا جو انہیں اپنے اندر اپنے باہر سنائی دے رہا تھا۔

ایک ہی صدا لمبی تان کی طرح بہتی ہوئی ان کو لپیٹ رہی تھی۔

انہوں نے کنیز کو پکارنا چاہا۔ نماز کا ایک لفظ بھی انہیں یاد نہیں آ رہا تھا۔ ایک گنگناہٹ سی جیسے تحت الثریٰ میں کوئی ہولے ہولے کچھ کہہ رہا ہو۔ بت دور نیچے زمین کی تہوں کے اندر سے۔

یہ کیسا زمزمہ تھا..... زمزمہ موت!

..... فنا..... فنا..... فنا.....

ایک نامختم سر تھا کہ پھیلتا چلا گیا۔ پھر چاروں طرف سکون بھری ہنسی پھیلی گئی۔

جانے کون نیستی اور ہستی کا مذاق اڑا رہا تھا۔

جانے کون!

رات کا پچھلا پہرہ زمزمہ موت سے معمور تھا۔

موت زندگی کی تلاش میں رہتی ہے کہ اسے جاوداں بنا سکے۔

زندگی موت کی گھات میں ہوتی ہے کہ اسے فنا کا مزہ چکھا سکے۔ اسے معدوم کر دے اور زندگی اور موت دونوں کے لئے سرگرداں رہتا ہے کہ ان سے آزادی حاصل کر کے اسے پاسکے جو مقصود بالذات ہے۔ جو آئینوں میں جوہر ہے اور جوہر کا جوہر ہے۔ جو ماورا ہے اور ماورا کا ماورا ہے۔ جانے آدمی موہوم تلاش میں کیوں دیوانہ ہوتا ہے۔ اپنی بے بضاعتی پر نازاں رہتا ہے۔

زندہاں میں حسین بن منصور نے سجدہ شکر ادا کیا۔ مشیت سے راندہ درگاہ قرار دیا گیا وہ اس کے انجام کے لئے اس کی اعانت کر رہا تھا۔

سراپردہ اسرار سے پرے تک جس کی نگارہ رازدروں تک رسائی رکھتی تھی۔ وہ جھٹکا گیا تھا!

زمین آسمانوں اور کائنات میں آوارہ قرار دیا گیا وہ دھکیلا گیا تھا۔ نکالا گیا تھا۔ اپنے عشق میں بے باک اور اپنے مسلک پر قائم۔

-۵-

اس کے ساتھ وہ بھی تو یاد کیا جاتا تھا۔ اس کا ناز پسندیدہ نہیں تھا مگر وہ اپنے ناز پر نازاں تھا۔ دوسرا کوئی کہاں تھا؟

یہ عالم تو وہم و ظلم و مجاز تھا۔

آتش شوق سے پگھلتا ہوا اس کا یہ سراپا لوگوں میں سیال آتش۔ اگر وہ آہ کرے تو اس کی گرمی ہر طرف آتش فشاں بن جائے۔

اپنے سوال کے ساتھ اپنی منزل شوق کی طرح وہ نظر جھکائے منتظر تھا۔

فانی بھی اور باقی بھی!

اسے زندان کے باہر پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی جیسے رات کا پرندہ ویرانوں کی تلاش میں ہو۔ پھر گلیارے پر جھکے درخت کی شاخوں میں نہایت مضطرب ہو کر تے سے چونک کر کسی چڑیا نے شور مچایا۔

قیامت قائم ہو گئی۔ ابد آن پہنچا ہے۔

فنا..... فنا..... فنا

حسین نے دیکھا سلاخوں میں سے جو آسمان دکھائی دیتا تھا وہ زرد اور سفید تھا جیسے بے ستونوں کے دھواں دھواں کسی انجانی ہوا نے اسے اڑایا ہو۔

وہ ہنسا۔ بھلا اب عرشیاں کہاں جائیں گے۔ ساتوں آسمان نظر کے سامنے ہوں گے اور وہ اپنی بارگاہوں کے باہر ہمیشہ منتظر رکھنے والا اب تو سامنے ہوگا۔ وہ اتنی بے تاب نگاہوں اور فور شوق سے دیکھا جائے گا تو اسے کیسا لگے گا۔ تپاں نگاہیں نے حجاب دیکھنے کی

آرزو مند پردوں سے پرے کی خواہش کیلئے ہوئے بال آخرنغمہ محبت اور زمزمہ موت اور اشواق زندگی کا اسیر ہوگا۔ انا الحق۔ انا الحق۔ قاضی ابو عمر نے دعائے کرب بار بار پڑھی اور پانی پر پھونک کر حامد بن عباس کے لئے ایک چینی کے پیالے میں رکھ لیا۔ انہوں نے وہ تمام ملفوظات اور دفتر کا مطالعہ کر لیا تھا اور الزامات کی لمبی فہرست تیار کر لی تھی۔ آدمی کیا شے ہے کہ وہ خدائی دعویٰ کرے۔ غیب دان ہو۔ مہدی موعود ہو۔ موسیٰ پر تصرف رکھتا ہو۔ دلوں کے حال جان لیتا ہو۔ تقدیریں بدل دینے پر قادر ہو۔ اس کی پرستش کی جاتی ہو۔ اصل میں عام آدمی، معمولی آدمی اندھیرے میں بھٹکتا، ملتچی، مایوس ہی تو اصل میں آدمی ہے۔ وہ جو اپنے خوف پر قادر ہو گیا جو قانع ہو گیا۔ جو راضی برضائے الہی ہو گیا وہ ان سارے قید و بند سے آزاد ہو گیا۔ وہ زندگی کے دل میں کس طرح سے اقامت گزیر ہو سکتا!

حسین ابن منصور کو وہ یعنی قاضی ابو عمر سمجھ نہیں سکے تھے۔

فرد جرم تیار کر لینے کے باوجود سرخروئی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ شریعت و طریقت دونوں سے بری الذمہ۔ وہ تو ان سارے حواشی کی روشنی میں جو انہوں نے ترتیب دیئے تھے اس زندانی کو معتبوب کرنا چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے وہ حامد بن عباس سے بھی بھگد اللہ آنکھ ملا کر بات کر سکیں اور دین میں جو رخنہ اندازیاں ان کے سامنے آئی ہیں ان کے لئے بھی باز پرس ہو تو ان پر زیادتی یا طرفداری کا کوئی الزام نہ آئے۔ اور اسی لیے انہوں نے ایک مجلس مباحثہ وہ مناظرہ پیا کرنے کا اہتمام کیا جس میں مد مقابل جو ہوسو ہو مگر جواب دینے کے لئے بہر حال ایک ہی ہوگا۔ حسین بن منصور حلاج۔

از پئے جاناں جاں ہم رفت

ایں ہم رفت و آں ہم رفت

رف۔ رف۔ رفتن دے۔

محلہ عشابیہ کے ایک گلیارے میں دھنکی کا یہ بیت ان کے کانوں میں یوں پڑ رہا تھا جیسے سارے گیت اور نغمے جمع ہو کر رف۔ رف۔ رفتن کر رہے ہوں۔

حامد بن عباس نے کہا تھا کہ وہ اس مجلس مباہلہ میں شریک نہیں ہوگا اور آاضی ابو عمر کو اپنے طور پر فیصلہ کرنا ہوگا کہ کون کیا کہتا ہے۔ کیوں کہتا ہے..... اور عروس البدلاؤ تخصیص وہ قابل گردزدنی ہوگا کہ اسلام میں رخنہ اندازیاں نہ ہوں۔ انا الحق کا نعرہ مستانہ جو دیوانے اور فرزانے اپنے اپنے طور پر اپنے مسائل کے لئے یا مذاقا استعمال کرتے تھے۔ ان دنوں بغداد کے گلی کوچوں میں فقیروں

اور بے نواؤں کے درمیان لوگ یہ لفظ بطور خاص کہتے تھے۔ بازاروں میں پھرنے والے آوارہ لونڈے اور مغنی اور گداگر سبھی اس کو تکیہ کلام بنائے ہوئے تھے..... انا الحق..... انا الحق!

قاضی ابوعمر نے مدرسہ نظامیہ کے کسی فقیہ و استاد کو اس مباحثے میں شریک ہونے کی دعوت نہیں دی۔ وہ جانتے تھے کہ عقائد اور مخفی مجالس اور نہایت اسرار کی باتوں میں وہ لوگ اتنی دور نکل گئے تھے کہ گوان پر کوئی گرفت نہیں ہو سکتی تھی مگر انہیں عام مجالس میں آنے کی زحمت دے کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مدرسے کی دنیا ایک الگ دنیا تھی کہ سختی سے شریعت کے پابند ہونے کے باوجود آزاد تھے اور ان پر کوئی گرفت نہ تھی۔ یہ نظام تعلیم اس آزادی رائے کی دلیل تھا جو ہر زمانے میں سوچنے والوں اور تصنیف و تالیف کرنے والوں کے حصے میں آیا تھا۔ یہ لوگ مورخ نہیں تھے۔ ادیب نہیں تھے۔ تاریخ دان نہ تھے۔ فلسفی نہ تھے اور ان کے باوجود یہودی اور نصرانی مدرسوں کی طرح ان پر کوئی قید نہ تھی۔ منصور کے بیٹے اور مچی کے پوتے کے ایمان کا میزان اس کی شوریدہ سری کا جائزہ یہ لوگ نہیں لے سکتے تھے۔ جب اسباب و شواہد سب جمع تھے تو کوئی بھی آدمی جو روح اسلام سے آشنا ہو اس مجلس میں بیٹھ سکتا اور شریک ہو سکتا تھا۔ ہاں حکم لگانے کا اختیار تو سوائے خلیفہ مقتدر باللہ کے کسی کو نہیں ہو سکتا جو ان دنوں روم سے آنے والی ایک سفارت کی وجہ سے سخت مصروف تھا کیونکہ سفر تقریباً چھ ماہ سے باریابی کے منتظر تھے اور محلات، قصر دجلہ پر ختم ہونے والی شاہرائیں اور مختلف دفاتر درست کئے جا رہے تھے کہ جس شوکت و جلالت کے لئے بغداد اقصائے عالم میں ایک خاص شہرت رکھتا تھا اس کا کوئی تو مظاہرہ ہو سکے۔

ام جعفر (مقتدر کی ماں) کی پریشانی دیدنی تھی جو اپنی ساری جلالت مابی کے باوجود چاہتی تھی کہ حسین ابن منصور کسی نہ کسی طور حامد بن عباس کے زندان سے نکال لیا جائے اور پھر نصر حاجب کے پاس واپس کیا جائے۔ یہ نہایت معمولی بات تھی جس کے لئے وہ وزیر مملکت سے ٹکانا اور کا زیر بار احسان نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ جو چاہتی تھی عام طور پر ہو جایا کرتا تھا مگر اب۔ اب خدا جانے کیا بات تھی کہ وہ حامد سے کہنا نہیں چاہتی تھی۔

قاضی ابوعمر یہ سب جانتے تھے اور صرف شغب کو شکست دینے اور بے بس کرنے کے لئے انہوں نے اس کے معاملات میں اور زیادہ سختی برتنا شروع کر دی تھی۔ وہ اکثر حسین کو اپنے سامنے بلاتے اور اس سے گفتگو کرتے۔ وہ پابجولاں زندان سے لایا جاتا اور کبھی کبھار بغیر کسی پرسش احوال کے لوٹا یا جاتا رہا تھا۔ لوگ ان کی عدالت میں بھی چپکے چپکے اس سے دعا کے طالب ہوتے تھے۔ ان کے کاتب اور وہ شرطے جو اسے زندان سے لاتے تھے سب اس کے اسیر لگتے تھے۔ صرف وہ اکیلا تنہا الگ ہر قید سے آزاد دکھائی دیتا

تھا۔ اور وہ اتنا بے نیاز کیوں تھا اس نے قید و بند کی شکایت کیوں نہ کی تھی۔

جب تین سو قیدی زندان سے فرار ہو گئے تھے تو انہوں نے اسے بلایا تھا۔

”یہ قیدی تم نے آزاد کئے ہیں۔ وہ جو پکڑ کر واپس لائے گئے ہیں کہتے ہیں کہ انہیں تم نے اشارہ کیا تھا اور دیواریں اپنی جگہ سے ہٹ گئی تھیں۔“

”قاضی قضا! بھلا میں اس پر کیسے قادر ہو سکتا ہوں۔“

”تو پھر وہ جو کہتے ہیں اس کا کیا جواب ہے۔“ پوچھا گیا۔

”میں جو اسیر ہوں بھلا کسی کو رہا کرنے کا اختیار رکھ سکتا ہوں۔“ حسین نے کہا۔

پھر پوچھا گیا: ”تم شعبہ باز ہو۔“

”میں کیا ہوں۔ کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو ذرہ ناچیز بھی نہیں ہوں۔“ اس نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

”مگر زندانیوں نے جو کہا ہے تم پر جو الزام ہے؟“

”الزامات اس لئے لگائے جاتے ہیں کہ ان کے جواب نہیں دیئے جاسکتے۔“ نہایت نرمی سے کہا گیا۔

”تم نے حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر ان کو آزاد کر دیا۔“ سختی سے پوچھا گیا۔

”تم گستاخ اور بے ادب ہو۔ جھوٹے اور غلط آدمی ہو۔ شعبہ باز اور جادوگر ہو۔“ ایک ایک لفظ کو الگ الگ کہا گیا تھا۔

حسین ابن منصور نے کوئی جواب نہیں دیا۔

بہت دیر کے بعد جب قاضی ابو عمر اپنی عدالت پرخواست کر رہے تھے انہوں نے اسے واپس بندی خانے میں لے جائے اور قید تنہائی میں ڈالے جانے کی حدایت کی۔ دل ہی دل میں وہ الجھ رہے تھے..... یہ عجیب قیدی ہے جو قیدی نہیں لگتا۔ جو عدالت میں ہو تو روشنی بڑھ جاتی ہے اور لوگوں کو یارائے گویائی نہیں رہتا۔ زبان گنگ ہونے لگتی ہے۔

ان خطوط سے ثابت ہوتا تھا لوگ اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس میں بے پناہ ہتھکنڈیں تھیں مگر پھر بھی وہ نہایت صبر و سکون سے تقریباً آٹھ سالوں سے اسیر تھا اور اپنی رہائی کے لئے کوشاں نہیں تھا۔ اس نے کسی سے کبھی درخواست نہیں کی کہ اس کی بات خلیفہ تک پہنچائی جائے۔ نبیوں کے سے حوصلے سے وہ بے پناہ برداشت سے یہ سب اٹھا رہا تھا۔ وہ کسی اشارے کا منتظر تھا۔

انہیں سوری یوسف کے بعض مطالب یاد آئے۔ عجیب بات تھی۔

وہ معتبہ تھا تو سہی مگر کس پاداش میں وہ پکڑا گیا تھا۔

قاضی ابو عمر نے فقہ کی کوئی نہایت ادق کتاب کھول کر اپنے سامنے رکھی اور خیالات کے دھارے میں بہنے لگے کیونکہ جو فہرست انہوں نے مرتب کی تھی وہ بس مفروضے تھے کہ دونوں طرف ثابت ہو سکتے تھے۔ انہوں نے حامد کو کسی قسم کی اطلاع دینے سے پہلے خود زندان میں اس سے ملنے کا فیصلہ۔

اندھیری رات میں گلیاں اور کوچے روشن تھے۔ چہل پہل سے بازار بھرے تھے۔ آوازوں کا طلسم سامنتی ہوئی فضا ایک ریشمی ردا تھی کہ مختلف الوان سے تیار کی گئی قوس و قزح کی سی لگتی تھی۔ دجلہ پر کشتیوں کا بنا پل، چپوؤں کی چپ، سوار یوں کا شور، اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کا بجنا، مغنیوں کی آتش نوائی، دور کسی نصرانی عبادت گاہ میں کسی ہنگامی صورت کے لئے بڑے سے گھنٹے کی بلاتی ہوئے صدا، مشرقی اور مغربی کنارے پر بنے قصر، روشنیوں کے دھارے پر خواب ناک سے قہقہوں اور مے نوشی کی رنگین ساعتوں کا عکس بنے ہوئے۔ مسجدوں میں درود و سلام کی نغمگی عرش کی طرف مائل، پرواز، اور شہر کے سارے دروازے جو دجلہ کے پلو پر کھلتے تھے ان پر آرائش کرتے ہوئے ہنستے بولتے لوگ، رقص کی محفلوں کی چھن چھناہٹ، پرسوز لے میں شہادت حسین کا واقعہ بیان کرتے ہوئے ذاکر، آہ و بھانا، و شیون سے معمور قریے۔ یہ کیا دلربا شہر تھا جس کی سرائیں قافلوں کی رونقوں کی گنگاہیں تھیں اور اقصائے عالم سے یہ لوگ یہاں کھینچے چلے آتے تھے۔ ترک سرداروں کے گھیرے میں کوئی شاندار جلوس کسی طرف رواں تھا اور وہ کوزہ گروں کے محلے سے گزر رہا تھا جہاں کہیں کہیں آگ کے شعلے نئے کوزوں کے پکنے کا پتہ دیتے تھے۔ اس کے باوجود کہ ہر کوزے کے مقدر میں شکست ہے اسے کسی قابل بنانے کے لئے آگ میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ کسی قابل بننے سے پہلے ان گنت مراحل ہوتے ہیں اسر کسی ایک مرحلے میں سے نہ گزرے بنا کچھ بھی تو نہیں بنا جاسکتا۔ مقدر نے نہایت سخت قدغن لگا دیا ہر شے پر۔ ناچنگلی سے پچنگلی تک مراحل ہی مراحل تھے..... عجیب قانون قدرت تھا۔

زندان کی سلاخوں کے باہر کھڑے قاضی ابوعمر نے حسین کو پکارا:

”ابن منصور!“

حسین کی ہنسی اسے سنائی دی۔ پھر اس کے دانت چمکے جیسے بجلی کا کوندا۔ اس نے دیکھا تو اس کی بے پناہ آنکلیں اور نگاہ آنے والے اس ٹکرائی۔ ”قاضی ابو عمر! یہ پاداش عمل ہے!“

وہ حیرت زدہ تھا۔ تھوڑا خوف زدہ سا۔ سلاخوں سے دور ہٹ گیا۔ دیوانوں سے احتراز ہی مناسب ہے فاصلہ ضروری ہے۔

قاضی ابو عمر نے پھر کہا: ”ابن منصور۔“

”اس طویل فہرست کا ایک ایک حرف درست ہے اور میرا خون مباح ہے۔ آپ شریعت کے مطابق کام کریں۔“ حسین نے سلاخوں کے قریب آ کر کہا۔

”کیا تمہیں اپنی بریت میں کچھ نہیں کہنا۔“ پوچھا گیا۔

”نہیں۔ کچھ نہیں۔ میں صرف منتظر ہوں۔“

”منتظر۔ رہائی کے طالب۔ زندان سے باہر کھلی فضا میں آنے کے۔ اپنے مریدوں اور پیچھے چلنے والوں پرستش کرنے والوں خدا اور مہدی ماننے والوں کے درمیان لوٹ جانے کے۔“ سانس لئے بنا سوال کیا گیا۔

حسین سلاخوں کے قریب آیا۔ بہت دیر تک وہ قاضی ابو عمر کی طرف دیکھتا رہا اور پھر بہت آہستہ سے اس نے کہا:

”نہیں۔ میں صرف منتظر ہوں۔“

”س شے کے۔ کس واقعے کے۔ کس روشنی کے۔“ قاضی نے گہرا کر پوچھا۔

”حامد کی پیاس بجھانے کا۔“ حسین بن منصور حلاج نے متانت سے جواب دیا۔

”نہیں۔ بخدا نہیں۔ اس کے باوجود کہ سینکڑوں بے گناہوں کا خون انصاف کے تقاضوں کے لئے بہایا جاتا ہے مگر تمہارے خون کی حفاظت اب مجھ پر فرض ہو گئی ہے۔ کیا تم بغداد کے آاضیوں اور فقہوں سے اتنے ناامید ہو۔“ س

”نہیں۔ میں نہایت پر امید ہوں۔“ آخر ”انا الحق“ کی سزا کچھ تو ہو۔“

”یہ سب تم دیوانگی کے عالم میں کہتے ہو اور یہ نعرہ مستانہ تمہارے خون کو مجھ پر مباح نہیں قرار دیتا۔“ قاضی ابو عمر نے سلاخیں چھوڑ دیں تھیں اور مقدمے میں شہادت دینے سچ کہنے اور سچ کے سوا کچھ نہ کہنے والے کی طرح کھڑا تھا۔ اس کی سیاہ ڈاڑھی میں سفید بال روشنی کرنوں کی طرح گلزارے میں عقب سے آنے والی روشنی کی وجہ سے چمک رہے تھے۔

وہ جب اس کی تشہیر کر چکے تو انہوں نے خچروں کو سائے میں باندھا اور حامد بن عباس کو احوال سنانے کے لئے بارگاہوں میں بار دیئے گئے۔

”وہ جو اپنے آپ کو عالم ربانی اور صوفی کہتا تھا اب اس کا جی کیسا ہے۔“

ہنس کر انہوں نے جواب دیا: ”بغداد کے گلی کو چوں میں کسن بچوں اور آوارہ جوانوں بیکار شہدوں کتوں اور فقیروں کا ایک لشکر

تھا جو اس پر پتھراؤ کرتے اور اس کا مذاق اڑاتے تھے اور وہ اپنے آپ کو نبی اور مہدی اور خدا سمجھنے والا تن کریوں بیٹھا تھا اور اتنا خوش تھا گویا دو جہان کی دولت اسے مل گئی تھی۔“

”تعب ہے۔“ پھر طویل وقفے کے بعد حامد نے کہا۔ ”دیوانہ لگتا تو نہیں مگر دیوانہ ہے..... زندیق۔“

”کچھ مدرسوں سے نکالے ہوئے لڑکے اس کے پاس اپنے مرے ہوئے جانور لے کر آئے کہ وہ انہیں زندہ کر دے۔ انہوں نے وہ تقریباً اس کے سر پر دے مارے۔ اس کی جھولی میں ڈال دیئے۔“

”پھر!“ حامد نے نہایت مسرور ہو کر پوچھا۔ وہ اپنے ہاتھوں کو مل رہا تھا جیسے بہت مزے میں ہو۔

”اس نے انہیں اپنے سامنے رکھ لیا اور یوں دیکھتا رہا جیسے ابھی پھونک دے گا تو وہ زندہ ہو جائیں گے۔ مگر بہت دیر تک وہ انہیں یونہی دیکھتا رہا پھر اٹھا کر انہیں لوٹا دیئے۔“

”پھر۔“ پوچھا گیا۔

بھیڑ مایوس ہوئی تو انہوں نے اسے گالیاں دیں۔ کاذب کہا اور اس کے گرد جمع ہر کرنا پتے اور شور مچاتے رہے۔ وہ اپنی آنکھیں میچ مچاتا رہا اور انہیں دیکھ کر ہنستا رہا جیسے بہت مزے میں ہو۔

”اچھا۔“ حامد نے نہایت مایوسی سے کہا۔ ”جب اس پر سنگ باری کی گئی تو اس نے احتجاج نہیں کیا۔“

”بالکل نہیں۔ وہ پتھروں کو یوں دبوچ لیتا جیسے بچوں کے کھیل میں شریک ہو۔ پھر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور اس نے تالیاں بجا کیں۔ یاسیدی! ہم نے اس سے عمدہ مکمل دیوانہ کبھی نہیں دیکھا۔ بغداد کی رونقیں بڑھ گئی ہیں۔ قرون بعد ایسا تماشا ہاتھ آیا ہے۔ اس کے ماتھے پر ایک شکن نہ تھی۔ اسے کچھ محسوس ہی نہیں ہوتا۔ ٹولید مووہ بس محو تھا یہاں تک کہ اذان کی آوازیں مسجدوں سے بلند ہوئیں اور پھیلیں۔ اس نے نیت باندھی اور نماز پڑھی۔“

حامد اپنی نشست گاہ میں قصر کے سب سے شاندار کمرے میں ایک زخمی جانور کی طرح گھوم رہا تھا۔

”کیا اسے اذیت نہیں ہوئی۔ وہ خفا نہیں ہوا۔“ اس نے استفسار کیا۔

”یاسیدی! جو لوگ اس دیوانگی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ راہ خدا میں تکلیف اٹھا رہے ہیں ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ بس راضی برضا ہو جاتے ہیں اور یہ دیوانہ تو کچھ زیادہ ہی راضی برضا ہے۔“ ایک شرطے نے کہا۔

”خاموش رہو اور جتنی بات پوچھی جائے اس کا جواب دو۔“ عمار نے حامد کی طبیعت کو بگڑتے محسوس کر لیا تھا۔

لی۔

حامد بن عباس نے کہا:

”آاضی ابوالحسین سے کہو صبح ان سے سب الزامات کی فہرست مرتب کرے اور عدالت میں حسین بن منصر کا مقدمہ پیش ہو۔“

عمار سر جھکا کر باہر نکل گیا۔ حامد کی طبیعت بہت بدمزہ تھی۔ اس کا ہم سبق اور ساتھی اور زندگی کی دوڑ میں اس سے بہت پیچھے رہ جانے والا کہاں سے کہاں تک جا پہنچا تھا اور وہ اپنے طوفانوں کا سیر اپنے جذبات کا قیدی اپنے طالع کا منتظر اپنی شکست سے ہراساں اپنے کچھ ہونے پر نازاں مگر ٹانٹا ہوا جس کے اندر نوحوں کی گونج تھی۔ جو خالی سناٹوں سے ٹکرا کر لوٹ لوٹ آتی تھی۔

افول اور حسین!

ہاں افول پھر اس کا بیٹا حسین..... زندگی نے اس کے ساتھ مذاق کیا تھا۔ بھلا اس کا دل کسی بھی کنیز میں کیوں نہیں لگا۔ اسے ایک خلا کا احساس کیوں رہا اور وہ ”روح اللہ“ کہنے ولای اسے اس دیوانے کو زندیق کو جاہل کا ذب کو نا کام اور نامراد کو کیا سمجھتی رہی۔ کوئی منجم کوئی ستارہ شناس کوئی پیش گوئی کرنے والا اسے کبھی بتانہ سکا کہ جو ہوا وہ کیوں ہوا۔ کیونکر ہوا۔ وہی اس کا نشانہ کیوں بنا۔ راحت اور آسودگی اس کے لئے کیوں نہ تھی۔ اس کی روح کبھی کبھار تپ کر اس کے اندر پیاس ہی پیاس بن جاتی تھی۔

پھر اس پر شدید پیاس کا دورہ پڑا۔ اور اس کے اندر کسی نے کہا..... جب تک حسین بن منصور زندہ ہے تمہاری پیاس نہیں بجھ سکتی۔ نامراد اور تشنہ تم زندگی کے صحرا میں بھٹکتے رہو گے تا آنکہ موت تمہیں اپنی آغوش میں لے لے۔ تم فنا ہو جاؤ۔ تم نہ رہو۔ حامد بن عباس وزیر مملکت عباسی جاہ و جلال اور شان و شوکت لازوال ہے مگر تم تو لازوال نہیں ہو اور اس سے پہلے کہ وقت تمہاری گرفت سے پھسل جائے تم اپنی تشنگی مٹالو۔

نقیب نے باواز بلند کہا:

”حسین بن منصور عدالت میں حاضر ہو۔“

لوگوں کا ایک جم غفیر تھا جو جگہ کی کمی کی وجہ سے لب آب کو چھوتی ہوئی شاہرا پر امنڈ آیا تھا جیسے لبالب بھرا ہوا جام ہو کہ چھلکتا

جائے۔

دونوں طرف شرطے تھے اور بغداد کا شہنہ قاضی کی نشست کے قریب ایک اونچی مسند پر جلوہ افروز تھا۔ پھر پاس کی عدالتوں کے

قاضی تھے جو اس خاص الخاص مقدمے کی سماعت میں شریک ہونے کی غرض سے آئے تھے۔ کچھ فقیہ اور ملا۔ پاس کے محلوں سے اساتذہ روز عدالوں کے چکر لگانے والے دلال، کاتب، پھر ہر تارے کی جگہ پر سب سے پہلے پہنچنے والے اور زندہ ہونے کا ثبوت دینے والے پھکڑ باز اور آوارہ لوگ۔ قافلوں کے سالار جو اپنے سامان کے ساتھ محض پاس کی سراؤں میں ٹھہرے ہوئے تھے اور محض تماشا دیکھنا چاہتا تھے، وکیل اور طالب علم..... ایک رنگ برنگ بھیڑ تھی جو جلوس کی صورت یہاں جمع تھی۔ مجمع اب قاضی کی آواز کا منتظر تھا جو ایک طویل پرچہ ہاتھ میں لئے تھا اور اسے بار بار پڑے رہا تھا۔ شجہ بھی خلقت کے اس اثر دھام کی وجہ سے ذرا مضطرب تھا۔

”تم پر الزام ہے کہ تم اپنے کو خدا کہتے ہو“ انا الحق“ اور ایک آدمی کے لئے ایسا کہنا کلمہ کفر ہے۔ کیوں نہ تم کو کافر قرار دیا جائے..... کیا تم اپنی بات کی وضاحت کرو گے۔ اس الزام کا جواب دو۔“

حسین نے اٹھنے کی کوشش کی مگر بیڑیوں کے بوجھ سے وہ اٹھ نہ سکا۔ تیرہ وزنی حلقے اس کے پاؤں میں تھے۔

”نہیں“ میں نے بقائمی ہوش و حواس کبھی ایسا نہیں سمجھا نہیں کہا۔ اور احوال کی بات الگ ہے آدمی اپنے سے لے لیا جاتا ہے۔ پھر وہ جوابدہ نہیں۔ بندہ اپنے کو خدا کیونکر کہہ سکتا ہے۔“

عدالت میں سانس تک لینے کی آواز نہیں تھی۔

”تم سوال نہیں کر سکتے صرف جواب دے سکتے ہو۔“

اس نے سر جھکا لیا۔ اپنی بے پناہ اور اس کے باوجود کثرت گریہ سے مچ چاتی ہوئی آنکھیں بند کر لیں جیسے اگلے سوال کے لئے تیار ہو رہا ہو۔

”تم پر یہ الزام ثابت ہو چکا ہے تم مردوں کو زندہ کرتے ہو۔ تمہیں اس کے متعلق کیا کہنا ہے۔“

”زندگی اور موت پر تو قادر وہی ہے۔ زندگی سے موت اور موت سے زندگی بنانے والے۔ رات سے دن اور دن سے رات نکلنے والا۔ میں کون ہوں کہ زندہ کروں۔“

”کلام پاک کی آیات برحق مگر یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ محمود علی قتائی کو پیش کیا جائے۔“

دو شرطے جس شخص کو بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے سامنے لائے وہ رہا رہا تھا جیسے تشنچ کیفیت سے اس کا وجود بل رہا ہو۔

عدالت کی فضا بوجھل تھی۔

”یہ تمہارا مرید ہے اور کہتا ہے کہ تم مردوں کو زندہ کرتے ہو۔ تم نے ایک گدھے کو ٹھوکر ماری تو وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔“

دہلی دہلی ہنسی کی آواز عقب سے سنائی دی۔ کس نے زور سے کہا۔

”گدھے کو زندہ کرنے والا خدا۔“

لوگ بنے اور فضا کا بوجھ ایک دم کم ہو گیا۔ بدل گیا۔ حسین نے بھی سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ اور کہا: ”مرید اگر مجھ سے حسن ظن رکھیں

تو اس میں میرا کیا اختیار ہے۔“

”سوال کرنے سے احتراز کرو۔“

”تم شعبدہ باز، حیلہ گر اور سحر جاننے والے ہو۔ تم نے سرد موسم میں پہاڑ کے کونے پر ہاتھ مار کر سبز لگی نکالی اور اپنے ساتھیوں کو

دی۔ اس کا مزہ نہایت عمدہ تھا۔ تم نے سفر کے دوران ساتھیوں کی خواہش پر انہیں ہوا میں ہاتھ بڑھا کر بھنی ہوئی سری اور روٹیاں فراہم

کیں۔ تم نے تین سو قیدیوں کو بندی خانے سے آزاد کر دیا۔ کیا یہ صحیح ہے۔“

”یہ سب اتنی تفصیل سے تو آپ جانتے ہیں۔ میں بخدا ان سب الزامات سے بری الذمہ ہوں۔ کوئی انسان ایسی باتوں پر کوئی

قدرت جب تک خدا کی مدد اس کے شامل حال نہ ہو کیونکہ وہی مالک الملک ہے۔“ حسین نے سر جھکا کر کہا۔

”تم نے ایک خط اپنے مرید کو خراسان میں لکھا جس میں تم نے اپنے آپ کو رحمان اور رحیم کہا۔“

”توبہ توبہ۔“ عقب میں سے پھر آواز آئی۔

ابن منصور نے سیدھے شخصہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا:

”انسان کیا حقیقت رکھتا ہے کہ کچھ کہے۔ یہ سب طرف تو جلنوہ جاناں ہے جاری و ساری اصل اور پر تو وہی ایک ذات تو ہے۔

آدمی تو محض آلہ ہے اور جب وہ رب ہے تو سب کچھ وہی ہے۔ ہر رنگ میں ہر طور ہر جگہ ہر طرف۔ نظارہ بھی اور تجلی بھی اور صرف وہی

ہے ہو۔ ہو۔“

قاضی اور شخصہ اور دوسرے قاضی اور کاتب سب نے سر جھکا لئے تھے گویا اس کی بات پر صاد کر رہے ہوں۔ سمجھ رہے ہوں۔ باہر جمع

بھیڑ میں اب اضافہ ہوا جاتا تھا۔ گویا تماشا تھا اور تماشا کی ایک پردوسرا گرے پڑتے تھے۔ تشہیر کے بعد لوگوں نے جان لیا تھا کہ انا

الح آ کہنے والا دیوانہ ہے مگر دیوانوں کو فرزانوں کی طرح کبھی عدالت میں پیش نہیں کیا گیا تھا اور مارے حیرت کے وہ سب عدالت کی

طرف بھاگے تھے کہ مقدمے کی تفصیلات عمدہ ہوں گی ایک طرف حکومت اور عدالت اور نہایت علماء اور فضلا کی جماعت اور دوسری

طرف ایک دیوانہ جو اکثر چپ رہتا مگر جوش میں ہوتا تو جان کی بے تابی سے التہاب دل سے پرسوز لے میں جو آتشیں ”انا الحق“ کہتا

اور دیوانہ بھی نہیں لگتا تھا۔

”تم پر الزام ہے کہ تم نے بنت سری کو سجدہ ریز ہونے کو کہا تھا۔ بنت سری حاضر ہو۔“

چہرہ نقاب سے چھپائے ایک بندر درپے پیچھے سے وہ آئی۔ غلام سری کی بیٹی لکڑی کے چبوترے کو پکڑ کر کھڑی ہوئی۔ لرزتی ہوئی گھبرائی ہوئی۔

غلام سری بھی اس کے ہمراہ تھا۔

”تم اس شخص کو پہچانتی ہو۔ یہ جو بیڑیوں میں جکڑا کھڑا ہے۔“ سوال کیا گیا۔

”ہلی۔“ جواب آیا۔ ”یہ حسین ابن منصور حلاج ہے۔ میرا باپ ان کا مولا ہے۔“

”کیا تم نے اس کو سجدہ کیا تھا؟“ پوچھا گیا۔

”شعبان کا چاند دیکھ کر میں سیڑھیاں اتر رہی تھ اور ابن منصور صحن میں تھے۔ پھر ان کی پوتی نے مجھے کہا۔ جب تم اترو تو میرے دادا کے سامنے جھکنا اور انہیں سجدہ کرنا کیونکہ ان میں خدا کی سی طاقتیں ہیں وہ بہت عظیم ہیں“ پھر دم لے کر اس نے کہا..... ”میں نے ان کے سامنے زمین چومی اور اپنا سر نیاز جھکا یا۔ سجدہ ریز ہوئی۔ انہوں نے میری طرف دیکھا بھی نہیں یہ کتاب لکھتے رہے۔ قاضی نے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی بندر کی طرف چلی گئی۔

مجھے میں سے کسی نے کہا: ”ایسی جسارتوں کو اٹھانے کے لئے بہت بڑا حوصلہ چاہیے۔“

”جب سجدہ ریز کی طرف دیکھا ہی نہیں گیا تو سجدہ قبول ہی نہیں ہوا۔ یہ سراسر الزام ہے کذب اور افترا۔“ کسی نے سرگوشی میں کہا۔

”خاموش رہو۔“ بھیڑ میں مل کر کھڑے کسی شرطے نے زور سے کہا۔

عجیب طرح کی گھٹن اور گرمی تھی اور وقت ٹھہرا ہوا لگتا تھا۔ جو آدمی در آئے تھے وہ واپس جانے کی نیت کرتے مگر کھڑے رہتے۔ لوگ اپنے دامنوں سے اپنے چہرے سے پسینہ پونچھ رہے تھے اور ان سے اپنے آپ کو ہوا بھی دے رہے تھے۔ شخصہ اور قاضی سب پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ حالانکہ یہ زمستان کے سخت ترین دن تھے اور برف بارشمالی ہوانے عدالت سے قلب لوگوں کو پیکا دیا تھا۔

”تم ابلیس پرست ہو کہ ابلیس کی شان میں تم نے ایک قصیدہ تحریر کیا ہے۔“ قاضی نے کچھ اشعار پڑھ کر سنائے۔

”وہ راندہ درگاہ ہونے سے پہلے ہر وقت سے پہلے خدا کا مقرب ترین فرشتہ تھا۔“ جواب دیا گیا۔

”تم اس کے پرستار ہو۔ اس کے مذہب کو رواج دیتے ہو۔“ قاضی نے ڈانٹ کر کہا۔

”بخدا وہ مذہب کبھی رواج نہیں پاسکتا۔ وہ تو قابل تقلید بھی نہیں قابل پرستش کیسے ہو گیا!“

”عدالت تم سے جواب چاہتی ہے۔ نہیں یا ہاں۔ زیادہ کچھ نہیں۔“

قاضی نے ایک کتاب ہوا میں لہوا کی۔ بازو اوپر کیا:

”یہ دیکھتے ہو۔ اسے پہچانتے ہو۔“

اوپر نگاہ اٹھائے بنا حسین نے کا۔ ”پہچانتا ہوں۔“

قاضی نے اوراق پلٹے اور پڑھا:

”اگر کوئی شخص حج کا ارادہ رکھتا ہو اور قدرت نہ رکھتا ہو تو وہ اپنے گھر میں ایک کمرہ مرلیع مخصوص کر لے۔ اسے پاک و صاف رکھے

کسی قسم کی نجاست وہاں نہ پہنچے اور نہ اس کے سوا کوئی دوسرا وہاں جائے۔ سب کو اس سے دور کرے۔ پھر ایام حج میں اس گھر کا

طواف کرے جیسا خانہ کعبہ کا کرتے ہیں اور جو مناسک مکہ میں ادا کائے جاتے ہیں سب بجالائے۔ جب کرچکے تو قیس یتیموں کو جمع کر

کے اپنی ہمت اور قدرت کے موافق کھانا کھلائے اور بذات خود ان کی خدمت کرے۔ جب وہ کانے سے فارغ ہو کر ہاتھ دھولیں تو

پھر ہر ایک کو سات درہم یا تین درہم دے۔ یہ عمل اس کے لئے حج کا قائم مقام ہوگا۔“

حامد بن عباس پچھلے دروازے شحنے کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ قاضی ابو عمر بھی اس کے ہمراہ تھا۔ ابو جعفر بن بہلوں قاضی بھی ان کے

ساتھ۔ علماء اور شہود کی ایک جماعت بھی اسی دروازے سے آ کر سامنے بیٹھ گئی تھی۔

قاضی ابو عمر نے کہا۔ ”یہ مضمون تجھے کہاں سے پہنچا۔“

”حسین بصری کی کتاب الاخلاص سے۔“ حسین نے نرمی سے جواب دیا۔

”اے حلال الدم۔“ قاضی اب عمر نے زور سے کہا: ”تو جھوٹ کہتا ہے۔ ہم نے مکہ میں کتاب الاخلاص سنی ہے اس میں تو یہ

مضمون نہیں تھا۔ اے کاذب و فاجر! تو غلط کہتا ہے۔“ وہ سخت خفا تھے۔

حامد نے آگے جھک کر قاضی ابو عمر سے کہا: ”یہ لکھ دیجئے۔“

ہاتھ کے اشارے سے انہوں نے اسے رکنے کا کہا ملزم سے مخاطب ہو کر کہنے لگے:

”کیا تم نے خود کتاب الاخلاص دیکھی ہے یا محض سنی ہے۔“

”نہیں میں نے صرف سنا تھا اور یہ مضمون اس کے اندر تھا مجھے کسی ثقہ آدمی نے کہا تھا۔“

”تم صرف سنی سنائی اور مفروضوں پر اتنی بڑی بات لکھ گئے جو اگر عام ہو جائے تو اسلام کی ساری عمارت ہی زمیں پر آ رہے۔ تم

نے مذہب میں رخنہ اندازی کی ہے۔“

حامد نے آلم قاضی ابو عمر کے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کی جس کو انہوں نے پکڑ تو لیا مگر پھر رکھ دیا۔

”حسین بصری اگر مذہب اسلام میں رخنہ اندازی کرنے والے تھے تو پھر کون اس خلاؤں کو پر کر سکتا ہے۔“ اس نے سوال کیا۔

”خاموش۔ سوالوں سے احتراز کرو۔ صرف یہ بتاؤ کیا تم نے یہ مضمون کسی کتاب سے ن آ ل کیا ہے یا محض قیاس ہے!“

”بخدا ہرگز قیاس سے نہیں۔ مجھے ان مطالب پر پہلے پہل ایک ہاشمی نے خبر دی تھی۔“

قاضی بہلول ہاشمی کا ذکر سن کر مسکرائے۔ ”وہی ہاشمی جو اپنے آپ کو تمہارا نبی کہتا ہے اور تم جو اپنے آپ کو اس کا خدا کہتے ہو۔“

قاضی ابو عمر نے کہا: ”اور تمہارے مریدوں میں سے امام رضائے کے داعی ہیں اور یہ سارے دفاتر جو جمع ہیں تم ان کی تکذیب

کیسے کر سکتے ہو۔“

حامد نے کہا: ”قاضی ابو عمر۔ اس سوال جواب سے اب کیا ملے گا۔ آپ اس کاغذ پر فتویٰ لکھ دیں کہ اس کا خون مباح ہے۔“

قاضی ابو عمر نے گفتگو روک کر پہلی بار گہری نظروں سے حامد کی طرف دیکھا۔

”یہ بات کہ حسین بن منصور حلاج الدم ہے۔“ حامد نے کاغذ ان کے سامنے کیا۔

حسین نے نگاہ اٹھائی تو بھیڑ کے آخر میں آقائے رازی کو دیکھا اور نہایت محبت سے مسکرایا۔ آقائے رازی کی اڑی ہوئی رنگت

اور گھبرایا ہوا چہرہ دیکھ کر اس ن سر ہلایا اور اشارہ کیا۔

قاضی بہلول نے کہا: ”یہ معتزلی ہے اور لوگوں میں کفر پھیلاتا ہے اس لئے قابل گردن زدنی ہے۔“

حسین نے بازو سے اوپر اٹھائے اور زور سے کہا:

”میری پشت شرعاً محفوظ ہے اور میرا خون بہانا حرام ہے۔ میرا مذہب سنت کے مطابق ہے اور میرا اعتقاد اسلام ہے۔ میری

کتابوں میں جو کچھ بھی ہے شرع کے موافق ہے اس لئے میرا خون بہانے میں اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے۔“

حامد نے قلم بھر قاضی ابو عمر کے ہاتھ میں دے کر کاغذ سامنے کر دیا۔

”آپ اس پر لکھ دیجئے۔“

”مجھے سوچنے غور و فکر کرنے کا موقع دیجئے وزیر مملکت۔“ قاضی ابو عمر نے جھنجھلا کر کہا۔

قاضی ابو الحسین الاشائنی نے کہا: ”جب آپ ایک بات کہہ چکے ہیں تو اس کو لکھ دینے میں کیا حرج ہے۔“

شحنہ نے ذرا سختی سے کہا: ”قاضی ابو عمر جو بات ایک بار آپ کی زبان سے نکل گئی سو نکل گئی۔ وہ ٹھیک ہے۔ جائز ہے۔ سوچ کر

کہی گئی ہے۔ آپ قضاۃ کے نہایت اعلیٰ منصب پر ہیں۔ کیا کوئی بات سہواً کہہ سکتے ہیں۔“

حسین کہتا رہا۔

”میرے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ میری پشت مضبوط ہے۔ میرا خون بہانا حرام ہے۔“

زرر و آقائے رازی اپنا راستہ بناتا ہوا بھیڑ کودائیں بائیں سے ہٹاتا ایک ایک بالشت آگے بڑھتا اس کے قریب آ رہا تھا۔ لوگ

یونہی شور مچا رہے تھے۔ ”حلال الدم۔ حلال الدم۔“ ایک طرف سے آواز آتی تھی۔ ”نا جائز۔ نا جائز۔ محض سنی ہوئی باتوں اور

مفروضوں پر کوئی بھی قابل گردن زدنی نہیں ہوتا۔“

”خاموش.....“ بغداد کا شحنہ دھاڑا۔ ”سوائے قاضی ابو عمر کے کسی کو کوئی بات کہنے کا اختیار نہیں اور نہ ہی کوئی بات درخور اعتنا

ہے۔“

حامد نے آگے بڑھ کر جاذب قاضی ابو عمر کے ناک کے سامنے کر دیا تھا۔

”جوپ نے کہا ہے جو آپ نے سوچا تھا۔ جو فتویٰ آپ نے دیا تھا اسے لکھ دینے میں کیا آباحت ہے۔ یہ روز روز کا فتنہ مٹے۔ یہ

کفر اور الحاد کا داعی۔ یہ معزلی۔ زندیق۔ قرمطی جافر گمراہ کرنے والا شخص زمین کے سینے پر بوجھ ہے قاضی ابو عمر..... انا الحق کہنے

ولا چاہے وہ دیوانگی میں ہی کیوں نہ کہے قابل تعزیر ہے۔ آپ کس کی طاقت سے خوفزدہ ہیں؟ اور کیوں؟ لکھئے۔“ اس نے قلم ان کے

ہاتھ میں تھما دیا اور دوات خود پکڑے رہا۔ ”لیجئے قلم کو روشنائی میں ڈبو کر لکھئے۔“

قاضی ابو الحسین نے کہا: ”قاضی ابو عمر۔ اگر وزیر مملکت مجھے کہتے تو میں لکھ چکا ہوتا۔ جب آپ ایک فتویٰ دے چکے ہیں تو لکھنے

سے گریز کیسا؟“

”یہ ایک کلمہ خفلی تھا۔ میں اس کے خون کی حفاظت کروں گا اس لئے کہ وہ دیوانہ ہے۔“

ہنس کر نہات مکر وہ تفاخر سے حامد بن عباس نے کہا: ”بغداد کو گمراہ کرنے والا..... داعی نبوت دیوانہ کیونکر ہو گیا۔ آپ کن

بھول بھلیوں میں اٹک گئے ہیں قاضی ابو عمر۔“

شحنہ نے پھر کہا: ”ایک باختیار شخص ہوتے ہوئے ایک مجھے کے سامنے آپ نے جو بات کہہ دی ہے کیا وہ آپ نے بنا سوچے سمجھے کہہ دی تھی۔ قاضی ابو عمر۔ اب فرار کی راہ نہیں رہی۔“

پھر آوازیں آنے لگیں:

”فتویٰ تو آپ دے چکے۔ اب لکھ بھی دیجئے۔“

حامد نے قلم سیاہی میں ڈبو کر قاضی ابو عمر کو دیا اور کاغذ آگے کر دیا تاکہ وہ اس پر اپنے دستخط کر سکیں۔

سب لوگ خاموشی سے یہ کاروائی دیکھنے لگے۔ س

سر کو جھٹک کر کوئی راہ فرار نہ پا کر قاضی ابو عمر نے اس کاغذ پر اپنی مہر ثبت کر دی اور فتویٰ لکھ دیا۔ پھر لوگوں نے قضاۃ نے اور شحنہ نے اور خود ابو الحسین الشنائی نے اپنی اپنی مہریں لگائیں نام لکھے اور حسین ابن منصور کی موت کے پروانے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

حامد بن عباس نے اٹھتے ہوئے بڑی گہری نظروں سے اس دیوانے کی طرف دیکھا..... ”اغول کا روح اللہ۔“

شرطے حسین کو اس زندان کی طرف لے گئے جس میں وہ اسیر تھا۔ اور کوچہ گرد شام کو جب گلستانوں اور باغوں میں کنارہ جلہ شاہراہوں پر کشتیوں میں اور مغنیوں کی محفلوں میں ملے یہی تذکرہ تھا کہ دیوانہ جو ”انا الحق“ کہتا تھا اپنی سزا کو پہنچے گا کیونکہ قاضی ابو عمر نے اس کی موت کے فتویٰ پر مہر لگا دی تھی۔ ہاں حسین بن منصور حلاج کے مقدر پر مہر لگا دی گئی تھی۔ اب کوئی دعا کم نہیں آ سکتی تھی۔

سب بیکار۔ بے کار!

اگر اس دیوانے کا یہی مقدر تھا تو کیا مقدر تھا۔

جنوں کیا اس قدر کڑی سزا کا مستحق ہوتا ہے۔

کیا ریوں کے درمیان چہل قدمی کرتے ہوئے سنا کہ قاضی ابو عمر نے انا الحق کہنے والے دیوانے کو سزائے موت دی ہے تو وہ لرز گئی۔ بھلا مقدر کے لئے اب دعا کون کرے گا..... اس کی درازی عمر کے لئے اس کی صحت و طاقت کے لئے اس کے بخت رسا کے لئے!

وہ برابر ٹوہ میں لگی رہی تھی اور جب نصر حاجب نے اسے بتایا تھا کہ حامد بن عباس نے اسے اپنے زندان میں منتقل کر لیا ہے تو وہ خوفزدہ ضرور ہوئی تھی مگر پھر وقت گزرتا رہا۔ گھٹتا رہا۔ پل پل ساعت دناور مہینے اور سال گزر گئے تھے۔ وہ غافل تو نہیں ہوئی مگر ذرا

مطمئن ہو گئی تھی کہ اسیر زنداں سے ایک دن چٹ جائیں گے اور انتہائے خال میں اس سے خوش بھی تھی۔ وہ سیر و سیاحت کا شوقین اگر زندان میں نہ ہو تو بغداد میں بھی نہ وہ اور وہ جو اس تک رسائی رکھتی ہے اسے کہاں پاسکے؟ اس نے اپنی خود غرضی کی وجہ سے اس کی رہائی کے لئے زیادہ کوشش بھی نہیں کی تھی۔

اس نے اپنا سر پیٹ لیا۔ اب وہ کیا کرے؟

مقتدر کو وزرائے سلطنت اور عمائدین سردران قوم اور ترک لوگ اپنے گھیرے میں لئے تھے۔ وہ ام جعفر سے اپنی ماں سے شغب سے بھی دور ہو گیا تھا۔ شرع میں جب وہ تخت خلافت پر جلوہ افروز ہوا تو ڈر اور سہا ہوا لڑکا تھا۔ اب زمانہ بدل گیا تھا۔ وہ زور اور قوت سے دانش و ہوشیار سے ساری آگوں مہارتوں کو تھامے تھا۔ ایک طاقتور حکمران جس کو سفارتوں اور بادشاہوں کے سلام وصول کرنے اور لوٹانے اور عباسی مملکت کے جاہ و جلال کی حفاظت کا اختیار تھا مگر وہ اب شغب کا کم سن بیٹا تو نہ تھا اور وہ اپنی ساری طاقت اور الگ دربار اور امراء کے ایک گروہ کے باوصف اس سے ایک ذرا سی بات منوانے کا حوصلہ نہ رکھتی تھی۔ وہ اسے ناکامونا مزاد دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک ماں کے درد دل سے وہ اس کی سلطنت کے استحکام کیلئے دعا گو تھی۔ حامد بن عباس نے نہ جانے کس طرح سے یک بیک یہ سارا اہتمام کر لیا تھا اور اسے خبر تک نہ ہوئی تھی۔ حسین کا مارا جانا خود عباسی حکمرانوں کے لئے نیک فال نہ تھی۔ وہ کیا کرے۔ وہ کہاں جائے اپنی بے بسی پر وہ مضطرب ہوئی۔

قاضی ابو عمر سے وہ پہلے ہی کئی معاملوں میں تنازعہ کر چکی تھی اور اب وہ ہرگز اس کے کسی حکم کی پیروی نہیں کرے گا بھلا کیوں کرے گا!

مدرسہ نظامیہ کے فقیہ اور جنید سے کچھ امید تھی مگر نہایت موہوم۔ حامد اتنا طاقتور اور کمینہ پرور اور ریشہ دوانیوں کا ماہر تھا کہ کوئی بھی اس دے دہی مول نہیں لے سکتا۔ مونس بھی اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آہ وہ کیا کرے۔ کہاں جائے۔ لوگ کہتے تھے خلیفہ کی ماں نہایت اثر و رسوخ رکھتی ہے اور دربار کے کاموں میں دخیل ہے مگر کیا وہ دخیل تھی؟ ایک آدمی کی موت کے احکامات کو بدلوانے تک کی طاقت وہ نہ رکھتی تھی۔

وقت اور زمانہ اور حالات سب اس کے خلاف تھے۔

خود خدا اور اس کے فرشتے بھی شغب ام جعفر سے کوئی سروکار نہ رکھتے تھے۔ اس نے نہایت مایوسی میں وہی ہرزے پر اپنا سر ٹیک دیا..... ”او خدا! او خدا!“

آقائے رازی نے سلاخوں کے ساتھ اپنا ماتھا ٹیک دیا۔ اندھیری سیاہ اور باد و باراں سے مضطرب رات میں اس نے ہولے سے پکارا۔

”ابن منصور!“

”آقائے رازی“

عشق	مزرع	گلاب	ہے
عشق	مزرع	زندگی	ہے

”حسین۔ دیوانہ نہ بنو۔ میں تمہیں لینے کے لئے آیا ہوں۔ گھوڑے باہر کھڑے ہیں۔ مضبوط اور تازہ دم۔ ہم صبح و نئے سے پہلے بغداد سے نکل جائیں گے۔ خراان میں تمہاری اپنی سرزمین میں لوگ تمہارے منتظر ہوں گے۔“

”نہیں نہیں۔ بخدا نہیں۔“ اس نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔

”آخر کیوں ابن منصر۔“

حسین نے سلاخوں کی طرف دیکھا جو راستے سے ہٹ گئیں۔ وہ دونوں پاس پاس کھڑے تھے۔

”میں جس کی قید میں ہوں وہ مجھے رہا کرے تو؟“ اس نے کہا۔

”حامد بن عباس کو تم سے یونہی کد ہے۔“ رازی نے کہا۔

”نہیں یونہی نہیں آقائے رازی۔ یونہی نہیں۔ کد کی کوئی وجہ ہے۔ اس کا دل بھی تھوڑی خوچی چاہتا ہے۔ گو میں کبھی کسی واسطے سے بھی اس کی ناخوشی کا سبب نہیں ہو..... اسے شدت عطش سے ناکامی اور نامرادی کے خیال سے نکلنے کا ایک موقع ہے یہ۔“ حسین نے بات ختم کی۔

”تم سچ بچ دیوانے ہو۔ کوئی یوں بڑھ کر موت کو گلے لگاتا ہے۔ حسین! تم خراسان کی طرف نکل چلو۔ تمہارے مرید ہیں۔ تم کو چاہنے والے داعی اور مبلغ۔ اور تمہارے مسلک سے آشنا لوگ اور تم پر جان نثار کرنے والے..... تم بس نکل چلو۔ باقی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ رازی چپ ہو گیا۔

”مشیت یہی ہے آقائے رازی کی میں عشق کی فصل کاٹوں۔ محبت کے لئے جان دوں اور سنو آقائے رازی! جس کے نصیب میں شہادت ہو۔ جسے یہ مرتبہ مل سکے وہ کیوں اس بھاگے۔ کہاں جائے جاوداں موت سے جاوداں زندگی کی طرف جبکہ موت سب کا

مقدر ہے میں زندگی کو کیوں نہ پسند کروں۔ ازپئے جاناں۔“

”میرا خیال تھا تم مجھے پہچانتے ہو۔ منصور کا بیٹا میری عزت کرتا ہے اور تم سمجھے ہو نہ میں جذباتی ہوں نہ ہی خود پرست جوان۔ میرے بالوں میں گھلی سفیدی پر ترس کھاؤ۔ چلو۔“

”آقائے رازی۔ کیا سب کے مقدر میں شہادت ہے۔ ہو سکتا ہے فرار سے حالات بگڑ جائیں۔ ٹھہرے رہنے منتظر رہنے اور حالات کا مقابلہ کرنے میں ہی ساری لذت ہو۔ مجھے افسوس ہے میں آپ کی بات پر عمل نہیں کر سکتا۔“ حسین زندان میں اپنی جگہ پر لوٹ آیا تھا۔

”تم کیوں موت کی تلاش میں ہو۔ کیوں مرنے سے عشق کرتے ہو۔“ رازی نے پوچھا۔

”آپ نہیں سمجھیں گے۔ ریشم اور نوادرات کے سوداگر یہ بات نہیں سمجھ سکتے۔ ایک اور فہم ایک جدا طرز خیال کی ضرورت ہے۔ آپ اپنی جگہ نہایت ہمدرد اور بہت ہی عمدہ دوست ہیں مگر میں مجبور ہوں۔ میرے احکامات دوسری جگہوں کے نہیں ہیں۔ مجھے بغداد میں اپنے مقدر کے فیصلے کا انتظار کرنا ہے۔“ حسین نے نہایت قطعیت سے کہا۔

آقائے رازی باہر سلاخوں کے باہر اس کے خیالوں کی دنیا سے باہر اس کے اعمال کی دنیا سے باہر ٹھہرا ہا مگر اس نے پھر کبھی نہیں کہا ”حسین ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ مقدر کا منظر ہے یہ ابن منصور۔“ پھر اس نے سایوں کو زندان کی طرف بڑھتے دیکھا اور اوٹ میں ہو گیا۔

شعب نے کہا:

”یا شیخ! میں نے آپ کے یہاں سے فرار کا منصوبہ بنایا ہے۔ اگر آپ صاد کریں تو آج ہی رات نکل جائیں۔“

”ام جعفر۔ شہادت ی رائے برسوں میں صدیوں میں قرونوں میں ایک رات ہوتی ہے..... کیا اسے ٹھکرا دیا جائے..... اور زندگی کیا ہے۔ کب تک۔ اول ذآ خرفاظا ہر دباطن فنا۔“

”یا شیخ۔ آپ اپنے اس فیصلے پر نظر ثانی نہیں کریں گے۔“ اس نے سلاخوں سے تقریباً چمٹتے ہوئے کہا۔ ”میرا بیٹا تو امراء کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ حامد بن عباس ایک باگ ڈور تھا مے ہے۔ مگر آپ اس تھوڑے وقت میں خراسان یا ماوراء النہر یا ہندوستان کہیں چلے جائیں!“

”ام جعفر۔ میرے احکامات یہیں کے ہیں۔ بس یہیں منتظر ہوں۔ کیا وہ قدرت نہیں رکھتا کہ دلوں کو پھیر دے۔ حالات کو بدل

دے۔ اندھیرے میں روشنی کر دے۔ ناامید نہ ہوں۔“

”یا شیخ۔ آپ حامد کو نہیں جانتے۔“ ام جعفر نے کہا۔

”نہیں۔ میں حامد کو نہیں جانتا مگر جاننے سے بھی کیا ہوتا۔ وہ مقدر کو تو پھیر نہیں سکتا۔“

شغب سلاخوں کے ساتھ لگ کر آہ وزاری کرنے لگی۔ پھر رات کے سناٹے میں ایک عجیب نوبت سی بجنے لگی۔ ایک گنگناہٹ جیسے زمرہ موت سے معمور کوئی صدا ہو..... مدہوش کر نیوالی۔ سب کچھ بھلانے والی!

قاضی ابو عمر کے فتویٰ پر سوائے شبلی اور ابن عطار کے سب کے دستخط تھے۔ مقتدر نے دیکھا۔ پڑھا اور ایک طرف رکھ دیا۔ وہ رومی سفارت کی نہایت ضروری تفصیلات اور گفتگو کے نکات پر غور کر رہا تھا۔ ایک بار پھر عباسی دربار کو سجا یا اور شان و شوکت کا مکمل فن پارہ بنایا جا رہا تھا۔ وہ یعنی مقتدر باللہ اپنے اجداد کی طرح بارگاہوں اور ایوانوں اور ایک کے بعد دوسرے قصر سید و رطویل مسافت کے آخر میں جبکہ عجائبات زمانہ انہیں تقریباً نیم جاں کر چکے ہوں گے سفیروں سے ملے گا۔ وہ رعب و شان سے نہایت مرعوب آدمی باتیں بھی کہنے کا حوصلہ نہ رکھتے ہوں گے۔ تھکے ہوئے نظاروں سے سیر ہوئے وہ جب اس تک پہنچیں گے تو ہیبت و دبدبے سے تقریباً مدہوش ہوں گے۔

ایک سال سے بھی زیادہ عرصے سے وہ سفارت کاریابی کی متمنی تھی اور بغداد کی رونقوں میں مگن تھی۔ یہ عربی النسل، ترکی ایرانی، ہندوستانی تاتاری، خراسانی چھوٹی اور بڑی ریاستوں اور سلطنتوں کے نمائندے سوداگر اور طالب علم۔ مختلف مذاہب اور نسلوں کے مخلوط لوگ جیسے رنگ برنگ طلیساں ہو۔ رومی یہاں آ کر حیران ہوئے تھے کھیل تماشے اور نظارے انہیں محو رکھتے تھے مگر اتنے طویل انتظار سے وہ تنگ آ گئے تھے۔ انہوں نے نہایت قریب سے عام زندگی کو دیکھا تھا۔ فوج اور منتظم، وزراء اور فقہا، مسجدیں اور عبادت گاہیں، سب کا مطالعہ کیا تھا۔ صحرائیں نے کیا دنیا تخلیق کی تھی کہ اس کے دبدبے اور شوکت سے وہ دہل دہل جاتے تھے۔ ہر امیر پر خلیفہ ہونے کا دھوکا ہوتا تھا۔ سوار یوں پرنگی تلواروں کے پہرے میں سرداروں کو نکلتے دیکھا تھا۔ محملوں میں خواتین اور عمار یوں میں امرا نکلتے تھے۔ علم و فن کا چرچا اقصائے عالم سے بہترین چیزوں کے بازاروں میں ڈھیر گویا اقصائے عالم سے سمٹ کر سارا حسن اور تمام فن اور تمام وجاہت اور تمام رونق یہاں جمع ہو گئی ہو۔ مختلف مذاہب کے داعی اور نقیب اور درویش اور امیر یہاں جمع تھے۔ ایک خواب کی سی دنیا تھی کہ جب آنکھ کھلے گی تو سب غائب ہوگا۔ ایک ظلم تھا قریب نظر، یہ سب اصل نہیں لگتا تھا جیسے آئینہ آب پر کوئی عکس بہتا جائے۔ اس سلطنت کے جتنے فساد انہوں

نے سنے تھے وہ دیکھی ہوئی حقیقتوں سے کمتر تھے اور حقیقت اصل میں فزوں تر۔

مقتدر نے اپنی ماضی ام جعفر کا خط پڑھا اور پھر پڑھا۔ یہ درخواست تھی حسین بن منصور کو معاف کر دیا جائے اس سے درگزر کرنے کی۔ یہ کہ وہ صرف دیوانہ تھا اور دعا گو تھا اور عالم ربانی تھا۔ اس کا درجہ بڑا تھا۔ وہ اگر احوال کی وجہ سے انا الحق کہتا تھا تو اس میں اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ یہ اس کی دعاؤں کی برکت تھی کہ جعفر (مقتدر) تخت خلافت پر جلوہ افروز تھا اور فرانس کی سفارتیں اس کی منتظر تھیں۔ اگر حسین بن منصور معاف کر دیا جائے تو ام جعفر مطمئن اور خوش ہوگی اور درازی عمرو بادشاہت صحت کی دعا کرے گی۔ جب سے وہ خلیفہ بنا تھا وہ ماں کے سحر سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ وہ جو چاہتی وہی ہوتا یہاں تک کہ عمائدین اور اس کے ہم وطن ترکی سردار خود منوں اس کے خلاف ہو گئے اور روز کوئی نہ کوئی اس کے خلاف ایک نیا فسانہ سناتا۔ اور مقتدر نے شغب کو منع کیا کہ وہ معاملات سلطنت اور سیاست میں دخل نہ دیا کرے۔ ہارون رشید کی بیوی زبیدہ نے محض عقل اور فہم و فراست سے جیسے لوگوں کے دل جیتے تھے وہ بھی کرے۔

شغب نے اپنے ہاتھوں سے سلطنت عباسیہ پھسلے دیکھ کر خود ہی کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ وہ کبھی کسی شے کی طالب نہ ہوتی اور کبھی کسی معاملے میں دخل اندازی نہ کرتی۔ مگر امیر اور وزیر ہر معاملہ جو وہ اپنے طور پر طے کرتا یہی سمجھتے کہ ام جعفر کی وجہ سے ہوا ہے۔ انہیں بس شغب کیزات سے لزرہ طرہ دھتا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ مقتدر کسی بھی طور خود مختار ہو۔ وہ اسے قصر کی دیواروں سے ورے کی دنیا سے نا آشا رکھنا چاہتے تھے۔ جیسے خواب کی دنیا کا شہزادہ ہو۔ حامد منوں ابن فرات اور نصر حاجب اس کے گرد حصار کی طرح مقیم تھے جس کے اندر کوئی نہیں جاسکتا تھا۔ ہر حاکم ایک حصن حصین کے اندر رہتا ہے باہر کی باتوں سے بے خبر۔ ایک نہایت ہی معزز قید کی طرح۔

شغب کا خط پڑھ کر وہ سوچتا رہا۔ ضرور کوئی اہم بات ہے ورنہ سارے جاسوسوں اور سچے نويسوں کی پرواہ کئے بنا وہ کبھی سفارش نہ کرتی حکم نہ دیتی بامنت۔ اس سے ایک زندگی کی بھیک نہ مانگتی۔ اس کی ماں زمانہ شناس اور رمزشناس تھی۔

نہ چاہنے کیا وجود اس کی جی چاہا کہ وہ ام جعفر کی بات مان لے اور قاضی ابو عمر اور دوسروں کے دخطوں کی لمبی فہرست رکھنے والے اس فتویٰ کے ٹکڑے اڑا دے۔ اسے اپنی ماں ساری خامیوں کی باوجود بہت عزیز تھی۔ وہ اس کے حکم سے سر تابا کرنے کی مجال نہیں رکھتا تھا اور اختلافات گو تھے مگر اس کا خیال تھا یہ موت ٹالی جاسکتی تھی۔

حامد بن عباس کا غدوں پر خلیفہ کے دستخط کروانے کے بعد بھی کھڑا رہا۔

”امیر المومنین! سفارت روم کے آرام کا مناسب خیال رکھا جا رہا ہے۔ قصر مزین کئے جا رہے ہیں۔“ اور اس نے ایک نقشہ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ اس راستے کی تفصیل جس سے وہ داخل ہوں گے اور سارے محلات جن سے گزریں گے۔ مقتدر کے مکدر چہرے پر روشنی سی ہوئی۔

”امیر المومنین! اس پر بھی اپنی مہر ثبت فرمادیں۔“

مقتدر نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس سے کوئی راز نہیں کھلتا تھا۔ کنویں کیسی گہرائی لئے ہوئے وہ اندر کی طرف دھنسی آ نکھیں۔ وہ ایسا انسان تھا جس کے ظاہر اور باطن میں بہت فرق تھا۔ جو ادنیٰ غلاموں کی سی ذہنیت رکھنے کے باوجود اپنے محکمے کو کمال جانفشانی سے چلاتا تھا۔ جو بیمار ہو تو بھی کاتبوں کو بلا کر کام کی تفصیل طلب کرتا تھا۔ ہاں مقتدر اس سے خوش تھا۔ بہت خوش نہیں جیسا وہ نصر حاجب کے ساتھ تھا، مونس کے ساتھ۔ مونس تو یوں بھی رعب و دبدبے سے اپنے ترک ہونے کا فائدہ اٹھاتا تھا۔

مقتدر نے روشنائی کے لئے ادھر ادھر دیکھا۔ حامد نے اپنے لمبے کوٹ کی جیب میں سے دوات حاضر کر دی۔ اسے کھول کر دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور ادب سے پیش کیا۔ اس وقت وہ کتنا بے بضاعت لگ رہا تھا۔ خلیفہ کو اس پر غصہ آیا کہ وہ کیوں اتنی عاجزی کر رہا تھا۔ کیوں!

اسے بے جا عاجز لوگ پسند نہ تھے۔ وہ انسانوں کو مجبور و مقبور دیکھنا نہیں چاہتا اور اسی لئے اس کے عہد میں بغداد کی رونقیں اپنے عروج پر تھیں۔ عجیب شخص آ زادی کا قائل تھا اور لوگوں کے خیالات اگر باغیانہ نہ ہوں تو اسے پسند تھے۔ وہ منفرد سوچ اور منفرد عمل کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ آدمی میں جو ایک ازلی شان ہے اور آدم کی پیشانی میں جو نور ہے جس کے لئے وہ سجدہ گاہ قدسیاں قرار دیا گیا، اسے وہ شان پسند تھی۔ تھوڑا سا استغناء، ذرا سی لاپرواہی اور بے نیازی جو انسان میں شان ربوبیت پیدا کر دے جو اسے ساری کائنات کا مطمع نظر، مقصود ازلی کا پیارا بنادے، جب اس کے سامنے خوشامد سے لوگ جھکتے تو وہ ہیچ و تاب کھاتا کیونکہ وہ امیر المومنین تھا اور لوگ اس کے سامنے کی زمین کو بوسہ دے کر اس سے بات کرتے تھے۔ یہ دستور زمانہ تھا اور کیا برا دستور تھا۔

جب اس فتویٰ پر خلیفہ کی مہر ثبت ہو چکی تو حامد نے سیدھا کھڑا ہو کر اپنے گرد و پیش دیکھا۔ نصر حاجب اسراپردوں میں سے ظاہر ہو رہا تھا اور وہ مونس کے ہمراہ تھا۔

امیر المومنین نے ان دونوں سے کچھ امور سلطنت پر گفتگو کی۔ حامد نے اجازت چاہی اگلے قدموں وہ بارگاہ سے باہر آ گیا اور باہر ایک تاریک سیاہ آندھی نے بغداد کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لئے بڑھنا شروع کیا۔ بادل بجلی کو طوفانوں کو سناٹوں کو رعد اور شور کو

اور ویران اداسی کو لئے بڑھتے رہے۔ قہر بلا اور بادوباراں نے غنیم کی فوج کی طرح بغداد کو اپنے حصار میں لے لیا۔
مقدرات کیا تھے!

اور یہ گنگناہٹ جیسے دور کہیں زمین کی پہنائیوں میں موت کا زمرہ ہو۔

کون ایسی شاندار زندگی کی تھی جس کے استقبال کے لئے موت بے قراری سے منتظر تھی۔ اپنی بساط بچھائے وہ سراپا انتظار تھی۔
اور مغنی آتش نفس اپنے نغموں سے فنا۔ فنا۔ فنا کا زمرہ سنار ہاتھا!
جنید نے آئینوں کی دکان بڑھادی تھی۔ شبلی نے پوچھا۔
”آخریک بیک آپ نے آبائی کاروبار ترک کیوں کر دیا ہے۔“

”اس کاروبار میں یہی خرابی ہے صیقل کرنے میں ذرا سا ہاتھ جنبش کرے تو آئینہ دھندلا جاتا ہے اور پھر سیاہ ہو جایا کرتا ہے۔
میرے کاروبار کی شہرت جس خوبی کی وجہ سے تھی اب اس کو قائم رکھنا اسی معیار پر آئینے بنانا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔“ وہ چپ ہو گئے۔
شبلی نے سر ہلایا جیسے بہت کچھ سمجھ رہے ہوں۔ پھر دکان کے پچھلے حصے میں جا کر وہ بیٹھ گئے اور ایک ایک آئینے کو جو وہاں زمانوں
سے جمع تھا دیکھتے رہے۔ سارے آئینے اندھے تھے۔ کسی میں ان کو کوئی بھی صورت نظر نہ آئی۔ ہر طرف سیاہی تھی اور اندھیرا تھا۔
زندگی کی رمق نہ تھی اور بخ بستہ خانے سہرا بر ایک صدا چلی آتی تھی اور سارے آئینے اس صدا کو پکڑا اور ستر ہے تھے مگر وہ جانچ نہیں
سکتے تھے کہ یہ گنگناہٹ کہاں سے آ رہی ہے۔ بہت آہستہ سے شبلی اس اسباب کو جو آئینوں کے بنانے میں استعمال ہوتا تھا ضائع
کرنے لگے۔ انہوں نے رنگ اور سفیدی کو سرخی میں بے طرح ملانا شروع کیا۔ پھر سارے فرش پر اس کو پوت دیا اور پھر اس میں خود
ڈمگمانے لگے اور گر گر کر اٹھنے اور اٹھ اٹھ کر گرتے رہے اور پھر انہوں نے غوغا کیا کہ وہ خود آئینہ بن گئیں۔ وہ سرخی کو اپنے بازوؤں
پاور ہاتھوں اور منہ پر پل رہے تھے۔ جیسے کوئی تالاب میں ڈکیاں لگانے والا ابھرے اور ڈوبے اور سطح آب پر بننے والے بلبلے کبھی اس
کی غمازی کریں کبھی خود مٹ کر اسے چھپالیں۔

جنید میزھیوں کے سرے پر روشنی میں کھڑے تھے۔ انہوں نے کم روشنی میں دیکھا کہ شبلی آئینہ بنے تھے۔ انہوں نے نہایت
افسوس سے سر ہلایا اور کہنے لگے:

”آئینے کے مقدر میں ٹوٹنا ہوتا ہے۔“

تہ خانے میں سے کسینے پکار کر کہا: ”ہر ریزہ ایک الگ آئینہ بن جاتا ہے۔ ایک طرح سے تو یہ آئینے کی کامیابی ہے۔“

شبلی رقص کناں آئینوں کو ایک دوسرے پر مارنے لگے۔ اس شکست کی صدا اس زیر زمین نغمے پر چھا گئی۔ آئینوں کا ڈھیر بڑھتا گیا۔ چمک پکڑ کر کرنوں اور اجالوں اور روشنیوں اور آفتابوں کو منعکس کرنے لگا۔ وہ دکان شیشہ گراں کائنات بن گئی۔ دنیاؤں سے بھری ہوئی آفتابوں اور ماہتابوں سے لبالب بھری ہوئی۔ سرخی اور سفیدی سے بھری ہوئی۔

جنید اپنے کتب خانے میں بیٹھے رہے۔ ان کا قلم آج رک رک کر چل رہا تھا۔ خیالات مجتمع نہیں ہو رہے تھے اور شبلی سرخی میں ڈوبے ہاتھوں کو منہ پر ڈل رہے تھے۔ ہاں ہ سرخرو ہو رہے تھے جیسے وہ سارے کاروبار حیات کو تھک کر چکے ہوں۔

پھر وہ گلیوں و بازاروں کو چوں اور گلیاروں میں بھاگنے لگے۔ آوارہ لونڈے ان کے پیچھے تھے۔ انہوں نے زندان کی طرف بھاگنا شروع کیا اور بچوں کی ٹولیاں ان کے عقب میں دوڑنے لگیں۔ وہ کسی بڑے سے دیوان خانے کی ڈیوڑھی میں چھپ جاتے اور آنے والی بھیڑ ان کے تعاقب اور زور سے آگے نکل جاتی۔ کھی ننے پر شوق لوگ اس گروہ میں مل جاتے اور کنارہ دجلہ کی شاہراہ پر امنڈتے۔ خوشگوار ہوا اور پھولوں کی خوشبو میں یہ آنکھ مچولی جاری تھی۔ شبلی بہت مزے میں تھے۔ انہیں ہمیشہ بھاگنے اور چھپنے اور لوگوں کی بھیڑ سے بچنے اور سے اپنے پیچھے لگانے میں مزہ آتا تھا۔

زندان کی سلاخوں سے لگ کر شبلی نے اندر جھانکا۔

حسین پر مسرت اور خوش تھا۔ اس نے رنگے ہوئے چہرے کو قریب دیکھا تو ہنسا۔ اور پھر دیر تک ہنستا رہا۔

”یہ سرخی آدمی کو آئینہ بنا دیتی ہے آئینہ ساز نہیں بناتی۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔ اصل نہ سہی۔ پر تو سہی۔“ شبلی نے ہاتھوں کو دوبارہ منہ پر ملا۔

”کیا وضو کر رہے ہو شبلی۔“ حسین نے پوچھا۔

”نہیں۔“ پھر اپنے آپ کی طرف دیکھ کر کہا: ”میں دریا بردہ ہوں۔ وضو ہی وضو ہے میرا۔“

”یہ بھی سچ ہے۔ ہاں یہ بھی سچ ہے۔ دریا میں ڈوبنے والے کو وضو کی ضرورت نہیں۔ مگر مجھے تو اس نے ہاتھ پاؤں باندھ کر دریا

میں پھینک دیا اور پھر ہوشیار رہنے اور دامن ترنہ کرنے کی بھی تاکید کی۔“ حسین نے نہایت طمانیت سے کہا۔

”وضو کی ضرورت تو پھر بھی رہی۔“ شبلی سرخروئی سے باہر کھڑے تھے اور بھیڑ احاطے کے باہر نعرے لگا رہی تھی۔

”دیوانہ۔ دیوانہ۔“

”وضو ہو تو نماز بھی ادا ہو۔“

”یقیناً وضو کریں گے تو نماز ادا ہوگی۔“ حسین نے کہا۔ ”یہ وعدہ ہے“

”جنید اب فقیہ ہو گئے ہیں۔ وہ آئینہ خانے کو بند کر کے بیٹھ گئے ہیں۔“ شبلی نے کہا۔

”انہیں ایسا ہی کرنا تھا۔ مقدرات یہی تھے۔ مشیت سے بچ کر کوئی کہاں جاسکتا ہے۔“ حسین ہنسے۔ مگر کاروبار حیات کو لپیٹا تو

نہیں جاسکتا۔ دروازے بند کرنے سے کوئی بچ تو نہیں سکتا۔ جو جس گواہی کے لئے پکارا جاتا ہے اسے گواہ رہنا ہی ہوتا ہے۔“

”یا شیخ۔ کل صبح سورج ٹوٹنے والا ہے۔“ شبلی نے سلاخوں کو چھوڑ دیا اور رونے لگے۔

”ہرز رہ آفتاب ہوگا۔ شمشیر کا دم اب شمشیر سے باہر ہے۔“ حسین نے پھر جائے نماز پر جا بیٹھے اور زندان کی نیم تاریک کوٹھری

میں انکی بے پناہ آنکھیں جگمگنے لگیں۔

حامد بن عباس نے کہا:

”قاضی ابو عمر۔ میں آپ کا نہایت شکر گزار ہوں۔ اگر آپ ”حلال الدم“ نہ کہتے تو میں کچھ کر نہیں سکتا تھا۔“ اس نے نبیذ کا جام

ایک ہی سانس میں خالی کر کے صراحی کے برابر میں رکھ دیا۔

”آ قاضی ابو عمر کا چہرہ اڑا اڑا تھا اور بے سکون بھی۔“

”حامد۔ خدا سے ڈر اور اسے جانے دو۔ تم نے جان لیا کہ تمہاری طاقت بے پناہ ہے۔ تم ایک انسان کی زندگی اور موت پر تقریباً

قادر ہو مگر یہ خون ناحق ہوگا۔“

حامد ہنسا اور دیر تک ہنستا رہا۔

”خون ناحق نہیں۔ یہ ایک زندگی کے بدلے زندگی ہے۔ یہ میری بے خواب اور بے چین اور نامراد زندگی کے جواب میں زندگی

ہے۔ قاضی ابو عمر! کبھی آپ نے اذیت اور محبت کو یک جا اٹھایا ہے۔“

”اگر محبت، محبت ہو تو اذیت کہاں ہوئی۔ تمہاری مفروضے غلط ہیں۔ تم اسے اس کی زندگی کی خیرات مانگتے آ یا ہوں۔ میرے منہ

سے سہو ایہ لفظ نکل گیا تھا۔ میرا مطلب صرف گالی دینا تھا۔ اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پانا۔ یونہی اپنی بڑائی آزمانا۔ اپنے قضا کے عہدے

کا لطف لینا۔ مجھے حسین بن منصور کے چہرے کا اعتماد ہلا دیتا ہے۔ دوسرے داعی اور کاذب نبی اور مہدی کا دعویٰ کرنے والے لوگ

آل علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے لوگ، اہل بیعت کی محبت میں گرفتار لوگ، سب رو برو آتے ہیں تو گھبرا جاتے ہیں مگر یہ زندانی دوسروں

سے مختلف ہے۔“ وہ سانس لینے کو رکے۔

حامد نے خوش ہو کر کہا: ”تو اس کا انجام بھی دوسروں سے مختلف ہوگا۔ اس کو دار پر لٹکانے سے قبل ہم اس کو مشلہ کریں گے۔ مجھے اس کی آنکھوں کے آنسو درد سے زرد پڑتا چہرہ بے پناہ خوشی دیں گے۔ قاضی ابو عمر! زندگی میں ایک بار تو مجھے خوش ہونے کا حق ہے۔ ہے نا!“

قاضی ابو عمر بیٹھے سے ایک دم کھڑے ہو گئے۔ ”نہیں ہرگز نہیں۔ بخدا ہرگز نہیں۔“

حامد نے کہا: ”یہ دیکھئے۔“ اس نے کاغذ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ ”سگسار کرنے“ مشلہ کرنے۔ اس سے پہلے ایک ہزار کوڑے مارے جانے اور آخر پر دار پر لٹکائے جانے کے احکامات ہیں۔ آپ پہچانتے ہیں نا خلیفہ کی مہر؟“ اس نے کاغذ ان کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

”ایک ہی آدمی کے لئے اتنی بہت سی سزائیں۔“ قاضی نے کانپ کر کہا۔

”ہاں جرم جرم شراب کی طرح ایک ایک قدم موت اس کی طرف بڑھے گی تو کتنی اذیت ناک ہوگی۔“ حامد ہنسا اور صراچی سے اس نے نیبڈ جام میں انڈیلی کیونکہ شب کی اس ساعت وہ دونوں اکیلے تھے اور دجلہ کی طرف کھلنے والے اونچے درپچوں سے باہر پوری دنیا تھی جو اس اذیت ناک لمحے پر گواہ اور عینی شاہد ہونے والی تھی۔

”تم اس موت سے اس قدر لذت محسوس کر رہے ہو جیسے ساری عمر تم نے اس کا انتظار کیا ہو۔“ قاضی ابو عمر بہت بد مزہ ہو رہا تھا۔

”یونہی سمجھ لیجئے۔“ حامد نے اٹھ کر وسیع نشست گاہ میں ٹہلتے ہوئے کہا۔

”مگر کیوں۔ آخر کیوں۔ تم زندگی میں نہایت بامراد کامیاب با اختیار آدمی ہو اور وہ ایک فقیر بے نوا۔

اس کے بے نوائی میری کئی کامیاب زندگیوں پر حاوی ہے۔ میرا با اختیار ہونا کبھی اس کا مسئلہ نہیں رہا۔ اس لئے کہ اس نے جو اختیار مجھ پر حاصل کیا۔ گو محض اتفاق ہوگا مگر میری زندگی کو ریزہ ریزہ کر گیا۔ میری زندگی نامراد و ناکام رہی اور وہ کامگار و بامراد ہوا۔“ حامد اب تیز تیز بول رہا تھا۔

”میں اس سے ملا ہوں مجھے تو حب جاہ و اور حب دنیا دونوں میں سے ایک خواہش بھی اس میں نظر نہیں آئی۔ وہ تو موت کا طلب

گار اور اس سے محبت کرنے والا ہے۔ وہ تو آزاد آدمی ہے۔ آزاد آپ سمجھتے ہیں نا۔“ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر قاضی ابو عمر بولا۔

”اس کا ایک قدم عقبی پر ہے اور ایک دنیا پر، حامد اسے کسی بات کی پرواہ نہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ تم اس کی موت کو قریب لا

کر اس کی آرزو پوری کرو گے اور اس کا خون ناحق تمہاری گردن پر ہوگا۔“ وہ چپ ہو گئے۔

”آپ نے خود ”حلال الدم“ کہا تھا اور اب آپ اپنے الفاظ واپس نہیں لے سکتے۔ اسے معاف نہیں کر سکتے۔ اسے زندگی لوٹا نہیں سکتے۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔“ حامد بہت آہستہ آہستہ زیر لب بات کر رہا تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور اس کی آنکھوں میں اور سر پر سیاہی امنڈی ہوئی لگتی تھی جیسے اس کے اندر کہیں سیاہ رات کروٹیں لے رہی ہو اور زمزمہ موت کی گنگناہٹ اس کے خون میں ہو۔ قاضی ابو عمر سحر زدہ سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔

”کل کا دن اسے دار پر دیکھے گا اور آب بطور گواہ وہاں موجود ہوں گے کہ ہر کام اسی طرح انجام پایا جس طرح میں نے چاہا ہے۔ ہاں میں چاہتا ہوں کہ اس کی ہڈیوں میں اتنے چھید ہوں جیسے نے میں ہوتے ہیں۔ اس کا گوشت ریشہ ریشہ کاٹا جائے اور اس کو اتنی بے پناہ اذیت ہو کہ دشت ساویہ تک اس کی آواز پہنچے۔ قبروں میں سونے والے جاگ اٹھیں اور ماتم کریں اور ان کی سینہ کو پی کی آوازیں مشرق سے مغرب تک ہر جگہ سنائی دیں۔ کبھی بھلائی نہ جاسکیں۔ دنیا اس کی کرب ناک چیخوں سے گونجتی رہے گونجتی ہی رہے۔ کوئی زمانہ کوئی وقت کبھی اس اذیت کو بھلا نہ سکے۔ قطرہ قطرہ اس کا خون جس جگہ گرے وہاں ہمیشہ کے لئے ٹھہرا رہے۔ ساعت بہ ساعت اس کا سانس اکھڑے اور ہوائیں اسے اقصائے عالم میں لے جائیں اوہ ایک بیشک کی چیخ بن کر زندہ رہے۔ ہاں قاضی ابو عمر! یہ آپ کا نبی اور مہدی اور پارسا۔ یہ اغول کا روح اللہ“

”بغداد تم اپنے حواسوں میں نہیں ہو دیر مملکت۔ میں بغداد کا قاضی القضاۃ ہرگز اس حکم کی تعمیل نہیں کروں گا۔ کیونکہ دار پر لٹکائے جانے کا مطلب یہ ساری اذیتیں ہرگز نہیں۔ یہ اس حکم میں فتویٰ میں بود میں لکھا گیا ہے۔“

”تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ قاضی ابو عمر۔ دار تو بذات خود ایک اذیت ہے۔ ایک دم مرنے کی جگہ۔ وہ ہولے ہولے مٹے گا۔ عذاب سے نجات کی دعا کرے گا تو رحمت خداوندی جوش میں آئے گی۔ وہ آپ کا مرد صالح، عالم ربانی، انا الحق کہنے والا دیوانہ۔“

”مجھے یہ سمجھ نہیں آئی اس لمحے تک کہ تم اس کی موت کے اس شدت سے طلب گار کیوں ہو؟“

”یہ راز آپ پر کبھی کھل نہیں سکے گا۔“ حامد نے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ لئے اور نشست پر پیچھے کی طرف سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”اچھا۔ اب اجازت طلب کروں گا۔ قاضی ابو عمر نے یک بیک اٹھتے ہوئے کہا۔ حامد کے سترے زرد چہرے پر طمانیت تھی۔ اس نے سر کے اشارے سے اجازت دے دی۔ پھر پردوں کے پیچھے سے ایک کے بعد ایک دروازے کھلتے چلے گئے اور باہر نکل کر قاضی ابو عمر نے کہا ”مجھے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے۔ اس قصر میں زندگی نہیں موت کمین ہے۔۔۔۔۔۔ یہ قضا کا عہد جو حامد کا

حاسان ہے میں اس کو لوٹا دوں گا۔ زندگی پر موت کا یہ اختیار مجھے ہرگز پسند نہیں۔ زندگی پر موت کی بادشاہت۔ آدمی پر آدمی کا اتنا اختیار۔“

اور حامد نے اس کے جانے کے بعد درپے سے جھانک کر باہر اترتی ہوئی رات کو دیکھا تو اجالوں میں سے اندھیرے کی ردا پھیلانے محو پرواز تھی اور اکیلے تارے سہمے ہوئے بچوں کی طرح کہیں کہیں جھانک رہے تھے۔ ہوا تھکی تھکی اور پریشان تھی جو کونوں اور کنجوں میں بیٹھ کر دل کا غبار نکالنے کے لئے گریہ کرنا چاہتی تھی اور زمین کے اندر دوڑ کہیں ایک زمزمہ سانسائی دے رہا تھا۔ گنگناہٹ جیسے عناصر کی ترتیب نو میں مصروف ہوں اور کسی قصر و فریب کی تعمیر ہو رہی ہو۔ استقبال کی تیاریوں کے باعث کنار و جلہ روغن اور روشنیوں سے آراستہ کئے گئے تھے اور عکس پانی میں بہتا ہوا آسمان لگتا تھا جو بادلوں نے اڑایا ہوا اور پھر یروں کی طرح لہرایا گیا ہوا اور سنوارا اور نیچے اتارا گیا ہو۔

یہ بغداد کی عام معمولی رات تھی۔

کیا یہ باقی راتوں کی سی رات تھی؟

وہ عزازیل تھا میرے بھائی کہ وہ راندہ درگاہ خداوندی تھا

وہ اپنی ازلی تقدیس سے دھکیلا گیا

وہ اپنے آغاز سے اپنے انجام کی طرف لوٹا یا نہیں گیا

کیونکہ وہ اپنے انجام سے آزاد نہیں ہوا

اس پر اپنے آغاز سے لعنت کی گئی

اور وہ پیاس کی شدت سے اس جگہ تڑپا یا گیا جہاں ہر طرف جھیلیں شفاف پانی سے لبریز تھیں

وہ عذاب میں چیختا رہا کیونکہ آگ نے اسے جلایا

اس کا خوف محض بہانہ تھا

وہ اپنے غرور میں اندھا تھا

اور اس لئے وہ جہاں پر ہے وہاں ہے

حسین کو اس زندان میں اپنے انجام کا انتظار تھا کہ اس نے عظیم سائے کو سلاخوں پر محیط ہوتے محسوس کیا جیسے بادل سورج کے

سامنے آ جائے۔ پھر وہ ازلی قدیم مگر گھٹی آواز آئی:

”تم انا الحق کہتے ہو اور تمہارا انجام دار ہوگا۔“

”کیا تم اپنے انجام سے باخبر نہ تھے۔“ حسین نے پوچھا۔

”عرشیوں میں سے صرف میں ہی باخبر تھا اور میں راندہ درگاہ قرار دیا گیا۔ تم بھی غرور ذات سے انا الحق کہتے تھے اور تم شہید قرار دیئے جاؤ گے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟“

سایہ سکر گیا یہاں تک کہ ایک سلاخ تک بھی پہنچ نہیں پاتا تھا۔

”تم بھی شہید ازل ہو مگر تم نے اپنے آپ کو ہر حکم سے بالاتر سمجھ لیا تھا۔ میری محبت میں نیاز تھا اور تمہاری محبت میں نازا اور وہ جو کسی لفظ اور کسی تقدیس کے بیان کئے جانے کا محتاج نہیں وہ نہ نیاز جانتا ہے نہ نازا سے جو پسند آ جائے۔ کیا تم اپنے آپ کو اس درمیان سے نکال نہ سکتے تھے۔“

”نہیں حسین ابن منصور۔ یہ مشیت تھی۔ اگر وہ چاہتا تو سب ممکن تھا۔ اس نے مجھے اپنی بادشاہت سے نکال دیا تو کیا ہے۔ مجھ سے بڑھ کر اس کا چاہنے والا کون ہے۔“ اس کی آواز کے تمسخر کو حسین نے محسوس کیا اور کہا:

”نہیں۔ مجھے چاہت کا دعویٰ نہیں۔ مجھے تو کوئی دعویٰ ہی نہیں۔ ہاں تمہارے اور میرے شوق میں فرق ہے میرا شوق گھاس کی پتی کی آرزو ہے۔ تپاں! لرزاں اور بس!“

وہ افسوس زدہ سا کوئی جواب دیئے وہاں کھڑا رہا۔ روشنی اور اندھیرے کے سنگم پر ایک ذرے کی طرح جس کی کل کائنات اس کا اپنا آپ ہی تھا۔ اس کی بد صورتی میں از لہ حسن کی ایک جھلک سی تھی۔ موہوم سا شائبہ۔ جھکا ہوا آوارہ بہ دل آوارہ بہ جاں۔ مقام پر دوازی زخمی یادوں کو لئے ہوئے۔

”وہ حق کے لئے انا الحق کو دار آویزاں کریں گے۔ بغداد کے جسر الاعلیٰ پر تمہاری لاش جھولتی رہے گی۔“ اس نے ایک اور وار کیا۔

”نہیں۔ تم انا کے لئے دھکیلے گئے تھے۔ میں تو کہیں نہیں ہوں۔ سب طرف وہ ہی وہ ہے جلوہ جاناں۔ خود جاناں۔ یہ ظاہر آنکھ ہے جو دیکھتی ہے۔ یہ ظاہر کے کان ہیں جو سنتے ہیں یہ شریعت نجس سے ابا کرنے والے کو دار پر کھینچا جاتا ہے اور خوب ہی کھینچا جاتا ہے۔ کیا تم منزل شوق میں نہیں ہو؟“

”مجھے اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں۔“ اس نے یونہی کہا۔

”اپنے ساتھ نہیں۔ انا کے ساتھ نہیں۔ انا کے بغیر تم تو رازداں ہو۔“ حسین کو گلہ رے میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔

”الوداع۔ اب ہم کبھی نہیں مل سکیں گے۔“

”الوداع..... حسین نے سلاخوں کے پار دیکھا۔ وہ نہایت افسردہ پڑ مردہ واپس جا رہا تھا۔

در کھلے..... سلاخیں کھلیں..... آزادی کا وقت آ گیا تھا بالآخر!

خلقت کا اثر دھام تھا اور جلا د کوڑا لئے کھڑا تھا۔ حسین کی پیٹھ جو محض استخوان تھی، تنگی کی گئی۔ آہ و بکا کی صدا عین برابر آرہی تھیں۔

اس کی پوتیاں اس کے بیٹے ان کے دوست اور جانے کون کون رو رہا تھا۔ دیوانے کو کلمہ کفر کہنے کی سزا دی جا رہی تھی۔

حبشی نے چمڑے کا لباس پہن رکھا تھا اور آندھی کے شور میں جو طوفان کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی نہایت استقلال سے کھڑا

تھا اور بہت خوفناک نظر آتا تھا۔ یہ شاہی جلاس تھا جسے محض بغاوت کرنے والوں کو سزا دینے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ حکومت وقت

اور خلیفہ وقت کے خلاف بغاوت کے جرم میں جو پکڑے جائیں ان پر وہ صاعقہ قہر بلا بن کر گرتا تھا۔ اس کی آنکھیں پیدائشی سرخ تھیں

کہ ان میں خون اتر ا ہوا لگتا تھا۔ وہ ظالم تھا اور ہر وقت شراب کے نشے میں دھت رہتا تھا۔ وہ پانی کی جگہ بھی مئے ارغوانی پیتا تھا کہ اس

کے منہ میں جو خون کا ذائقہ جم گیا ہے اس کی تلخی کچھ کم ہو۔ حلقوم سے لے کر معدے تک ایک خراب ذائقہ جم گیا تھا اس لئے وہ گھڑی

گھڑی تھوکتا تھا۔ ایک غرغراہٹ سے جو اسے نہایت خوفناک بنا دیتی تھی۔

سیاوش کی بھنویں اس کے پپوٹوں کو ڈھانچے تھیں اور دو آدمی سے اپنے کندھوں پر اٹھائے تھے۔ اسے دکھائی نہیں دیتا مگر کوڑوں

کی آوازیں جیسے کسی دیوار پر مارے جا رہے ہوں اسے برابر سنائی دے رہی تھیں۔ پھر اس نے نالہ کیا:

”آہ پوتے۔ اسلام نے تم کو یہ دیا۔ کیا برا انجام ہے۔“

حسین نے اس شور میں جانے اس کی آواز کیسے سن لی کہ ہنسا اور زور سے کہا:

”دادا۔ میں نے خوب تر صلہ پایا ہے تم رنجیدہ مت ہو۔ بہت مزے میں ہوں۔“

کوڑے کے لہرانے کی آواز جیسے سانپ کی پھنکار وہ اور حبشی کی ہانپتی ہوئی سانسیں جیسے ساز بجایا جا رہا ہو۔ پتہ نہیں دیوانہ چیخ

کیوں نہیں رہا تھا۔ نالہ و بکا کیوں نہیں کرتا! کوڑے کو اور لہراؤ۔ شدت اور شدت۔ تلخ تر اپنی پوری قوت لگاؤ۔ حبشی کے اندر عجیب پکڑ

دھکڑ ہو رہی تھی۔ اس کا دل گھٹنے کی طرح تیز چل رہا تھا اور آندھی کا شور بڑھ رہا تھا۔ ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ تماشا دیکھنے والے حیران

تھے کہ دیوانہ خاموش تھا۔ کیا اس کے اندر خروش کو ضربوں نے زخمی کر دیا تھا؟

”انا الحق کہتے ہو۔“ حبشی نے اپنے کانوں میں پڑے بالے نوج کر پھینک دیئے۔ اپنے سر پر منڈھی چڑے کی ٹوپی اتار کر الگ کر دی۔ اس کے گھنگھریالے سیاہ بال لہرائے گئے اور اس پر دیوانگی سوار ہو گئی۔ ضربوں کی شدت اسے اپنے جسم پر محسوس ہو رہی تھی مگر زخموں سے رستے خون کے باوجود آہ کیوں نہیں کرتا۔ ہاں میں اس لے کو اور تیز کر دوں گا۔ آہوں کا نغمہ کیوں سنائی نہیں دیتا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوڑوں کے ساتھ وہ خود اس ناتواں جسم کے ساتھ ٹکرا رہا تھا اور دلدوز آہوں کے ساتھ اپنے سے بیگانہ وہ کوڑے لہرا رہا تھا اس نفسی کو جو ہوا کے کھنچے پر کوڑے کے مضرب سے بجائی جا رہی تھی وہ سن رہا تھا۔ اور تیز اور تیز۔ اس کا بدن ایک دائرے کی طرح تھا جس کے اندر وہ قید تھا اور جس سے باہر نکلنے کے لئے اسے حسین کی آواز کا سہارا چاہیے تھا جو اسے مل نہیں رہا تھا۔

حسن کی بیٹیاں بے ہوش ہو گئیں۔ نالہ و بکا کی آوازیں آندھی کے ساتھ مل کر سارے بغداد پر اس کے محوں پر اس کے گلیاروں اور بازاروں میں شاہراہوں پر گھومیں۔ انہوں نے سیر کرنے والوں کو ہراساں کیا۔ سرائے میں سودا گروں کو پریشان کیا۔ دشت سوس کی سرخ اور زرد اور سیاہ ریت فوج کی طرح اپنے ذرات کے ساتھ اس عروس البلاد پر حملہ آور ہوئی۔ حسین بن منصور کو دھنکی کا گیت تستر کی ہوانے سنایا اڑے جانے جاں ہم رفت مقتدر اپنے ایوان درایوان محل میں رومی سفارت کو شرف باریابی بخش رہا تھا جب اس کے کانوں نے ایک آواز سنی۔ اونچی دیواروں اور فصیلوں اور مسافت کی دوری کے باوجود پتہ نہیں کیونکر سراپردوں اور بارگاہوں سے گزر کر جہاں ہوا کا گزر بھی ممکن نہیں ہوتا۔ یہ صدا اس تک پہنچی تھی۔ شغب اپنے محل میں ماتم کناں اپنی بے بسی پر مضرب اور سینہ کو بلی کر رہی تھی۔

حامد نے اس سے بدلہ لے لیا تھا مگر وہ اتنا طاقتور کب سے ہو گیا تھا؟

آدمی کیونکر آدمی کا مالک ہو جاتا تھا۔ اس کی جان لینے پر قادر۔ آخر کیوں۔ آخر کیوں؟

کینزیں اور لونڈیاں رو رہی تھیں جیسے کوڑوں کی نفسی انہیں رلا رہی ہو۔

حسین بن منصور دیوانہ تھا تو سہمی مگر کیسا دیوانہ تھا کہ کوڑوں کے باوجود ہنستا تھا اور جب خروش میں اس کی جان آرام پاتی تو انا الحق کہتا تھا۔

نصر حاجب کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ خلیفہ نے محسوس کیا کہ وہ غیر حاضر سا تھا اور گرجا جاتا تھا۔ وہ ایک نرم خور حمد دل دوست نواز حاکم تھا اس لئے نصر کی طبیعت کی خرابی کو محسوس کرتے ہوئے اس نے اسے جانے کی اجازت دی۔

مقتدر کے گرد دولت دنیا اور اپنے جدا ماجد ماموں کی طرح دوستوں کا مجمع تھا۔ شان و شوکت دربار سے رومی سفیر تقریباً نیم بے ہوش ہو گئے تھے۔ اس شہر خوبی و محبوبی کو دیکھ کر اس کی رونقوں اور نظاروں سے لطف اندوز ہو کر انہوں نے ہیبت و رعب کو محسوس کیا تھا، مگر یہ سب بجائے قصر جو محض گزر گاہ تھے کیا خوب تھے۔

عباسی خلفا کی داستانیں جو ان تک پہنچی تھیں۔ یہ ایک اور ہیدینا تھی جس سے یورپ نا آشنا تھا۔ ہاں گریہ کی صدا کہاں سے آ رہی تھی؟ انہوں نے گھبرا کر پردوں کی طرف دیکھا جو خلیفہ کے تخت سے دور تھے ہوئے تھے۔ ان پردوں سے پرے کچھ تھا۔

ہوائیں یہ ساری آوازیں اپنے دامن میں سمیٹ کر لا رہی تھیں اور لہریاں لبادوں کو سمیٹ کر پھر ادھر کا رخ کرتیں۔ جیسے کسی چٹان کے راہ میں حائل ہو جانے سے پانی اس کے گرد بڑھنے لگے۔ بھیڑ پل کے اطراف بڑھ رہی تھی۔ دجلہ سے بڑا ایک دریا تھا کہ لہریاں لیتا، سمٹا اور برستا تھا۔ مجمعے میں سے اکثر لوگ ”انا الحق“ کہتے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے۔ کچلے جا رہے تھے۔ گرتے اور اٹھتے تھے۔

بغداد کی شاہراہوں پر رونق بڑھ گئی تھی کیونکہ دیوانہ سخت جان تھا۔ کوڑوں کی شدید ضرب بھی اسے آہ کھینچنے پر مجبور نہ کر سکی تھی۔ وہ زندہ تھا اور ”انا الحق“ کہہ رہا تھا۔ پھر لوگوں نے محسوس کیا کہ کوڑے کی ہر ضرب انا الحق کہہ رہی تھی۔ اور ہوا فضا سب اس کلمہ کفر سے معمور ہونے لگی تھی خود جیسی آہ کرنے کی جگہ انا الحق کہہ رہا تھا۔ عجیب بات تھی۔

اطراف سے دور دراز کے علاقوں سے مضافات کی بستیوں سے سراؤں میں ٹھہرے ہوئے مسافر یہ تماشا دیکھنے کے لئے بھاگے آتے تھے۔

فضا میں جب کوڑا لہرایا جاتا تو ہوا کو چیر کر انا الحق سنائی دیتا۔

حامد بن عباس کو خبر کی گئی۔

لوگ آہستہ آہستہ کہہ رہے تھے ”یہ معجزہ نہیں کہ ہر طرف سے انا الحق گھیرے ہوئے ہے.....!“

کوئی کہتا تھا یہ کلمہ کفر کیسے جاری و ساری ہو گیا ہے۔ یہ شیطان کا کام ہے۔ اس دیوانے کو ختم کر دینا چاہیے۔ کچھ لوگ یونہی سنگ باری کرنے لگے۔ پھر اور لوگ مل گئے اور سنگ باری تیز ہو گئی۔ پھر بغداد کے آوارہ لونڈوں نے پل کے ادھر ادھر سے دور و نزدیک سے پتھر لالا کر ڈھیر کرنا شروع کئے۔ وہ ایک تھا اور وہ ایک فوج ظفر موج کی طرح اس کے گرد تھے۔

وہ چٹان تھا اور عوام پانی کے ریلے کی طرح اس سے آ کر ٹکراتے اور لوٹ جاتے تھے۔ سنگباری بھی ایک ساز کی آواز کی طرح اپنی لے بدلنے لگی۔ ہر پتھر جو دیوانے سے چھو جاتا ”انا الحق“ کہنے لگتا۔

قاضی بھلول اور حامد نے بھی یہ نظارہ کیا۔ شبلی اور ابن عطار بھی اس بھیڑ میں کھڑے تھے۔

”کیا یہ سنگباری کفر کے خلاف نہیں ہے کہ تم لوگ اس میں حصہ لیتے ہو۔“ قاضی نے سنگریزہ شبلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ ”یا شیخ یہ کفر کے خلاف ہے۔ کلمہ انا الحق اور اس کا کہنے والا سارے فقہاء کے فتویٰ سے قابل گردن زدنی قرار پایا ہے۔ آپ بھی دیوانے پر پتھر پھینکیں۔“

شبلی نے پھول اٹھایا۔ اس کو اپنے ہاتھ میں تولا۔ نہایت آہستہ سے بازو لہرایا اور حسین بن منصور حلاج کی طرف اس کی پرواز کو دیکھتے رہے۔ سارے سنگ و خشت کے ڈھیر میں یہ واحد ضرب تھی جس کی چھن نے اسے نہایت مضطرب کیا۔ زخمی نگاہ اور آنکھیں جن سے خون رواں تھا۔ شبلی پر ٹک گئیں۔ پھر وہ چیخ یوں گونجی کہ زمان و مکان سے اسے سنا اور سنائے میں آ گئے۔

شام یک بیک رات بن گئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

لوگ دیوانے کو پتھروں کے ڈھیروں کو چھوڑ کر گھروں کی طرف پلٹے۔ زخموں سے چور چور محافطوں کے گھیرے میں وہ سخت جان دیوانہ وہ انا الحق ستارہا جو اس کے ہر بن مو سے اور ہر اس شے سے جو اس کے گرد تھی نکل رہی تھی۔ یہ نعرہ مستانہ انا الحق۔ ”جو شے مجھے مس کرتی ہے تو اس کو مس کرتی ہے۔“

وہ سیاہ رات اس نے دار کے نیچے نوافل ادا کرنے میں گزاری۔

حسن اپنی بیٹیوں اور بیٹوں کو لے کر بیضا کی طرف لوٹ گیا کیونکہ اس کے لئے کوئی جائے امان نہ تھی کوئی پناہ گاہ نہ تھی۔ حسن نے اتنی بھری پری دنیا میں جہاں وہ نہایت کامیاب تھا اپنے آپ کو بے آسرا اور تنہا محسوس کیا تھا۔ جن درباردار یوں سے وہ سمجھتا تھا اس کی عزت ہے وہ سارے انداز غلط ثابت ہو گئے تھے۔ اور اس نے حکومتوں کے لئے اپنے جی میں شدید نفرت محسوس کی۔ ایک دیوانہ کیا لیتا تھا اگر انا الحق کہتا تھا۔ وہ اس کا باپ تھا اور اس کی ساری کوششیں اسے بچانے کے لئے ناکام ہوئی تھیں۔ کسی نے کوئی سفارش نہیں سنی۔ کوئی شنوائی نہیں ہوئی۔ دولت و جاہ کس کام آئے تھے اور جب وقت پڑے پر وہ کام نہیں آ سکتے تھے تو پھر وہ کس کام کے تھے۔ جب ہر شے فنا کی زد میں تھی تو پھر ہستی اور نیستی میں کیا فرق تھا۔

آدمی بیکار تنہا نہیں اور آرزوئیں اور امیدیں لے کر پھرتا ہے اور مضطرب ہوتا ہے اور آخر میں مارا جاتا تھا۔

مدرسہ نظامیہ کے سارے فقیہ اپنی کھال کو بچانے کی فکر میں وزیر مملکت کے زور سے مرعوب ہو گئے تھے اور انہوں نے اس فتوے پر مہر ثبت کر دی تھیں جن کے نہ ہونے سے شاید حسین بن منصور بچا جاسکتا تھا۔

اسے معلوم تھا کہ وہ جسم دار پر لٹکتا رہے گا تا کہ عبرت کا باعث ہو اور حسین یہ دلخراش نظارہ کب دیکھ سکتا تھا۔ سیاوش نے انہی دو آدمیوں کے کندھوں پر اٹھے اٹھے جان دے دی تھی کہ محی کا دوست اپنی تاب ظلم و ستم کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔ اس کی روح مقدس آگ میں اپس مل گئی تھی جس کا وہ حصہ تھا اور ابو یعقوب قطع نے کانوں کو لپیٹ لیا تھا۔ بھلا ان کا اس دار و گیر اور ہجوم میں کیا کام تھا۔ عمرو بن عثمان کی کہتے تھے: افوس میری بد دعا پوری ہو گئی۔ کاش میں نے وہ لفظ نہ کہے ہوتے، مگر گنج نامہ پر خبر پالینے کا انجام بغیر راز شاہاں کا امین ہوئے یہی ہو سکتا تھا جو ہو گیا یونہی ہونا مقدر تھا۔

فاطمہ نیشاپوری نے دار کے نیچے محسوس عبادت حسین سے پوچھا:

”یا شیخ۔ تصوف کیا ہے۔“

حسین کی آواز بمشکل اس تک پہنچ پائی۔ اس نے کان لگا کر سنا۔ ہونٹ مل رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

”جو آج دیکھا اور جو کل دیکھو گے۔“

”آپ لوگوں کے حق میں بد دعا کیوں نہیں کرتے۔“

مگر جواب فاطمہ نیشاپوری تک پہنچ نہیں پایا۔ کیونکہ عناصر مل کر انا الحق کہہ رہے تھے اور کائنات میں یہی ایک آواز تھی۔ انا الحق، انا الحق!

دوسرا دن طلوع ہی نہیں ہوا کیونکہ اندھیرا بغداد کو گھیرے ہوئے تھا۔ ایک تاریک آندھی جس میں مغرب اور مشرق کی وادیوں اور کوہساروں کی آب جو کی اور بحر محیط کی ہوائیں جمع تھیں، مسلسل چل رہی تھی اور ذرہ ذرہ گردیوں تھیں جیسے آسمان ریزہ ریزہ ہو کر گر رہا ہو۔ صبح میں نہ پرندوں کی چپکاریں تھیں اور نہ ہی بوئے گل۔ ایسا سناٹا اور ادا سی تھی کہ دجلہ اپنے کناروں میں اندھے آئینے کی طرح تھا اور خون کی بو ہر سو پھیلی تھی۔ گرم اور تازہ اور جاندار اور نہایت جو شیلے خون کی بوجس کے ساتھ جلنے کی بساند بھی تھی جیسے آگ پر اسے پکایا جا رہا ہو۔

یہ مسئلہ کئے جانے کی گھڑی تھی اس لئے کہ نوبت کی طرح انا الحق کی صدا جیسے کسی جاں بلب مریض کے آخری سانس کے ساتھ سنائی دے رہی تھی۔

حامد نے کہا: ”عمار۔ اگر کوڑے کھانے اور سنگباری کے بعد بھی وہ زندہ رہا تو مسئلہ کئے جانے پر بھی وہ شاید جان سے نہ گزرے۔ تمہارا کیا خیال ہے۔“

عمار نے کہا: ”یاسیدی! جان سے تو وہ کب کا گزر چکا۔ صرف اس کی ”انا“ زندہ ہے اور وہ حق کو پکارتی ہے۔“

”خوب۔“ حامد نے کہا ”خوب۔ انا زندہ ہے اور وہ مردہ ہے۔ کیا پھیلیوں میں باتیں کرتے ہو۔“

”آقائے سیدی ورنہ اتنی زحمت اٹھانے کے بعد کوئی ذی روح زندہ رہ سکتا ہے۔“ عمار نے کہا۔

”میں اس کی انا کو قتل کروں گا وہ حق کو نہ پکار سکے۔“ اس نے مٹھیاں بھینچ لیں اور دانت پیس کر کہا: ”تم دیکھنا کہ جب انا نہیں رہتی

تو کچھ بھی نہیں رہتا۔ کچھ نہیں رہے گا اور یہ پکار جو درود دیوار سے پست و بلند سے خوب وزشت سے آرہی ہے ختم ہو جائے گی۔“

حبشی نے اس کے پاؤں کاٹے۔ چھری کندھ کی اور ریشہ ریشہ کٹ رہا تھا۔ نہایت آہستگی سے۔

حسین کا چہرہ زرد تھا۔ وہ اپنی ان بے پناہ آنکھوں سے جواب خشک تھیں کہ گریہ وزاری کے انجام تک اپنی منزل کو سامنے دیکھ

رہی تھیں۔

”میری ہمت کے پاؤں کاٹ سکوں تو جانوں۔“ حسین نے مسکرا کر کہا۔ ”جن راہوں سے میرا گزر ہوگا وہاں کی گرد راہ کا بھی

تمہیں اندازہ نہیں۔ ہاں کاٹو اور آہستگی سے تاکہ نس نس کئے۔“ اس نے آقائے رازی کو سامنے دیکھا تھا۔

”آقائے رازی۔ اتنے زرد رویوں ہو۔ کیا تمہیں دشت سوس کی خوشبو چاروں طرف پھیلی ہوئی محسوس نہیں ہوتی۔ آج دشت

نازاں ہے اور آرے رقصاں ہیں۔ آج تو کامگار اور مردادون ہے۔ عشق تپاں آج اپنی منزل کو پہنچے گا۔ آقائے رازی۔ سنو ہوا

مبارک باد لغموں سے یوں بھری ہے جیسے آوازوں سے باجا۔“

آقائے رازی نے آہ زار کی اور چیخ چیخ کر رونے لگا۔ آنسو اس کی سفید داڑھی پر سے گرد سفر کو دھور ہے تھے۔ وہ ہاتھ مل رہا تھا:

”آہ منصور کا بیٹا کیسا دیوانہ ہو گیا تھا۔ آہ آہ اور آہ“

کئے ہوئے پاؤں میں سے انا الحق کی آواز آتی تھی۔ لوگ ڈر کر بھاگ رہے تھے۔

حامد کا پیغام آیا: ”اگر وہ اب بھی زندہ ہے تو اس کے بازو کاٹ ڈالو۔“

حبشی نے کہا: ”میں اب جوڑ جوڑ بند بند کاٹوں گا۔“ وہ بھی جوش میں آیا ہوا تھا اور ساری آوازوں کی طرف سے کان بند کئے تھا۔

کئے ہوئے ہاتھوں سے خون بہتا دیکھا کہ اس نے اسے اپنے منہ پر مل لیا۔

آقائے رازی نے کہا: ”بجدا میں دیوانہ ہو جاؤں گا۔ یہ کیا کر رہے ہو۔“
 ”وضو کر رہا ہوں تاکہ نماز عشق ادا کر سکوں۔ آقائے رازی کیا عشق مزرع زندگی نہیں۔“
 ”حسین کیا تم اتنے دیوانے ہو کہ تمہیں جان سے گزرنے کا بھی خیال نہیں۔“
 رازی نے کہا۔

”کیوں نہیں۔ کیوں نہیں۔ یہ جان ہی تو تھیکہ راہ میں حائل تھی۔ اب میں آزاد ہوں۔ میں اور وہ یوں مل گئے ہیں جیسے شراب پانی میں مل جاتی ہے۔“

”حسین۔ حسین۔“ فاطمہ نیشاپور نے اپنے جگر کو تھام کر کہا: ”یہ کیا ہے۔“
 ”یہ تصوف ہے۔ راضی برضا۔ خوش۔ مستعد۔ اس کو پانے کی خوشی میں دیوانہ۔“
 ”تمہیں تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔“ آقائے رازی نے پوچھا۔

”نہیں بجدا نہیں۔ مجھے تکلیف کیوں ہو۔ وہ میرا دوست ہے میں اس کا دوست ہوں۔ ہم میں صرف لاوت و ناسوت کا فرق ہے۔ اب وہ بھی نہیں رہا۔ انا الحق۔“

اس نے اتنے زور سے نعرہ لگایا کہ آسمانوں اور زمینوں اور دجلہ کی لہروں نے مل کر کہا۔ انا الحق انا الحق۔ اور پھر یہ صدا اطراف بغداد سے سنائی دینے لگی۔

”اب وقت اور سوال برابر ہیں۔ جیسا کہ خواجہ حسن بھری نے حطیم میں کہا تھا۔“ سمنون محب کے دل نے کہا۔

”بے شک بے شک۔ دونوں برابر ہیں۔ سوال بھی اور وقت بھی۔ ہاں خواجہ حسن بھری نے جو فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔ میں ساری عمر منتظر رہتا اور میرے سوال کو برابر وقت نہ ملتا تو بھلا پورا ہو سکتا تھا۔ ہاں اے میرے دوست! اب سب برابر ہے اور میرا سوال پورا ہو۔ میں نے تجھ سے تجھے مانگا تھا اور کیا خوب سوال تھا۔ میں بارگاہوں کے باہر منتظر رہا اور میری نگاہ نہیں بھٹکی۔ میری نگاہ کا منتہی تو تھا۔ انا الحق۔“

جنید نے کہا: ”اسے اپنے پر اختیار نہیں تھا کہ اس کا اختیار کسی اور کے ہاتھ میں تھا۔“

قاضی ابو عمر نے کہا: ”میں اس سے بری الذمہ ہوں اے میرے خدا۔ میں اس سے بری الذمہ ہوں۔ اس خون ناحق کا بوجھ حامد کی گردن پر ہو۔“

”یہ شعبدہ باز جادوگر کہیں موت کو بھی شکست نہ دے دے۔“ حامد نے زخمی جانور کی طرح اپنے خانہ باغ میں گھوم رہا تھا۔ شورانا لہق سے گھرا ہوا غلام اسے دم دم کی خبریں دے رہے تھے جب حسین نے خون سے وضو کیا تو حامد نے کہا:

”بے مثال عاشق ہے۔ کیا وقت نے جذبے کی شدت کو کم نہیں کر دیا کرتا۔“

قاضی ابوالحسین نے کانپ کر کہا: ”کہیں ہم سے غلطی تو نہیں ہوئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خدا سے تعلق میں بہت آگے نکل گیا ہو۔“ حامد بہت تلخی سے ہنسا۔ ”خدا کا عشق۔ اس کا کیا ذکر کر رہے یہاں۔“

قاضی نے نہایت مضطرب ہو کر کہا: ”آپ محسوس نہیں کرتے وزیر مملکت کہ کوئی انسانی فانی جذبہ اتنا شدید نہیں ہوتا کہ محب اور محبوب ایک ہو جائیں۔“ پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر اس نے کہا: ”آپ یہ صداے انا لہق سن رہے ہیں۔“

”شعبدہ بازی۔ جادوگری۔ اس کے ختم ہوتے ہی یہ سب ختم ہو جائے گا۔“ اس نے تالی بجائی۔

جبشی نے روش پر قدم رکھا۔

”عمار کو بلاؤ۔ فوراً“

”عمار۔ یہ شور قیامت یونہی تھے گا کہ اس کی گردن اڑا دو۔“ وہ تیزی سے اس روش کی طرف چلنے لگا جہاں فواروں کی ایک لمبی قطار تھی اور پھنوار راستے کو گیلیا کرتی تھی۔ درختوں کے سائے میں یہ عجیب سماں تھا۔ مگر اب حامد کو لگا فواروں سے پانی کے ساتھ خون برس رہا ہے۔ پگڈنڈی خون رنگ ہو رہی ہے۔ سائے سکڑ گئے تھے اور ہر صدا آہ و نالہ کی صدا تھی۔

وہ پلٹا اور اس نے قاضی ابوالحسین سے کہا: ”اب سارے جذبے انسانی اور آفاقی مٹ جائیں گے۔“

قاضی نے سر کو دائیں بائیں ہلایا جیسے افسوس زدہ ہو مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

”آخر یہ سب کیا ہے۔“ حامد نے قریب آ کر پوچھا۔

”کیا۔“ قاضی نے پوچھا۔

”یہی صدا کیوں اور آہ و نالہ۔ آخر کیوں۔ کیا عناصر اتنے مضطرب ہو جاتے ہیں۔ کیا ہر ذرہ ایک آنکھ بن جاتا ہے کہ اس ایک

نظارے کے لئے کھلے۔“

”شاید۔“ ابوالحسین نے زیر لب کہا۔

”آپ شاید کیوں کہتے ہیں۔ کیا آپ کو دکھائی نہیں دیتا کہ ہر ہر کوئلہ قتل حسین کی تصویر بنا ہوا ہے۔ دیکھئے اب وہ اس کی گردن کو

اڑا رہے ہیں۔ بخدا اس سے بہتر نظارہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔“
اس نے ایک نعرہ مستانہ لگایا اور رقص کرنے لگا۔

قاضی ابوالحسین نے نہایت زرد چہرہ آسمان کی طرف اٹھایا اور دشت سوس کی فضا میں معلق زرد اور سیاہ سرخ ریت بارش کے قطروں کی طرح ٹپ ٹپ اس کے دائیں بائیں گرنے لگی۔ جیسے اس نظارگی سے اس کا تعلق ختم ہو گیا ہو۔ خود یہاں بغداد کے نواح میں اسے اب اور ٹھہرے رہنے کی اجازت نہ ہو۔ جیسے فوج نے محاصرہ اٹھالیا ہو اور شہر ممنوع سے مراجعت کر رہی ہو۔ ایک قربانی کافی۔
معبداہید کی آگ کے سامنے ایک ذبیحہ ہی سب کا کفارہ ہو فضا انا الحق کی صداؤں سے یوں بھری تھی جیسے ہر ذرے کو دار پر کھینچا گیا ہو اور اس کے حلق سے گھٹی گھٹی انا الحق کی آواز آ رہی ہو۔ ایک لفظ طبل جنگ کی طرح، نوبت کی طرح نقارے کی طرح بجایا جا رہا ہو۔
اعلان کی جا رہا ہو کہ سب طرف وہی ہے وہی ہے۔ انا الحق، انا الحق!

جہان اس خون ناحق میں ڈوبا ہوا لگتا تھا۔ سنگباری کے پتھر اور جشی کی کندلوں اور حسین کے جسم کا ہرن بن موانا الحق پکار رہا تھا۔
آہ و نالہ کرتے لوگوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر پہلے اس شہید ازل کے قتل کا نظارہ شوق سے کر رہے تھے اب سینہ کو بی کر رہے تھے۔ بغداد کی گلیاں اور بازار ایک عجیب اداسی سے بھر گئے تھے۔ سارے کاروبار معطل ہو گئے تھے۔ فضا بوجھل اور ہوا دم گھونٹنے والی تھی۔

”کون ہے اس قتل بے گناہ کا اصل محرک کون ہے۔“ لوگوں نے ایک دوسرے سے پوچھا۔
لوگ گھروں سے نکل کر پل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ دجلہ کے دونوں کنارے ہجوم خلق سے بے تاب لگتے تھے۔ بوڑھے سر ہلا کر کہتے تھے۔

”اس خون ناحق کی وجہ سے اب بغداد پر آفت آئے گی۔“
ہر اس عورتیں بے پردہ اپنے بچوں کو سینے سے چمٹائے نکل آئیں
”کیا قیامت قائم ہو گئی تھی۔“

”اس خون ناحق کے ذمہ دار کو دار پر کھینچو۔“ سب طرف سے آوازیں آئیں۔ عمار نہایت حواس باختہ بغیر اجازت طلب کئے در

آیا:

”مولائی سیدی۔ وہ حسین بن منصور کے قاتل کو تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ لگتا ہے قیامت قائم ہو گئی ہے۔ لوگ فساد پر آمادہ

ہیں۔“

حامد نے چیخ کر کہا: ”جاؤ اور اس کے جسد خاکی کو جلا دو۔ خاک اڑا دو۔ اس کی انا کو میں نے قتل کر دیا ہے۔ اب وہ کیسے حق کو پکارے گی۔“ وہ پھر رقص کرنے لگا۔

عمار نے سوچا۔ حامد بن عباس وزیر مملکت دیوانہ ہو گیا تھا۔

پھر وہ بھاگا اور اس نے خلقت کے ہجوم کو چیر کر راستہ بنایا۔ پل کے ایک حصے کو توڑ کر جمع کیا اور اس کٹے ہوئے سر بریدہ لاشے کو ان مشلہ کٹے ہوئے بازوؤں اور پاؤں کو اس ڈھیر پر رکھ کر آگ لگا دی۔ ہجوم برابر نعرے لگا رہا تھا اور واویلا کر رہا تھا اور ہوا میں شعلے اور چنگاریاں اور ذرے انا الحق پکار رہے تھے۔ اتنی بہت آنکھیں اس پرنگراں تھیں اور محمی کا پوتا حسین خود آتشکدہ بن گیا تھا۔ تاکہ اس آگ کی فروزاں رکھ سکے جو اسے خون کی امانتوں کے طور پر ملی تھی۔ وہ ایک شعلے میں تبدیل ہو رہا تھا کہ خود شعلہ تھا۔ انا الحق کہہ رہا تھا کہ وہ حق تھا۔

انا الحق..... انا الحق..... انا الحق!

کربلا میں رود فرات کے کنارے قتل حسین کے بعد

بغداد میں رود دجلہ کے کنارے قتل حسین کے بعد

آقائے رازی قافلے کے ہمراہ دشت سوس کی طرف جا رہا تھا۔ خراسانی سرائے کے باہر وہی شور و غوغا تھا جو الوداع کہنے والوں کے آنسوؤں اور دعاؤں اور رخصت دانے والوں کی جلد لوٹ آنے کی مناجاتوں سے ترتیب پاتا تھا۔ اونٹ بار کئے جا رہے اور بلبلارہے تھے۔ نچروں پر سامان تجارت، پانی، مشکیزے اور اسلحہ تھا۔ مضامین سے گھی اور مکھن اور موٹا سوتی کپڑا لے کر عورتیں گھوم رہی تھیں۔ ان کے چہرے نقابوں میں جھم جھماتے تھے اور زندہ جاندار بہت کچھ دیکھتی ہوئی آنکھیں نظر آتی تھیں اور ان پر ستاروں کا گمان ہوتا تھا۔ چاند کسی مسافر کی نیم کشیدہ کمان کی طرح آسمان کی پشت پر معلق تھا۔ ہودوں اور عماریوں میں سوار ہونے والوں کی چہل پہل، بچوں کا شور اور چہکار ایک بڑے میلے کی یاد دلاتی تھی اور شاہراہ پر کئی اور چھوٹے قافلے مختصر فاصلوں کے لئے رواں تھے۔ اونٹوں کے گلے میں پڑی گھنٹیوں کی منٹا ہٹیں ایک بڑے آہنگ میں شریک ساز کی سی دل نشینی سے بھتی تھی اور حدی خوانوں کے گیت ہوا میں سے آبشار کی طرح گر رہے تھے۔

دشت سماویہ میں اغول سوتی تھی۔

دشت سوس میں آندھیوں کی بے قرار یوں زرد سرخ اور سیاہ ریت کے ذروں کو قرار آ گیا تھا۔ اس وقت تک جب تک شعلہ
ساماں دل جان سے گزرنے اور جہاں سے گزرنے کا اہتمام نہ کرے جس کی پکار عرش کے کنگروں کہ نہ چھو لے اور بارگاہوں سرا
پردوں سے پرے تک نہ پہنچ جائے۔

آب دژ کے کنارے ریشم بننے والوں کی بستی کے قریب مسجد ہے۔ آقائے رازی نے سوچا، خانقاہ سے نکل کر درویشوں کی کوئی
ٹولی اب بھی نماز میں شامل ہو اور پھر اپنے غفلوں کو سمیٹ کر کلاہ تھامے ان میں سے ایک انگلی اٹھا کر کہے:

عشق	مزرع	گلاب	ہے
عشق	مزرع	زندگی	ہے

محی کے پوتے اور منصور کے بیٹے کے لئے کیوں عشق مزرع گلاب نہیں بنا.....؟ مزرع زندگی نہیں تھا؟ اسے سارے جہاں
میں دھنکیوں کا گیت ہی سنائی دیا:

از	پئے	جاناں	جاں	ہم	رفت
جاں	ہم	رفت	و	جاں	ہم
				جاں	رفت

”بے شک یہ اپنا اپنا مقدر ہے کہ عشق کہیں مزرع زندگی ہے اور کہیں جان سے گزرنے کا نام!“

